دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
جاسوسی ڈائجسٹ
مارچ 2013
نگران اعلیٰ
معراج

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

جلد43 • شمارہ03 • مارچ 2013 • زرِسالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط وکتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر229 کراچی74200 • فون 35895313 (021) فیکس35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

عزیزانِ من... السلام علیکم!

دو ہزار تیرہ کا..... تیسرا شمارہ حاضر ہے...... ماہرین کہتے ہیں کہ پاکستان میں بنیادی ضروریات کی دستیابی میں جو رکاوٹیں پیش آتی ہیں، وہ شہریوں کو ذہنی مریض بنا رہی ہیں۔ اس دباؤ کے سبب ہر شخص بوکھلایا، ڈرا سہما ہوا نظر آتا ہے۔ بجلی، گیس، پانی کی کمیابی پر مستزاد اسٹریٹ کرائمز ہیں جنہوں نے بڑے شہروں کے باسیوں کے ساتھ اب دیہی اور مضافاتی بستیوں کو بھی ہراساں کرنا شروع کر دیا ہے۔ کراچی میں قتل و غارت گری اپنی جگہ بدترین مذمت کے قابل ہے۔ جو اس کی زد سے بچے ہوئے ہیں وہ دورانِ سفر، کسی ٹریفک جام میں، کسی چوراہے پر، سرخ بتی پر یا کسی اسپیڈ بریکر پر اپنی جملہ نقدی اور قیمتی اشیاء سے محروم اور ساتھ ہی ہلاک یا زخمی ہو جانے کی دہشت میں مبتلا رہتے ہیں۔ ہماری سڑکوں پر اور گلیوں میں اس لہو رنگ دہشت کا راج ہے اور ہمارے تمام رہنما ہوٹر بجاتی گاڑیوں کے کاروانوں میں بے چاری پولیس کو جوتے رہتے ہیں..... امن و امان کون قائم رکھے، ڈکیتوں، رہزنوں، مجرموں اور مجرموں کو کون پکڑے...... ایسی بالادستیوں بلکہ چیرہ دستیوں کی رسی جب حد سے زیادہ دراز ہو جاتی ہے تو پکڑ کے لیے پھر فرشتے ہی حرکت میں آتے ہیں۔ نہ جانے انہیں کس کا انتظار ہے۔ سنا ہے کہ کراچی میں اسٹریٹ کرائمز پر قابو پانے کے لیے پولیس کا موٹر سائیکل اسکواڈ تیار ہو رہا ہے...... اللہ کرے کہ یہ شہریوں کو اس عذاب سے نجات دلا سکے تاکہ دیگر شہروں میں بھی کسی ایسے بندوبست کی امید کی جا سکے ورنہ روایت یہ ہی ہے کہ ایسے منصوبے عموماً کاغذوں میں ہی دفن ہوتے رہے ہیں... آیئے چوروں... ڈکیتوں اور راہزنوں سے بچتے ہوئے محفل میں چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کون، کیا کر رہا ہے...

چشتیاں سے آصفہ صداقت کی تحریفیں ''پہلے تو ڈھیر ساری معذرت آپ سے اور اپنی محفل کے تمام نٹ کھٹ ساتھیوں سے کہ سال بھر بعد شریک محفل ہوں۔ (کیوں جی... ہم تو بہت اداس تھے... آپ کہاں شادیانے بجانے میں مصروف تھیں؟) وجہ کچھ بھی رہی ہو مگر مجال ہے جو آپ سب لوگ میرے بغیر اداس ہوئے ہوں۔ سرورق کی حسینہ دودھ جیسی چٹی ہونے کے بجائے چاکلیٹ کی طرح براؤن تھی۔ کھاتے کھاتے رہ گئے۔ کافی غور و خوض اور گہری مشاہدے کے بعد اس نتیجے پر پہنچ کر فروری کا سرورق عمدہ تھا۔ او ہو یہ محفل میں جلنے کی بو کدھر سے آ رہی ہے۔ آہا ہاجی! کرسی صدارت پر... دھواں تو اٹھنا ہی تھا۔ ہاہاجی ڈھیر ساری مبارک باد۔ ثاقب تبسم کا منفرد پارہ چھو گیا دل ہمارا۔ ویل ڈن برادر اور بہت بہت شکریہ ادارے کا جنہوں نے آخر کار ڈائجسٹ ملنے کی تاریخوں کا اعلان کر کے دل خوش کر دیا۔ اب ذرا چلتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ کیپل سائن، علیم صاحب نے کیا چن کر نام رکھا ہے۔ تحریر میں سنجیدگی کم اور مزاحیہ پن زیادہ تھا۔ تنویر ریاض کی میزان تھوڑی سی بور لگی۔ سلیم فاروقی نے پہلا رنگ لکھ کر کمال کر دیا۔ زبردست پلاٹ تھا۔ کبھی ہر مہینے ایسی پولیسیا کہانی ضرور شائع کیا کریں۔ ہماری پولیس پر اس کا اچھا اثر پڑے گا۔ ہائی واوے ایسے پولیس والے ہوتے کہاں ہیں؟ بہرحال مایوسیوں کے اندھیرے کو دور کرتی اور زندگی میں نوید کی کرنوں کو روشن کرتی پر اثر تحریر تھی۔ آخری رنگ میں کاشف زبیر صاحب کو پایا تو بے اختیار کہہ اٹھے۔ ان کی کسی بھی کہانی نے آج تک بور نہیں کیا، چاہے وہ المیہ ہو یا طربیہ یا ہو مزاحیہ ایک خاص مقصد اور پیغام تو چھپائے ہوتی ہے۔ استقامت میں جمشید رضی کو تباہ ہونے کے ساتھ ساتھ ارادے کا پکا اور مضبوط شخص تھا۔ تحریر کے انجام نے چونکا دیا۔ ویل ڈن کاشف صاحب! دونوں رنگوں میں ڈوب کر اپنی اقبال تک پہنچے۔ خوب صورتی صورت کی نہیں سیرت کی ہوتی ہے۔ بالآخر اقبال صاحب نے ثابت کر دیا وفا اور بے وفائی کو صورت و سیرت کے ساتھ مشروط کرتی اور احساس جرم کو اجاگر کرتی واقعی سنسنی خیز داستان تھی۔ عثمان صاحب کی قتل معبد بھی عمدہ تحریر تھی، پڑھ کر مزہ آ گیا۔ ناکردہ چھوٹی مگر اچھی تحریر تھی۔ جمال دستی کی انو کھی تفریح واقعتاً تفریح ثابت ہوئی۔ خوب صورت اور طرح دار عورتیں کیسے مردوں کو بے وقوف بنا کر اپنی انگلیوں پر نچاتی ہیں۔ جرم تو جرم ہے چاہے اس کی صورت کوئی بھی ہو۔ آخر کم کو اپنے جرم کی سزا موت کی صورت ملی۔ آصف ملک نے حق دار میں حق کو مطلوبہ شخص تک پہنچا ہی دیا، خوب تحریر تھی۔ دور وحشت میں سسپنس، تھرل، ایڈونچر بھی کچھ تھا۔ مریم کے خان صاحب ایویں تو آپ کے فین نہیں۔ انجم صاحب نے فرار کی شکل میں اچھا تحفہ دیا۔ اسامی گرداب میں رومانس کیوں ختم کر رہی ہیں اور جاوید بھی پتا نہیں اب کس جال میں اپنے آپ کو پھنسانے جا رہا ہے۔ اگرچہ کہانی کا پھیلاؤ بڑھ گیا ہے مگر اسامی لوگوں کی باتوں میں آ کر اس کو ختم کرنے کے چکروں میں نہیں پڑنا۔ للکار تو میری فیورٹ کہانی ہے۔ طاہر جاوید مغل صاحب سے گزارش ہے بھئی یوسف نامی کریکٹر کو تو پھڑکا ہی دیں۔ ایویں ثروت اور تابش کے درمیان دیوارِ چین بنا ہوا ہے۔ جاوا کا کریکٹر بھی بہت مزے کا ہے۔ اتنی اچھی تحریروں کا سہرا تو جاسوسی کے سر ہی بندھنا چاہیے۔ بہرحال اس ماہ جاسوسی کا سارا شمارہ ہی زبردست تحریروں پر مشتمل تھا۔ ویل ڈن اینڈ کیپ اٹ اپ۔''

انجینئر عمیر شہزاد بنگش کا پشاور سے عنایت نامہ ''یہاں پر میں آپ لوگوں کو اپنی داستانِ غم سنانے سے گریز کروں گا اور پاکستان کی دکھی عوام کو مزید دکھی نہیں کروں گا کہ ہم نے بارش میں جاسوسی کیسے حاصل کیا۔ جاسوسی کے سرورق پر ہماری تیز رفتار آنکھیں مرکوز تھیں۔ باہر کی کڑاکے دار سردی سے بچنے کے لیے دوستوں کی محفل میں گھس گئے جہاں پر ایڈیٹر صاحب کو طن عظیم کی محبت اور غم میں نڈھال پایا پارلیمنٹ میں ماہا ایمان کو کرسی صدارت پر براجمان پایا۔ جنہوں نے اپنی عمر اور عہدے کا لحاظ کرتے ہوئے سنجیدہ پن کا مظاہرہ کیا۔ بھنڈ ایجنسی سے طاہر حسین کو ایڈیٹر صاحب نے دانش مندی اور ہوش مندی سے جواب دیا۔ محمد ہمایوں سعید کا تبصرہ پڑھا جس میں اس نے اپنی عمر کا تجربہ استعمال کرتے ہوئے لوگوں کو مفید ٹوٹکے بتانے کا عمل جاری رکھا۔ شمس

الحق کی طرح عبدالمنان چوچک کو بھی لوڈشیڈنگ نے ستایا۔ باقی تبصروں میں عثمان غنی، مصدق محمود دانش اور دلنشین بلوچ کی خیال آرائی اچھی لگی۔ کہانیوں میں انچ اقبال پہلے پڑھی اور اس کے بعد للکار کا رخ کیا۔ میں جب بھی للکار میں ثروت کے بارے میں پڑھتا ہوں تو مجھے سلطانہ کی یاد بہت ستاتی ہے اور دل خون کے آنسو روتا ہے۔ (آپ کا دل کیوں روتا ہے... یہ بات سمجھ نہیں آئی؟) محکمہ ڈاک کی نااہلی کی وجہ سے باقی رسالہ پڑھے بغیر آپ لوگوں کو حاضری دینے کے لیے حاضر ہوں۔" (حاضری قبول کی جاتی ہے)

اسلام آباد سے سید شکیل حسین کاظمی کی معروضات "پچھلے دنوں اسلام آباد سمیت تقریباً پورے ملک میں مسلسل تین روز تک موسم ابر آلود رہا اور بعض مقامات پر خوب بارش بھی ہوئی۔ اسی بارش میں مجھے جاسوسی کے حصول کے لیے بھیگ جانے کا شرف بھی حاصل ہوا، وہ بھی اتنی سردی میں مگر صد شکر کہ کوئی مسئلہ نہیں بنا۔ سرورق حسبِ روایت اور خوب صورت تھا۔ چیں بہ جبیں، نکتہ چینی میں مدیرِ اعلیٰ کی طرف سے معاشی اور سیاسی دگرگوں حالات پر اچھی تحریر پڑھنے کو ملی۔ ماہا ایمان اپنے خوب صورت اور مکمل تبصرے کے ساتھ منصبِ صدارت پر موجود تھیں۔ ماہا ایمان ذاتی تخلیق بھی اگر آپ کے حق میں نہ ہو تو اس کا فائدہ؟ بہت ساری باتیں جو میں خود نہیں کہہ سکتا شیکسپیئر پر ڈال دیتا ہوں۔ کاشف علی میراں آپ کو شگفتہ مبارکباد آپ کی شادی کی سالگرہ کے لیے۔ ثاقب تبسم نگینہ صاحب کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح بھرپور اور جاندار تھا۔ عبادت کاظمی ایڈوانس ٹیلی کام کی طرح ہم بھی دوستوں کو بھولتے نہیں۔ عمیر شہزاد بخش اور ترقی کی سوچ میں کافی ہم آہنگی نظر آئی ہے۔ دلنشین بلوچ رازکی باتیں سرِعام نہیں بتائی جاتیں۔ ویسے یہ سوال مجھ سے میری پڑوسن بھی اکثر کرتی ہے۔ اسے تو میں تفصیل سے سمجھا چکا ہوں، کبھی وقت ملا تو آپ کو بھی سمجھا دوں گا۔ اور میں بادام نہیں مغز کھاتا ہوں۔ کس کا، یہ اگلی قسط میں بتاؤں گا۔ میں چاہتا تھا شیکسپیئر کی طرح اپنی پڑوسن کو بھی خود ہی محفل میں متعارف کراؤں مگر بھلا ہو عبدالمنان صاحب کا جنہوں نے میرا کام آسان کر دیا کیونکہ وہ پہلے سے اس کردار سے متعارف ہو چکے ہیں فیس بک پر۔ اس لیے محفل میں سب سے اچھا تبصرہ عبدالمنان کا لگا کیونکہ اس میں ذکر میری پڑوسن کا تھا۔ ہمایوں سعید برادر! آپ کے بلند افکار جان کر بہت اچھا لگا، خودی بلند ہونے میں کافی وقت لگتا ہے جیسے آپ نے ارتقا کے مراحل طے کیے، پہلے رومیو پھر راج۔ اب جبکہ آپ کی خودی بلند ہو چکی تو آپ نے دوسرے ناموں کا سہارا لینا چھوڑ دیا۔ اس لیے میں بھی شاید تین چار سال تک شیکسپیئر سے جان چھڑوا ہی لوں گا۔ مگر یہ یاد رہے، میں نے اپنا نام تبدیل نہیں کیا۔ محفل سے نکلتے ہی للکار کا رخ کیا۔ مغل صاحب کے شاہکار قلم سے ایک اور بہترین قسط پڑھنے کو ملی۔ آخر کو عمران آ ہی گیا انڈیا اور کہانی اچانک ہی پہلے سے زیادہ اچھی لگنے لگ گئی۔ امید تو ہے عمران کوئی بہتر راستہ نکال لے گا ورنہ ہو سکتا ہے اسے یہ موت کا کھیل کھیلنا بھی پڑ جائے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ اس کے بعد گرداب کی باری آئی۔ گرداب میں شہریار اور سلو یقیناً نوسربازوں کے ہتھے لگنے والے ہیں، ادھر بااختیار چودھری کی بےاختیاری قابلِ دید رہی۔ سرورق کے رنگوں کی بات کریں تو سلیم فاروقی صاحب کی اجالوں کے سفیر بس گزارہ کر گئی۔ سلیم فاروقی صاحب کی کہانیوں کا انداز کافی حد تک یکسانیت کا پہلو رکھتا ہے مگر یہ ضرور ہے کہ بور نہیں لگتا۔ دوسرا رنگ کاشف زبیر صاحب کا استقامت مجموعی طور پر اچھی کہانی تھی مگر اس میں مجھے ڈاکو بہت رحم دل نظر آئے۔ یعنی وہ جمشید رضی کو راضی کرنے کے لیے تشدد کے ساتھ ساتھ ترلے بھی کرتے رہے اور آخر تک کسی بھی صورت انسانیت کے لبادے سے باہر نہیں آئے۔ باقی معروفیت ہی اتنی ہے کہ آدھے سے زیادہ رسالہ ابھی رہتا ہے مگر شاملِ حال رہنے کے لیے تبصرہ ارسال کر رہا ہوں۔" (شکریہ)

چوچک اوکاڑہ سے عبدالمنان کا اظہارِ تشکر "فروری کا ڈائجسٹ حسبِ معمول پانچ تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل پر نظر ڈالی تو پہلا تاثر یہ تھا کہ اوپر والے صاحب تو شکیل کاظمی کی طرح پڑوس سے مار کھانے کے بعد بھی کھسیانی ہنسی ہنستے نظر آ رہے ہیں اور نیچے ان کی پڑوسن کسی نقاب پوش سے پیچیں لگانے میں معروف نظر آ رہی ہیں۔ فہرست اور اشتہارات کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے چیں بہ جبیں، نکتہ چینی میں پہنچے۔ سب سے پہلے اپنے تبصرے کو ڈھونڈنے کی کوشش کی اور صاحبانِ تبصرہ نویس میں سب سے آخری نشست پر خود کو بیٹھے دیکھا۔ ماہا ایمان صاحبہ! مبارک باد قبول کیجیے گا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے مغل اعظم کی للکار پڑھی۔ مغل صاحب کی کہانی پڑھتے ہوئے یہ محسوس نہیں ہوتا کہ کہانی پڑھ رہے ہیں بلکہ 3G ٹیکنالوجی کی طرح ہم بھی اس کہانی کا کردار محسوس کرتے ہیں۔ مغل صاحب منظر نگاری اور ایکشن، توہم پرستی اور پیار پر لکھنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ اس دفعہ کی قسط شاندار تھی۔ گرداب کی طرف بڑھے تو مایوسی کا شکار ہو گئے کیونکہ اسما صاحبہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بڑی تفصیل سے بیان کرنا شروع کر دیتی ہیں جو بور کر دیتی ہیں۔ جب کہانی شروع ہوئی تھی تو اس وقت چودھری کا کردار بڑا جاندار تھا لیکن اب وہ صرف کٹھ پتلی نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ سلو اور عادل کے مکالمے اور گھوڑے پر سفر اور پیچھے کی باتوں کے دوران ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں انیسویں صدی کی کوئی کہانی پڑھ رہا ہوں۔ انچ اقبال صاحب کی کہانی کی اڑان سے تو ایسا لگ رہا تھا کہ اونچی پرواز کرے گی لیکن جلدی ختم ہو گئی۔ کاشف سر کی استقامت درمیانی سی اسٹوری تھی۔"

گلی جنوں سے فہیم اللہ خان کی شکایات "اس بار تو جاسوسی کچھ زیادہ ہی لیٹ یعنی 9 تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل پر سرسری نگاہ ڈالی اور آگے بڑھے محفل کی طرف۔ ایڈیٹر صاحب! آپ ٹھیک کہتے ہیں کہ ہم ترقی نہیں کر رہے لیکن یہ سب ہمارے اعمال کا نتیجہ ہے۔ یہ میرا دوسرا خط ہے۔ پہلے خط کے شائع ہونے پر خوشی تو یقیناً ہر کسی کو ہوتی ہے لیکن مجھے کچھ زیادہ نہیں ہوئی تھی کیونکہ ایڈیٹر صاحب نے ایڈیٹنگ کی قینچی کچھ زیادہ ہی گہری چلائی تھی اور یہ جملہ بھی کاٹ دیا تھا کہ یہ میرا جاسوسی میں پہلا خط ہے۔ (خوش آمدید، بہت بہت خوش آمدید... اب تو خوش ہیں؟) اس دفعہ خلافِ توقع کرسی صدارت پر ماہا ایمان کو دیکھا۔ مبارک باد قبول کیجیے۔ کوٹ رادھا کشن سے کاشف علی میراں کو شادی کی سالگرہ مبارک ہو۔ ماہتاب گل صاحب! نئی زندگی کی شروعات مبارک۔ پشاور سے بلقیس خان، ماہا ایمان کی خوشامد کرتی نظر آئیں۔ انجینئر عمیر شہزاد بخش صاحب! میں نے تو ٹائٹل اور ٹائٹل گرل کی تعریف کی ایک رسم نبھائی تھی، تبصرے کو خوب صورت بنانے کے لیے۔ بہرحال ہر کسی کی اپنی اپنی سوچ ہوتی ہے۔ علی پور سے ثاقب تبسم نگینہ کا شاعرانہ مزاج کا تبصرہ پسند آیا۔ پشاور سے عثمان غنی! شکریہ۔ کہانیوں میں سب سے پہلے للکار پڑھی۔ اچھا ہوا ثروت پر یوسف کی حقیقت کھل گئی۔ لگتا ہے عمران پھر بڑی ہنگامہ خیزیاں لانے والا ہے۔ اگلی قسط کا

شدت سے انتظار رہے گا۔ اس کے بعد دوسری سلسلے وار کہانی گرداب پڑھی۔ کہانی خوب جا رہی ہے۔ باقی رسالہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔" (واہ بھئی واہ)

گجرات سے مصدق محمود دانش کی آمد شماؤ کر کے "4 فروری کی ابر آلود سہ پہر کو اسکول سے گھر واپسی پر جاسوسی حسبِ معمول عرفان نیوز ایجنسی سنگووال سے خریدا۔ سرورق کا دیدار گھر جا کر کیا تو مس جاسوسی کے نیم وا گلاب ہونٹوں کو دیکھ کر چودہ طبق روشن ہو گئے، شماؤ کر کے۔ مثلث کا دوسرا فرد شیطانی ہنسی اور خباثت والے چہرے سے نمایاں تھا۔ منہ سے تھوڑا الو لگ رہا تھا جبکہ تیسرے کردار کے دہشت گرد ہونے میں کم از کم مجھے تو کوئی شک نہ تھا۔ چیں کم مرچ مسالے زیادہ یعنی چیں بہ جبیں، نکتہ چینی میں ماہا جی خالی ٹوکرے کے ساتھ سال نو کی مبارک باد دے رہی تھیں، خیر مبارک۔ مگر مٹھائی کدھر ہے؟ خط پہلے نمبر پر تھا سو مبارکاں، شماؤ کر کے۔ تبصرہ جاندار تھا۔ کاشف علی میراں! 25 فروری کو ہم بھی رشتۂ ازدواج میں قید ہوئے تھے، شماؤ کر کے۔ اور اس دفعہ شادی کی تیسری سالگرہ۔ نمبر 3 پر بلقیس خان عرف بلو جی بلند پرواز کر رہی تھیں، اب پتا نہیں کسی جہاز پر یا خیالوں کی دنیا میں؟ فہد علی جنجوعہ! اماں جی بھی کی ایک جیسی ہی ہوتی ہیں، آپ کی طرح رحمن ملک کی اماں جی بھی کہتی ہوں گی۔ "میرا پتر کروڑوں میں ایک" شماؤ کر کے۔ سید محی الدین کی خوشی شمس الحق کی حاضری اور عبدالمنان کی شمولیت پسند آئی۔ دلنشین صاحبہ! دیدار یار پر مبارکاں، شماؤ کر کے۔ بات اب کہانیوں کی ہو جائے تو انچ اقبال کی کہانی اپنا قیدی ظلم و جبر میں ڈوبی نظر آئی جس میں معاشرے کی بگڑتی صورتِ حال نمایاں تھی۔ پارس نے صحیح وقت پر قربانی دی۔ للکار سنسنی خیز انداز میں آگے بڑھ رہی ہے اور عمران کی ہوشیاری کے ساتھ ساتھ خوش قسمتی اسے دشمنوں پر حاوی کر رہی ہے، شماؤ کر کے۔ اسما قادری کی گرداب میں اس دفعہ شہریار، سلو کے ساتھ اغوا ہو گیا۔ سرورق کے رنگ اب کی بار دونوں کے دونوں پسند آئے۔ سلیم فاروقی کی کہانی اجالوں کے سفیر میں حسن پوری طرح چھایا نظر آیا۔ پوری طرح معاشرے کی تلخ حقیقتوں کی عکاس یہ تحریر اچھی لگی، شماؤ کر کے۔ دوسرا رنگ کاشف زبیر کا استقامت بھی لاجواب کہانی تھی۔ مختصر کہانیوں میں قتل معبد، حق دار اور دودِ وحشت پسند آئیں، شماؤ کر کے۔ اب تمام دوستوں سے اجازت پھر ملیں گے۔"

میر فوجی علی ڈوتو مری فرام دریا خان مری سے "میں جاسوسی کا 15 سالہ شوقین ہوں اور آپ کی محفل میں کئی دفعہ شامل ہونا چاہا مگر بدقسمتی سے آپ کی مہربانی سے باہر ہی رہا۔ خیر جاسوسی 4 تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ مغل بھائی کی پیشکش للکار نے اور خصوصاً عمران کی واپسی پر مزہ آیا۔ پلیز ثروت کو پولیس یوسف کی جان چھوڑ کر ماہ وش کو اپنا لے۔ گرداب کے آخری ورق پبلشر کی غلطی کی وجہ سے نہیں ملے۔ خیر، عادل صاحب پڑوسی ملک پہنچ گئے مزہ آئے گا۔ ان کی زبان سے ہندی بہت اچھی لگتی ہے۔ اجالوں کے سفیر، سلیم فاروقی صاحب زبردست مزہ آ گیا۔ ایسی بھی پولیس ہے۔ اپنا قیدی، انچ تھوڑا سا مختلف تھا۔ اب ہماری پولیس اتنی بھی تیز نہیں۔ استقامت، بہت خوب، بہت ہی خوب۔ جمشید صاحب کی ایمانداری اچھی لگی۔ آخر میں تمام اہلِ وطن کو 23 مارچ کی مبارک۔ اللہ تعالیٰ پاکستان کو ترقی اور کامرانی عطا فرمائے، آمین۔"

ندا مشعل جی مرغزار کالونی گجرات کی آمد بہار "جاسوسی ڈائجسٹ میں لمبے عرصے بعد حاضری۔ مصدق محمود دانش کی صدائے بےخودانہ سن کر ہم دوستوں کی محفل میں رم جھم کی طرح آ گئے۔ کئی دلوں کو بھگو دیں گے، کئی کو تر و تازہ کر لیے پرکھ جو کر لیں گے۔ ہمیں اس کا پکا یقین ہے۔ خیر دوستو! فروری کا رسالہ جو تھی ملا تو سرورق پر اِک نظر ڈالی۔ سرورق کی چھپے نقوش والی حسینہ آہ بھر رہی تھی۔ شہزادی کو حسرت بھری نگاہوں سے الوداع کہہ رہی تھی۔ سرورق کے باقی دو کردار کوئی خاص رعب داب والے نہ تھے۔ سوا ان پر نو کمنٹس۔ دوستوں کی محفل میں منتظم نازک ہٹ لسٹ پر تھی اور وہ تھیں تو مان نہ مان میں تیرا مہمان... ہاہاہا۔ یعنی جاسوسی کی جان مس ماہا ایمان۔ خط لاجواب تھا۔ کھلتا گلاب تھا۔ ہمارا بھی جی خوش کر گیا۔ انکل جی کی طرح ہماری طرف سے بھی پہلا نمبر مبارک باد۔ کاشف علی بھائی کے دکھڑے سنے۔ ترس بھی آیا اور حکام بالا پر شدید غصہ بھی۔ جنہوں نے ہر چیز پر ٹیکس لے کر بھی غریبوں کا خون نچوڑ کر بھی، عوام کو بدلے میں بےپناہ مسائل ہی دیے۔ بلقیس باجی نے ماہا ایمان کو اپنا لیڈر مان لیا۔ شدید حیرت کہ موصوفہ میں حسد والا مادہ نہیں، ہاہاہا۔ فہد علی بھائی! آپ جلدی سے بھاگ لے آئیں۔ کہیں اماں جی پکی بات نہ کہہ دیں۔ سید محی الدین صاحب! حسیناؤں کی تیاریوں پر گرمی اور سردی کا اثر نہیں ہوتا۔ طاہر بھائی کو جاسوسی ڈائجسٹ میں خوش آمدید۔ عمیر شہزاد کا تبصرہ شاندار تھا، پسند آیا۔ نگینہ بھائی نے تبصرے کو شاعری میں خوب صورت انداز میں پرو دیا۔ سید عبادت کاظمی کی درخواست بھی انکل جی نے منظور کر لی۔ باقی خطوط بھی اچھے تھے۔ بات کہانیوں کی ہو جائے تو سلسلے وار کہانیاں ہی چھائی ہوئی ہیں۔ مگر للکار کی نسبت اسما قادری کی گرداب بہت زیادہ پسند ہے۔ کیونکہ گرداب حقیقت کے قریب تر ہے اور شہریار بلاشبہ اس کہانی کا ہیرو ہے جس کی ہیروئن کسی اور کی ہو گئی۔ بہرحال، یہ کہانی معاشرے کی حقیقتوں کو ظاہر کر رہی ہے۔ اپنا قیدی، عورت کی ہوس کو بھی نمایاں کر گئی اور عورت کی قربانی کو بھی۔ پارس نے قربانی دے کر عورت کی بھی لاج رکھ لی۔ ورنہ ماہ دولت اس پر لعنتیں ہی بھیجے، ہاہاہا۔ سرورق کی کہانیوں میں اجالوں کے سفیر اچھی تھی۔ باقی کہانیوں میں حق دار اور فرار نمایاں تھیں۔"

منشی حماد فرہاد کا ساہیوال سینٹرل جیل سے محبت نامہ "آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس وقت میں تیسری جماعت میں پڑھتا تھا جب سے مجھے آپ کے رسالوں کی لت پڑی ہے۔ اپنے نصاب کی کتابوں کے علاوہ بڑے بھائی کی دسویں کی کتابیں شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ آنکھ کھلنے کے وقت سے ہی میں نے جاسوسی، سسپنس اور سرگزشت رسالے گھر میں بکھرے دیکھے ہیں۔ ایسے ماحول میں آپ کے رسالوں یعنی ڈائجسٹوں کا قاری ہوں مگر کبھی بھی اتنی فرصت نہیں مل سکی کہ اپنی محبت کا اظہار نامہ آپ کو بھیج سکوں۔ حالات اور معروفیات سے اجازت ہی نہ مل سکی اور اب میں سزائے موت کا قیدی ہوں اور سینٹرل جیل ساہیوال سے لکھنے کی جسارت اس امید پر کر رہا ہوں کہ میرے نامے کی قسمت ردی کی ٹوکری میں نہیں ہو گی۔ آپ اس بات کو بہتر سمجھتے ہوں گے کہ رشوت خور پولیس والوں سے کام لینا کس دل گردے کی بات ہے۔ جیسے تیسے کر کے جاسوسی کا دیدار تو ہو جاتا ہے مگر وہ بھی مہینے کی آخری تاریخوں پر۔ ایسے میں، میں تبصرہ کرنا بھی چاہوں تو یہ بات دیوانے کے خواب کے مترادف ہو گی۔ مگر آج جب فروری کی پانچ تاریخ کو رسالہ ملا تو اتنی خوشی محسوس ہوئی جتنی ایک قیدی کو باعزت بری ہونے کی اطلاع پر یا سزائے موت ختم کر دیے جانے کے حکومتی اعلان پر ہونی چاہیے تھی اور میں نے اپنی اس خوشی کو شیئر کیا، طاہر جاوید مغل صاحب کے ساتھ۔ للکار کے طلسم میں ایسا جکڑا گیا کہ دو گھنٹے بعد جب کہانی کے آخر پر پہنچا تو وہ حال ہوا جو پیاسے مسافر کا صحرا میں پانی ختم ہو جانے

کے بعد ہوتا ہے۔ تھوڑی دیر کے سکتے کے بعد اپنا محبت نامہ تحریر کرنے بیٹھ گیا۔ یہ سوچ کر کہ کہیں ایسا نہ ہو محفلِ یاراں میں داخل ہونے کا سنہری موقع کھو دوں... یوں تو جاسوسی اور سسپنس کی ہر کہانی اپنی مثال آپ ہوتی ہے، یعنی کہ لاجواب ہوتی ہے مگر طاہر جاوید مغل صاحب رسالے میں شائع ہونے والی تمام کہانیوں میں سر پر تاج سجائے نظر آتے ہیں۔ بلاشبہ طاہر جاوید مغل کہانیوں کے بادشاہ ہیں اور شاہکار تخلیق کیا کرتے ہیں۔ مغل صاحب کا اندازِ تحریر ایسا ہے کہ کہانی کے تمام مناظر اور کردار آنکھوں میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ بالکل فلمی سین کی طرح۔ محفلِ یاراں کی بات کریں تو اس محفل میں مغل صاحب کی برابری کی دعوے دار ایک ہی صنفِ نازک نظر آتی ہے جن کا نام ماہا ایمان ہے۔ ماہا ایمان ہی محفل میں ایسی لکھاری ہیں جن کو بار بار پڑھنے کو دل کرتا ہے اور بہت اچھا لگتا ہے اور اگر ذرا دلنشیں کرنے کو دل چاہے تو دلنشین صاحبہ کے درشن کر لیتا ہوں۔ شاید یہ میرا پہلا اور آخری خط ہو۔ اس لیے ادارے کے سب لوگوں کو سلام، محفلِ یاراں میں سب کو سلام۔“

چکوال سے ایم عزیر کی دعائیں ”تاکش اس دفعہ کافی جاندار تھا۔ چٹکی بکٹ چٹکی میں پہنچے تو خود کو بلیک لسٹ میں پایا۔ گزشتہ 5 خطوط میں میرا ایک خط شائع ہوا باقی بلیک لسٹ میں پہنچے۔ ہم بھی انکل جی راضی پہ رضا ہیں۔ وہ نفرت سے دیکھ لیتا ہے تو ہم بھی خوش کہ وہ دیکھتا تو ہے۔ ایکشن طور پر یہ خط میں للکار کے لیے لکھ رہا ہوں۔ جذبوں کی انتہا کو چھو جانے والے طاہر جاوید مغل جی کے الفاظ دل میں ایک تہلکہ سا مچا دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں ہر خوشی سے نوازے اور پورا ادارہ جو ان کی خوب صورت تحریروں کو ہم تک پہنچاتا ہے، اللہ تعالیٰ ان سب کو بھی۔ خاص طور پر انکل جی کو صحت دے اور تمام غموں سے دور رکھے۔ میرا پیارا رب پاکستان کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔“

اوکاڑہ سٹی سے تصویر یاسمین کی تیزی ”بارہ ربیع الاول کو صبح چار بجے میرے بھانجے کی دنیا میں آمد ہوئی، ہم سب کو اس بات کی بہت خوشی ہوئی کہ اس کی آمد بہت مبارک دن ہوئی ہے۔ لہٰذا اس دن کی نسبت کے لحاظ سے اس کا نام محمد مصطفیٰ رکھا گیا۔ (بہت بہت مبارک ہو) جاسوسی کا ٹائٹل زبردست تھا۔ اس کے بعد جاسوسی کی محفل میں شریک ہوئے۔ جہاں ماہا ایمان بڑے کرّوفر سے صدارت کی کرسی پر موجود تھیں۔ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ ماہا ایمان! ضروری تو نہیں ہے کہ آپ نے اور ماہ تاب نے شادی کا لڈو کھا لیا تو ہر ایک کو اس میں دلچسپی ہو۔ بلقیس خان، ماہا ایمان کو محسن نگاری تھیں۔ بلقیس آپ محسن علی سوم کو تھوڑی آگ دکھا کر یہ سوم ان سے الگ کیوں نہیں کر دیتیں۔ فہد علی جھجھ مہرباں باپ کو اپنی اولاد چاہے بیٹا ہو یا بیٹی چاند کا ٹکڑا ہی لگتی ہے۔ اس میں نئی بات کون سی ہے؟ طاہر حسن جھنڈ کا خط پڑھا جس میں شکوے اور شکایتیں موجود تھیں۔ اب آپ کا خط شامل ہو گیا ہے اور آپ کو یقین بھی آ گیا ہوگا کہ یہ طبقاتی فرق یا صوبائی فرق محفل میں نہیں ہے۔ یہاں تو جو بھی شریک ہوتا ہے، اسے خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ ثاقب تبسم نگینہ خدا کے لیے اپنی شاعری کا شوق کہیں اور پورا کر لیں۔ قافیہ بھی کہیں اور جا کر ملا لیا کریں۔ آپ نے میری فن کاری کے نمونے کہاں دیکھ لیے ضرور بتایئے گا۔ (ہم تو اکثر دیکھتے رہتے ہیں۔ تقریباً ہر خط میں آپ کی فنکاری کے نمونے ہوتے ہیں اور شاندار ہوتے ہیں) سید عبادت کاظمی تے خیر نال ہوں غائب نہ ہو جانا کسی ہوں موجود ہی رہنا۔ محمد ہمایوں سعید لگتا ہے کہ آپ نے بھی کوئی ایف ایم نہیں سنا ورنہ ماہ تاب کو یہ بات نہ کہتے۔ ایف ایم کا چسکا ایک الگ ہی چیز ہے مگر افسوس مجھے اب اتنا ٹائم نہیں ملتا۔ مبشر حسن! تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ عثمان غنی کا تبصرہ بہت اچھا تھا۔ مصدق محمود دانش جب بھی گجرات کا نام پڑھتی ہوں کچھ یاد آ جاتا ہے۔ شاہ فلاں شاہ کم ہی کیا کریں ورنہ پولیس آپ کو دہشت گردی کے الزام میں گرفتار کرے گی۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے للکار پڑھی، قسط پڑھ کر مزہ آ گیا۔ عمران کی انٹری آمد نے خوش کر دیا جبکہ یوسف کی کمینگی پر جی بھر کر لعنت بھیجی۔ تابش میں روز بروز بہتری آ رہی ہے۔ ویسے ثروت کو اب یوسف سے الگ ہو ہی جانا چاہیے۔ گرداب اب بور ہو گئی ہے جیسا کہ اس کا آغاز تھا، اب کہانی میں وہ چارم نہیں رہا۔ اسما قادری خواہ مخواہ کہانی کو طول دے رہی ہیں۔ پہلی کہانی میں ایچ اقبال نے پارس پر زیادہ زور دیا۔ سفیان بس ایک طرف کونے میں لگا رہا جبکہ جو بھی تھرل تھا، وہ پارس کی بدولت تھا۔ اس نے اپنی غلطی کا کفارہ اچھے سے ادا کر دیا۔ ویسے کہانی اتنی لمبی ہونی نہیں چاہیے تھی جتنی کھینچی گئی۔ کاشف زبیر کی استقامت بھی زبردست تھی۔ سلیم فاروقی کی اجالوں کے سفیر واقعی اگر پولیس کے محکمے میں چند اچھے لوگ موجود ہیں تو وہ بھی ان کرپٹ لوگوں کی وجہ سے برے بن جاتے ہیں۔“ (اب تو خوش ہیں کہ قینچی زیادہ نہیں چلی!)

اسلام آباد سے انور یوسف زئی کی شمولیت ”کئی روز کی موسلادھار بارش کے بعد 6 فروری کو سورج اور جاسوسی نے بیک وقت دیدار کرایا۔ سرورق جاذبِ نظر تھا۔ خطوط کی محفل میں اپنا نام بلیک لسٹ تک میں نہ پا کر حیرانی ہوئی گویا کہ گمشدہ ڈاک والے ہاتھ دکھا گئے۔ اس بار راولپنڈی کے امین مقبول صاحب اور اسلام آباد کے کاظمی صاحب بھی غائب تھے۔ شاید اس بار آپ نے خطۂ اسلام آباد کا بائیکاٹ کر دیا۔ بہرحال، حافظ آباد کی ماہا ایمان کو کرسیِ صدارت مبارک ہو جبکہ علی پور کے ثاقب تبسم نگینہ کا تبصرہ بڑا اچھوتا تھا۔ پہلی کہانی ایچ اقبال کی اپنا قیدی میں جاسوسی کے معیار کی تھی اور کراچی کے حالیہ واقعات کی عکاسی کرتی تھی۔ للکار میں اب عمران آ پہنچا ہے اور تابش اور ثروت کو جاوا کے چنگل سے نجات دلائے گا۔ گرداب میں کہانی اب بھارتی پنجاب تک پہنچ گئی اور شہریار عادل ابھی تو سلو کا ہی مرہونِ منت نظر آتا ہے۔ چودھری اپنی جاگیر بچا کر گزشتہ ریشہ دوانیوں میں دوبارہ مصروف ہو گیا ہے مگر نیا اے سی عمیر اس کی ایک نہ چلنے دے گا۔ سرورق کی پہلی کہانی اجالوں کے سفیر بس گزارے لائق تھی جبکہ دوسری کہانی کاشف زبیر کی استقامت بہت اچھی تھی۔ کاشف زبیر صاحب، راولپنڈی، اسلام آباد کے ماحول کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔ بدیسی کہانیوں میں انوکھی تفریح سب سے بہترین کہانی تھی۔ دیسی کہانیوں میں سلیم انور کی تحصیل سائن ایک اچھی کاوش تھی مگر شاید کسی مغربی کہانی سے ماخوذ تھی۔ (جی ہاں) یہ جان کر خوشی ہوئی کہ جاسوسی ڈائجسٹ اب ہر ماہ کی 3 تاریخ تک مل جایا کرے گا۔ کوشش کریں کہ حسبِ معمول ماضی کی طرح پہلی تاریخ تک مل جایا کرے، شکریہ۔“

سارہ کی کراچی سے آراء ”اس تیز رفتار زمانے میں جہاں آپ سیکنڈز میں ای میل، بلیس اور میسجز وصول کرتے ہیں۔ وہاں لیٹر لکھنے، ٹکٹ لگانے، پوسٹ کرنے کا الگ ہی حسن ہے۔ دلچسپ مشغلہ بھی۔ مصروفیت بھی۔ (بجا فرمایا) خیر جناب کئی رنگوں سے سجا سرورق لیے جاسوسی ملا۔ بہت اچھا لگا۔ فہرست

پر نظر ڈالتے سیدھا چٹکی بکٹ چٹکی پہنچے۔ جہاں صرف 3 پریاں؟ صدمے سے برا حال ہو گیا۔ بڑی گنتیاں ہو رہی تھیں۔ لگ گئی نا نظر۔ پھر ماہا جی کو منصبِ صدارت پر پا کر تھوڑا دل ٹھنڈا ہوا۔ ہمایوں سعید اپنا ننھا سا دماغ مت الجھائیں۔ جنوں کے بلند و بالا ٹاور پر آپ کیا کر رہے تھے؟ سچ بتا دیں آخر بات کیا تھی؟ عمیر شہزادہ! آپ کیا گارڈ آف آنر کی امید میں بیٹھے تھے؟ عبدالستار اوکاڑہ ویلکم۔ طاہر حسن! بھیا اتنا غصہ! بہت بری بات ہے۔ آپ ٹائم پر خط پوسٹ کرو پھر شکایت نہیں ہوگی۔ اب کچھ اسٹوریز کے بارے میں۔ ایچ اقبال کی اپنا قیدی اچھی رہی۔ ہمارے معاشرے میں کتنی بے حسی ہے۔ سچ ہے ہر شخص جانتا ہے کہ مجرم کو وہی سزا نہیں ملتی جس کا وہ مستحق ہوتا ہے لہٰذا ہر ایک نے مجرم کو سزا دینے کی ذمے داری خود لے لی ہے جو یقیناً غلط ہے۔ اپنا قیدی کے تمام کرداروں کے نام اسٹوری کی سب سے اچھی بات لگی۔ قتلِ معبد میں مجرموں نے بہت بیکار، کمزور اسٹوری گھڑی۔ ناکردہ کا اینڈ اچھا لگا۔ حق دار میں ماٹیکل نے خود کو واقعی حق دار ثابت کیا۔“

پشاور سے بلقیس خان عرف بلو کا انتظار ”ماہِ فروری کا شمارہ 6 کو ملا۔ اشتہارات کو ناک آؤٹ کر کے چٹکی دان میں پہنچے۔ جی سب سے پہلے آپ سب کے لیے ایک اہم خبر۔ 23 مارچ کو میری سالگرہ ہے اور میں اپنی سالگرہ میں جاسوسی کو بھی شامل کر رہی ہوں۔ یہ دن میرے لیے زبردست و یادگار دن ہے کیونکہ پورا پاکستان اس کو سیلیبریٹ کرتا ہے۔ (ہماری طرف سے مبارک باد قبول کریں) جاسوسی کے صوفۂ خاص پر ماہا ایمان کو براجمان پایا۔ ماہا جی بادام، اخروٹ کھایا کریں۔ کبھی بھی یادداشت متاثر نہیں ہوگی۔ مجھے ایجنسی کے طاہر حسن کو ویلکم ان جاسوسی۔ ثاقب تبسم کا منفرد پارہ پڑھ کر دماغ کا پارہ پارہ ہو گیا۔ اتنا پارہ کر ڈسپرین کھانی پڑی۔ ہمایوں سعید کو دوسرا جنم لینے پر مبارک باد قبول ہو۔ دلنشین بلوچ، آئندہ بھی دوسرے کے دانت گننے بھیجیے ورنہ اپنی ضرور کھایئے اور لو بہار کے مزے لو۔ عثمان غنی اپنی تصویر ضرور بھیجیے۔ کہانیوں میں للکار نے ڈرامائی موڑ لے لیا ہے۔ دیکھتے ہیں آگے آگے ہوتا ہے کیا۔ ویسے گرداب کب ختم ہو رہی ہے؟ گرداب تو پڑھتی نہیں ہوں مگر اس کے ختم ہونے کا انتظار ضرور کر رہی ہوں۔“

حسن ابدال سے ریاض بٹ کی جسارت ”جاسوسی کا پرانا قاری ہوں لیکن خط پہلی بار لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ امید واثق ہے کہ حوصلہ افزائی نصیب ہوگی۔ محفل میں خوب رونق ہے۔ ماہا ایمان کرسیِ صدارت پر خوب چمک رہی ہیں۔ بھئی ہم بھی اب بزرگ ہی ہیں۔ اس لیے آپ کے فقرے کا جواب نہیں دیں گے اس فقرے کا جو آپ نے تشبیر انکل کے لیے کہا ہے۔ کاشف علی میراں صاحب! آپ کا تبصرہ منفرد ہے۔ صرف اتنا کہنا ہے کہ پسند اپنی اپنی۔ باقی تبصروں میں بلقیس خان، فہد علی جھجھ، ثاقب تبسم نگینہ، دلنشین بلوچ اور محمد ہمایوں سعید کے تبصرے اچھے لگے۔“

علی پور چٹھہ سے ثاقب تبسم نگینہ کی خوش خبریاں ”فروری کا جاسوسی چار تاریخ کو ملا تو حیرت انگیز خوشی ہوئی کہ اس بار آپ کے جلدی درشن ہو گئے۔ حسینہ پر فتنہ و فساد کا سائز پوز اس کی ادا کو بھی چار چاند لگا رہا تھا اور اس کے تاثرات میں مدہوش سی دعوتِ نظارہ بھی اٹھکھیلیاں کر رہی تھیں۔ سرورق مختلف رنگوں سے مزین ایک بہترین مرقع ثابت ہوا لیکن حسینہ کا اندازِ محفل اور بھر پور تھا۔ اس کا حصار ابھی ٹوٹا نہیں تھا تو میں اسی ربط کے ساتھ محفلِ ناقدین میں پہنچا جہاں دشمنِ عزیز کے لیے آپ کی نیک اور معروف تمناؤں نے استقبال کیا۔ شکریہ... ماہا جی اول، ہمارے علاقہ حافظ آباد سے تعلق رکھنے والی محترمہ ماہا ایمان صاحبہ کا واہ! انداز و جارحانہ اندازِ تکلم و تحریر بہت بھایا۔ بہت دل پذیر تبصرہ تھا۔ میں چاہتا ہوں آپ تک میری بک پہنچے۔ اس کا طریقہ بتا دیں۔ آپ کی والدہ محترمہ بھی درست فرماتی ہیں لیکن آپ بھی غلط نہیں کرتیں۔ شعر پسند کرنے کا بھی شکریہ۔ کاشف علی اگر آپ ناراض ہوئے ہیں تو اب راضی ہو جائیں۔ لفظوں سے پیار کرنے والے محبت کے داعی ہوتے ہیں، انہیں نفرت زیب ہی نہیں دیتی۔ بلقیس بیٹا! آپ نے مجھے بتا دیا کہ میں آپ کا انکل ہوں تو آئندہ اس رشتے کا احترام بھی کرنا۔ اور کے 3 اگلے ماہ کی 24 تاریخ کو میری سالگرہ ہے۔ (آپ کو بھی بہت بہت مبارک ہو جنم دن کی) ماہ تاب گل جی! آپ کو شادی کی مبارک۔ دیر سے معذرت کے ساتھ مبارک قبول کریں۔ عبدالستار کا آخری خط بھی دلچسپ تھا۔ اس محفل سے نکل کر ایچ اقبال کا اپنا قیدی دیکھا جس نے زندگی کی کئی پرتیں کھول دیں۔ نفرت و محبت، جرم و سزا، ظالم و مظلوم اور زندگی کے اتار چڑھاؤ کا حسین امتزاج اس کہانی کا کمال تھا۔ عمار آزاد کا قتلِ معبد درمیانے درجے کی لیکن اچھے لہجے کی حامل کہانی تھی۔ میمونہ عزیز کا ناکردہ جرم مختصر اور موثر لگا۔ جمال دستی کی انوکھی تفریح کا پلاٹ واقعی انوکھا تھا۔ اس میں بھی نفسیاتی خلفشار کا تانا بانا تھا۔ للکار میں اس بار بھی طاہر جاوید مغل نے اگرچہ ایکشن قدرے تیز رکھا لیکن کہیں کہیں بوریت کا احساس بھی ہوا۔ امید ہے آئندہ قسط میں یہ کمی بھی دور ہو جائے گی۔ آصف ملک نے حق دار میں خوب صورت اور جان دار پلاٹ کا انتخاب کیا۔ یہ کہانی ہر لحاظ سے بہترین تھی۔ مریم کے خان کا دورِ وحشت بھی خوب تخلیق تھی۔ وحشت اور دہشت کا یہ ملاپ اور پھر اس کا اختتام عمدہ تھا۔ انجم فاروق ساحلی نے فرار حاصل کرنا چاہا لیکن وہ پوری طرح اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اسما قادری کا گرداب اس بار شہریار کے لیے زیادہ اہم تھا۔ اس وقت کہانی پورے عروج پر ہے۔ تحریر ریاض نے مہارت سے اپنا میزان درست رکھا۔ اچھے انجام کی حامل یہ کہانی بھی پسند آئی۔ سرورق کی پہلی کہانی اجالوں کے سفیر ہمارے معاشرے کی زبردست عکاسی تھی۔ سلیم فاروقی نے اس کہانی میں پولیس اور بااثر مجرموں کے تعلق کو خوبی سے بیان کیا۔ کاشف زبیر نے آخر میں استقامت دکھائی۔ لیکن مجھے ذاتی طور پر اس بار کاشف زبیر کی کہانی کچھ زیادہ پسند نہیں آئی۔ اس کی وجہ میری کم علمی بھی ہو سکتی ہے۔ بہرحال مجموعی طور پر اس بار بھی شمارہ زبردست تھا۔ مارچ میں ملک میں دو اہم واقعات ہونے والے ہیں... ایک تو نگران حکومت آئے گی اور ایک میری سالگرہ۔“ (یقیناً)۔

ڈاکٹر مرزا انتظار ندیر مغل آف تسوال کھوکھراں سے لکھتے ہیں ”ہمارے ضلع کی آن، بان اور شان محترمہ ماہا ایمان قصرِ صدارت کی حکمراں... سب یاراں، ان سے خفا لیکن وہ ہوتی نہیں پریشان۔ اس دفعہ ان کی شمشیر وستاں کے آگے آتے ہیں۔ تشبیر بھائی، ثاقب نگینہ بابی، مبشر حسن اور ادریس خان... الامان... الامان... الامان۔ ماہا جی! حل کا عمر سے کوئی تعلق نہیں اس پر ہے ہمارا ایمان، کاشف علی میراں کا موضوع تھا پاکستان جس کا بیڑا غرق کر رہے ہیں سیاست داں۔ پیاری بیٹا بلو یعنی بلقیس خان، بپھرا ہوا آتش فشاں لگیں ہم کو لیکن کچھ کم نہ تھے عبدالستار، جو بھی کل مخلوق پر لاحول ولا

بلینک چیک

سلیم فاروقی

اس دور کے انسان کو خیانتوں کی اشد ضرورت ہے... جہاں نفرتوں اور خودغرضیوں کے گرداب میں انسان شرفِ انسانیت کو بھول بیٹھا ہے... آج کے ترقی یافتہ دور میں انسان کے پاس سب کچھ ہے... بس ایک محبت کا جوہر ہے جو اس کے اندر ایک تڑاخے کے ساتھ ٹوٹ رہا ہے... اس دور کے ایک انسان کے اندر کئی انسان بستے ہیں... ایسے ہی انسانوں کے درمیان پنپتے رشتے اور ناتے انتہائی نازک ڈور سے منسلک ہوتے ہیں... غیر معمولی کھنچاؤ اور رویوں سے اس میں گرہ پڑجاتی ہے... اور پھر اعتبار کے قابل کچھ نہیں رہتا... کچھ ایسے ہی اپنوں کی چالبازیوں اور کج ادائیوں کے ہیر پھیر... جن کی مکروفریب میں ملفوف وفائیں اور محبتیں دل کا وبال بن رہی تھیں...

اپنی فطرت اور جبلت کے تقاضوں سے مجبور کچھ گھناؤنے چہروں کے عکس در عکس سلسلے...

مجھے ان دنوں کوئی خاص کام نہیں تھا اس لیے آفس میں بیٹھا بیزار ہو رہا تھا۔ میں نے وقت گزاری کے لیے ایک ناول نکالا اور پڑھنے لگا۔ ناول کے چند صفحے پڑھنے کے بعد میرا دل اس سے بھی اچاٹ ہوگیا۔ جس شخص نے اب تک اتنی ہنگامہ خیز زندگی گزاری ہو، وہ یوں ایک کمرے میں بند ہو کر کب تک بیٹھ سکتا ہے۔

میں نے ناول ایک طرف رکھا اور انٹرکام پر اپنی سیکریٹری ماریہ سے کہا۔ "ماریہ! میں اس وقت ایک اہم کام میں مصروف ہوں اس لیے مجھے ڈسٹرب مت کرنا۔ کوئی فون کال ٹرانسفر مت کرنا۔ کوئی ملاقاتی آئے تو اسے باہر ہی سے ٹال دینا۔"

ماریہ میری پی اے بھی تھی، ریسپشنسٹ اور ٹیلی فون آپریٹر بھی تھی اور بوقت ضرورت وہ مجھے چائے اور کافی بھی بنا کر دے دیا کرتی تھی۔ آرمی سے ریٹائرمنٹ کے بعد مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا اس لیے میں نے یہ سیکیورٹی ایجنسی کھول لی تھی۔

میرے پاپا ایک سرکاری ادارے میں اچھے عہدے پر فائز تھے۔ ان کا خیال تھا کہ پڑھائی میرے بس کا روگ نہیں ہے۔ یہی سوچ کر انہوں نے مجھے آرمی میں جانے کا مشورہ دیا پھر اپنے تمام تر لاابالی پن کے باوجود مجھے پاکستان آرمی کے لیے منتخب کرلیا گیا۔ میرے دونوں چچا اور ان کے بچے کہتے تھے کہ خاور دوسرے ہی ہفتے ملٹری اکیڈمی سے بھاگ آئے گا یا اسے وہاں سے نکال دیا جائے گا۔

بھی بات میرے چچازاد عمیر نے میرے سامنے کہی تو میں نے جھپٹ کر اس کا گریبان پکڑ لیا۔ وہ عمر میں مجھ سے صرف ایک سال بڑا تھا۔ میں دائیں ہاتھ سے اس کے منہ پر گھونسا مارنے والا تھا کہ کسی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

میں نے جھنجلا کر دیکھا، وہ میری بہن رمشا تھی۔ یہ حرکت صرف وہی کرسکتی تھی ورنہ اس کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو شاید میں عمیر کو چھوڑ کر اسی کی مرمت کر دیتا۔

"کیا کر رہے ہیں بھیا؟" رمشا نے کہا۔

"تم اس کی بکواس نہیں سن رہی ہو۔" میں نے کہا۔ اس دوران میں عمیر موقع پاکر وہاں سے کھسک لیا تھا۔

"تو کیا غلط کہہ رہے تھے عمیر بھائی؟" رمشا نے کہا۔ "وہاں بھی اگر آپ اسی طرح لڑتے رہے تو دوسرے ہفتے کیا پہلے ہی ہفتے واپس آجائیں گے۔ اگر آپ کو عمیر اور دوسروں کی بات کا اتنا ہی بُرا لگتا ہے تو آپ انہیں غلط ثابت کر دیں۔"

"رمشا! تم مجھے چیلنج کر رہی ہو؟" میں نے کہا۔

"میں چیلنج نہیں کر رہی بلکہ آپ کی غیرت دیکھ کر بات کر رہی ہوں۔" پھر وہ خوشامدانہ انداز میں بولی۔ "بھیا! مجھے بھی لوگوں کی باتیں بہت ناگوار گزرتی ہیں۔ کیا آپ پاپا، امی اور میری خاطر خود کو بدل نہیں سکتے؟" یہ کہتے ہوئے وہ رونے لگی۔ رمشا کی آنکھوں میں آنسو تو میں برداشت ہی نہیں کرسکتا تھا۔

میں نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "رمشا گڑیا! میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اب میں ملٹری اکیڈمی سے کیپٹن بن کر ہی نکلوں گا۔"

"پکا وعدہ؟" رمشا روتے روتے مسکرانے لگی۔

"بالکل پکا۔" میں مسکرایا۔

☆☆☆

پھر میں پی ایم اے چلا گیا۔ وہاں ایسے بے شمار مواقع آئے جب میں دوسروں کی پٹائی کرسکتا تھا لیکن ہر بار رمشا کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آجاتا۔

میں چھٹیوں میں گھر آتا تب بھی بات بے بات کسی سے نہیں لڑتا تھا۔ پاپا مسکراتے اور رمشا بھی میرے اس رویّے سے خوش تھی۔ پھر وہ دن بھی آیا کہ میں پاسنگ کرنے کے بعد اپنے شانے پر سیکنڈ لیفٹیننٹ کا اسٹار سجائے گھر آگیا پھر وقت بہت تیز رفتاری سے گزر گیا۔

مجھے آرمی جوائن کیے ہوئے دس سال ہو چکے تھے۔ اب میں میجر تھا۔ اس دوران میں مجھے پاپا اور امی کے انتقال کا صدمہ بھی سہنا پڑا اور رمشا سے جدائی بھی برداشت کرنا پڑی۔ پاپا نے اپنی زندگی میں فواد سے اس کی شادی کر دی تھی۔ وہ انجینئر تھا اور بہت ذہین لڑکا تھا۔ شادی کے دو سال بعد وہ کینیڈا اشفٹ ہوگیا۔

مجھے فواد کے اس فیصلے پر شدید اعتراض تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ رمشا مجھ سے اتنی دور جائے لیکن شادی کے بعد تو لڑکیاں پرائی ہو جاتی ہیں۔ یوں میں نارتھ ناظم آباد کے اس ایک ہزار گز کے بنگلے میں تنہا رہ گیا۔

یوں بھی میں کراچی میں تو رہتا ہی نہیں تھا۔ کبھی میری پوسٹنگ لاہور میں ہوتی تھی، کبھی ملتان میں۔ گھر کی حفاظت کے لیے میں نے ایک چوکیدار رکھ لیا تھا۔ میرے کئی دوستوں نے مجھے مشورہ دیا کہ اس بنگلے کو کرائے پر اٹھادوں لیکن میرا دل نہ مانا۔ پاپا نے اسے بہت محبت سے بنایا تھا۔ انہوں نے اپنی پوری جمع پونجی اس بنگلے میں لگادی تھی۔ میں تو اسے کرائے پر اٹھانے یا بیچنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔

★★★

میں جب کیپٹن تھا تو مجھے ایس ایس جی کے لیے منتخب کرلیا گیا۔ میں نے بہت کامیابی سے ٹریننگ مکمل کی پھر مجھے اسپیشل سروسز گروپ (ایس ایس جی) کی ایک رجمنٹ میں بھیج دیا گیا۔ اپنی اعلیٰ کارکردگی کے باعث مجھے جلد ہی میجر کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔

★★★

وہ دن میری زندگی کا تاریک ترین دن تھا۔ جنگ ہو یا امن، ہماری مشقیں جاری رہتی ہیں۔ میجر صفدر بھی میرے ہی گروپ میں شامل تھا لیکن وہ مجھ سے ایک سال سینئر تھا۔ اسے مجھ سے نہ جانے کیا پرخاش تھی۔ اس دن وہ میرے آفس میں آیا تو اس کا موڈ بہت خراب تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ڈانٹ کھا کر آیا ہو۔

میں اسے دیکھ کر احتراماً کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "تشریف رکھیے سر۔"

وہ رعونت سے بیٹھ گیا اور منہ بنا کر بولا۔ "خاور! تمہیں آج میٹنگ میں اتنی اپنی شیخی دکھانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"میں سمجھا نہیں سر؟" میں نے اس کے تلخ لہجے اور انداز کو بہت مشکل سے نظر انداز کیا۔

"حالانکہ تم خوب سمجھ رہے ہو۔" اس نے ترشی سے کہا۔ "میٹنگ میں مجھے لیٹ ڈاؤن کرنے کی کیا ضرورت تھی ایڈیٹ؟"

"سر پلیز! اپنی زبان قابو میں رکھیں۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"کیا کہا تم نے؟" وہ درشت لہجے میں بولا۔ نہ جانے اس کا تعلق انسانوں کے کس قبیل سے تھا کہ وہ فوج میں اتنا عرصہ گزارنے کے باوجود بدزبان تھا۔

"میرا مطلب ہے کہ لینگویج پلیز۔"

"تمہیں اس میٹنگ میں ہیرو بننے کی کیا ضرورت تھی؟" اس نے جھنجلا کر پوچھا۔

"وہاں سبھی اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے، کیا میں وہاں زبان بند کرکے بیٹھتا؟" میں نے درشت لہجے میں کہا۔

بات دراصل یہ تھی کہ ایک ٹاسک کے سلسلے میں ہمارے بریگیڈ کمانڈر نے تمام افسروں سے پلان طلب کیا تھا۔ اس پلان کو بریف بھی کرنا تھا۔ صفدر چاہتا تھا کہ میں اپنا پلان اسے تھمادوں لیکن میں نے اسے ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ اس کا پلان انتہائی پھسپھسا اور ناقابلِ عمل تھا۔ میں نے چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا۔ بس یہی بات اسے کھا گئی تھی۔

"تم خود کو سمجھتے کیا ہو؟" صفدر دھاڑ کر بولا۔

"میں پاکستان آرمی کا میجر ہوں۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اور خود کو میجر ہی سمجھتا ہوں۔"

"یو باسٹرڈ، تم...."

"شٹ اپ۔" میں جھنجلا کر کھڑا ہو گیا۔ "اب مجھے گالی مت دینا۔" میں نے بہت مشکل سے اپنے غصے پر قابو پایا۔

"کیا کرے گا تو؟" وہ تم سے تُو پر آگیا۔ "مارے گا مجھے؟"

"میں تیرا وہ حشر کروں گا کہ تُو دوسروں کے لیے عبرت کا نمونہ بن جائے گا۔" میں نے بھی اسی کے لہجے میں جواب دیا۔

وہ بھی طیش میں آکر کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ "چل پھر بنا مجھے عبرت کا نمونہ، یو باسٹرڈ۔ میں تجھے پھر گالی...." اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی میں نے اس کے منہ پر اتنا زوردار تھپڑ مارا کہ اس کی آواز باہر تک گئی ہوگی۔

صفدر کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس نے میرا گریبان پکڑنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے موقع نہیں دیا۔ وہ ایس ایس جی کا ٹرینڈ افسر تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر اس کا داؤ چل گیا تو وہ مجھے مارے گا اور جواب میں مجھ سے مار کھائے گا۔ ہماری لڑائی خون ریز بھی ہوسکتی تھی۔ وہ میری احتیاط اور فوجی ڈسپلن کو میری کمزوری سمجھ رہا تھا۔

اس نے میز پر رکھی ہوئی ایش ٹرے مجھ پر کھینچ ماری۔ میں اگر فوراً ہی نہ جھک جاتا تو اس بھاری ایش ٹرے سے میرے سر پر شدید ضرب لگتی۔ جھکتے جھکتے بھی وہ اچٹتی ہوئی میرے سر پہ لگی اور میری پشت پر لگی ہوئی ایک تصویر کے فریم سے ٹکرا گئی۔ پھر میں سب کچھ بھول گیا۔ میرے اندر وہی خاور بیدار ہوگیا جسے میں نے بہت مشکل سے قابو کیا تھا۔

ایش ٹرے کی ضرب سے میرے سر میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ صفدر نے مجھے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر آگے بڑھ کر میری گردن دبوچ لی۔ یہ اس کا مخصوص داؤ تھا۔ میں نے اپنے گھٹنے سے اس کی ناف پر بھرپور ضرب لگائی۔ وہ کراہ کر دوہرا ہوگیا۔ میں نے گھٹنے کی دوسری ضرب اس کے چہرے پر لگائی۔ وہ الٹ کر فرش پر گرا۔

اسی وقت چق ہٹا کر کیپٹن مدثر اندر آیا۔ اس نے جھپٹ کر صفدر کو مجھ سے چھڑایا۔ گھٹنے کی ضرب سے اس کی ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ میرے سر سے بھی خون بہہ کر چہرے اور آنکھوں پر آ رہا تھا۔

"وھاٹ از گوئنگ آن سر؟" (کیا ہو رہا ہے سر) صفدر نے پھر مجھ پر جھپٹنے کی کوشش کی لیکن کیپٹن مدثر نے اسے پکڑ لیا اور بولا۔ "سر پلیز۔"

"چھوڑو مجھے باسٹرڈ۔" صفدر دھاڑ کر بولا۔

گالی سن کر ایک لمحے کے لیے مدثر کا چہرہ بھی سرخ ہوگیا پھر وہ ضبط کرکے بولا۔ "سر! آپ اتنے سینئر افسر ہیں اور آپ...."

"شٹ اپ۔" صفدر نے اس کے چہرے پر بھی تھپڑ رسید کر دیا۔ "چھوڑو مجھے۔" میں نے اس دوران میں ٹشو پیپر سے اپنی آنکھیں صاف کرلی تھیں۔

بات تو ہائی کمانڈ تک پہنچنا ہی تھی اس لیے میں نے مدثر کو آنکھوں سے اشارہ کیا کہ اسے چھوڑ دو۔ مدثر نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ جھپٹ کر میری طرف آیا اور پھر میری گردن پکڑنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کے پیٹ میں اتنی زور سے لات ماری کہ وہ الٹ کر دیوار سے ٹکرایا اور چھپکلی کی طرح فرش پر گر پڑا۔

اسی وقت باہر بھاری بوٹوں کی آوازیں سنائی دیں۔ صفدر اس وقت تک دوبارہ کھڑا ہو چکا تھا۔ آنے والے ہمارے سی او کرنل وقار تھے۔ ان کے ساتھ آرپی (رجمنٹل پولیس) کے تین جوان بھی تھے۔

انہوں نے حیرت سے کمرے کا منظر دیکھا پھر ہم دونوں کے حلیے دیکھے اور بولے۔ "کیا آفس کو آپ لوگوں نے اکھاڑا بنالیا ہے؟ آپ دونوں اسی حالت میں میرے

آفس میں رپورٹ کریں۔" انہوں نے ہمیں گھورتے ہوئے حکم دیا۔

"سر! غلطی اصل میں..."

"آپ میرے آفس میں آکر بات کریں۔" کرنل صاحب نے صفدر کی بات کاٹ دی۔

"اوکے سر۔" اس نے کہا۔ کرنل صاحب جانے کے لیے مڑ گئے لیکن آر پی کے تینوں جوان وہیں کھڑے رہے۔

ہم دونوں سی او (کمانڈنگ آفیسر) صاحب کے سامنے پیش ہو گئے۔ وہاں انہوں نے باری باری ہم دونوں کے بیانات لیے پھر اس کے بعد معاملہ خاصا طویل ہو گیا۔

مختصر یہ کہ مجھے ملازمت سے استعفا دینا پڑا۔ یہ بھی کرنل صاحب کی نوازش تھی ورنہ اگر مجھے فوج سے نکالا جاتا تو میرا مستقبل بالکل تاریک ہو جاتا۔

فوج سے فارغ ہونے کے بعد میں نے اپنے ایک دوست کے مشورے پر سیکیورٹی ایجنسی کھول لی۔ میرا دفتر آئی آئی چندریگر روڈ پر تھا جو اصل میں میرے اسی دوست کا دفتر تھا۔ سرمایہ بھی اسی نے لگایا تھا۔ اس کے باوجود میں نے اس پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالا تھا۔ میرا اسٹاف مجھ سمیت چار افراد پر مشتمل تھا۔ اسٹاف میں میرے علاوہ ماریہ تھی، میرا ایک اسسٹنٹ جمیل تھا اور چپراسی سلامت تھا۔ میں نے کراچی کی ایک بڑی کمپنی سے معاہدہ کر رکھا تھا۔ ضرورت پڑنے پر مجھے ان سے سیکیورٹی گارڈ بھی مل جاتے تھے اور گاڑی بھی۔ میں اس کا معاوضہ ادا کرتا تھا۔ ابھی تک صرف پانچ چھوٹی چھوٹی کمپنیوں نے میری خدمات حاصل کی تھیں۔ اس کے علاوہ تقریباً دس بنگلوں پر بھی میرے سیکیورٹی گارڈز تھے۔

میرے پارٹنر اشرف کو امید تھی کہ ایک سال کے اندر اندر ہماری سیکیورٹی ایجنسی اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے گی۔ اشرف کا اصل بزنس تو ٹیکسٹائل کا تھا، سیکیورٹی ایجنسی اس کا شوق تھا۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے جلدی سے کتاب دراز میں ڈالی اور اپنے سامنے رکھی ہوئی ایک فائل کھول کر بولا۔ "کم ان۔"

دوسرے ہی لمحے ماریہ اندر داخل ہوئی اور منہ بنا کر بولی۔ "تم دو گھنٹے سے ایسا کون سا ضروری کام کر رہے ہو؟"

"میں حساب کتاب لگا رہا ہوں کہ اس مہینے ہماری کمپنی کو کتنا فائدہ ہوا ہے۔"

"سب کچھ کمپیوٹر میں موجود ہے خاور۔" ماریہ منہ بنا کر بولی۔ "اگر تم اسی طرح آرام کرتے رہے تو چل چکی کمپنی۔ ایک شخص مسلسل ٹیلی فون کر رہا ہے اور ہر بار مجھے ہی جھوٹ بولنا پڑتا ہے کہ میجر صاحب میٹنگ میں مصروف ہیں۔"

"وہ کوئی کلائنٹ تو نہیں تھا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"ظاہر ہے وہ کوئی کلائنٹ ہی ہوگا۔" ماریہ نے کہا۔ "اب تم شاہ رخ خان یا سلمان خان تو ہو نہیں کہ لوگ تم سے بات کرنے کے لیے مر رہے ہوں۔"

"کلائنٹ کو ڈیل کرنا تو تمہارا کام ہے ڈارلنگ۔" میں نے ہنس کر کہا۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ ماریہ میری سیکریٹری اور ٹیلی فون آپریٹر تو تھی ہی، مجھ سے شادی بھی کرنا چاہتی تھی ورنہ اچھی تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود وہ کم سیلری پر میرے ساتھ کام کیوں کرتی۔ میں پہلی ملاقات میں خود بھی اس سے بہت متاثر ہوا تھا اور صرف وہی نہیں، میں بھی اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔

"کلائنٹ کو ڈیل کرنا میرا کام ضرور ہے لیکن وہ... کم بخت صرف تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔" اس نے کہا۔

"اچھا پہلے کھانا تو نکالو۔ شدید بھوک لگ رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"میں آج صرف سینڈوچ لائی ہوں۔" اس نے کہا۔ "اگر تمہیں کچھ اور کھانا ہے تو باہر سے منگوا لو۔"

"ارے سینڈوچ ہی بہت ہیں۔" میں نے کہا۔ "بس تم جلدی سے کافی بنا لو۔"

اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ماریہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "یہ وہی کھردری آواز والا کلائنٹ ہوگا۔"

"لائن مجھے دے دینا۔" میں نے کہا۔

ماریہ نے ریسیور اٹھایا پھر دوسرے ہی لمحے میرے ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ "یس۔"

"سر! خادم حسین صاحب لائن پر ہیں، بات کیجیے۔"

مجھے فون پر کھردری سی ایک آواز سنائی دی۔

"میجر خاور صاحب بول رہے ہیں؟"

"جی ہاں۔" میں نے متانت سے کہا۔

"میجر صاحب، میں خادم حسین ہوں۔" اس نے کہا۔

"جی خادم حسین صاحب۔" میں نے نرم لہجے میں پوچھا۔ "فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"میں وہ باتیں آپ سے ٹیلی فون پر نہیں کر سکتا۔" اس نے کہا۔ "کیوں نہ ہم لنچ ایک ساتھ کر لیں۔"

"سوری خادم حسین صاحب۔" میں نے کہا۔ "لنچ تو میں کر چکا ہوں۔ اگر آپ کو اتنا ہی ضروری ہے تو آپ میرے آفس آجائیں۔ یہاں زیادہ سکون سے بات ہو سکے گی۔"

"اچھا آپ مجھے آفس کا ایڈریس سمجھائیں۔" اس نے کہا۔

میں نے انہیں آفس کا پتا نوٹ کرا دیا۔

ہم کافی پی کر فارغ ہوئے ہی تھے کہ سلامت نے بتایا۔ "کوئی خادم حسین صاحب آئے ہیں۔"

"ماریہ بی بی کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ کچن میں ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، تم انہیں اندر بھیج دو۔" یہ کہہ کر میں نے حسب معمول ایک فائل کھول لی اور نہایت انہماک سے اس کا جائزہ لینے لگا۔

تھوڑی دیر بعد درمیانے قد اور گٹھے ہوئے جسم کا ایک شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی آواز ہی نہیں شخصیت بھی کھردری تھی۔ اس نے لٹھے کا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا اور گرمی کے باوجود واسکٹ بھی پہن رکھی تھی۔ میں پہلی ہی نظر میں سمجھ گیا کہ اس کی واسکٹ کی اندرونی جیب میں کوئی پستول یا ریوالور ہے۔

"میجر خاور صاحب؟" اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"جی میں ہی خاور ہوں۔" میں نے باوقار انداز میں کہا۔ "تشریف رکھیے۔" پھر میں جبراً مسکرا کر بولا۔ "کیا پئیں گے چائے یا کافی؟"

"تکلف نہ کریں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "مجھے اصل میں علی حسن چانڈیو صاحب نے بھیجا ہے۔" علی حسن چانڈیو کے نام پر میں چونکا۔ وہ ملک کا معروف سیاست داں تھا اور فلاحی عوام پارٹی کا سربراہ بھی تھا۔

"انہیں کون نہیں جانتا۔" میں نے کہا۔ "لیکن وہ تو مجھے نہیں جانتے پھر..."

"میجر صاحب۔" اس نے کہا۔ "وہ بھی آپ کو جانتے ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"یہ بات اگر آپ میری سیکریٹری کو ٹیلی فون پر بتا دیتے تو میں ملاقات سے انکار نہ کرتا۔ آپ نے خوامخواہ زحمت کی۔"

"چانڈیو صاحب کا حکم تھا کہ میں آپ سے ذاتی طور پر ملوں۔" اس نے کہا۔

"آپ بھی کیا پارٹی کے کارکن ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میں چانڈیو صاحب کا ملازم ہوں۔" اس نے یوں فخر سے کہا جیسے وہ ان کی کابینہ کا کوئی وزیر ہو۔

"چانڈیو صاحب مجھ سے کب اور کہاں ملنا چاہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔ "انہیں کتنے سیکیورٹی گارڈز کی ضرورت ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سر! یہ تو چانڈیو صاحب ہی آکر بتا سکیں گے۔ میں آپ سے ٹیلی فون پر بات کروا سکتا ہوں۔" عجیب آدمی تھا۔ پہلے وہ مجھ سے خود ملنے پر اصرار کرتا رہا، اب چانڈیو سے ٹیلی فون پر بات کروا رہا تھا۔ یہ معاملہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے اپنا سیل فون جیب سے نکالتے ہوئے کہا لیکن اس نے مجھ سے پہلے اپنا سیل فون نکال لیا اور نمبر پنچ کرنے کے بعد بولا۔

"سر! میں اس وقت خاور صاحب کے آفس میں بیٹھا ہوں۔ لیجیے بات کریں۔" اس نے ٹیلی فون میری طرف بڑھا دیا۔

"السلام علیکم سر۔" میں نے کہا۔ "خاور عرض کر رہا ہوں۔"

"وعلیکم السلام۔" چانڈیو نے گونج دار آواز میں جواب دیا۔ "خاور صاحب! مجھے آپ سے بہت ضروری کام ہے۔ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو آج ڈنر آپ میرے ساتھ کر لیں۔"

"جی ضرور سر۔" میں نے کہا۔ "مجھے آپ سے ملاقات کر کے خوشی ہوگی۔"

"ایک بات کا خیال رکھیے گا، اس ملاقات کا علم کسی کو نہیں ہونا چاہیے۔"

"اوکے سر۔" میں نے کہا۔

"باقی باتیں آپ کو خادم حسین سمجھا دے گا۔" اس نے بے نیازی سے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

"سر! آپ نے چانڈیو صاحب کا بنگلا تو دیکھا ہی ہوگا؟" خادم حسین نے پوچھا۔

"میں نے بدقسمتی سے ابھی تک ان کا بنگلا نہیں دیکھا۔" میں نے اس طرح کہا جیسے ان کے بنگلے کی زیارت بھی خوش قسمتی کی علامت ہو۔

"کوئی بات نہیں سر۔" اس نے کہا۔ "آپ نو بجے تیار رہیے گا، میں آپ کو لینے آجاؤں گا۔"

"آپ تکلیف نہ کریں۔" میں نے کہا۔ "مجھے صرف ایڈریس بتا دیں۔ میں خود ہی وہاں پہنچ جاؤں گا۔" پھر

میں ہنس کر بولا۔ ”ویسے بھی چانڈیو صاحب اپنے علاقے میں خاصے معروف ہیں۔ ان کے بنگلے کا پتا تو کوئی بھی بتادے گا۔“

”ایک منٹ سر۔“ اس نے کہا پھر جیب سے سیل فون نکال کر نمبر ملایا اور سندھی میں بولا۔ ”سائیں یہ کہہ رہا ہے کہ خود ہی پہنچ جائے گا… نہیں سائیں، آئے گا تو ضرور۔ آپ کا نام سن کر ہی اسے پسینا آگیا تھا۔ جی سائیں! میں بنگلے کا پتا اسے لکھوا دیتا ہوں۔“ اس کی اس گفتگو نے مجھے مزید اُلجھن میں مبتلا کردیا۔ وہ جس انداز میں گفتگو کررہا تھا، وہ میرے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔

”ٹھیک ہے سر۔“ خادم حسین نے کہا۔ ”آپ چانڈیو صاحب کا ایڈریس لکھ لیں، آپ ٹھیک دس بجے وہاں پہنچ جایئے گا۔“ اس نے مجھے یوں ہدایت دی جیسے میں اس کا یا اس کے باس کا ملازم ہوں۔

اس کے جانے کے بعد ماریہ کمرے میں داخل ہوئی اور بولی۔ ”کیا کوئی بڑا کام مل گیا… کس سوچ میں گم ہو؟“

”بڑا کام …!“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”اس مردود نے تو ابھی تک یہ بھی نہیں بتایا کہ اس کے باس کو مجھ سے کیا کام ہے۔“

”کیا مطلب؟“ ماریہ نے حیرت سے کہا۔

”تم نے علی حسن چانڈیو کا نام تو سنا ہوگا؟“

”وہ سندھ کا وڈیرا؟“ ماریہ نے کہا۔ ”تم شاید بھول گئے خاور کہ تین چار مہینے پہلے اس کے گاؤں میں ایک نجی جیل کا انکشاف ہوا تھا۔ ایک این جی او اور میڈیا نے مل کر اس جیل کا سراغ لگایا تھا۔“

”اوہ، ہاں۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے اچھی طرح یاد ہے لیکن اس چانڈیو کا نام یاد نہیں آرہا تھا۔“

”تو کیا تم اس سے ملنے جاؤ گے؟“ ماریہ نے پوچھا۔

”تمہارا کیا خیال ہے، مجھے جانا چاہیے یا نہیں؟“

”تمہیں ضرور جانا چاہیے۔“ ماریہ نے کہا۔ ”وہ آخر ہمارا کلائنٹ ہے۔“

”میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ اس سے ملاقات کر ہی لینا چاہیے۔ ہمیں اس سے کیا غرض کہ اس کا کردار کیا ہے۔“

***

علی حسن چانڈیو کا بنگلا ڈھونڈنے میں مجھے کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ وسیع و عریض آہنی دروازے پر دو مسلح گارڈز موجود تھے۔ وہ کسی سیکیورٹی ایجنسی کے نہیں بلکہ چانڈیو کے ذاتی گارڈز تھے۔ دروازے کے دائیں جانب پیتل کی بہت خوب صورت نیم پلیٹ لگی تھی جس پر انگریزی میں اے، ایچ، چانڈیو۔ پریذیڈنٹ ایف اے پی کے الفاظ جلی حروف میں لکھے ہوئے تھے۔

میں نے اپنی گاڑی عین اس کے گیٹ کے سامنے روکی تو ایک گارڈ میری طرف بڑھا اور اکھڑ لہجے میں بولا۔ ”یہاں گاڑی پارک نہ کریں۔“

”مجھے چانڈیو صاحب سے ملنا ہے۔“ میں نے باوقار لہجے میں کہا۔ ”میرا نام میجر خاور ہے اور میں…“

”سوری سر۔“ گارڈ نے جلدی سے کہا۔ ”سائیں نے حکم دیا تھا کہ خاور صاحب آئیں تو انہیں فوراً اندر بھیج دینا۔ میں گیٹ کھولتا ہوں۔“ وہ دوسرے گارڈ سے مخاطب ہوا۔ ”گیٹ کھول بابا، سائیں کا خاص مہمان ہے۔“ وہ بھی سندھی ہی بول رہا تھا۔

دوسرے گارڈ نے جلدی سے اندر جاکر کوئی لیور دبایا تو دروازہ کھلتا چلا گیا۔ اس نے مجھے گاڑی اندر لے جانے کا اشارہ کیا۔

گیٹ کے ساتھ ہی گارڈ روم تھا۔ وہاں یقیناً انٹرکام بھی ہوگا کیونکہ جب میں نے اپنی گاڑی اس بنگلے کے پورچ میں روکی تو پورچ میں پہلے سے ایک ملازم کھڑا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر میری دس سالہ پرانی ٹویوٹا کرولا کا دروازہ کھولا تو مجھے بالکل بھی شرمندگی نہیں ہوئی حالانکہ وہاں پراڈو سمیت جدید ماڈل کی دو چند اعلیٰ گاڑیاں پہلے سے موجود تھیں۔

میں ابھی اس وی آئی پی سلوک پر خوش ہو ہی رہا تھا کہ اس نے میری ساری خوشی کو خاک میں ملادیا اور بولا۔ ”سر! بُرا مت مانیے گا۔ سائیں کا حکم ہے کہ ان کا کوئی مہمان ہتھیار لے کر اندر نہیں جاسکتا۔“

میں بُری طرح بھنا گیا لیکن سنبھل کر بولا۔ ”میرے پاس صرف ایک پسٹل ہے۔“ میں نے اپنے بغلی ہولسٹر سے پسٹل نکال کر اس کے حوالے کردیا۔

”سر! اگر آپ بُرا نہ مانیں تو آپ کی تلاشی لے لوں؟“ اس نے بہت احترام سے گویا میرے سر پر جوتا رسید کردیا۔

”سوری۔“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ”میں یہاں اپنی بےعزتی کروانے نہیں آیا۔ میرا پسٹل مجھے دے دو، میں واپس جارہا ہوں۔ مجھے اتنی ذلت برداشت کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ چانڈیو صاحب کو بتادینا کہ میں واپس جارہا ہوں۔“ میں نے اس سے اپنا پسٹل لے کر دوبارہ گاڑی میں بیٹھنے کی کوشش کی۔

”ایک منٹ سر۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”آپ ذرا ٹھہریں، میں صاحب کو اطلاع دے دوں۔“ اس نے کہا اور تقریباً بھاگتا ہوا اندر کی طرف روانہ ہوگیا۔

میں اطمینان سے گاڑی میں بیٹھ کر سگریٹ پھونکنے لگا۔ ابھی میں نے آدھی سگریٹ بھی ختم نہیں کی تھی کہ برآمدے میں ایک شخص مجھے نظر آیا۔ میں اسے دیکھتے ہی پہچان گیا۔ وہ علی حسن چانڈیو تھا۔ میں نے اکثر اخبارات اور ٹی وی پر اسے دیکھا تھا لیکن اس کی شخصیت اس سے کہیں زیادہ باوقار تھی جتنی ٹی وی پر نظر آتی تھی۔ اس کے پیچھے تین مسلح گارڈ بھی تھے۔

میں اسے دیکھ کر بھی اطمینان سے سگریٹ کے کش لگاتا رہا۔ ایک گارڈ تیزی سے میری طرف آیا اور بولا۔ ”سر! چانڈیو صاحب برآمدے میں کھڑے ہیں۔“ میں نے یوں چونک کر اس طرف دیکھا جیسے ابھی تک دیکھا ہی نہ ہو۔ میں گاڑی سے باہر آگیا۔

”ویلکم… ویلکم مسٹر خاور۔“ چانڈیو نے مجھے دیکھ کر خوشگوار انداز میں کہا۔ اس کے گارڈز یوں کھڑے تھے کہ میری ذرا سی غلط حرکت پر وہ مجھے گولیوں سے چھلنی کردیں گے۔ ان کے چہروں کے تاثرات سے مجھے ایسا ہی لگ رہا تھا۔

میں برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا تو چانڈیو نے بہت گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا اور بولا۔ ”یہ تو سائیں ہماری روایت کے خلاف ہے کہ گھر آیا مہمان دروازے ہی سے واپس چلا جائے۔ میرے گارڈ کو معلوم نہیں تھا کہ آپ میرے خاص مہمان ہو ورنہ وہ ایسی جسارت کبھی نہ کرتا۔ یہ تو ان لوگوں کے لیے ہے جو بغیر بلائے مجھ سے ملاقات کرنے کے لیے آتے ہیں۔“ پھر وہ ہنس کر بولا۔ ”آپ اندر تشریف لایئے۔“

میں اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں پہنچا تو اس کی آرائش دیکھ کر دل ہی دل میں چانڈیو کے ذوق کو سراہا۔ ڈرائنگ روم کیا، وہ تو ایسا کمرا تھا جس میں انتہائی قیمتی سامان رکھا ہوا تھا۔ ڈرائنگ روم میں دو آدمی پہلے سے موجود تھے۔ ان کے چہرے دیکھ کر مجھے ایسا لگا جیسے میں نے انہیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔

وہ ہمیں دیکھ کر کھڑے ہوگئے اور باری باری دونوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا پھر ان میں سے ایک بولا۔ ”سائیں، ہمیں اجازت دیں۔“

”ٹھیک ہے بابا۔ میں تم لوگوں سے پھر کبھی بات کروں گا۔“ وہ دونوں بہت مؤدب انداز میں وہاں سے رخصت ہوگئے۔

ان کے جانے کے بعد چانڈیو بےتکلفی سے بولا۔ ”خاور صاحب! اطمینان سے بیٹھیں۔ آپ ڈنر جلدی کرنے کے عادی تو نہیں ہیں؟“

”میرے ڈنر کا کوئی ٹائم نہیں ہے سر۔“ میں نے کہا۔ ”کبھی کبھی تو مصروفیت کی وجہ سے ڈنر کرنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔“ اسی وقت ایک ملازم ٹرالی دھکیلتا ہوا آگیا۔ ٹرالی میں کولڈ ڈرنکس اور گلاس تھے۔ اس کے علاوہ ڈرائی فروٹ بھی تھے۔

”خاور صاحب۔“ اس نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں کہ آپ کا وقت بہت قیمتی ہے لیکن میں آپ کے وقت کی پوری پوری قیمت ادا کروں گا۔“

”چانڈیو صاحب! پہلے مجھے کام کی نوعیت تو معلوم ہو۔ میں آپ کو بہترین سیکیورٹی گارڈز مہیا کرسکتا ہوں۔ ان میں سے اکثریت آرمی کے ریٹائرڈ کمانڈوز کی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس کے علاوہ میں آپ کی گاڑی کے لیے ٹریکر بھی مہیا کرسکتا ہوں۔ سیکیورٹی الارم نصب کراسکتا ہوں۔ آپ بتایئے، آپ کو کس چیز کی ضرورت ہے؟“

”میرے کام کی نوعیت ذرا مختلف ہے۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ یہ کام آسانی سے کرسکتے ہیں۔“

”میں سمجھا نہیں؟“ میں نے کہا۔ ”میں سیکیورٹی ایجنسی چلاتا ہوں چانڈیو صاحب۔ اس سے متعلق ہی خدمات آپ کو بھی مہیا کرسکتا ہوں۔“

”کام کے بارے میں پہلے اتنا بتادوں کہ اس میں رازداری شرط ہے۔ اگر آپ کام نہ کرنا چاہیں تو پھر بےشک نہ کریں لیکن پھر آپ اس بات کو بھول جائیں گے کہ میری آپ سے کبھی ملاقات بھی ہوئی تھی۔“

”چانڈیو صاحب۔“ میں نے کہا۔ ”ہم فوجی لوگ ٹو دی پوائنٹ بات کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اس لیے اگر آپ بھی…“

”میں اسی طرف آرہا ہوں۔“ چانڈیو نے کہا۔ سیاسی حلقوں میں تقریریں کرکر کے اس کی زبان تو صاف ہوگئی تھی لیکن لہجے میں اب بھی وہی مخصوص اکھڑپن تھا۔

”میری زندگی کا ایک بڑا حصہ یورپ اور امریکا میں گزرا ہے۔“ اس نے خودکلامی کے انداز میں کہا۔ ”میں نے ہارورڈ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی ہے۔“ میں اس سے کہنے

والا تھا کہ میں اس کی پروفائل سننے یہاں نہیں آیا ہوں لیکن میں نے اپنی زبان بند رکھی۔

"میں نے طالب علمی کے زمانے میں ایک امریکن لڑکی سے شادی کرلی تھی۔ اس سے میری ایک بیٹی بھی ہے پھر ہماری علیحدگی ہوگئی اور وہ بیٹی کو لے کر الگ ہوگئی۔ وہاں میں نے ایک فائیو اسٹار ہوٹل اور ڈیپارٹمنٹل اسٹورز کی ایک چین قائم کی تھی۔ اس کاروبار کا ٹرن اوور اس وقت لاکھوں ڈالرز سالانہ ہے۔" میں نے پھر بے چینی سے پہلو بدلا۔

"آپ کو اپنے یہ اثاثے الیکشن کمیشن کے سامنے ڈکلیئر کرنے چاہئیں۔" میں نے کہا۔

"ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی۔" اس نے درشت لہجے میں کہا۔ شاید اسے میری مداخلت پسند نہیں آئی تھی۔ "یہاں بھی میری اتنی زمینیں ہیں کہ میری نسلیں بیٹھ کر کھا سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ میرے بیٹوں نے کراچی، فیصل آباد اور گجرات میں کئی ٹیکسٹائل ملز اور الیکٹرک کے سامان کی فیکٹریاں لگا رکھی ہیں۔" اب مجھے اس کی بات سے جھنجلاہٹ ہونے لگی تھی۔

"امریکا اور یورپ والے کاروبار کا علم میرے بیٹوں اور بیوی کو بھی ہے لیکن اس میں ان کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ امریکا اور یورپ کا تمام کاروبار اپنی بیٹی عینا کو دے دوں گا۔"

"عینا کو؟" میں نے پوچھا۔

"میری امریکن بیوی کی بیٹی کا نام عینا ہے۔" اس نے کہا۔ "اور میں نے اس سلسلے میں وصیت بھی لکھ دی ہے لیکن میرے بیٹوں کو بھی کہیں سے بھنک مل گئی ہے کہ میں وہ کاروبار عینا کے نام کر رہا ہوں۔"

"تو کیا انہیں آپ کی پہلی شادی کا علم نہیں تھا؟"

"پہلی نہیں... وہ میری دوسری شادی تھی۔ پہلی شادی تو بہت نوعمری میں میری چچا زاد سے ہوئی تھی۔ اس وقت میں گریجویشن کر رہا تھا۔" وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔ "میرے بیٹے نعمان اور حسان نہیں چاہتے کہ میں وہ جائداد عینا کو دوں۔ ان کا خیال تھا کہ جب میں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے تو وہ معاملہ ختم ہوگیا ہے لیکن دو سال پہلے مجھے معلوم ہوا ہے کہ میری بیٹی ورجینیا کے ایک ریسٹورنٹ میں ویٹر ہے اور اس کی ماں مر چکی ہے۔"

"اور کیا پھر آپ کا عینا سے کوئی رابطہ ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"میں خود وہاں گیا تھا لیکن وہاں جا کر معلوم ہوا کہ عینا وہاں سے ملازمت چھوڑ کر جا چکی ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے۔ میں نے اسے بہت تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ گزشتہ ہفتے میرے ایک خاص آدمی نے مجھے بتایا کہ حسان بابا نے اس کا سراغ لگا لیا ہے۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔" میں نے کہا۔

"یہی بات تو خطرناک ہے۔" اس نے کہا۔ "اب وہ دونوں بھائی عینا کو ٹھکانے لگانے کی کوشش کریں گے۔ نعمان تو شاید ایسا نہ کرے لیکن حسان کچھ بھی کرسکتا ہے۔" اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

"میں اس سلسلے میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"آپ میری بیٹی کو تلاش کریں اور اس کی حفاظت کا بندوبست کریں۔" اس نے کہا۔

"میں آپ کی بیٹی کو تلاش کروں؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "امریکا کوئی چھوٹا ملک نہیں ہے۔ کراچی میں کسی آدمی کا سراغ لگانا انتہائی مشکل کام ہے پھر امریکا..."

"مشکل تو ہے ناممکن نہیں ہے۔" اس نے کہا۔

"اس کے لیے تو خاصا وقت درکار ہوگا..." میں نے کہا۔

"ہمارے پاس وقت ہی تو نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ "جہاں تک آپ کے وقت کا تعلق ہے میں آپ کے ایک ایک لمحے کی قیمت ادا کر دوں گا۔ اس سلسلے میں جو اخراجات ہوں گے، وہ اس کے علاوہ ہوں گے۔" اس نے اپنے بریف کیس سے چیک بک نکالی اور ایک چیک لکھ کر میری طرف بڑھایا۔

"پانچ لاکھ کا چیک ہے۔ یہ صرف آپ کے ابتدائی اخراجات کے لیے ہے۔" اس نے دوسرا چیک سائن کرکے میرے سامنے رکھ دیا۔ "یہ بلینک چیک ہے اور اس میں رقم آپ اپنی مرضی سے لکھ لیں۔"

"چانڈیو صاحب! پہلے تو یہ طے ہوجائے کہ میں کام کر بھی سکتا ہوں یا نہیں؟"

"آپ یہ کام کرسکتے ہیں۔" چانڈیو نے کہا۔ "ابھی ہم کھانا کھائیں گے۔ اس دوران میں آپ سوچ لیں پھر ہم اس موضوع پر مزید بات چیت کریں گے۔" اس نے ملازم کو آواز دے کر کھانا لگانے کا کہا۔ ان دنوں میری حالت کچھ بہتر نہیں تھی۔ بس جیسے تیسے گزارہ ہوجاتا تھا۔ اگر آفس میرے دوست کا نہ ہوتا تو شاید میں اسے بند کرچکا ہوتا۔ میرا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس کیس میں کامیابی اور

ناکامی کے امکانات ففٹی ففٹی نہیں تھے بلکہ ناکامی کے امکانات بہت زیادہ تھے۔

کھانے کے دوران میں چانڈیو نے بھی مجھے نہیں چھیڑا۔ ہم دونوں خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔ دونوں ہی اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔ اس دوران میں بہت سی باتیں میرے ذہن میں آئیں۔

کھانے کے بعد ہم پھر ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔ چانڈیو نے کافی وہیں منگوالی۔ کافی پینے کے دوران میں بھی میں مسلسل سوچتا رہا۔

"خاور صاحب!" چانڈیو نے کافی دیر بعد مجھے مخاطب کیا۔ "مجھے یقین ہے کہ آپ نے اس معاملے پر اچھی طرح غور کرلیا ہوگا؟" پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "اگر آپ اس کیس میں کامیاب ہوگئے تو میں آپ کو بہترین سیکیورٹی ایجنسی بنا کر دوں گا۔ یہ میری طرف سے آپ کو گفٹ ہوگا۔"

"اور اگر میں ناکام ہوگیا تو؟" میں نے غور سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ناکامی کا لفظ کم سے کم میری ڈکشنری میں نہیں ہے۔" چانڈیو نے کہا۔ "آپ کا تعلق بھی آرمی کے ایس ایس جی گروپ سے رہا ہے۔ آپ کو بھی اس لفظ سے نفرت ہونی چاہیے۔" اس نے کہا۔ "لیکن اگر اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود آپ ناکام ہوئے تو بھی آپ کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ نقصان تو میرا ہوگا۔"

"بات نقصان یا فائدے کی نہیں ہے چانڈیو صاحب! ہر ٹاسک کو میں چیلنج سمجھ کر قبول کرتا ہوں۔ میرا سب سے بڑا نقصان تو یہی ہوگا کہ اس ناکامی سے میرا اپنی ذات پر سے اعتماد اٹھ جائے گا۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے یہ کام کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے؟" وہ مسکرا کر بولا۔

"میں نے فیصلہ تو کرلیا ہے لیکن اس سلسلے میں مجھے آپ کا تعاون درکار ہوگا۔ اگر آپ مجھ پر اعتماد کرتے ہیں تو کوئی بات چھپائیں گے نہیں۔"

"میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔" اس نے کہا۔ "لیکن پہلے یہ چیک قبول کرلیں۔"

میں نے بلینک چیک اسے واپس دیا اور دوسرا چیک جیب میں ڈال لیا اور بولا۔ "یہ کام اب میرے لیے بھی چیلنج ہے چانڈیو صاحب... کامیابی کی صورت میں آپ سے یہ چیک بھی قبول کرلوں گا۔"

"مجھے آپ سے یہی امید تھی۔" چانڈیو نے کہا۔

"آپ کے پاس اپنی بیٹی اور بیوی کی کوئی تصویر ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں دو چار تصویریں ہیں لیکن عینا اس وقت بہت چھوٹی تھی۔ میں وہ تمام تصاویر اور دیگر معلومات کی فائل آپ کے آفس بھجوا دوں گا۔ اس فائل سے آپ کو بہت مدد ملے گی۔"

"اب یہ بتائیے کہ آپ کا وہ آدمی کون ہے جس نے آپ کو یہ اطلاع دی تھی کہ حسان صاحب کو عینا کا سراغ مل گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ ایک لمحے کے لیے ہچکچایا پھر بولا۔ "وہ بظاہر تو حسان ہی کا آدمی ہے لیکن اصل میں میرے لیے کام کرتا ہے۔ اگر حسان کو اس بات کی بھنک مل گئی تو وہ اس آدمی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"آپ مجھ پر بھروسا کرسکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"وہ قادر بخش ہے۔"

"حسان صاحب آج کل کہاں ہوتے ہیں؟"

"وہ کراچی میں ہے۔ دونوں بیٹوں کی شادیاں کرنے کے بعد میں نے انہیں علیحدہ کردیا ہے۔"

"اور نعمان صاحب؟" میں نے پوچھا۔

"نعمان چھوٹا ہونے کے باوجود بہت ذہین اور سمجھدار ہے۔ وہ حسان سے بالکل مختلف ہے لیکن اپنی ماں کی بات بہت مانتا ہے۔ ممکن ہے حسان کے کہنے پر وہ کوئی قدم نہ اٹھائے لیکن ماں کے کہنے پر اٹھا سکتا ہے۔"

"وہ دونوں آپ کی بات نہیں مانتے؟"

"میرے سامنے تو وہ سر نہیں اٹھا سکتے لیکن..."

"میں سمجھ گیا۔" میں نے انہیں مزید شرمندگی سے بچانے کے لیے کہا۔

"میں نے اسی لیے اپنی زندگی میں دونوں بیٹوں کو ان کا حصہ دے دیا ہے۔ ان کے کاروبار میں کافی مدد کی ہے لیکن جب معاملہ کروڑوں کا ہو تو یہی صورتِ حال پیدا ہوجاتی ہے۔"

"ٹھیک ہے چانڈیو صاحب۔" میں نے کہا۔ "میں کل سے اپنا کام شروع کردیتا ہوں۔ ہاں، مجھے آپ کا سیل نمبر بھی چاہیے جس پر ہر وقت آپ سے رابطہ ہوسکے۔"

"ہاں، وہ تو میں خود ہی دینے والا تھا۔" چانڈیو نے کہا۔ "میں نے یہ نمبر چند مخصوص افراد کے سوا کسی کو نہیں دیا۔ میرے بیٹوں اور بیوی کو بھی اس کا علم نہیں ہے۔" اس نے مجھے ایک نمبر بتایا جسے میں نے اپنے سیل فون میں محفوظ کرلیا۔

میں تمام ضروری سیل نمبر ایک ڈیجیٹل ڈائری میں بھی محفوظ کر لیتا تھا تاکہ سیل فون کی گمشدگی کی صورت میں نمبر میرے پاس محفوظ رہیں۔

"اب مجھے اجازت دیں۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہاں، امریکا جانے سے پہلے مجھ سے ایک ملاقات ضرور کر لیجیے گا۔" چانڈیو نے کہا۔

"ابھی تو میں کچھ کام یہاں کروں گا۔" میں نے کہا۔ وہ مجھے چھوڑنے باہر تک آیا.... باہر کھڑے ہوئے گارڈز اسے دیکھ کر اچانک مستعد ہو گئے۔

میں گھر پہنچا تو رات کا ایک بج رہا تھا۔ میں گھر میں اکیلا ہی رہتا تھا۔ بس حفاظت کے خیال سے دو گرے ہاؤنڈز کتے پال رکھے تھے۔ حفاظت سے زیادہ یہ میرا شوق تھا۔ میں نے دونوں کتوں کو کھانے کو دیا اور انہیں کھول کر اندر آ گیا۔

اس کاروبار کے چکر میں مجھ پر کافی قرض چڑھ گیا تھا اور میں اور ماریہ یہ سوچ رہے تھے کہ اس کاروبار کو وائنڈ اپ کر کے میں کسی ادارے میں ملازمت کر لوں۔

میں نے سوچا سب سے پہلے تو میں لوگوں کے قرض چکاؤں گا۔ میں نے اس وقت یہ بھی نہیں دیکھا تھا کہ چانڈیو صاحب نے کراس چیک دیا ہے یا کیش۔ میں کچھ دیر تک چیک کو لیے کھڑا رہا پھر احتیاط سے اسے اپنے بریف کیس میں رکھ دیا اور لمبی تان کر سو گیا۔

میری آنکھ ٹیلی فون کی گھنٹی پر کھلی۔ میں نے وال کلاک پر نظر ڈالی جو آٹھ بجا رہی تھی۔ میں نے جھنجلا کر ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا لیکن اس کے باوجود گھنٹی کی آواز بند نہیں ہوئی۔ وہ ٹیلی فون کی نہیں بلکہ ڈور بیل کی آواز تھی۔

اب تو اٹھنا ضروری تھا لیکن میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر کوئی غیر متعلق آدمی ہوا تو میں اسے بے نقط سناؤں گا لیکن برآمدے میں نکلتے ہی مجھے گیٹ کے باہر ماریہ کی گاڑی نظر آئی۔

میں گیٹ کی طرف بڑھا تو دونوں گرے ہاؤنڈز کتے اچھلتے ہوئے میرے آگے پیچھے دوڑنے لگے۔

"تم ابھی تک سو رہے تھے۔ کیا آج آفس نہیں جاؤ گے؟" اس نے منہ بنا کر کہا۔

"چلے جائیں گے یار۔" میں نے کہا۔ "تم اندر تو آؤ۔"

"ایک بات کان کھول کر سن لو۔ میں تمہیں زیادہ سے زیادہ دس منٹ دے سکتی ہوں تیار ہونے کے لیے۔"

"کیوں، دس منٹ میں کیا زلزلہ آنے والا ہے؟" میں نے پوچھا اور اس کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ دونوں کتے بھی اچھلتے ہوئے برآمدے تک ہمارے ساتھ آئے پھر وہ لان میں واپس چلے گئے۔ ماریہ اکثر گھر آتی رہتی تھی اس لیے دونوں کتے اس سے بھی مانوس تھے۔

"میں نے تم سے کہا ہے کہ اگر تمہاری یادداشت اتنی کمزور ہو گئی ہے تو ڈائری میں نوٹ کر لیا کرو۔"

"میری یادداشت اللہ کے فضل سے تم سے بہتر ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے یہ بھی یاد ہے کہ آج سیکیورٹی گارڈز کے سلسلے میں شیراز بلڈرز کے مالک شیراز احمد صاحب سے میٹنگ ہے۔"

"اس کے باوجود تم ابھی تک بستر میں پڑے ایسے رہے ہو۔ ہفتوں بعد تو کوئی کلائنٹ آیا ہے ورنہ...."

"ایسا کرو ماریہ، شیراز صاحب کو ٹیلی فون کر کے آج کی میٹنگ کینسل کر دو۔"

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" ماریہ فکرمند ہو گئی۔ "اگر ایسا ہے تو تم آرام کرو۔ میں اور جمیل میٹنگ اٹینڈ کر لیں گے۔"

"میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے اور ذہنی توازن بھی۔" میں نے کہا۔ "لیکن فی الحال ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ ہم مزید کسی پروجیکٹ پر ابھی کام نہیں کر سکتے۔"

"کیوں؟" ماریہ نے حیرت سے پوچھا۔ میں نے اسے اپنی اور چانڈیو کی ملاقات کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

"تو تم یہ کیس لے رہے ہو؟" ماریہ نے پوچھا۔

"میں یہ کیس لے چکا ہوں۔ چانڈیو صاحب نے ابتدائی اخراجات کے لیے چیک بھی دے دیا ہے۔ تم وہ چیک آج ہی بینک میں جمع کروا دینا۔" میں نے اٹھ کر بریف کیس سے وہ چیک نکالا اور ماریہ کو دے دیا۔

ماریہ نے چیک پر نظر ڈالی اور حیرت زدہ رہ گئی۔

"تو میں شیراز صاحب والی میٹنگ کینسل کر دوں؟"

"ہاں، کینسل کر دو اور ذرا اچھا سا ناشتا بناؤ۔ عرصہ ہوا تمہارے ہاتھ کا ناشتا کھائے ہوئے۔"

"اب زیادہ فری ہونے کی کوشش مت کرو۔" ماریہ نے کہا۔ "میں نے کل ہی تمہیں ناشتا بنا کر دیا تھا۔"

"تو پھر آج بھی بنا لو۔" میں نے کہا اور جلدی سے باتھ روم میں گھس گیا۔

میں تیار ہو کر لاؤنج میں پہنچا تو ماریہ ناشتا تیار کیے بیٹھی

تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر بولی۔ "تمہاری وجہ سے مجھے دن رات جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ تم کسی اہم میٹنگ میں اسلام آباد گئے ہوئے ہو اور آئندہ ایک ہفتے تک واپسی کا کوئی امکان نہیں ہے۔"

میں ناشتے سے فارغ ہوا تو ماریہ بولی۔ "اب چلو ساڑھے نو بج رہے ہیں۔"

"ایک منٹ۔" میں نے کہا۔ "میں کتوں کو کچھ کھلا دوں۔"

"ایک تو یہ تمہارے کتے کسی دن میرے ہاتھ سے مارے جائیں گے۔" ماریہ نے منہ بنا کر کہا۔

"تم جملہ الٹا بول رہی ہو۔" میں نے کہا۔ "یہ کہو تم کسی دن ان کتوں کے ہاتھوں ماری جاؤ گی لیکن کتوں کے ہاتھ کب ہوتے ہیں۔ تم...."

"اب یونہی بک بک کرتے رہو گے یا آفس بھی چلو گے؟" ماریہ جھنجلا رہی۔

میں نے کتوں کے لیے فریج سے گوشت نکالا، ٹیٹرا ملک کے دو لیٹر کے دو ڈبے نکالے۔ کتوں کے لیے مخصوص بسکٹ نکالے اور سب چیزیں کو ایک ٹرے میں لے کر باہر جانے لگا تو ماریہ بولی۔ "تم سے زیادہ تو یہ کتے کھاتے ہیں۔ ایک دن تمہیں یہ بھیک مانگنے پر مجبور کر دیں گے۔"

☆☆☆

میں آفس پہنچا تو سوا گیارہ بج رہے تھے۔ جمیل، ماریہ کی جگہ استقبالیہ کاؤنٹر پر بیٹھا جماہیاں لے رہا تھا۔ میری طرح وہ بھی آرمی کا کمانڈو تھا۔ وہ آرمی میں حوالدار تھا۔ پیراشوٹ سے جمپ لگاتے ہوئے اس کی کمر میں شدید چوٹ آئی تھی۔ اسے ایس ایس جی سے دوبارہ انفنٹری میں بھیجنے کی سفارش کی گئی۔ اسے اس میں اپنی ہتک محسوس ہوئی اور اس نے آرمی سے ریٹائرمنٹ لے لی۔ وہ انتہائی ذہین آدمی تھا۔ اس کی یادداشت غضب کی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کے دماغ میں کوئی کمپیوٹر فٹ ہے۔ اسے لوگوں کے سیل نمبرز تک زبانی یاد تھے۔ جس گاڑی کی رجسٹریشن نمبر ایک دفعہ دیکھ لیتا تھا، وہ اس کے ذہن میں محفوظ ہو جاتی تھی۔ جس شخص کو ایک دفعہ دیکھ لیتا پھر برسوں بعد بھی اسے پہچان لیتا تھا۔ اس کا مشاہدہ بھی غضب کا تھا۔

سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ مشکل حالات میں بھی بالکل پرسکون رہتا تھا۔ تمام بڑے بڑے دفاتر اور مختلف سرکاری اور نیم سرکاری محکموں سے معلومات حاصل کرنے میں اسے ملکہ حاصل تھا۔ وہ دیکھنے میں اول جلول سا نظر آتا لیکن ذہانت میں بے مثال تھا۔

مجھے دیکھ کر وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور فوجی انداز میں سیلیوٹ کیا پھر بولا۔ "صبح سے اب تک کئی ٹیلی فون آ چکے ہیں۔" اس نے ماریہ سے کہا۔

"تم میرے ساتھ آؤ۔" میں نے کہا۔ جمیل خاموشی سے میرے پیچھے پیچھے آ گیا۔

میں نے اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "جمیل ! تم علی حسن چانڈیو کو جانتے ہو؟"

"اسے کون نہیں جانتا۔" جمیل نے کہا۔ "وہ بہت بڑا وڈیرا ہے۔ ایک سیاسی پارٹی کا صدر ہے اور...."

"وہ آدمی کیسا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"دوسرے سیاست دانوں کے مقابلے میں وہ خاصا کھرا اور بااصول آدمی ہے۔"

"اس بااصول آدمی کی ابھی کچھ دن پہلے ایک نجی جیل کا انکشاف بھی ہوا ہے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"وہ نجی جیل اس کی نہیں بلکہ اس کے بیٹے حسان کی تھی۔ چانڈیو صاحب نے اپنے بیٹے کو بچانے کے لیے وہ الزام اپنے سر لے لیا۔"

"تم ایسا کرو وڈیرا علی حسن چانڈیو اور اس کی فیملی کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر کے مجھے رپورٹ کرو۔"

"اوکے سر۔" اس نے مستعدی سے کہا۔

"یہ کام کب تک ہو جائے گا؟"

"آج شام تک ہو جائے گا۔" جمیل نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "اگر دیر ہو گئی تو میں آپ کے گھر پر آ کر رپورٹ دے دوں گا۔"

"اگر شام تک کام نہ ہو تو گھر آ جانا لیکن آنے سے پہلے مجھے فون ضرور کر لینا۔"

"اوکے سر۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ابھی کچھ دیر باہر لاؤنج میں بیٹھو اور ماریہ کو اندر بھیج دو۔"

اس کے جانے کے بعد ماریہ کمرے میں داخل ہوئی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "جمیل کی کتنے مہینے کی سیلری ہمیں دینا ہے؟"

"دو مہینے کی۔" ماریہ نے جواب دیا پھر وہ کچھ توقف کے بعد بولی۔ "میں نے سلامت کو چیک دے کر بینک بھیج دیا ہے۔"

"اس وقت تمہارے اکاؤنٹ میں کتنی رقم ہے؟"

"کتنی رقم کی ضرورت ہے؟" ماریہ نے کہا۔

"باہر جمیل کو بے منٹ کرتا ہے۔ وہ بے چارہ کبھی اپنے منہ سے کچھ نہیں کہتا لیکن پیسے کی ضرورت تو اسے بھی ہوگی۔"

"میرے اکاؤنٹ میں رقم تو ہے لیکن پہلے چانڈیو کا چیک کیش ہونے دو، اس کے بعد دریا دلی دکھانا۔"

"تمہیں ملک کے اتنے بڑے اور اہم آدمی کے چیک پر شبہ ہے؟" میں نے کہا۔

"ہندی کی ایک ضرب المثل ہے کہ...."

"تمہیں بھی بھارتی چینل دیکھ دیکھ کر اچھی خاصی ہندی آگئی ہے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

اس نے میری بات کو نظر انداز کردیا۔

اسی وقت دروازے پر دستک دے کر سلامت اندر آگیا اور بولا۔ "میڈم! وہ چیک ہمارے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہو چکا ہے لیکن اس کے لیے کچھ انتظار کرنا پڑا۔ بینک کے منیجر نے پہلے چانڈیو صاحب سے کنفرم کیا کہ واقعی یہ چیک انہوں نے دیا ہے۔ ان کی تصدیق پر چیک کیش ہوگیا لیکن بینک منیجر حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔"

"اب تم ذرا اچھی سی چائے بنا کر ہمیں بھی پلاؤ اور خود بھی پیو۔" ماریہ نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ میں جانتا تھا کہ وہ اب کمپیوٹر پر اپنا اکاؤنٹ چیک کرے گی۔ میں اس دوران میں اطمینان سے بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد ماریہ انتہائی پُرجوش انداز میں کمرے میں داخل ہوئی اور بولی۔ "ہمارے اکاؤنٹ میں رقم جمع ہو چکی ہے۔ میں ابھی جمیل اور سلامت دونوں کو ان کے بقایاجات دے دیتی ہوں۔"

وہ چیک بک بھی اپنے ساتھ لائی تھی۔ رقم میرے اکاؤنٹ میں جمع ہوئی تھی اس لیے اس نے دونوں چیک لکھ کر میری طرف بڑھا دیے۔ میں نے دونوں چیکس پر سائن کیے اور آئندہ کا لائحہ عمل سوچنے لگا۔

میں آفس سے باہر نکل آیا۔ جمیل شاید میرے پاس آرہا تھا۔ اس کے کچھ کہنے سے پہلے میں نے کہا۔ "اب تم جاؤ لیکن مجھے آج رات تک مکمل رپورٹ چاہیے۔"

"اوکے سر۔" اس نے کہا اور آفس سے باہر نکل گیا۔

پھر میں کافی دیر تک کمپیوٹر پر گیم کھیلتا رہا اور اس کیس کے بارے میں سوچتا رہا۔

کافی دیر بعد ماریہ کمرے میں داخل ہوئی اور بولی۔ "گزشتہ دو گھنٹے میں تین بار کسی اقبال کا ٹیلی فون آچکا ہے۔ میں نے ہر بار یہی کہہ کر ٹالنے کی کوشش کی کہ خاور صاحب ایک انتہائی اہم میٹنگ میں مصروف ہیں۔"

"اقبال!" میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا پھر میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ "کیپٹن اقبال تو نہیں؟"

"اس نے صرف اقبال کہا تھا۔" ماریہ نے کہا۔ "اب وہ خود ہی آگیا ہے۔"

"یقیناً وہ کیپٹن اقبال ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ بھی میرے ساتھ ایس ایس جی میں تھا۔"

"تو کیا میں اسے تمہارے پاس بھیج دوں؟"

"یہ کنفرم کرنے کے بعد کہ وہ کیپٹن اقبال ہی ہے۔" میں نے کہا۔ میں فی الحال کسی بھی نئے کلائنٹ سے نہیں ملنا چاہتا تھا۔

ماریہ واپس چلی گئی تو میں ایک دفعہ پھر کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہوگیا۔ مشکل سے ایک منٹ بعد انٹرکام پر ماریہ نے بتایا۔ "سر! کیپٹن اقبال آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"بھیج دو۔" میں نے کہا۔ فوراً ہی اقبال کمرے میں داخل ہوا۔ وہ کیپٹن اقبال ہی تھا۔ میں اسے دیکھ کر کھڑا ہوگیا۔ وہ بھی والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گیا۔

"یار لگتا ہے ماشاء اللہ تیرا بزنس خوب چل رہا ہے۔ تجھے میٹنگز ہی سے فرصت نہیں ہے۔ صبح سے ٹیلی فون کر رہا ہوں لیکن تیری آپریٹر یہی جواب دے رہی ہے کہ خاور صاحب میٹنگ میں بزی ہیں۔"

"تو اگر نام کے ساتھ اپنا رینک بھی بتادیتا تو شاید تجھے اتنی پریشانی نہ ہوتی۔ کیپٹن اقبال کہتے ہوئے تجھے شرم آرہی تھی؟"

"یار! میں کیپٹن نہیں، اب میجر اقبال ہوں بلکہ تھا۔"

"ویری گڈ۔" میں نے کہا۔ "تیرا پروموشن بھی ہوگیا لیکن یہ تھا کا کیا مطلب ہے؟"

"میں نے ایک مہینے پہلے آرمی چھوڑ دی ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "بلکہ آرمی نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔"

"ویری سیڈ۔" میں نے کہا۔ "ایسی کیا بات ہوگئی؟"

"یار لمبی کہانی ہے۔" اس نے کہا۔ "تو مجھے چائے تو پلوا دے۔" پھر وہ ہنس کر بولا۔ "یار! ویسے تیری ٹیلی فون آپریٹر بہت پٹاخہ ہے۔ اتنی حسین لڑکی تجھے کیسے مل گئی؟"

"او بھائی ذرا سنبھل کے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "وہ تیری ہونے والی بھابی ہے۔"

"سوری یار۔" اقبال جلدی سے بولا۔ "ویری سوری۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ تو نے اب تک شادی کرلی ہوگی۔"

"تو نے کرلی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں یار، میں شادی کرچکا ہوں۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔

"تو اس میں اتنے افسوس کی کیا بات ہے؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔

"افسوس اس بات کا ہے کہ میری آزادی چھن گئی ہے۔ پہلے تو اپنی نیند سوتا تھا، اپنی نیند جاگتا تھا۔ اب تو بس قیدی ہو کر رہ گیا ہوں۔"

میں نے انٹرکام پر ماریہ سے کہا۔ "ماریہ! ذرا اندر آؤ۔" ماریہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس دن واقعی وہ ہمیشہ سے زیادہ حسین لگ رہی تھی۔

میں نے اس سے کہا۔ "ماریہ! یہ میرے دوست میجر اقبال خان ہیں۔ میرے ساتھ ایس ایس جی میں ہوتے تھے۔" پھر میں نے اقبال سے کہا۔ "یہ مس ماریہ ہیں۔ ٹیلی فون آپریٹر، میری پرسنل سیکریٹری، میری آفس انچارج اور...."

"بس میں سمجھ گیا۔" اقبال نے ہنس کر کہا۔ "دوسرے سیٹھوں کی طرح تو بھی ان کا استحصال کر رہا ہے۔ سیلری دیتا ہوگا ایک کام کی اور لیتا دس کام ہے۔"

"ماریہ۔" میں نے موضوع بدلنے کو کہا۔ "سلامت سے کہو ذرا ہمیں اچھی سی چائے پلادے اور کچھ کھانے کو بھی بھجوا دینا۔ یہ بے چارہ صبح سے بھوکا ہوگا۔"

"سلامت کو میں نے ایک ضروری کام سے بھیجا ہوا ہے۔ میں دیکھتی ہوں۔" میں جانتا تھا کہ سلامت کو ماریہ نے بھیجا ہے۔ میں اقبال کے سامنے یہ نہیں کہنا چاہتا تھا کہ تم چائے بنالاؤ۔

ماریہ کے جانے کے بعد میں نے پوچھا۔ "ہاں یار! اب بتا تو نے آرمی کیوں چھوڑ دی؟"

"مجھے میڈیکل گراؤنڈ پر ریٹائر کیا گیا ہے۔" اقبال کے لہجے میں افسردگی تھی۔ "میرا ایک گردہ ناکارہ ہو چکا تھا، اسے نکال دیا گیا۔ اب ایک گردے والا آدمی تو ایس ایس جی میں نہیں رہ سکتا تھا نا۔"

"ایک گردہ بھی کافی ہوتا ہے اقبال۔" میں نے کہا۔ "تو جانتا ہے اسکواش کا کھلاڑی جہانگیر خان جو گیارہ سال تک کورٹوں کے سینوں پر مونگ دلتا رہا اور اسکواش کا ورلڈ چیمپئن بنا رہا، اس کا صرف ایک گردہ ہے۔ امریکا کا ایک باکسر...."

"میں جانتا ہوں۔" اقبال نے میری بات کاٹ دی۔ "لیکن میڈیکل بورڈ نے مجھے ریٹائر کردیا۔" میں سمجھ گیا کہ وہ اس موضوع پر مزید بات نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ میں اس سے اپنے دوسرے ساتھیوں کے بارے میں پوچھتا رہا۔ وہ بھی ماضی کے قصے دہرانے لگا۔

"تو کراچی کب آیا؟" میں نے پوچھا۔ "اور آج کل کیا کر رہا ہے؟"

"یار! میں آج ہی تو کراچی آیا ہوں۔ شہلا کو جہلم میں اس کے باپ کے گھر چھوڑ دیا ہے۔ جہاں تک یہ سوال ہے کہ میں کیا کر رہا ہوں تو کچھ کرنے ہی کے ارادے سے تو کراچی آیا ہوں۔ ابھی پچھلے ہی مہینے تو آرمی سے فارغ ہوا ہوں۔" اسے آرمی چھوڑنے کا شدید افسوس تھا۔

"اب تو کیا کرنا چاہتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یار! ظاہر ہے کہیں ملازمت کروں گا۔ تیری طرح میں سرمایہ دار تو ہوں نہیں کہ اپنا بزنس شروع کردوں۔ کرنل صاحب تو مجھے اپنے ساتھ ٹرانسپورٹ کے کام میں لگانا چاہ رہے تھے لیکن یہ بھی کوئی کام ہے۔ میں نے انکار کردیا اور کراچی چلا آیا۔"

"کرنل صاحب کون؟" میں نے پوچھا۔ "کرنل سسر یا پھر...؟"

"یار! وہ میرے سسر ہیں۔ شہلا کے والد محترم۔ وہ سات سال پہلے ریٹائر ہو چکے ہیں۔ ٹرانسپورٹ کا بزنس ان کے والد پہلے سے کر رہے تھے۔ انہوں نے بھی وہی بزنس سنبھال لیا۔"

"اور تو ٹھہرا ہوا کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی تو میں اپنے کالج کے زمانے کے ایک دوست کے ساتھ ٹھہرا ہوا ہوں۔ بعد میں کوئی اور بندوبست کرلوں گا۔"

"تو ایسا کر اپنا سامان اٹھا کر میرے گھر شفٹ ہوجا۔"

"میں کوئی نہ کوئی بندوبست کرلوں گا۔" اس نے کہا۔ "تجھے فضول میں تکلیف ہوگی۔"

"مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔" میں نے کہا۔ "اتنے بڑے مکان میں اکیلا رہتا ہوں میں۔ تیرے آنے سے تو مجھے خوشی ہوگی۔" اسی وقت سلامت چائے اور بسکٹ وغیرہ لے کر آگیا۔ ہم چائے پیتے ہوئے باتوں میں ایسے مصروف ہوئے کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ ماریہ کے احساس دلانے پر مجھے علم ہوا کہ اس وقت شام کے چھ بج رہے ہیں۔

"میں جارہی ہوں۔" ماریہ نے کہا۔

''ایک منٹ ماریہ۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا اور باہر نکل آیا۔ ''چیک بک ذرا مجھے دو۔'' اس نے اپنی دراز سے چیک بک نکال کر میرے حوالے کر دی۔ میں نے فوراً اس پر پچاس ہزار کا چیک لکھ دیا اور بولا۔ ''یہ تم لے جاؤ اور کبھی اپنی سیلری خود بھی لے لیا کرو۔''

''یہ حق ابھی مجھے نہیں ہے۔'' ماریہ نے ہنس کر کہا اور اپنا بیگ اٹھا کر باہر نکل گئی۔

اقبال بھی میرے پیچھے پیچھے باہر نکل آیا تھا۔ وہ ماریہ کے جانے کے بعد بولا۔ ''یار! ایسی خوب صورت لڑکیاں نہ جانے ہماری شادی کے وقت کہاں گئی تھیں؟''

''تم شاید بھول رہے ہو کہ تم ایک سیکیورٹی ایجنسی کے آفس میں کھڑے ہو اور تمہاری یہ تمام باتیں ریکارڈ ہو رہی ہیں۔ یہ تمام باتیں میں شہلا بھابی کو سنواؤں گا۔''

''تو میرا دوست ہے یا دشمن؟'' اقبال نے کہا۔ ''میں تو ماریہ بھابی کی تعریف کر رہا ہوں۔''

''اچھا اب چل دفتر بند کرنا ہے۔'' میں نے سلامت سے کہا کہ دفتر بند کر دے۔

میں نے گاڑی میں بیٹھ کر اقبال سے کہا۔ ''پہلے تو تُو اپنا سامان اٹھا پھر میرے ساتھ چل۔''

''ابھی...؟'' اقبال نے پوچھا۔

''ہاں ابھی۔'' میں نے کہا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ اقبال نے مجھے نارتھ ناظم آباد چلنے کو کہا۔ وہاں سے ہم نے اس کا سوٹ کیس اور بیگ وغیرہ اٹھائے اور میں اسے لے کر گھر آ گیا۔

''تو نہا کر فریش ہو جا جب تک میں اپنے کتوں کو دیکھ لوں۔'' میں نے کتوں کو کھولا، انہیں کھانے کے لیے بسکٹ وغیرہ دیے اور دیر تک ان سے کھیلتا رہا۔

''یار خاور۔'' تھوڑی دیر بعد برآمدے سے اقبال کی آواز آئی۔ ''اب اندر آ جاؤ۔''

''تو ڈر مت۔'' میں نے کہا۔ ''میری موجودگی میں یہ کتے تجھے کچھ نہیں کہیں گے۔ اب تو تجھے ویسے بھی یہیں رہنا ہے۔ ان سے دوستی تو کرنا پڑے گی۔'' اقبال جھجکتا ہوا میرے پاس آ گیا۔ کتے اسے دیکھ کر تھوڑا سا غرائے پھر میری آواز پر پُرسکون ہو گئے۔

''تو دو چار دن انہیں اپنے ہاتھ سے کھلائے گا تو یہ تجھ سے بھی مانوس ہو جائیں گے۔''

''یار! تُو کتوں سے کھیلتا رہے گا یا کچھ کھلائے گا بھی؟ میں نے صبح صرف ناشتا کیا تھا۔'' اقبال نے کہا۔

''سوری یار۔'' میں جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ کتوں کو بند کیا اور جلدی جلدی تیار ہو کر باہر نکل آیا۔

گھر سے کچھ فاصلے پر ایک ریسٹورنٹ تھا۔ وہاں کھانا بہت اچھا ملتا تھا۔ ہم دونوں نے وہاں کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد میں نے اقبال سے پوچھا۔ ''اب تمہارا کیا ارادہ ہے، کہاں جاب کرو گے؟''

''نو آئیڈیا۔'' اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''میں جاب تو کروں گا لیکن کہاں کروں گا، اب تک میں نے یہ فیصلہ نہیں کیا۔''

''تو میرا آفس جوائن کیوں نہیں کر لیتا؟'' میں نے پوچھا۔

''تیرا آفس؟'' اس نے حیرت سے کہا۔ ''تُو نے تو ابھی خود بزنس شروع کیا ہے۔ ابھی تو اسے مستحکم ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔ میں تجھ پر مزید بوجھ نہیں ڈالوں گا۔''

''ایسی تو کوئی بات نہیں ہے یار۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے واقعی ایک اسسٹنٹ کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے مجھے کبھی ملک سے باہر جانا پڑے۔ میری غیر موجودگی میں تو ہی دفتر کو سنبھال سکتا ہے۔''

''تو کہاں جا رہا ہے؟'' اقبال نے چونک کر پوچھا۔

''ہو سکتا ہے کہ مجھے کچھ دن بعد اسٹیٹس جانا پڑے۔'' یہ خیال مجھے اچانک ہی آیا تھا کہ میری غیر موجودگی میں اگر اقبال کو آفس کا چارج دے دیا جائے تو یہاں کا کام بھی چلتا رہے گا۔ مجھے یقین تھا کہ چانڈیو صاحب کی وجہ سے مجھے کافی بزنس مل جائے گا۔

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ جمیل کی کال تھی۔ ''ہاں جمیل؟'' میں نے پوچھا۔

''سر! آپ کہاں ہیں؟'' جمیل نے پوچھا۔

''میں اس وقت باہر ہوں لیکن پندرہ منٹ تک میں گھر پہنچ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''اوکے سر! میں آپ کے گھر آ رہا ہوں۔'' میں گھر پہنچا تو جمیل مجھ سے پہلے ہی وہاں موجود تھا اور اپنی بائک پر بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔

وہ اقبال کو دیکھ کر چونکا پھر بہت پُرجوش لہجے میں بولا۔ ''السلام علیکم کیپٹن صاحب! آپ کب آئے؟'' اقبال نے حیرت سے اسے دیکھا پھر وہ بھی اسے پہچان گیا۔

''او ہو حوالدار جمیل بھی یہاں موجود ہے، ویری گڈ۔''

ہم اندر جا کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ جمیل بھی خاموشی سے بیٹھ گیا۔ وہ کچھ بولتے ہوئے جھجک رہا تھا۔

''جمیل، اب اقبال صاحب ہمارے ساتھ ہی کام کریں گے اس لیے تم ان کے سامنے بھی سب کچھ بتا سکتے ہو۔''

جمیل کی عادت تھی کہ وہ زیادہ سوال جواب نہیں کرتا تھا۔ اس نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ اقبال نے آرمی کب چھوڑی اور کیوں چھوڑی۔

''سر! میں نے علی حسن چانڈیو کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر لی ہیں۔'' جمیل نے کہا۔ ''علی حسن چانڈیو دوسروں کے برعکس اصول پرست سیاست داں ہے۔''

''یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔ تم مجھے اس کی فیملی کے بارے میں بتاؤ۔''

''چانڈیو صاحب نے ایک شادی بہت کم عمری میں اپنے ہی خاندان میں کی اور دوسری شادی انہوں نے امریکن لڑکی سے کی تھی۔ اس سے ان کی علیحدگی ہو چکی ہے۔ پہلی بیوی سے ان کے دو بیٹے ہیں حسان اور نعمان۔ دونوں شادی شدہ ہیں۔ حسان کی شہرت اچھی نہیں ہے۔ وہ انتہائی بدخصلت اور بدکردار شخص ہے۔ گاؤں میں بھی جیل بھی اسی نے بنائی تھی۔ وہ انتہائی لالچی اور خود غرض شخص ہے اور اپنے فائدے کے لیے اپنے بھائی کو بھی قتل کر سکتا ہے۔ چھوٹا بیٹا نعمان باپ کی طرح اصول پرست ہے۔ وہ ایمان داری سے کام کرتا ہے اور ٹیکس تک چوری نہیں کرتا اور غریبوں کی بھی مدد کرتا ہے۔ باپ کا بہت احترام کرتا ہے لیکن اس کا جھکاؤ ماں کی طرف زیادہ ہے۔ حسان بہت سے غیر قانونی کاموں میں بھی ملوث ہے۔ وہ کئی ڈاکوؤں کی بھی سرپرستی کرتا ہے اور زمینوں پر زبردستی قبضے بھی کرتا ہے۔ کراچی میں اس نے دو بڑے تعمیراتی پروجیکٹ شروع کر رکھے ہیں۔ وہ کروڑوں روپے کی زمین ہے جس پر حسان نے ناجائز قبضہ کر رکھا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے تعلقات انڈر ورلڈ سے بھی ہیں لیکن ابھی تک یہ تصدیق نہیں ہو سکی کہ وہ کسی قسم کی اسمگلنگ میں بھی ملوث ہے یا نہیں۔ کل تک یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔''

''حسان کی شادی کس سے ہوئی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کی شادی بھی شہر کے ایک معروف بلڈر کی بیٹی سے ہوئی ہے۔ وہ بلڈر بھی نیک نام نہیں ہے۔''

''کل تم یہ بھی معلوم کرنا کہ حسان کے رابطے بیرونِ ملک میں کہاں کہاں اور کس سے ہیں۔''

''اوکے سر۔'' جمیل نے کہا پھر مسکرا کر بولا۔ ''سر! آپ لوگ چائے پییں گے؟''

بچے ہمارے عہد کے

''گڈ آئیڈیا۔'' میں نے کہا۔

وہ چائے بنانے چلا گیا۔ میں نے اقبال سے کہا۔ ''اصل میں اس وقت جمیل خود بھی چائے پینا چاہ رہا ہوگا۔ وہ جانتا ہے کہ میں چائے اور کافی خراب بناتا ہوں اس لیے بے چارہ خود ہی کچن میں چلا گیا۔''

چائے پینے کے بعد جمیل جانے کے لیے کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''سر! کل میں صبح آفس آنے کے بجائے اپنے کام پر نکل جاؤں گا۔''

''اوکے، تم ماریہ کو بھی اطلاع دے دینا۔''

اس کے جانے کے بعد میں نے اقبال کو اس کیس کی پوری تفصیل بتائی اور اس سے پوچھا۔ ''تمہارے ذہن میں کوئی طریقہ ہے کہ ہم اپنے کام کا آغاز کیسے کریں؟'' اقبال سوچنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں وقت ضائع کیے بغیر امریکا نکل جاؤں۔ یہاں کے معاملات تو تم دیکھ لو گے۔ اگر حسان اس قسم کی مجرمانہ ذہنیت کا مالک ہے تو اب تک اس نے ضرور حنا کو ٹھکانے لگانے کے لیے کسی کو روانہ کر دیا ہوگا۔'' میں نے جیب سے سیل فون نکال کر جمیل کا نمبر ڈائل کیا اور اس سے کہا۔ ''یہ بھی معلوم کرنا کہ حسان کا دستِ راست کون ہے؟ میرا مطلب ہے ایسا آدمی جو حسان کے بہت زیادہ قریب ہو۔''

''اوکے سر۔'' جمیل نے کہا۔

میں نے دوسرا نمبر چانڈیو صاحب کا ڈائل کیا۔ انہوں نے دوسری گھنٹی پر سیل فون اٹھا لیا۔ ''السلام علیکم۔'' میں نے کہا۔

''وعلیکم السلام۔''

''چانڈیو صاحب! کیا آپ قادر بخش سے یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ اس نے یہ بات کس سے سنی ہے کہ حسان کو حنا کا سراغ مل گیا ہے؟''

"آپ لائن پر رہیں، میں ابھی پوچھتا ہوں۔ قادر بخش اس وقت میرے پاس ہی بیٹھا ہوا ہے۔"

میں سیل فون کان سے لگائے اس کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی آواز آئی۔ "خاور صاحب، قادر بخش کو یہ بات حسان کے ایک بہت قریبی آدمی سلطان خان سے معلوم ہوئی ہے۔"

"تھینکس۔" میں نے کہا۔

"اور کوئی بات؟" چانڈیو نے پوچھا۔

"سر! جب ضرورت ہوئی آپ کو زحمت دوں گا۔" میں نے کہا۔ "ابھی تو مجھے صرف یہی معلوم کرنا تھا۔"

"خدا حافظ۔" انہوں نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے اقبال کو بتایا تو اس نے کہا۔ "اب دیکھنا یہ ہے کہ جمیل کیا رپورٹ لاتا ہے۔ اس کے بعد ہی ہم کچھ کر سکیں گے۔"

"کیا کرنے کا ارادہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اگر جمیل نے بھی سلطان خان کا نام لیا تو میں اسے اٹھا لوں گا۔ وہ زیادہ دیر زبان بند نہیں رکھ سکے گا۔"

"لیکن اقبال یہ تو غیر قانونی کام ہے۔" میں نے کہا۔

"تو وہ لوگ کون سا قانونی کام کر رہے ہیں۔ اس چکر میں پڑے رہے تو یہ کیس کبھی بھی حل نہیں کر پاؤ گے۔ کیا کسی قانونی ادارے کو یہ اختیار ہے کہ وہ جسے بھی چاہے اٹھائے اور تھرڈ ڈگری استعمال کر کے اس سے کردہ اور ناکردہ تمام گناہ اگلوائے؟ اگر انہیں یہ اختیار نہیں ہے تو پھر وہ بھی تو غیر قانونی کام کرتے ہیں۔ پھر ہم تو کسی بے قصور کو اٹھا بھی نہیں رہے ہیں۔"

"اس اغوا سے ہمیں کیا فائدہ ہوگا؟ وہ کوئی بھی بتا سکتا ہے کہ عینا وہاں موجود ہے۔"

"میں اسے اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک اس بات کی تصدیق نہ ہو جائے۔"

اقبال ٹھیک ہی کہہ رہا تھا، میں نے سوچا۔ "میں سب سے پہلے وہاں جاؤں گا جہاں عینا ویٹریس تھی۔ ممکن ہے وہاں سے کچھ سراغ مل جائے۔" پھر میں اور اقبال دیر تک اس کیس پر سر کھپاتے رہے۔

دوسرے دن حسبِ معمول ماریہ نہیں آئی اس لیے مجھے ناشتا خود ہی بنانا پڑا۔ میں نے ناشتا بناتے ہوئے سوچا کہ اب مجھے کھانا پکانے کے لیے کسی کا بندوبست کرنا ہی پڑے گا۔

ہم باہر نکلنے ہی والے تھے کہ مجھے کتوں کے زور زور سے بھونکنے اور غرانے کی آوازیں آئیں پھر ایسی آوازیں آئیں جیسے وہ کسی پر جھپٹ پڑے ہوں۔ میں نے غیر شعوری طور پر اپنا پسٹل نکال لیا۔ اقبال کا ہاتھ بھی جیب تک گیا تھا لیکن اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اس نے لپک کر لاؤنج میں ایک طرف رکھی ہوئی ہاکی اٹھالی۔

اسی وقت ایک فائر کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی کتوں کی آوازیں اور ایک انسانی چیخ بھی سنائی دی۔

میں نے دروازہ کھولا اور پھرتی سے زمین پر لیٹ گیا۔ پھر میں کرالنگ کرتا ہوا باہر نکلا تو مجھے ایک شخص گیٹ کی طرف بھاگتا دکھائی دیا۔ اس کے پیچھے پیچھے میرا ایک گرے ہاؤنڈ بھی تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ گیٹ کھولنے کی کوشش کرتا، کتے نے پہلے اس کی پنڈلی بھنبھوڑی پھر اچھل کر اس کی گردن پکڑی۔ گھبراہٹ میں اس کے ہاتھ سے پسٹل بھی نکل گیا۔

"ٹونی۔" میں چیخ کر بولا۔ "اسٹاپ۔" کتا وہیں رک گیا لیکن وہ اب بھی اس انداز میں کھڑا تھا کہ اگر وہ شخص بھاگنے کی کوشش کرے تو دوبارہ جھپٹ کر اس کی گردن پکڑ لے۔

اچانک مجھے اپنے پیچھے بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں پھر میں نے اقبال کو ہاکی لیے گیٹ کی طرف بھاگتے دیکھا۔ میں لان کی طرف بھاگا تو مجھے اپنا دوسرا کتا نظر آیا جو زخمی حالت میں ایک طرف پڑا تھا۔ مجھے علم تھا کہ اقبال اس شخص کو قابو کر لے گا۔ میں جھپٹ کر کتے کی طرف گیا۔ گولی اس کے پیٹ میں لگی تھی اور وہ اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہا تھا پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے دم توڑ دیا۔

اس وقت تک اقبال نے اس شخص کی گردن دبوچ لی تھی اور اس کا پسٹل اٹھا کر اس کی کنپٹی پر رکھ کے اسے اندر کی طرف دھکیل رہا تھا۔

کتا اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر پاگل ہو گیا۔ وہ بار بار اسے سونگھ رہا تھا۔ اس کا زخم چاٹ رہا تھا پھر وہ اس کے نزدیک بیٹھ کر بھیانک انداز میں رونے لگا۔

"ٹونی۔" میں نے اسے ڈانٹا اور اسے ڈاگ ہاؤس کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔ میں نے بنگلے کے کونے میں دو کمروں کا ایک ڈاگ ہاؤس بنا رکھا تھا۔ کتا میرے کہنے پر وہاں سے چلا گیا لیکن مڑ مڑ کر اپنے ساتھی کی لاش کو دیکھ رہا تھا۔

مجھے بھی اپنے قیمتی کتے کے ضائع ہونے کا بہت افسوس تھا۔ میں اندر واپس گیا تو اقبال کا شکار ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔

اس کی دائیں پنڈلی ٹونی نے بری طرح ادھیڑ ڈالی تھی اور اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔

"کون ہو تم؟" میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔ وہ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔

"یہی سوال میں اس سے دس دفعہ کر چکا ہوں لیکن شاید یہ گونگا ہو گیا ہے۔"

"میں تم سے صرف دوسری دفعہ پوچھوں گا کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟" میں نے درشت لہجے میں کہا۔ "پھر میں تمہیں اپنے کتے کے حوالے کر دوں گا۔ وہ اپنے ساتھی کی لاش دیکھ کر ویسے بھی پاگل ہو رہا ہے۔ وہ تمہاری تکا بوٹی کر دے گا۔ بتاؤ تم کون ہو؟" وہ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔

"اسے باہر لاؤ اور ٹونی کے حوالے کر دو۔" میں نے اقبال سے کہا۔ "میں ابھی پولیس کو فون کر دوں گا کہ کسی نے میرے گھر میں داخل ہونے کی کوشش کی اور میرے ایک کتے کو ہلاک کر دیا۔ جواب میں میرے دوسرے کتے نے اس کا نرخرہ چبا لیا۔"

اقبال اسے گردن سے پکڑ کر بے دردی سے دھکیلتا ہوا باہر لے آیا۔ "میں آخری دفعہ پوچھ رہا ہوں۔" میرے بجائے اقبال نے پوچھا۔ "پھر تمہاری لاش سے تصدیق تو ہو ہی جائے گی کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے تھے۔"

وہ خاموشی سے ہمیں دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ ٹونی کے نکیلے دانتوں نے اس کی پنڈلی کا پورا گوشت ادھیڑ ڈالا تھا۔

"ٹونی۔" میں نے بلند آواز میں کہا۔ کتا گولی کی تیزی سے وہاں آ گیا اور اس شخص کو دیکھ کر بری طرح غرانے لگا۔

میں نے اچانک اس شخص کو زور سے دھکا دے دیا۔ وہ پشت کے بل زمین پر گرا۔ ٹونی جھپٹ کر اس کے سینے پر چڑھ گیا۔

"اسے روکو... میں..." اس وقت تک ٹونی نے اس کی گردن میں اپنے نکیلے دانت گڑا دیے تھے۔

"ٹونی۔" میں چیخا۔ ٹونی نے اس کی گردن بری طرح بھنبھوڑی پھر اس کے سینے سے اتر گیا۔ اس شخص کے گلے سے عجیب طرح کی خرخراہٹ کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں جیسے گائے کو ذبح کرنے کے بعد اس کے حلق سے بلند ہوتی ہیں۔

میں جھپٹ کر اس کے پاس پہنچا اور بولا۔ "بتاؤ تم کون ہو۔ میں تمہیں ابھی اسپتال لے جاؤں گا۔ تمہاری جان بچ سکتی ہے۔"

"میں... د..." اس کی سانس اکھڑ گئی۔

"چا... نی..." اس نے کہا۔

"اقبال! پانی لاؤ۔" میں چیخ کر بولا۔ اقبال اندر کی طرف دوڑا لیکن اس سے پہلے ہی زخمی کا جسم لرزا اور وہ ساکت ہو گیا۔ میں نے اس کی نبض دیکھی، وہ بالکل ساکت تھی۔

اقبال پانی کا گلاس لے کر آیا تو صورتِ حال سمجھ گیا۔ میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور پولیس کا نمبر پنچ کرنے لگا۔ میں نے ڈیوٹی آفیسر کو وہی کچھ بتایا جو اس سے پہلے اس شخص سے کہہ چکا تھا۔

"کون ہو سکتا ہے یہ؟" اقبال نے پوچھا۔

"میں بھی پہلی دفعہ اس شخص کو دیکھ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"کہیں یہ حسان کا کوئی آدمی تو نہیں؟" اقبال نے پُرخیال انداز میں کہا۔

"ہو بھی سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں چانڈیو سے خفیہ طور پر تو نہیں ملا تھا۔ ممکن ہے اس کے کسی آدمی نے حسان کو میرے بارے میں بتایا ہو۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی اچکا ہو۔" اقبال نے کہا۔

"نہیں۔" میں نے سختی سے اس... بات کی تردید کر دی۔ "اچھے دن دہاڑے نہیں آتے۔ ہاں ڈاکو آ سکتے ہیں۔ اس شخص نے بنگلے کی چار دیواری پھلانگ کر اندر داخل ہونے کی کوشش کی۔ اب یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ اسے کتوں کا علم نہیں تھا۔" ہم دونوں برآمدے میں بیٹھے قیاس کے گھوڑے دوڑاتے رہے اور پولیس کا انتظار کرتے رہے۔

جب ہمیں وہاں بیٹھے بیٹھے آدھا گھنٹا گزر گیا تو میں نے ایک مرتبہ پھر پولیس کو کال کی۔ وہاں سے جواب ملا کہ ہماری موبائل روانہ ہو چکی ہے۔

پولیس سے پہلے وہاں ماریہ اور جمیل پہنچ گئے۔ ماریہ حسبِ معمول گاڑی سے اتری اور گیٹ کھلا دیکھ کر بلند آواز میں بولی۔ "کیا آج تم چھٹی پر ہو؟"

"اندر آؤ۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ اور جمیل ایک ساتھ اندر داخل ہوئے۔ جمیل اس کی گاڑی میں آیا تھا۔ ابھی اس نے آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ اس کی نظر مرنے والے پر پڑی۔ وہ بری طرح چونک گئی پھر تقریباً دوڑتی ہوئی میرے پاس آئی اور بولی۔ "خاور! کیا ہوا، یہ آدمی کون ہے... تم تو خیریت سے ہو نا؟" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"ارے مجھے کچھ نہیں ہوا۔" میں نے کہا۔ "اس

شخص نے بنگلے میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی لیکن میرے کتوں نے اسے ادھیڑ کر رکھ دیا۔ میں پولیس کے انتظار میں بیٹھا ہوں۔"

"اور تم نے مجھے اطلاع دینے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔" ماریہ کے لہجے میں شکوہ تھا۔

"میرا خیال تھا کہ میں کچھ دیر میں ہی اس سے نمٹ کر آفس آجاؤں گا پھر تمہیں بتادوں گا۔"

"تو پولیس اس شخص کی ڈیڈ باڈی لے کر کیوں نہیں گئی؟"

"پولیس ابھی پہنچی ہی نہیں ہے۔" اقبال نے کہا۔

"جمیل۔" میں نے کہا۔ "اس شخص کو غور سے دیکھو اور بتاؤ کہ تم نے اسے پہلے کہیں دیکھا ہے؟"

"میں نے اس شخص کو پہلے نہیں دیکھا۔" جمیل نے پُریقین لہجے میں جواب دیا۔

اسی وقت پولیس کی ایک موبائل وین بھی گیٹ کے سامنے رکی۔ اس میں سے ایک انسپکٹر اور تین سپاہی برآمد ہوئے۔

"میں نے آپ لوگوں کو اڑتیس منٹ پہلے کال کی تھی اور آپ اب آرہے ہیں؟" میں نے درشت لہجے میں کہا۔

"ہمارے پاس نفری بھی کم ہے اور گاڑیاں بھی صرف دو ہیں۔" پھر وہ بولا۔ "آپ کی تعریف؟"

"میجر خاور سی ای او آف سیکیورٹی ایجنسی۔" میں نے کہا۔

میرے نام کے ساتھ میجر کا لفظ سن کر وہ کچھ مستعد ہوگیا اور بولا۔ "سر! اس سے پہلے ایک اور ڈکیتی کی واردات ہوگئی تھی۔ ہماری دونوں گاڑیاں وہاں انگیج تھیں۔" پھر اس نے مرنے والے کے نزدیک جا کر اس کے چہرے کا جائزہ لیا اور بولا۔ "اچھا تو یہ تھا۔"

"آپ اسے پہچانتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ اشتہاری ملزم ہے جناب۔" اس نے کہا۔ "دین عمر اس کا نام ہے لیکن دینو کے نام سے مشہور تھا۔ پولیس کو یہ ایک قتل اور کئی ڈکیتیوں کی وارداتوں میں مطلوب تھا۔ اچھا ہوا اسے آپ کے کتوں نے ماردیا ورنہ عدالت تو اسے ڈھائی تین سال سے زیادہ کی سزا نہیں دیتی۔" پھر وہ چونک کر بولا۔ "آپ کا کتا کہاں ہے؟"

"کون سا کتا... مردہ یا زندہ؟"

"دونوں۔" انسپکٹر نے کہا۔

"وہ کتا اس طرف پڑا ہے۔" میں نے اشارے سے اسے بتایا۔ "اور دوسرا کتا میں نے بند کردیا ہے ورنہ وہ اس کی لاش کو بوٹیوں میں تقسیم کردیتا۔"

اس نے ضابطے کی کارروائی پوری کرنے کے لیے ہم دونوں کے بیانات لیے پھر ماریہ کی طرف متوجہ ہوا۔ "آپ بتائیے، آپ نے کیا دیکھا؟"

"میں ابھی پانچ منٹ پہلے آئی ہوں۔" ماریہ نے کہا۔

"یہ میری پی اے ہیں اور وہ میرا اسسٹنٹ جمیل ہے۔ دونوں ابھی پہنچے ہیں۔"

"کیا میں وہ کتا دیکھ سکتا ہوں جس نے مقتول کی گردن ادھیڑی ہے؟"

"کیوں، کیا اس کا بھی بیان لینا ہے؟" اقبال نے ہنس کر کہا۔

"سر! آپ بہت مذاقیہ ہیں۔" سب انسپکٹر نے کہا۔ اسے معلوم تھا کہ اقبال بھی میری طرح میجر ہے اور میری کمپنی کا ڈائریکٹر ہے۔

"آپ بیٹھیں سر۔" جمیل نے مجھے اٹھتے دیکھا تو کہا۔ "میں کتے کو لے کر آتا ہوں۔"

"اس وقت وہ بہت زیادہ بھڑکا ہوا ہے۔ وہ صرف میرے قابو میں آئے گا۔ کوئی دوسرا اس وقت اس کے نزدیک بھی نہیں جاسکتا۔"

"اسے زنجیر ڈال کر لائیے گا۔"

"ہاں، میں اسے بغیر زنجیر کے نہیں لاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "وہ پولیس والوں کا تو بہت دشمن ہے۔ نہ جانے کیوں انہیں دیکھتے ہی قابو سے باہر ہوجاتا ہے۔"

میری بات پر سب انسپکٹر کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار ظاہر ہوئے۔ وہ سنبھل کر بولا۔ "ویسے یہ کتے اتنے خطرناک تو نہیں ہوتے۔"

"آپ جانتے ہیں یہ کتوں کی کون سی نسل ہے؟"

"لو جناب! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔" سب انسپکٹر نے ہنس کر کہا۔ "یہ بہت اعلیٰ نسل کے السیشین ہیں۔" سب انسپکٹر کی بات پر مجھے ہنسی آگئی۔ ماریہ بھی مسکرانے لگی۔

"میں کتا لے کر آتا ہوں۔" میں نے کہا۔ میں نے کتے کے پٹے میں زنجیر ڈالی اور اسے لے کر واپس آگیا۔ وہ کم بخت سب انسپکٹر کو دیکھ کر بری طرح غرانے لگا۔

"ٹونی۔" میں نے اسے ڈانٹا تو اس نے غرانا بند کردیا لیکن سب انسپکٹر اس دوران میں برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر کھڑا ہوگیا تھا۔

"یہ تو بہت خطرناک کتا ہے۔" اس نے کہا پھر بولا۔

"آپ نے کسی چیز کو ہاتھ تو نہیں لگایا؟"

"لگایا ہے۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔ "میں نے اپنے کتے کو کھینچ کر یہاں سے ہٹایا تھا ورنہ آپ اس کی لاش بھی شناخت نہ کر پاتے۔"

تھوڑی دیر میں ایمبولینس اور پولیس کا دیگر عملہ بھی آگیا۔ ان لوگوں نے لاش اور کتے کی تصویریں لیں۔ اس دوران میں سب انسپکٹر کے ساتھ آنے والے سپاہیوں میں سے ایک نے انکشاف کیا کہ دینو بائیں طرف کی دیوار پھاند کر آیا تھا۔ وہاں دیوار کی دونوں طرف اس قسم کے جوتوں کے نشانات تھے جو مقتول نے پہن رکھے تھے۔

سب انسپکٹر نے بھی اس جگہ کا معائنہ کیا اور بولا۔ "یہ شخص یہاں سے دیوار پھلانگ کر اندر آیا تھا۔" وہ اچانک مجھ سے مخاطب ہوا۔ "آپ کو کسی پر شک تو نہیں ہے؟"

"آپ نے یہ سوال بہت دیر میں کیا۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "نہیں، مجھے کسی پر شک نہیں ہے۔ میری کسی سے ایسی کوئی دشمنی نہیں کہ وہ میری جان لینے پر آمادہ ہوجائے۔"

"اس شخص کا ریکارڈ تو یہ بتارہا ہے کہ یہ پیسے لے کر لوگوں کو مارتا پیٹتا ہے۔ ضرورت پڑنے پر قتل بھی کرسکتا ہے۔"

"اب یہ معلوم کرنا تو آپ کا کام ہے کہ دینو یہاں کیوں آیا تھا۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ پولیس کی کارروائی میں ایک بج گیا۔ میرے اور اقبال کے نام کے ساتھ میجر دیکھ کر انہوں نے اتنی رعایت ضرور کی کہ ہمیں پولیس اسٹیشن لے جانے کے بجائے وہیں ہمارے بیانات لے لیے۔

ان کے جانے کے بعد ماریہ نے کھانا لگنے کی اطلاع دی تو مجھے خوش گوار حیرت ہوئی۔ اس نے اس دوران میں کھانا تیار کرلیا تھا۔

میں نے کھانے کے دوران میں جمیل سے پوچھا۔ "ہاں جمیل! کیا اپ ڈیٹ ہیں؟"

"سلطان خان، حسان کا خاص آدمی ہے۔" جمیل نے کہا۔ "وہ فیڈرل بی ایریا میں رہتا ہے۔ میں اس کا ایڈریس بھی لے آیا ہوں۔ دوسری خبر یہ ہے کہ حسان منشیات اور اسلحے کی اسمگلنگ میں بھی ملوث ہے۔ اس کی دوستی انڈر ورلڈ کے لوگوں سے بھی ہے۔ ان کا نیٹ ورک پورے یورپ اور امریکا میں ہے۔"

کھانا کھانے کے بعد ماریہ چونک کر بولی۔ "وہ چانڈیو صاحب کا آدمی آپ کے لیے ایک فائل دے گیا تھا۔ میں وہ فائل لے آئی ہوں، گاڑی میں رکھی ہے۔" جمیل ماریہ سے گاڑی کی چابی لے کر باہر چلا گیا۔

"تم اس واقعے کی اطلاع چانڈیو کو بھی دے دو۔ ممکن ہے وہ بھی یہ جانتا ہو۔" اقبال نے کہا۔

"ہاں یار! وہ جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں، انہیں بتانا ضروری ہے۔" میں نے کہا اور اپنی جیب سے سیل فون نکال لیا۔

☆☆☆

"خاور صاحب! یہ تو اچھی خبر نہیں ہے۔" چانڈیو نے کہا۔ "ممکن ہے حسان کو آپ کے بارے میں علم ہوگیا ہو۔"

"آپ یقین سے یہ بات کیسے کہہ سکتے ہیں؟"

"بابا اور کون آپ پر حملہ کرواسکتا ہے۔" چانڈیو نے کہا۔ "میں دینو یا دین عمر نام کے کسی آدمی کو نہیں جانتا لیکن مجھے شبہ ہے کہ یہ کام حسان ہی کرواسکتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ کھیل شروع ہوچکا ہے۔ خاور صاحب! اب ہمارے پاس وقت بالکل نہیں ہے۔ جو کچھ کرنا ہے جلدی کرنا ہے۔"

"آپ سے زیادہ مجھے فکر ہے چانڈیو صاحب۔" میں نے کہا۔ "آپ پریشان نہ ہوں۔"

"اگر میری بیٹی کو کچھ ہوا تو میں حسان کو اپنے ہاتھوں سے گولی ماردوں گا۔" چانڈیو غضب ناک لہجے میں بولا اور سیل فون کا سلسلہ منقطع کردیا۔

"تم آج آفس آؤ گے یا نہیں؟" ماریہ نے کہا۔

"ہاں ماریہ! میں ان چکروں میں تمہیں ایک اہم بات بتانا بھول گیا۔" میں نے کہا۔ "اب اقبال بھی ہماری ٹیم میں شامل ہے۔" پھر میں چونک کر بولا۔ "تمہارا پاسپورٹ بنا ہوا ہے؟"

"ہاں۔" ماریہ نے جواب دیا۔ "تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"تمہیں شاید میرے ساتھ ملک سے باہر جانا پڑے۔" میں نے کہا۔

"ناممکن۔" ماریہ نے کہا۔ "میرے ابو اور امی اس کی اجازت کبھی نہیں دیں گے۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"تم کیا دودھ پیتے بچے ہو؟" اقبال نے کہا۔ "مس ماریہ کس حیثیت سے تمہارے ساتھ جائیں گی۔ تم اس وقت یورپ میں نہیں پاکستان میں ہو اور ہمارا معاشرہ ابھی اتنا ایڈوانس نہیں ہوا ہے کہ کوئی لڑکی کسی لڑکے کے ساتھ ملک سے باہر چلی دے۔"

"میں تمہارے ابو سے بات کرلوں گا۔" میں نے

ماریہ سے کہا۔

"کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔" ماریہ نے کہا۔ "وہ لوگ کسی بھی قیمت پر نہیں مانیں گے پھر میں تمہارے ساتھ جا کر کیا کروں گی؟ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ تم اقبال صاحب یا جمیل کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔"

"اگر اقبال بھی میرے ساتھ چلا گیا تو پھر یہاں کے معاملات سے کون نمٹے گا؟" میں نے کہا۔ "ویسے تو امریکا، یورپ اور کینیڈا میں بھی میرے دوست موجود ہیں۔"

"تو پھر تم جانے کی تیاری کرو۔" ماریہ نے کہا۔ "یہاں کے معاملات سے ہم لوگ نمٹ لیں گے۔"

تھوڑی دیر بعد ماریہ اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔ "میں پہلے آفس جاؤں گی پھر ای میل اور ڈاک چیک کرنے کے بعد گھر چلی جاؤں گی۔" اس کے ساتھ ہی جمیل بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

ماریہ کا تعلق متوسط طبقے سے تھا۔ اس کے والد کالج میں پروفیسر تھے اور کچھ عرصے پہلے ہی ریٹائر ہوئے تھے۔ ماریہ تو یونہی شوقیہ ملازمت کے لیے میرے پاس آئی تھی ورنہ اسے ملازمت کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی تھی۔

اسے دیکھتے ہی میں نے ملازمت کے لیے منتخب کرلیا تھا پھر نہ صرف وہ میری پی اے بنی بلکہ ایک ہی مہینے میں سب کچھ بن گئی۔

"یار خاور۔" اقبال نے کہا۔ "تجھے اپنی سیکیورٹی کا بندوبست کرنا چاہیے۔ اگر ریو کو حسان نے بھیجا تھا تو وہ دوبارہ بھی کوشش کرسکتا ہے۔" مجھے اس کی بات پر ہنسی آگئی۔

"یار! کیا مضحکہ خیز بات ہے۔ سیکیورٹی ایجنسی کے مالک کو خود اپنی سیکیورٹی کی ضرورت پڑ گئی۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟" اقبال سنجیدگی سے بولا۔ "سیکیورٹی کی ضرورت تو کسی بھی پڑ سکتی ہے۔"

"اچھا یار! کل میں اس سیکیورٹی ایجنسی سے بات کروں گا جس کے گارڈز میں ہائر کرکے دوسروں کو تحفظ فراہم کرتا رہا ہوں۔" میں نے چانڈیو کی بھیجی ہوئی فائل اٹھائی اور لاؤنج میں آ بیٹھا۔

پولیس والے پوسٹ مارٹم کے لیے کتے کی لاش بھی لے گئے تھے تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ اس پر گولی ریو نے چلائی تھی۔ میں نے حسب معمول شام کو ٹونی کے سامنے اس کے پسندیدہ بسکٹ اور دودھ رکھا لیکن اس نے انہیں منہ بھی نہیں لگایا۔

"ٹونی۔" میں نے بلند آواز میں کہا۔ "چلو کھاؤ۔"

میرے کہنے پر وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے میری ڈانٹ ڈپٹ پر صرف ایک بسکٹ کھایا اور دوبارہ گردن ڈال کر بیٹھ گیا۔ میں اس کی زنجیر کھول کر واپس آگیا اور چانڈیو کی بھیجی ہوئی فائل لے کر اپنے اسٹڈی روم میں آگیا۔

اقبال بھی میرے ساتھ ہی آگیا۔ اس فائل میں تقریباً گیارہ انجینئرز کی رپورٹس تھیں۔ ان میں سے نو انجینئرز امریکا کی تھیں اور دو برطانیہ کی۔ ان سب نے اپنے اپنے طور پر عینا کو تلاش کرنے کی کوشش کی تھی لیکن کامیاب نہیں ہو پائی تھیں۔

میں ایک ایک رپورٹ پڑھتا گیا اور اقبال کی طرف بڑھاتا گیا۔ ان رپورٹس کے ریکارڈ کے مطابق عینا کو تلاش کرنے والے ہر اس جگہ گئے تھے جہاں عینا کے ملنے کی امید تھی لیکن ان میں سے کسی کو بھی کامیابی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ ان رپورٹس کو میں نے بار بار پڑھا اور جتنی بار بھی پڑھا میری مایوسی میں اضافہ ہوتا گیا۔

اقبال بھی تمام رپورٹس دیکھ چکا تھا۔ وہ مجھ سے بولا۔ "خاور! تو اتنا ڈپریس کیوں ہو رہا ہے؟ ممکن ہے ان لوگوں نے کوئی اہم نکتہ نظر انداز کردیا ہو۔"

پھر میں نے بھی سوچا کہ ان انجینئرز کی رپورٹ حرف آخر تو نہیں ہے۔ میں ایک دفعہ کوشش ضرور کروں گا۔

"خاور! ہم آج ہی سلطان خان کو اٹھا لیتے ہیں۔" اقبال نے کہا۔ "لیکن ایک پرابلم ہے۔"

"کیا؟" میں نے پوچھا۔

"ہم اسے رکھیں گے کہاں؟" میں نے چند لمحے سوچا پھر مجھے اشرف کے ایک فارم ہاؤس کا خیال آیا۔

وہ فارم ہاؤس اس نے چند مہینے پہلے ہی خریدا تھا۔ فارم ہاؤس ملیر میں تھا اور پچاس ایکڑ کے رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ وہاں ابھی صرف کیلے کے کچھ درخت لگے ہوئے تھے یا پھر کچھ درخت آم کے تھے۔ اشرف کا خیال تھا کہ وہ اس فارم ہاؤس کو جدید قسم کے واٹر پارک میں تبدیل کرے گا۔ وہ کاروباری ذہنیت کا آدمی تھا اور اس قسم کے منصوبوں پر غور کرتا رہتا تھا۔ وہاں ابھی صرف اس نے دو چوکیدار رکھے ہوئے تھے۔ وہ دونوں مقامی آدمی تھے۔ اشرف نے انہیں اجازت دے دی تھی کہ جب تک میں وہاں تعمیر شروع نہ کروں وہ وہاں مویشی رکھ سکتے ہیں۔ دونوں چوکیدار مجھے بھی اچھی طرح پہچانتے تھے بلکہ مجھے فارم ہاؤس کا مالک سمجھتے تھے۔

"یار! جگہ کا کوئی پرابلم نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "میں اسے اشرف کے فارم ہاؤس میں لے جاؤں گا۔"

"پھر تو سارا مسئلہ ہی حل ہوگیا۔"

"اب یہ سوچ کہ سلطان کو اغوا کیسے کیا جائے؟"

"ہم رات گئے اسے گھر سے اٹھا لیں گے۔" اقبال نے کہا۔

"وہ ڈیفنس جیسے علاقے میں نہیں رہتا جہاں پڑوسی کو پڑوسی کی خبر نہیں ہوتی۔ وہ فیڈرل بی ایریا کے علاقے میں رہتا ہے جہاں گھروں کی چھتیں آپس میں ملی ہوئی ہیں۔ وہ گنجان آباد علاقہ ہے۔ اس کے گھر والوں نے ذرا سا شور مچا دیا تو لمحوں میں پورا محلہ اکٹھا ہوجائے گا۔" میں نے کہا۔ "ہم اسے اس وقت اغوا کریں گے جب وہ حسان کے پاس سے گھر واپس جا رہا ہوگا۔"

"اب کیسے معلوم ہوگا کہ وہ گھر کس وقت جاتا ہے؟" اقبال نے کہا۔

"یار، تو جمیل کو کیوں بھول گیا؟ اس نے یہ بھی معلوم کرلیا ہوگا کہ سلطان خان کب واپس جاتا ہے اور کس راستے سے جاتا ہے۔" میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور جمیل کا نمبر ملا کر کہا۔ "جمیل! تم فوراً میرے بنگلے پر پہنچو۔"

"اوکے سر۔" اس نے جواب دیا۔

"یار! میں جب تک کافی ہی بنا لوں۔" اقبال نے کہا۔

"تھوڑی دیر صبر کرلے۔" میں نے کہا۔ "جمیل کافی بنانے میں ماہر ہے۔ وہ آئے گا تو کافی ضرور بنائے گا۔"

ہم لوگ ایک مرتبہ پھر وہ رپورٹس دیکھنے لگے جو چانڈیو نے مجھے بھیجی تھیں۔ تقریباً پچیس منٹ بعد ڈور بیسل بجی۔ گھنٹی کی آواز سن کر ٹونی نے زوردار انداز میں بھونکنا شروع کردیا۔

اقبال نے اپنا سیل فون نکالا اور... نمبر ملا کر بولا۔ "ہاں جمیل! کہاں ہو تم؟"

"سر! میں خاور صاحب کے گیٹ پر کھڑا ہوں۔" جمیل نے جواب دیا۔

"کنفرم کرنا ضروری تھا۔" اقبال نے کہا۔ میں برآمدے میں نکلا تو ٹونی میرے قدموں میں لوٹنے لگا پھر وہ میرے ساتھ ساتھ دروازے تک آیا۔

میں نے گیٹ کا ذیلی دروازہ کھولا اور جمیل سے کہا۔ "اپنی بائک بھی اندر لے آؤ۔" جمیل کی بائک دیکھ کر ٹونی پرسکون ہوگیا۔

میں نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی، اس وقت ساڑھے سات بجے تھے۔ میں اسے اپنے ساتھ اسٹڈی روم میں لے گیا پھر اس سے پوچھا۔ "جمیل! تمہیں سلطان خان کے معمولات کا علم تو ہوگا؟ وہ کب آتا ہے، کب جاتا ہے، کس راستے سے جاتا ہے؟"

"جی سر! میں نے سب کچھ معلوم کرلیا تھا۔ وہ صبح دس بجے حسان کے دفتر پہنچتا ہے۔ اس کا دفتر شاہراہ فیصل پر ہے۔ وہاں وہ چھ بجے تک رہتا ہے پھر حسان کے بنگلے پر آجاتا ہے۔ وہاں سے وہ ساڑھے نو، دس بجے تک گاڑی میں اپنے گھر کے لیے نکلتا ہے۔"

"ویری گڈ۔" اقبال نے توصیفی انداز میں کہا۔ "اب تم اچھی سی کافی پیو۔"

"میں بناتا ہوں سر۔" جمیل نے مسکرا کر کہا اور فوراً ہی کچن کی طرف چلا گیا۔

"یار ویسے تجھے ٹیم بہترین ملی ہے۔" اقبال نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اب بہترین کہاں رہی۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "اس ٹیم میں اب تو بھی تو شامل ہوگیا ہے۔"

میری بات پر اقبال ایک مرتبہ پھر ہنسنے لگا پھر سنجیدہ ہوکر بولا۔ "میرا مشورہ تو یہ ہے کہ تو جمیل کو اپنے ساتھ لے جا۔ یہ وہاں بھی تیرے بہت کام آئے گا۔"

"تیرا مشورہ غلط نہیں ہے۔ جمیل واقعی میرے بہت کام آئے گا۔"

جمیل کافی بنا کر لایا تو میں نے پوچھا۔ "جمیل! تمہارا پاسپورٹ بنا ہوا ہے؟"

"جی سر! پاسپورٹ تو میں نے ابھی دو مہینے پہلے ہی بنوایا ہے۔ میں نے سوچا کہ میں سیکیورٹی ایجنسی میں کام کرتا ہوں تو میرے پاس ڈرائیونگ لائسنس کے ساتھ ساتھ پاسپورٹ بھی ہونا چاہیے۔"

"تم میرے ساتھ امریکا چلنے کی تیاری کرلو۔" میں نے کہا۔ "ہاں، کل اپنا پاسپورٹ مجھے دے دینا تاکہ میں اس پر ویزا لگوا لوں۔ چانڈیو صاحب دو دن کے اندر اندر ویزا لگوا دیں گے۔"

"اوکے سر۔" اس نے حسب معمول اقرار میں گردن ہلائی۔

"آج تمہیں شاید یہاں زیادہ دیر تک رکنا پڑے۔" میں نے کہا۔

"میں آپ کے ڈسپوزل پر ہوں سر۔" جمیل مسکرا کر بولا۔

ایک مسئلہ یہ تھا کہ میرے پاس فارم ہاؤس کے کسی چوکیدار سے رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ میں انہیں پہلے سے اپنی آمد کی اطلاع دے سکتا۔ میں نے سوچا کہ وہاں کے کسی چوکیدار کا سیل نمبر اشرف کے پاس ضرور ہوگا۔ میں نے سیل فون پر اشرف کا نمبر ملایا لیکن وہ بند تھا۔ میں نے اس کے دوسرے نمبر پر ٹرائی کیا لیکن وہاں سے بھی کوئی جواب نہیں ملا۔

"اشرف کا سیل آف ہے لیکن کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ دونوں چوکیدار مجھے پہچانتے ہیں۔ تو جانتا ہے میں سندھی بھی بہت روانی سے بولتا ہوں۔"

"جمیل! ایسا کرو کسی ریستوران سے کچھ کھانے کے لیے لے آؤ۔" اقبال نے کہا۔

"او کے سر!" اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا اور دروازہ کھول کر باہر نکلنے ہی والا تھا کہ ٹونی زور زور سے بھونکنے لگا۔

میں اور اقبال جھپٹ کر کھڑے ہو گئے۔ جمیل نے فوراً ریوالور نکال لیا اور دروازے سے کان لگا کر باہر کی سن گن لینے لگا۔

"تیرے پاس کوئی اور پسٹل یا ریوالور ہے؟" اقبال نے پوچھا۔

"ہاں، میرے بیڈروم میں ہے۔" میں نے کہا۔

جمیل نے اچانک کمرے کی لائٹ آف کر دی اور دروازہ کھول کر کرالنگ کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ ٹونی اب پُرسکون ہو گیا تھا۔ مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں کسی نے اسے بھی ہلاک نہ کر دیا ہو۔ فائر تو بے آواز بھی ہو سکتا تھا۔

میں بھی کرالنگ کرتا ہوا برآمدے میں نکل آیا۔ اچانک کچھ فاصلے سے مجھے ٹونی کے بھونکنے کی آواز آئی۔

میں نے آہستہ سے سیٹی بجائی۔ ٹونی سیٹی کی آواز سن کر تیر کی طرح میری طرف آیا تو میں سمجھ گیا کہ کوئی خطرہ نہیں ہے۔ جمیل بھی اٹھ کھڑا ہوا اور محتاط انداز میں باہر کی طرف بڑھا۔

اچانک لان سے اقبال کی آواز آئی۔ "اب یہاں کوئی نہیں ہے۔"

"تم یہاں کیسے؟"

"میں کچن کے دروازے سے باہر نکلا تھا لیکن کوئی تھا بھی تو اب وہ بھاگ چکا ہے۔"

میں اپنے بیڈروم سے نہ صرف طاقتور ٹارچ لے آیا تھا بلکہ لان کی لائٹس بھی کھول دیں۔ اقبال اور جمیل ٹارچ لے کر باؤنڈری وال کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور زمین کا جائزہ لے رہے تھے۔

اچانک اقبال بولا۔ "خاور! اس جگہ سے کسی نے دیوار پھلانگ کر اندر گھسنے کی کوشش کی ہے۔" اس نے کچھ نشانات کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ آنے والے کے جوتوں کے نشانات ہیں لیکن وہ اس جگہ سے آگے نہیں بڑھا۔ ٹونی کی آواز سن کر دوبارہ دیوار پر چڑھ گیا ہوگا۔"

دیوار کے دوسری طرف بھی اسی قسم کے نشانات تھے پھر وہ نشانات پختہ سڑک کی طرف جا کر غائب ہو گئے تھے۔ ٹونی میرے ساتھ تھا اور چوکنا ہو کر ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ جمیل اور اقبال مین گیٹ کھول کر باہر نکل آئے۔

"لگتا ہے کہ آنے والا کسی گاڑی میں بیٹھ کر فرار ہو گیا لیکن گاڑی اس نے سڑک ہی پر رکھی تھی۔" میں نے کہا۔ "ورنہ اس کے ٹائروں کے نشانات بھی ہوتے۔"

سڑک کی دوسری طرف 50 پلاٹ تھے جہاں خودرو جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ وہاں اکا دکا بنگلے زیرِ تعمیر بھی تھے لیکن مالکان نے ان کا اسٹرکچر بنا کر چھوڑ دیا تھا۔

ہم سڑک تک آئے اور ارد گرد کا جائزہ لیا۔

اچانک ٹونی تیزی سے ایک طرف بھاگا۔ میں اسے روکتا ہی رہ گیا۔ وہ سامنے کے خالی پلاٹوں کی خودرو گھنی جھاڑیوں میں گھس گیا تھا۔ پھر اس کی خوفناک غراہٹ کی آوازیں آئیں اور ایک انسانی چیخ سنائی دی۔

"ٹونی!" میں نے چیخ کر کہا۔ "اسٹاپ..." میں بھاگتا ہوا جھاڑیوں کی طرف گیا۔ میرے پیچھے پیچھے جمیل اور اقبال بھی تھے۔

میں نے ٹارچ کی طاقتور روشنی میں دیکھا۔ جھاڑیوں میں ایک شخص سہما ہوا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ زخمی تھا۔ ٹونی اس کے سر پر کھڑا ہوا غرا رہا تھا۔ مجھے اس کے نزدیک ہی ایک ریوالور بھی نظر آیا جو غالباً گھبراہٹ میں اس کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔

اقبال نے جھپٹ کر وہ ریوالور اٹھا لیا اور اس کے ساتھ ہی گردن دبوچ کر اسے بھی اٹھا لیا اور ریوالور کی نال اس کی گدی پر رکھ کے جمیل سے بولا۔ "اس کی تلاشی لو۔"

جمیل نے انتہائی مہارت سے اس کی تلاشی لی۔ اس کی جیب سے ایک پرس اور سیل فون برآمد ہوا۔

"اب اسے اندر لے چلو۔" میں نے کہا۔

اس کے دائیں ہاتھ سے خون بہہ رہا تھا۔ یقیناً وہ ٹونی کا کارنامہ تھا۔

اقبال اسے گھسیٹتا ہوا اندر لے آیا۔ وہ تیس بتیس سال کا نوجوان تھا۔ اس کا قد درمیانہ اور جسم ورزشی تھا۔ وہ جینز اور شرٹ میں ملبوس تھا اور چہرے سے پڑھا لکھا لگ رہا تھا۔

"کون ہو تم اور وہاں کیا کر رہے تھے؟" اقبال نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"م... میں... تو... یہاں سے گزر رہا تھا۔ رفع حاجت کے لیے ان جھاڑیوں میں بیٹھ گیا تھا کہ آپ کے کتے نے مجھے زخمی کر دیا۔" اس نے سنبھل کر کہا۔

"بکواس کرو گے تو دوبارہ کتے کے سامنے پھینک دوں گا۔" میں نے درشت لہجے میں کہا۔ "تم اس وقت کہاں جا رہے تھے؟"

"کیا اس سڑک سے گزرنا منع ہے؟" وہ سنبھل کر بولا۔

میں نے آگے بڑھ کر ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر رسید کر دیا۔ "ادھر ادھر کی ہانکنے کی کوشش مت کرو۔" میں نے کہا۔ "تم ریوالور ہاتھ میں لے کر رفع حاجت کرتے ہو؟"

"وہ تو میں نے پینٹ کی بیلٹ میں اڑس رکھا تھا۔ کتے کی وجہ سے میں گرا تو ریوالور بھی بیلٹ سے نکل گیا۔" وہ شخص خاصے مضبوط اعصاب کا مالک تھا اور جھوٹ بھی ایسا بول رہا تھا جسے جھٹلایا نہ جا سکے۔

"تمہارے پاس لائسنس ہے اس ریوالور کا؟" اقبال نے پوچھا۔

"میرے پاس سب کچھ ہے لیکن آپ کو کیوں دکھاؤں؟" وہ اب خود پر پوری طرح قابو پا چکا تھا۔

"میں کون ہوں؟" اقبال نے درشت لہجے میں کہا اور اپنا کارڈ نکال کر اسے دکھایا پھر جیب میں رکھ لیا۔ یہ اقبال کا وہ کارڈ تھا جو اسے سروس کے دوران میں جاری کیا گیا تھا۔

کارڈ دیکھ کر اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"اب بتاؤ، تمہارے پاس اس ریوالور کا لائسنس ہے یا پھر میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں؟"

"پہلے اس سے یہ معلوم کرو کہ اس نے بنگلے کی دیوار پھلانگنے کی کوشش کیوں کی؟" میں نے کہا۔

"او کے سر!" اقبال نے کہا پھر اس سے بولا۔ "دیکھو سب کچھ سچ سچ بتا دو گے تو تمہاری جان بچ جائے گی ورنہ میں ابھی تمہیں کتے کے سامنے ڈال دوں گا۔ وہ لمحوں میں تمہیں چیر پھاڑ کر رکھ دے گا۔"

"مجھے... مجید نے بھیجا تھا۔" اس کی ساری خود اعتمادی رخصت ہو چکی تھی۔

"کون مجید؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"وہ ایک این جی او چلاتا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ نے یہاں کسی لڑکی کو قید کر رکھا ہے۔ تم صرف یہ معلوم کر لو کہ وہاں وہ لڑکی ہے یا نہیں، بس میرا اتنا ہی کام تھا۔"

"اور تم معلوم کرنے آ گئے؟" اقبال نے قہر آلود لہجے میں کہا۔

"اس نے مجھے اس کام کے دس ہزار روپے دیے تھے۔" اس نے کہا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" اقبال نے پوچھا۔

"میرا نام اعجاز ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"تم اعجاز ہو یا مجاز۔" میں نے دانت پیس کر کہا۔ "لیکن میں صرف سچ سننا چاہتا ہوں۔"

"جو سچ تھا، میں نے آپ کو بتا دیا۔" اس نے کہا۔

"میں تمہیں یہاں دو دن بھی بند کر دوں گا تو تم مر جاؤ گے۔" میں نے کہا۔ "میرا کتا اتنا زہریلا ہے کہ اس کا زخمی دو دن میں مر جاتا ہے۔ اگر فوری طور پر تمہیں بھی مخصوص انجکشن نہ لگا تو تم بھی مر جاؤ گے۔"

اعجاز نے سہم کر مجھے دیکھا پھر تھوک نگل کر بولا۔ "مجھے جانے دیں... میں..."

اچانک اقبال کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اعجاز نے چونک کر اقبال کو دیکھا۔

اقبال نے سیل فون جیب سے نکالا تو خود بھی چونک گیا۔ وہ اس کا سیل فون نہیں تھا۔ وہ سیل فون اس نوجوان کی جیب سے برآمد ہوا تھا جو خود کو اعجاز کہہ رہا تھا۔

اقبال نے اسکرین پر نظر ڈالی پھر میرے اشارے پر کال ریسیو کرنے ہی والا تھا کہ سیل فون خاموش ہو گیا۔

"یہ جیتی کون ہے؟" اقبال نے پوچھا۔

"میرا دوست ہے۔" اعجاز نے جواب دیا لیکن اس کے لہجے میں اضطراب تھا۔

اعجاز نے اس کی جیب سے نکلا ہوا پرس کھولا۔ اس میں تقریباً ساڑھے تین سو روپے اور کچھ وزیٹنگ کارڈز تھے۔ ایک کارڈ کی پشت پر میرے بنگلے کا ایڈریس لکھا ہوا تھا، میرا نام نہیں تھا۔ اقبال نے پھر اس کے سیل فون کا جائزہ لیا۔ اسے اچھی طرح دیکھنے کے بعد اقبال نے کہا۔ "سر! میرے خیال میں ہم اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ اسے کتے کے حوالے کر کے پولیس کو اطلاع دے دیں کہ ہمارے کتے نے ایک اور آدمی کو مار دیا۔" پھر اس نے اعجاز کو باہر کی طرف

گھسیٹا اور اس کے منہ پر تھپڑ بھی رسید کر دیا۔ "ہمارے پاس تمہارا جھوٹ سننے کے لیے وقت نہیں ہے اس لیے اب کتا ہی تم سے نمٹے گا۔"

وہ اسے کھینچتا ہوا باہر لایا۔ میں نے ٹونی کو آواز دی۔ وہ خوف ناک انداز میں غراتا ہوا آگے بڑھا۔

اعجاز جلدی سے بولا۔ "نہیں... مجھے اس کتے سے بچاؤ... میں... سب کچھ... سچ سچ بتا دوں گا۔"

"بتاؤ تم یہاں کیوں آئے تھے؟"

"مجھے سلطان خان نے یہاں بھیجا تھا۔" وہ تھوک نگل کر بولا۔

"کون سلطان خان؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے زیادہ نہیں معلوم... وہ کسی زمیندار کا آدمی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"اس نے تمہیں یہاں کیوں بھیجا تھا؟"

"اس کا خیال ہے کہ آپ نے کسی لڑکی کو یہاں چھپا رکھا ہے۔" اعجاز نے جواب دیا۔

"تم پھر جھوٹ بول رہے ہو؟" میں نے کہا۔

"میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ اس نے کہا تھا کہ تم کسی نہ کسی طرح یہ معلوم کر لو کہ یہاں کوئی لڑکی ہے یا نہیں۔ اس کام کے اس نے مجھے دس ہزار روپے دیے تھے۔"

"کیا تم اس لڑکی کو پہچانتے ہو؟" میں نے کہا۔

"نہیں، سلطان خان نے کہا تھا کہ خاور وہاں اکیلا رہتا ہے۔ اس کے کمرے میں گیس کا اسپرے کر دینا۔ وہ دس منٹ میں بے ہوش ہو جائے گا، پھر تم اطمینان سے وہاں کے ہر کمرے کی تلاشی لے سکتے ہو۔"

"اسپرے کہاں ہے؟" اقبال نے چونک کر پوچھا۔

"وہ میرے ہاتھ میں تھا۔ کتے نے حملہ کیا تو وہ اسپرے بھی میرے ہاتھ سے گر گیا۔ وہیں جھاڑیوں میں کہیں پڑا ہوگا۔"

"تم یہاں تک پیدل آئے تھے؟" اقبال نے پوچھا۔

"میں بائک پر آیا تھا۔" اعجاز نے جواب دیا۔ "میں نے بائک آپ کے بنگلے کے نزدیک ہی چھپائی تھی۔ آپ لوگ باہر آئے تو مجھے بائک تک پہنچنے کا موقع نہیں ملا اور میں جھاڑیوں میں چھپ گیا۔"

"سچ اور جھوٹ کا تو ابھی علم ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

"اب چاہے آپ مجھے گولی مار دیں یا کتے کے حوالے کر دیں، میرے پاس بتانے کو کچھ ہے ہی نہیں۔" اعجاز نے کہا۔

"جمیل! اسے فرسٹ ایڈ دو اور بند کر دو۔ اس کا فیصلہ ہم بعد میں کریں گے۔"

"لیکن سر! وہ کتے کے کاٹنے کا انجکشن؟" اس نے خوشامد بھرے لہجے میں کہا۔

"کتے کو پہلے ہی انجکشن لگا ہوا ہے۔" میں نے کہا۔ "ویسے بھی تمہیں چوبیس گھنٹے کے اندر اندر انجکشن دینا ہے اس لیے ابھی تم صرف فرسٹ ایڈ پر گزارہ کرو۔" میں نے کہا۔

جمیل اسے لاؤنج میں لے گیا اور میرے باتھ روم سے فرسٹ ایڈ باکس نکال لایا اور انتہائی مہارت سے اس کا زخم صاف کر کے پٹی کر دی۔ پھر میرے کہنے پر اسے ایک بیڈ روم میں بند کر دیا۔ اس بیڈ روم میں باتھ روم بھی تھا اور ایک کھڑکی بھی جس میں گرل لگی ہوئی تھی۔

"یہاں سے بھاگنے کی کوشش بھی مت کرنا ورنہ کتے تمہیں چھوڑیں گے نہیں۔ تم نے تو صرف ایک کتا دیکھا ہے، بنگلے میں اس قسم کے مزید چار خطرناک کتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے بیڈ روم کا دروازہ بند کر کے اس میں تالا لگا دیا۔

اس وقت دس بج رہے تھے۔ میں نے اقبال سے کہا۔ "کھانا ہم بعد میں کھائیں گے، پہلے سلطان خان سے نمٹ لیں۔"

"ایسا کرو، کھانے پینے کا کچھ سامان ساتھ ہی لے لو۔ وہاں سے اگر فارم ہاؤس جانا پڑا تو ہمیں کھانا کہاں ملے گا؟"

جمیل کو اب تک کسی پلان کا علم نہیں تھا لیکن اس نے کچھ پوچھا بھی نہیں۔ میں نے خود ہی اسے بتایا کہ ہم لوگ سلطان خان کو اغوا کرنا چاہتے ہیں۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "سر! اسے فارم ہاؤس لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ سرجانی ٹاؤن میں میرے ایک کزن کا گھر موجود ہے۔ اس کی چابیاں بھی میرے پاس ہیں۔ وہاں ابھی اتنی آبادی بھی نہیں ہے۔"

"نہیں جمیل!" میں نے کہا۔ "وہاں ایسی ویرانی بھی نہیں ہے کہ کسی آدمی سے پوچھ گچھ کی جائے اور اس کی چیخ پکار کسی کو سنائی نہ دے۔ اس مقصد کے لیے فارم ہاؤس بہترین ہے۔ وہ زیادہ دور بھی نہیں ہے۔"

اس کے بعد جمیل خاموش ہو گیا۔ راستے میں ایک جگہ رک کر اقبال نے کھانے پینے کا سامان، منرل واٹر، چائے کی پتی، ٹیٹرا ملک پیک اور کافی وغیرہ خریدی اور ہم دوبارہ گاڑی میں آ بیٹھے۔

جمیل ہمیں راستہ بتا رہا تھا کہ سلطان خان کس راستے سے گزرتا ہے۔ حسان کے جس آفس میں سلطان خان اس وقت ہوتا تھا وہ شاہراہ فیصل پر تھا۔

اس دوران میں ہم شاہراہ فیصل کے اس علاقے میں پہنچ چکے تھے جہاں سلطان موجود تھا۔

جمیل نے وہاں کھڑی ہوئی گاڑیوں کا جائزہ لیا اور بولا۔ "سلطان خان ابھی دفتر میں موجود ہے۔"

میں نے گاڑی کا بونٹ اٹھا دیا اور دوبارہ گاڑی میں آ بیٹھا۔ دیکھنے والے یہی سمجھتے کہ گاڑی خراب ہو گئی ہے۔ گاڑی والا یا تو خود خرابی دور کرنے کی کوشش کر رہا ہے یا پھر کسی مکینک کو لینے گیا ہے۔

آدھ گھنٹے کے طویل انتظار کے بعد جمیل نے کہا۔ "سلطان خان اپنی گاڑی کی طرف جا رہا ہے۔"

میں نے اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں اس کا جائزہ لیا۔ وہ خاصا دراز قد آدمی تھا اور خاصے معقول لباس میں تھا اور اس کے ساتھ دو آدمی اور بھی تھے۔ انہیں دیکھ کر میں چونکا۔ میں نے جمیل سے کہا۔ "تم تو کہہ رہے تھے کہ سلطان خان اکیلا ہی جاتا ہے؟"

"سر! میں نے تو اسے اکیلا ہی جاتے دیکھا ہے۔" جمیل نے کہا۔

میں اپنے منصوبے پر غور کرنے لگا۔ اب ہمیں ایک سے نہیں بلکہ تین آدمیوں سے نمٹنا تھا لیکن میں ہر قیمت پر یہ کام آج ہی کرنا چاہتا تھا۔

وہ دونوں آدمی سلطان خان کے ساتھ ساتھ باتیں کرتے ہوئے اس کی گاڑی تک آئے پھر اس سے رخصت ہو کر دوسری طرف مڑ گئے۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔

اسٹیئرنگ پر اقبال تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ بہترین ڈرائیور ہے اور خاص طور پر تعاقب کرنے میں تو اس کی مہارت لاجواب تھی۔ سلطان خان وہاں سے روانہ ہوا تو ہم بھی اس کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

نصیر آباد کے نزدیک پہنچتے ہی میں نے اقبال کو ایکشن لینے کا اشارہ کیا۔ اقبال نے گاڑی کی رفتار بڑھائی اور اسے سلطان خان کی گاڑی کے برابر میں لے آیا۔ پھر وہ اسے غیر محسوس انداز میں بائیں طرف دبانے لگا۔ سلطان خان نے گاڑی کی رفتار ایک دم کم کر دی۔ اقبال آگے نکل گیا پھر مجھ سے بولا۔ "گاڑی کو ہلکا سا ٹچ کر دوں؟"

"ہاں لیکن گاڑی چلنے کے قابل رہنا چاہیے۔" میں نے کہا۔

"میں صرف ٹچ کروں گا۔ نقصان ہماری ہی گاڑی کو زیادہ پہنچے گا۔" یہ کہہ کر اس نے بھی رفتار کم کر دی۔

میں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ سڑک پر اچھی خاصی گاڑیاں تھیں۔

سلطان خان ایک مرتبہ پھر ہماری گاڑی کے برابر میں آ گیا۔ اسی وقت اقبال نے ہلکا سا اسٹیئرنگ گھمایا اور سلطان خان کی گاڑی سے رگڑ کھا کر گزر گیا۔ پھر اس نے گاڑی اس انداز میں روکی کہ سلطان خان کا راستہ مسدود ہو گیا۔

اقبال بکتا جھکتا گاڑی سے اترا، سلطان خان بھی بھنا کر گاڑی سے باہر آ گیا۔

"آپ رانگ سائڈ سے مجھے اوورٹیک کرنے کی کوشش کیوں کر رہے تھے؟" اقبال نے کہا۔

"غلطی آپ کی ہے۔" سلطان خان ترش لہجے میں بولا۔

"غلطی تمہاری ہی ہے۔" میں نے سخت لہجے میں اقبال سے کہا پھر معذرت خواہانہ انداز میں سلطان خان سے مخاطب ہوا۔ "سوری سر! غلطی میرے ہی آدمی سے ہوئی ہے۔ آپ دیکھیے آپ کا کتنا نقصان ہوا ہے، میں اس کی تلافی کرنے کو تیار ہوں۔"

نزدیک سے گزرتی ہوئی دو چار گاڑیاں رکیں جب لوگوں نے ہمیں دوستانہ انداز میں گفتگو کرتے دیکھا تو وہاں سے چلے گئے۔

"سر! نقصان تو میرا زیادہ نہیں ہوا ہے۔ صرف کلر ہی تھوڑا سا اترا ہے لیکن آپ کی گاڑی میں تو اچھا خاصا ڈینٹ پڑ گیا ہے۔"

"غلطی میرے آدمی کی ہے تو برداشت بھی مجھے ہی کرنا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "آپ اپنا نقصان بتائیے؟"

"میرا کوئی ایسا خاص نقصان نہیں ہوا ہے۔" سلطان خان مسکرایا۔ "ہاں اگر کوئی ڈھٹائی دکھائے تو غصہ آتا ہے۔ آپ جیسے شریف آدمی سے میں کیا کہہ سکتا ہوں؟" سلطان خان نے کہا۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ!" میں نے کہا۔

سلطان خان دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

میں نے اس سے کہا۔ "ایک منٹ سر!"

اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔ میں نے اچانک اس کی کنپٹی پر گھونسا رسید کر دیا۔ وہ اسٹیئرنگ پر اوندھا ہو گیا۔

میں نے جمیل کو اشارہ کیا۔ اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور سلطان کو ایک طرف دھکیل کر اسٹیئرنگ پر بیٹھ گیا۔

"یہاں سے سیدھے گھر چلو۔" میں نے کہا۔ "فی الحال میں نے فارم ہاؤس جانے کا ارادہ بدل دیا ہے۔"

"اوکے سر!" جمیل نے کہا پھر ہم گھر پہنچ گئے۔

"اسے اٹھا کر اقبال کے بیڈ روم میں لے چلو۔" میں نے جمیل سے کہا۔

جمیل نے اسے اقبال کے بیڈ روم میں ڈال دیا۔ میں نے جیب سے سیل فون نکال کر اس سیکیورٹی ایجنسی کو ٹیلی فون کیا جس سے میں سیکیورٹی گارڈز لیا کرتا تھا۔

"مجھے فوری طور پر چار سیکیورٹی گارڈز چاہئیں۔" میں نے کہا۔

"ایجنسی کے بہترین گارڈز آدھ گھنٹے کے اندر اندر وہاں پہنچ جائیں گے۔"

"یہ تو نے بہت اچھا کیا۔" اقبال نے کہا۔

"جمیل!" میں نے کہا۔ "سلطان کی گاڑی گیراج میں بند کر دو۔" میں نے کہا اور اس بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا جس میں سلطان خان کو رکھا گیا تھا۔

وہ ہوش میں آ رہا تھا۔ اقبال نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تو وہ پوری طرح ہوش میں آ گیا اور کھوئی کھوئی نظروں سے کمرے کا جائزہ لینے لگا پھر مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"آپ... آپ تو..." اس نے سرعت سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا لیکن جمیل پہلے ہی اس کی تلاشی لے چکا تھا۔

"مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟" اس نے ابتدائی جھٹکے سے سنبھل کر پوچھا۔

"تم سے سچ اگلوانے کے لیے۔" میں نے کہا۔

"کیسا سچ؟"

"تم حسان چانڈیو کے ملازم ہو؟"

"ہاں تو پھر؟"

"یہ بتاؤ، حسان کی سوتیلی بہن عینا کہاں ہے؟"

وہ بری طرح چونک اٹھا۔ "تم عینا کو کیسے جانتے ہو؟"

"میرے سوال کا جواب دو۔" میں نے درشت لہجے میں کہا۔

"جس آدمی کو اس کا علم ہے، میں اس کا نام بتا سکتا ہوں۔ اگر اس سے معلوم کر سکتے ہو تو معلوم کر لو۔"

"چلو، اس آدمی کا نام ہی بتا دو۔" اقبال نے کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ تم حسان کا نام لو گے۔"

"حسان صاحب تو خود اس کی تلاش میں ہیں۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔ "حسان صاحب کو اس کی تلاش کیوں ہے؟"

"وہ آخر ان کی بہن ہے۔" سلطان نے کہا۔ "سوتیلی ہی سہی۔"

"حسان کو بہن سے محبت ہے یا کروڑوں کی اس جائداد سے جو عینا کے نام ہے؟"

"یہ بھی ہو سکتا ہے لیکن انہیں عینا کی تلاش ہے۔"

"تم کیا سمجھتے ہو، میں حسان کو یہاں نہیں لا سکتا؟" میں نے کہا۔ "میرے آدمی اسے بھی یہاں لا سکتے ہیں۔"

"تم اتنے ہی بڑے سورما ہو تو اس کو یہاں لے آؤ جسے عینا کے بارے میں علم ہے۔"

"اور وہ آدمی کون ہے؟"

"وہ آرمی کا ایک ریٹائرڈ میجر خاور ہے۔" اس نے گویا میرے سر پر ہتھوڑا رسید کر دیا۔

"تم میجر خاور کو جانتے ہو؟" اقبال نے پوچھا۔ میری طرح اس کے چہرے پر بھی حیرت کے تاثرات تھے۔

"میں اسے اس حد تک جانتا ہوں کہ وہ کوئی سیکیورٹی ایجنسی چلا رہا ہے اور انتہائی سفاک آدمی ہے۔"

"تم نے اسے دیکھا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے اسے آج تک نہیں دیکھا ہے۔"

"تم تو بہت بڑے وڈیرے کے ملازم ہو تو تم نے میجر خاور سے کیوں نہیں پوچھا؟" میں نے کہا۔ "تم تو اس سے گن پوائنٹ پر پوچھ سکتے تھے؟"

"وہ اتنا آسان شکار نہیں ہے۔" سلطان خان نے کہا۔ "ہم اپنی کوشش کر چکے ہیں اور اس میں ناکام رہے ہیں۔"

میں اور اقبال، جمیل کو وہاں چھوڑ کر باہر نکل آئے۔ اقبال نے مجھ سے کہا۔ "کیا خیال ہے خاور! سلطان سچ بول رہا ہے؟"

"لگتا تو یہی ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ ہم سے بلف کر رہا ہو۔" اقبال نے کہا۔ "وہ جان بوجھ کر تمہیں نہ پہچانا ہو؟"

"اگر پہچان جاتا تو بھی اتنی تفصیل سے سب کچھ نہ بتاتا۔ اس کے لہجے اور انداز سے لگ رہا ہے کہ وہ سچ بول رہا ہے۔"

"ہاں، میرا بھی یہی اندازہ ہے۔" اقبال نے کہا۔

"تو پھر اسے اور اعجاز دونوں کو جانے دو۔" میں نے کہا۔ "لگتا ہے، مجھے عینا کی تلاش میں جانا ہی پڑے گا۔"

اقبال نے سلطان کی آنکھوں پر پٹی باندھی، اس کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھے اور جمیل سے کہا۔ "اسے کسی ایسی جگہ چھوڑ آؤ جو بالکل مخالف سمت میں ہو۔"

جمیل اسے لے کر چلا گیا اور آدھے گھنٹے بعد واپس آ گیا۔ اس وقت تک سیکیورٹی ایجنسی کے چاروں گارڈز پہنچ چکے تھے اور وہ عمارت سے عمارت کے مختلف حصوں کا جائزہ لے رہے تھے۔

میں نے جمیل سے کہا۔ "یار! اب تو وہ کھانے کا سامان گاڑی سے نکال لاؤ جو اقبال نے خریدا تھا۔"

ہم نے کھانا کھایا پھر جمیل روانہ ہو گیا۔ میں اور اقبال دیر تک اسٹڈی روم میں بیٹھے اس کیس پر غور کرتے رہے۔

☆☆☆

میں نے صبح اٹھ کر پہلا کام یہ کیا کہ چانڈیو صاحب سے رابطہ کیا اور ان سے کہا۔ "سر! میں فوری طور پر امریکا روانہ ہو رہا ہوں۔ آپ کے پاس عینا اور اس کی ماں کی کوئی تصویر ہو تو وہ مجھے بھجوا دیں۔ ہاں، اگر مناسب سمجھیں تو اپنی وصیت کی ایک کاپی بھی مجھے بھجوا دیں۔"

"خاور صاحب! تصویریں تو میں بھیج دوں گا لیکن وہ عینا کے بچپن کی ہیں۔ وصیت نامے کی فوٹو کاپی نہیں بھجوا سکوں گا۔ اس کے لیے آپ کو میرے گھر آنا پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے پھر میں ابھی آ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

اسی وقت ماریہ آ گئی۔ اس نے گیٹ پر سیکیورٹی گارڈز دیکھے تو حیران رہ گئی۔ میں اس وقت برآمدے ہی میں کھڑا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ "خاور! خیریت تو ہے یہ سیکیورٹی گارڈز اور..."

"ہاں خیریت ہے۔" میں نے کہا۔ "ابھی میں جلدی میں ہوں۔ تم ذرا اپنی گاڑی مجھے دے دو۔ میں آفس پہنچ کر تمہیں سب کچھ بتا دوں گا یا پھر اقبال بتا دے گا۔ تم اس کے ساتھ ٹیکسی میں آفس چلی جانا۔" پھر میں اقبال سے مخاطب ہوا۔ "گاڑی کو آج ہی ورک شاپ میں بھجوا دو۔" میری گاڑی پر اچھا خاصا ڈینٹ آ چکا تھا۔

چانڈیو، ڈیفنس میں ہی رہتا تھا اس لیے مجھے وہاں پہنچنے میں دس منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ اس کے گارڈز نے مجھے دیکھتے ہی گیٹ کھول دیا۔ میں نے گاڑی پورچ میں روکی اور گاڑی سے اترا تو برآمدے میں چانڈیو خود موجود تھا۔

اس نے میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "خاور صاحب! میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ آپ کو جو کچھ پوچھنا ہے پوچھ لیں۔"

"میں صرف وہ وصیت دیکھنا چاہتا ہوں جو آپ نے عینا کے لیے تحریر کی ہے۔"

وہ مجھے اپنے اسٹڈی روم میں لے گیا اور اپنے بیڈ روم میں جا کر وہاں سے ایک فائل لے آیا۔

میں نے اس کی وصیت کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ اس کے بیٹوں میں سے اگر کوئی عینا تک پہنچ بھی گیا تو اسے اس وقت تک نقصان نہیں پہنچائے گا جب تک عینا اپنی پوری

جائداد ان کے نام نہ کر دے۔

اس وصیت کی روشنی میں وہ لوگ عینا کو زندہ رکھنے پر مجبور تھے۔ وہ اسے اس وقت تک کسی بھی قسم کا جانی نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے جب تک اس سے بہ رضا و رغبت یا جبراً جائداد اپنے نام نہ کرا لیں۔

مجھے اب اس طرف سے تو اطمینان ہو گیا تھا کہ عینا کی جان خطرے میں نہیں ہے۔ میں نے چانڈیو صاحب سے یہ تذکرہ نہیں کیا کہ مجھ پر حسان کی طرف سے دو دفعہ حملہ ہو چکا ہے اور اس کے آدمی مجھ پر عینا کو اپنی تحویل میں رکھنے کا شبہ کر چکے ہیں۔

چانڈیو نے ایک لفافہ میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ”اس میں عینا اور اس کی ماں کی کچھ تصویریں ہیں۔ میں آپ کو چائے ضرور پلاتا لیکن مجھے ابھی ائرپورٹ پہنچنا ہے۔“

”چائے پھر بھی سہی۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”اب میں اجازت چاہوں گا۔“ میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ مجھے رخصت کرنے برآمدے تک آئے۔ میں اپنی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔

میں نے اس بات کا خاص طور پر دھیان رکھا تھا کہ کوئی گاڑی میرے تعاقب میں نہ ہو لیکن حیرت تو مجھے اس وقت ہوئی جب ایک گاڑی مسلسل میرے پیچھے لگی رہی۔ میں نے عقب نما آئینے میں گاڑی میں سوار افراد کے چہرے دیکھے تو مزید حیرت ہوئی۔ وہ اس ایجنسی کے گارڈز تھے جنہیں میں نے اپنے بنگلے کے لیے طلب کیا تھا۔

میں دفتر پہنچا تو ماریہ حسبِ معمول اپنی جگہ پر موجود تھی۔ اقبال میرے کمرے میں بیٹھا تھا لیکن وہ میری کرسی پر نہیں بیٹھا تھا۔

میرے آتے ہی ماریہ بھی آ گئی اور بولی۔ ”اتنے بڑے بڑے واقعات ہو جاتے ہیں اور مجھے کچھ معلوم ہی نہیں ہوتا۔“ اس کے لہجے میں شکوہ تھا۔

”کوئی بڑا واقعہ نہیں ہوا۔“ میں نے کہا۔ ”تم فضول میں پریشان ہی ہوتیں اس لیے میں نے تمہیں کچھ نہیں بتایا۔“

”اب تم گھر پر ایک ملازم رکھ لو۔“ ماریہ نے کہا۔

”ملازمہ کیوں نہیں؟“ میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

”چلو ملازمہ ہی رکھ لو۔“ ماریہ نے کہا۔

”یہ تو بعد کا مسئلہ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ابھی تو میں ملک سے باہر جا رہا ہوں۔ واپسی میں ممکن ہے میں کسی مستقل ملازمہ کا بندوبست کر لوں۔“ میں نے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

میرے جملے کا مطلب سمجھ کر اس کا چہرہ گلنار ہو گیا۔ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ”میں سلامت سے کہتی ہوں کہ وہ کافی بنا لے۔ صبح سے ہم لوگوں نے بھی تمہارے انتظار میں کافی نہیں پی۔“

اس کے جانے کے بعد میں نے بریف کیس سے وہ لفافہ نکالا جو مجھے چانڈیو نے دیا تھا۔ اس میں خوب صورت سی ایک امریکن لڑکی کی تصویر تھی۔ تصویر میں وہ اکیلی نہیں تھی بلکہ اس کے ساتھ اس کی طرح خوب صورت سی ایک لڑکی بھی تھی۔ تصویر میں لڑکی کی عمر دس گیارہ سال رہی ہو گی۔ ماں کے برعکس اس کی آنکھیں سیاہ تھیں۔ دوسری تصویر میں وہ لڑکی اکیلی تھی اور کچھ زیادہ کم عمر نظر آ رہی تھی۔ ایک تصویر میں وہ لڑکی چانڈیو صاحب کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ چانڈیو بھی جوانی میں بلاشبہ بہت دلچسپ اور اسمارٹ تھا۔ اس نے تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا اور کسی فلمی ہیرو کی طرح نظر آ رہا تھا۔ ایک تصویر میں وہ لڑکی اکیلی تھی۔ عمر اس میں بھی دس، گیارہ سال ہی رہی ہو گی۔

میں نے وہ تصویریں اقبال کی طرف بڑھا دیں۔

”لڑکی کی آنکھیں سیاہ ہیں اور اس کے بالائی ہونٹ پر دائیں جانب خاصا نمایاں تل کا نشان ہے۔“ اقبال نے کہا۔ ”اس سے لڑکی کی شناخت میں آسانی پیدا ہو جائے گی۔“

میں نے سیل فون پر جمیل کا نمبر ملایا تو معلوم ہوا کہ وہ دفتر ہی میں موجود ہے۔ میں نے اسے فوراً اپنے کمرے میں آنے کو کہا۔

وہ کمرے میں داخل ہوا تو میں نے اس سے کہا۔ ”جمیل! تم اپنے پاسپورٹ پر کب تک امریکا اور یورپ کے ویزے لگوا سکتے ہو؟“

”سر! میں نے اپنا پاسپورٹ تو ویزے کے لیے دے بھی دیا ہے۔ جلد ہی ویزے لگ جائیں گے۔ آپ بھی اپنا پاسپورٹ مجھے دے دیں، میں...“

”میرے پاسپورٹ پر ملٹی پل ویزے لگے ہوئے ہیں جو مزید دو سال کے لیے کارآمد ہیں۔ بس تم چلنے کی تیاری کرو۔“

☆☆☆

ہم لوگ کراچی ائرپورٹ پر موجود تھے۔ اقبال ہمیں ڈراپ کرنے آیا تھا۔ میرے منع کرنے کے باوجود ماریہ بھی آ گئی تھی۔

فلائٹ کی روانگی سے پندرہ منٹ پہلے میں، ماریہ اور اقبال سے رخصت ہوا۔ میں نے ماریہ کو سب کچھ سمجھا دیا تھا۔

فلائٹ میں میری سیٹ جمیل کے ساتھ ہی تھی۔ خاصے طویل اور تھکا دینے والے سفر کے بعد ہم لوگ نیو یارک پہنچے۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ ایک آدھ روز نیو یارک میں رک جاؤں لیکن میں نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور وہیں سے ورجینیا کے لیے فلائٹ پکڑ لی۔

ہم ورجینیا پہنچے تو سورج طلوع ہو چکا تھا اور خاصا خوشگوار موسم تھا۔ وہاں سے ہم ٹیکسی پکڑ کے ہوٹل پہنچے جہاں جمیل نے کمرے پہلے سے بک کرا لیے تھے۔

پھر جو میں لمبی تان کر سویا تو شام چار بجے آنکھ کھلی۔ میں نہا دھو کر تازہ دم ہوا اور روم سروس سے کھانا منگوانے کے بعد جمیل کے کمرے کا رخ کیا۔ وہ جاگ رہا تھا اور بالکل تیار تھا۔ میں نے اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔ ہم نے ڈٹ کر کھانا کھایا۔ پھر کافی پیتے ہوئے میں نے جمیل سے کہا۔ ”ہم سب سے پہلے اس ریسٹورنٹ میں چلیں گے جہاں عینا ویٹرس کے طور پر کام کرتی تھی۔“

میں نے کاؤنٹر پر بیٹھی استقبالیہ کلرک سے پوچھا۔ ”یہاں کوئی رٹز ریسٹورنٹ بھی ہے؟“

”یس سر!“ لڑکی مسکرا کر بولی۔ ”رٹز ریسٹورنٹ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ آپ چاہیں تو پیدل بھی وہاں جا سکتے ہیں۔ ہوٹل سے باہر نکل کر دائیں طرف چلیں گے تو مشکل سے دو منٹ چلنے کے بعد رٹز ریسٹورنٹ آ جائے گا۔“

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کمرے کی چابی اس کے حوالے کرنے کے بعد جمیل کے ساتھ باہر نکل گیا۔

رٹز ریسٹورنٹ جہاں عینا کام کرتی رہی تھی، وہاں سے واقعی مشکل سے دو منٹ کے فاصلے پر تھا۔

وہاں پہنچ کر میں نے ویٹرس کو کافی کا آرڈر دیا اور ریسٹورنٹ کا جائزہ لینے لگا۔ وہ خاصا بارونق اور معروف ریسٹورنٹ تھا۔ ویٹرس کافی لے کر آئی تو میں نے اس سے سرسری انداز میں کہا۔ ”کیا تم عینا کو جانتی ہو؟“

اس نے چونک کر مجھے دیکھا پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”نو سر! کون عینا؟“

”وہ بھی تین سال پہلے یہاں ویٹرس تھی۔“ میں نے کہا۔

میں نے جیب سے بیس ڈالر کا ایک نوٹ نکالا اور بولا۔ ”تم یہاں کی کسی پرانی ویٹرس کو جانتی ہو؟“ یہ کہہ کر میں نے نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔

”شیلی اور انجیلا یہاں گزشتہ چار پانچ سال سے کام کر رہی ہیں۔“ اس نے نوٹ جلدی سے لے لیا۔

”تم ان دونوں میں سے کسی کو یہاں بھیج سکتی ہو؟“ میں نے کہا اور دس ڈالر کا ایک نوٹ پھر جیب سے نکالا۔

”میں کوشش کرتی ہوں۔“ اس نے کہا اور نوٹ میرے ہاتھ سے لے کر چلی گئی۔

ہم نے کافی ختم ہی کی تھی کہ پُرکشش چہرے اور متناسب جسم والی ایک ویٹرس ہمارے پاس آ گئی۔ ”سر! میں انجیلا ہوں۔“

”مس انجیلا! مجھے ایک لڑکی کی تلاش ہے۔ تم اسے ضرور جانتی ہو گی۔“ میں نے بیس ڈالر کا ایک نوٹ نکالا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔

اس نے بھی نوٹ اچک لیا اور بولی۔ ”سر! اگر مجھے علم ہوا تو میں ضرور آپ کی مدد کروں گی۔“

”اس لڑکی کا نام عینا ہے اور وہ بھی یہاں ویٹرس تھی۔“

”سر! ایک لڑکی تھی تو لیکن میں اس کے ساتھ زیادہ بے تکلف نہیں تھی۔“ اس نے کہا۔

”اس کے بارے میں کسی سے معلوم ہو سکتا ہے؟“ میں نے کہا۔

”سر! میں اس سلسلے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“ اس کے انداز میں بیزاری تھی۔ ”لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ لوگوں کو اس کی تلاش کیوں ہے؟ اس سے پہلے بھی چند ماہ پہلے دو آدمی اس کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔“

”میں تو اس شخص کے بارے میں پوچھ رہا ہوں جس کے ساتھ عینا کے قریبی تعلقات تھے۔“

”سوری سر! مجھے بالکل یاد نہیں آ رہا ہے کہ...“

میں نے اس مرتبہ جیب سے بیس بیس ڈالرز کے دو نوٹ نکالے۔

”ممکن ہے ذہن پر زور دو گی تو تمہیں یاد آ جائے گا۔“

اس کی نظریں نوٹوں پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ آہستہ سے بولی۔ ”ریسٹورنٹ کے ہیڈ کک اسٹیو سے وہ بہت بے تکلف تھی۔“

میں نے دونوں نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ”تم اسٹیو سے میری ملاقات کرا سکتی ہو؟“

”وہ آج چھٹی پر ہے۔“ اس نے کہا۔

”اس کا ایڈریس تو ہو گا تمہارے پاس؟“ میں نے یہ کہتے ہوئے بیس ڈالر کا ایک اور نوٹ نکال لیا۔

”میں اس کا ایڈریس لے کر آتی ہوں۔“ اس نے وہ نوٹ بھی لے لیا اور وہاں سے چلی گئی۔

اس دوران میں جمیل بالکل خاموش رہا۔ وہ بہت گہری

نظروں سے ہر طرف کا جائزہ لے رہا تھا۔

وہ آہستہ سے بولا۔ ”آپ کی دائیں طرف کونے والی میز پر جو نیگرو بیٹھا ہے، وہ ہمیں بہت قہر آلود نظروں سے دیکھ رہا ہے۔“

”اچھا۔“ میں نے کہا اور سگریٹ سلگاتے ہوئے یونہی سرسری انداز میں دائیں طرف دیکھا۔ وہاں بیٹھا ہوا نیگرو واقعی مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بیٹھا ہوا تھا، اس کے باوجود میرا اندازہ تھا کہ اس کا قد.....

..... چھ فٹ سے اوپر ہی ہوگا۔ سردی کے باوجود اس نے آدھی آستین کی ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ سر عام نیگروز کی طرح بڑا تھا اور اس پر چھوٹے چھوٹے گھنگرالے بال تھے۔

تھوڑی دیر بعد وہی ویٹرس بل لے کر آئی جو ہمارے لیے کافی لائی تھی۔

”اس بل کے پیچھے اسٹیو کا ایڈریس بھی ہے جو مجھے اینجلا نے دیا ہے۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

میں نے بل اٹھا کر ٹرے میں پیسے رکھے اور خالص امریکن اسٹائل میں بولا۔ ”کیپ دا چینج!“ یہ کہتے ہوئے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ بل میں نے پہلے ہی اٹھا لیا تھا۔

ہمارے ساتھ ہی وہ نیگرو بھی اٹھا تو میں پھر چونکا۔

میں ریسٹورنٹ کے داخلی دروازے کی طرف بڑھا تو کوئی چیخ کر بولا۔ ”یو.... یو۔“

اس کی بلند اور گونج دار آواز سن کر میں نے گھوم کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے ہی رکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

وہاں بیٹھے ہوئے لوگ سہم کر اسے دیکھنے لگے۔ میں بھی اسی کے انداز میں اسے گھور رہا تھا۔

”کیا پرابلم ہے مسٹر؟“ میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا میرے سامنے آ گیا اور اچانک میرا گریبان پکڑ لیا۔ ”تم اینجلا کو کیا لالچ دے رہے تھے؟“ اس نے غرا کر پوچھا۔

”میرا گریبان چھوڑ دو۔“ میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

”میری بات کا جواب دو، یو باسٹرڈ!“

”میں کہہ رہا ہوں کہ میرا گریبان چھوڑ دو۔“ میں نے اس مرتبہ انتہائی بلند آواز اور درشت لہجے میں کہا۔

”میں نے کہا ہے کہ پہلے....“

میں نے اپنا گھٹنا پوری قوت سے اس کی ناف پر دے مارا۔ اس کا جملہ ادھورا رہ گیا اور میرا گریبان چھوڑ کر وہ رکوع کی حالت میں جھک گیا۔ میں نے اس کی گردن پکڑ کر اس کی پیشانی خاصی قوت کے ساتھ اپنے گھٹنے سے ٹکرا دی۔

مجھے اس کی سخت جانی پر حیرت ہوئی۔ وہ میری ضرب سے زمین پر گرا اور فوراً ہی لڑھک کر مجھ سے دور چلا گیا۔ بس اتنی ہی دیر میں وہ سنبھل گیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

اس نے ٹی شرٹ ہٹا کر اپنی بیلٹ کے ساتھ بندھی ہوئی موٹر سائیکل کی چین نکال لی اور اسے وحشیانہ انداز میں لہرانے لگا۔

”کارلوس!“ کسی نے اسے آواز دی۔ ”یہ دنگا فساد یہاں مت کرو۔“

اس نے پیچھے مڑ کر اس شخص کو..... ایک لات ماری اور چین لہراتا ہوا دوبارہ میری طرف بڑھا۔

نیگرو نے اچانک مجھ پر موٹر سائیکل کی زنجیر سے وار کر دیا۔ میں نے ایک کرسی اٹھا کے آگے کر دی۔ چین کرسی کے ایک پائے کے گرد لپٹ گئی۔ اس نے زوردار جھٹکا دے کر چین نکالنے کی کوشش کی تو کرسی کا وہ پایہ بھی نکل گیا جس پر چین لپٹی ہوئی تھی۔

اس نے سرعت سے دہرا وار میرے سر پر کیا۔ میں اگر ایس ایس جی کا تربیت یافتہ نہ ہوتا تو اس وزنی چین سے میری کھوپڑی تربوز کی طرح کھل جاتی۔ میں ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ چین زناٹے سے فرش پر گری۔ میں نے ایک دم اس پر پاؤں رکھ دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ جھٹکا دے کر چین نکالتا، میں نے آگے بڑھ کر دوسرا پاؤں بھی چین پر رکھ دیا۔

وہ چین کو جھٹکا دینے کے لیے جھکا تو میں نے اس کی پیشانی پر پوری قوت سے گھونسا جڑ دیا۔ میرے اس خوف ناک وار سے کوئی بچ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ الٹ کر پیچھے کی طرف گرا تو چین اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

دوسرے ہی لمحے موٹر سائیکل کی وہ چین میرے ہاتھ میں تھی۔ اس نے اس کے دوسرے سرے پر ربر کا ایک پائپ چڑھا کر چین کو موڑ کر ایک ہک سا بنا دیا تھا۔

میں نے چین کو لہرایا اور اس کے سر پر مارنا چاہتا تھا کہ اس نے سہمے ہوئے انداز میں مجھے دیکھا۔

میرا ہاتھ رک گیا اور میں نے چین زمین پر پھینک دی۔

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا پھر آہستہ آہستہ اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اس وقت بھی اپنا سر دائیں بائیں جھٹک رہا تھا۔

باہر سے اچانک پولیس کار کے سائرن کی آواز سنائی دی۔

وہ برق رفتاری سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ”مجھ سے پنجہ لڑاؤ۔“

میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم دونوں پنجہ آزمائی کرنے لگے۔

ہم دونوں میں سے کوئی بھی زخمی نہیں ہوا تھا۔ حیرت تو مجھے اس نیگرو پر تھی۔ اسے گھونسا مارتے وقت میرا ہاتھ بُری طرح جھنجھنا کر رہ گیا تھا۔ مجھے بالکل ایسا لگا تھا جیسے کنکریٹ کی کسی دیوار پر گھونسا مارا ہو۔ اس کے باوجود اس کا سر محفوظ تھا۔

پولیس والے جب ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے تو ہم ایک دوسرے سے پنجہ آزمائی کر رہے تھے۔

پولیس کے سارجنٹ نے ریسٹورنٹ کا جائزہ لیا پھر کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی لڑکی سے پوچھا۔ ”کیا ہوا ہے یہاں؟ پولیس کو ٹیلی فون کس نے کیا تھا؟“

”سر! یہ لوگ پنجہ لڑا رہے تھے۔“ اسی شخص نے جواب دیا جسے نیگرو نے لات مار کے پیچھے ہٹا دیا تھا۔ ”میں سمجھا کہ یہ لوگ لڑ رہے ہیں، بس میں نے اسی خوف سے پولیس کو کال کر لیا۔“

میں اس کے سفید جھوٹ پر حیران رہ گیا۔

پولیس کا سارجنٹ ہمارے پاس آ گیا اور بولا۔ ”اے مسٹر! یہ کوئی کلب نہیں ہے جہاں تم اس قسم کے مقابلے کرو۔ یہ ریسٹورنٹ ہے۔“

نیگرو نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو میں نے اس کا ہاتھ گرا دیا۔ ”شٹ!“ وہ بڑبڑایا پھر پولیس والے سے بولا۔ ”سوری سارجنٹ!“

سارجنٹ کچھ دیر کھڑا ہمیں گھورتا رہا پھر وہاں سے چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد ریسٹورنٹ میں پھر وہی رونق لوٹ آئی۔

نیگرو نے آہستہ سے کہا۔ ”میں کارلوس ہوں۔ میرے دوست مجھے ڈان کارلوس کہتے ہیں۔“ اس نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔

مجھے اس کے نام پر ہنسی آئی لیکن میں نے اس کا اظہار نہیں کیا اور اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔ ”میں خاور ہوں۔ میرا تعلق پاکستان سے ہے۔“

”میرا بھی یہی خیال تھا۔“ کارلوس نے کہا۔ ”کہ اتنا جی دار کوئی پاکستانی ہی ہو سکتا ہے۔ میں بہادر آدمیوں کی قدر کرتا ہوں اور تم نے تو مجھ پر احسان کیا ہے۔“

”احسان؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”میں نے کیا احسان کر دیا؟“

”تم نے میری جان بخش کر مجھ پر احسان کیا ہے۔ اس وقت میں چین کی زد میں تھا۔ تم چاہتے تو میری کھوپڑی توڑ سکتے تھے۔“

”میں بے بس اور مجبور دشمن پر کبھی وار نہیں کرتا۔“ میں نے ہنس کر کہا پھر چونک کر بولا۔ ”کارلوس! ایک بات بتاؤ۔ ریسٹورنٹ کے منیجر نے تمہاری خاطر جھوٹ کیوں بولا؟“

”اسے بھی اپنا ریسٹورنٹ چلانا ہے۔ یہاں موجود ہر شخص مجھے پہچانتا ہوگا۔ کسی میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ میرے خلاف کچھ کہہ سکے۔“

میں حیرت سے اسے تکتا رہ گیا۔ میں سمجھتا تھا کہ شاید ہمارے ہی ملک میں اس قسم کی صورتِ حال ہوتی ہے۔ امریکا میں بھی یہی سب کچھ ہو رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ کارلوس اس علاقے کا ڈان ہے۔

”مسٹر کارلوس! تم....“

”میں اس علاقے کا ڈان ہوں۔“ اس نے یوں فخر سے کہا جیسے وہ اس علاقے کا میئر ہو۔

”لیکن تمہیں مجھ سے کیا شکایت پیدا ہو گئی؟“ میں نے کہا۔

”اینجلا میری گرل فرینڈ ہے۔“ وہ مسکرا کر بولا۔ ”میں سمجھا کہ تم اسے ڈالرز..... دے دے کر کوئی لالچ دے رہے ہو، بس اتنی سی بات تھی۔“

”میں نے تو آج پہلی دفعہ اسے یہاں دیکھا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس سے ایک لڑکی کے بارے میں پوچھ رہا تھا جو یہیں ویٹرس تھی۔“ میں نے کہا۔

”تم صبا کے بارے میں تو نہیں پوچھ رہے تھے؟“

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”تمہیں کیسے پتا؟“

”اس سے پہلے بھی کئی افراد اس کے بارے میں پوچھتے ہوئے یہاں آئے ہیں لیکن انہوں نے ریسٹورنٹ کے منیجر سے معلومات کیں۔ اس سے انہیں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ اسے معلوم ہی نہیں ہے۔ تم نے اینجلا سے کیوں پوچھا؟“

”اس قسم کی معلومات عام طور پر ساتھیوں سے ہی ملتی ہیں لیکن اس سے بھی مجھے کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ صبا کہاں ہے؟“

”تمہیں صبا کی تلاش کیوں ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”وہ میرے ایک دوست کی گرل فرینڈ ہے۔“ میں نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔ ”گزشتہ دنوں پاکستان میں ایک ٹریفک ایکسیڈنٹ میں وہ مر گیا۔ اس نے صبا کی ایک امانت مجھے دی تھی۔ وہی اس تک پہنچانا ہے۔“

"تم دوست کی خاطر پاکستان سے یہاں آگئے؟" اس نے حیرت سے کہا۔

"دوست کی خاطر تو میں دنیا کے دوسرے سرے تک بھی جاسکتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اگر میں تمہیں عینا سے ملوا دوں تو؟" اس نے اچانک کہا۔

"میں تمہارا احسان مند رہوں گا... پھر تم کب عینا سے میری ملاقات کرا رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"تم ایسا کرو، اپنے دوست کا نام بتا دو۔ میں عینا سے معلوم کرکے تمہیں بتا دوں گا۔" کارلوس نے کہا۔

"نام تو میں عینا ہی کو بتاؤں گا۔" میں زبردستی مسکرایا ورنہ میرا جھوٹ پکڑا جاتا۔ "میں عینا کو سرپرائز دینا چاہتا ہوں۔ تم اسے میرا نام بتا سکتے ہو یہ بھی بتا سکتے ہو کہ میں پاکستان سے آیا ہوں۔"

"دیکھو خاور!" کارلوس سنجیدہ ہو کر بولا۔ "میں نے تمہیں دوست کہا ہے۔ تم مجھ سے کیا چھپا رہے ہو؟"

"وہ عینا کا باپ ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ تو گزشتہ کئی مہینوں سے بیٹی کو تلاش کر رہا ہے۔ جتنی بھی سراغ رساں ایجنسیوں کے ایجنٹ یہاں آئے، وہ عینا کے باپ ہی کے کہنے پر یہاں آئے تھے۔"

"عینا کا باپ تو بہت دولت مند آدمی ہے؟" کارلوس نے پوچھا۔

"تم عینا کے باپ کو بھی جانتے ہو؟" میں نے کہا۔

"میں نے عینا سے اس کا تذکرہ سنا ہے۔" کارلوس نے جواب دیا پھر وہ سنجیدہ ہو کر بولا۔ "میں عینا سے بات کروں گا۔ اگر وہ تم سے ملاقات پر راضی ہوئی تو میں ضرور تمہیں اس سے ملوا دوں گا۔"

"اور اگر وہ راضی نہ ہوئی؟" میں نے کہا۔

"تو پھر اس سے ملاقات ناممکن ہے۔" اس نے حتمی لہجے میں کہا۔

اس دوران میں حیرت انگیز طور پر جمیل وہاں سے غائب ہو گیا تھا۔ وہ اس پورے وقفے میں مجھے نظر نہیں آیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ میں کارلوس سے نمٹ لوں گا۔ اگر کوئی دوسرا مداخلت کرتا تو شاید جمیل بھی سامنے آجاتا۔

"پھر کب پوچھو گے عینا سے؟" میں نے کہا۔

"میں آج ہی بلکہ ابھی تھوڑی دیر میں اس کے پاس جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے، تم اس سے بات کرلو۔ میرا سیل نمبر لے لو۔ اس پر مجھے اطلاع دے دینا۔" میں نے اسے اپنا سیل نمبر لکھوا دیا۔ پھر میں واش روم کے بہانے وہاں سے اٹھا اور کچھ فاصلے پر جا کر جمیل کا نمبر ڈائل کیا۔

"یس سر!" دوسری طرف سے جمیل کی آواز سنائی دی۔

"تم ہو کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"میں اسی ریسٹورنٹ میں ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"جس شخص نے ابھی کچھ دیر پہلے مجھ سے جھگڑا کیا تھا، تمہیں انتہائی مہارت اور ہوشیاری سے اس کا پیچھا کرنا ہے۔ یہ معلوم کرو کہ وہ کہاں جاتا ہے۔"

"اوکے سر۔" جمیل نے جواب دیا۔

میں نے سلسلہ منقطع کر دیا اور دوبارہ کارلوس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

میں نے کچھ دیر بعد اس سے کہا۔ "اب میں چلتا ہوں لیکن عینا راضی ہو جائے تو مجھے اطلاع دے دینا۔"

"اوکے۔" اس نے انتہائی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔

وہاں سے نکل کر میں پیدل اپنے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔

ہوٹل پہنچ کر میں نے وہاں کے سیکیورٹی چیف کا نمبر ملایا اور اس سے کہا۔ "مسٹر آفیسر! اگر آپ کے پاس کچھ وقت ہو تو پلیز ذرا میرے روم میں آجائیں۔"

اس نے حیرت سے مجھ سے پوچھا۔ "کوئی پرابلم ہے سر؟"

"کوئی پرابلم نہیں ہے، مجھے کچھ معلومات چاہئیں۔"

"اوکے سر! میں ابھی دس منٹ میں حاضر ہوتا ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی اور ہوٹل کا چیف سیکیورٹی آفیسر اندر آگیا۔ "یس سر!"

"تشریف رکھیے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور گھڑی دیکھنے لگا۔

"آفیسر! کیا آپ کارلوس کو جانتے ہیں، ڈان کارلوس؟"

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا پھر بولا۔

"سر! میں ایک ہی ڈان کارلوس سے واقف ہوں۔ وہ اس علاقے کا ڈان ہے۔ وہ ہر قسم کے غیر قانونی کام کرتا ہے۔ میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ وہ معقول معاوضہ لے کر قتل بھی کرتا ہے۔" پھر وہ تشویش ناک لہجے میں بولا۔ "لیکن سر! آپ ڈان کارلوس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"یونہی۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "میں نے اپنے ایک دوست سے اس کا نام سنا تھا۔"

"سر! اگر آپ کے دوست نے اس سے ملنے کو کہا تھا تو میں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔ وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔"

"کتنا خطرناک؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔

"اتنا خطرناک ہے کہ اس نے بیسیوں جرائم کیے ہیں لیکن آج تک اس کے خلاف کچھ ثابت نہ ہوسکا۔ سر! بات کیا ہے... کوئی پرابلم ہے تو مجھے بتائیں؟"

"کوئی پرابلم نہیں ہے۔" میں مسکرا کر بولا۔ "مجھے اپنا قیمتی وقت دینے کا بہت شکریہ۔"

اس نے مجھے تشویش سے دیکھا پھر بولا۔ "سر! اگر کسی بھی قسم کا کوئی پرابلم ہو تو مجھے ضرور بتائیے گا۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

میں کچھ دیر تک ٹی وی کے چینل بدلتا رہا پھر نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

دروازے پر ہونے والی دستک سے میری آنکھ کھلی۔ میں نے کہا۔ "کم، ان۔"

دوسرے ہی لمحے جمیل اندر آگیا۔ اس نے پہلے بوتل سے ایک گلاس پانی لیا پھر پانی پی کر بولا۔ "سر! میں نے معلوم کر لیا ہے کہ وہ نیگرو کہاں گیا تھا۔ وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھا تو مجھے تشویش ہوئی۔ میں تو اس وقت پیدل تھا۔ ریسٹورنٹ کے باہر ایک ٹیکسی آکر رکی تو میں اس میں بیٹھ گیا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ ڈرائیور سکھ تھا۔ میں نے اس سے پنجابی میں بات کی تو وہ خوش ہو گیا۔ اسی وقت نیگرو بھی گاڑی پارکنگ سے نکال کر روانہ ہو گیا۔ میں نے بھی اپنے ڈرائیور سے کہا کہ اس کا پیچھا کرے۔ پہلے تو اس نے انکار کیا لیکن میں نے دگنے کرائے کی بات کی تو وہ راضی ہو گیا اور نیگرو کا تعاقب شروع کر دیا۔

"ایک گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد ہم یہاں کے خاصے پوش علاقے میں پہنچ گئے۔ وہ علاقہ خاصا سنسان تھا۔ ہم اس بنگلے سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہو گئے جہاں وہ کچھ دیر کے لیے رکا تھا۔ پچیس منٹ کے صبر آزما انتظار کے بعد بھی جب وہ نیگرو باہر نہیں آیا تو میں نے اپنے ٹیکسی ڈرائیور سے واپسی کے لیے کہہ دیا۔

"ٹیکسی ڈرائیور نے گاڑی کا انجن اسٹارٹ کیا ہی تھا کہ مجھے ایک مرتبہ پھر وہی نیگرو دکھائی دیا۔ اس مرتبہ اس کے ساتھ وہ ویٹرس انجیلا بھی تھی۔ انجیلا اس کے ساتھ پارکنگ تک آئی۔ نیگرو اس سے سرعام خالص امریکن انداز میں رخصت ہوا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ وہ نیگرو ایک مرتبہ پھر شہر کی طرف روانہ ہو گیا اور پھر اچانک ٹیکسی ڈرائیور اس کا سراغ کھو بیٹھا۔" جمیل کے لہجے میں شرمندگی تھی۔

"اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"اسٹیئرنگ پر تم ہوتے تو قصوروار بھی ہوتے۔" میں نے کہا۔

"مجھے لگتا ہے، اس انجیلا کو بہت کچھ معلوم ہے لیکن کچھ بتا نہیں رہی ہے۔"

"اس نے جو ایڈریس دیا تھا وہ..."

"وہ بھی درست نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"سر! میرا خیال ہے کہ عینا کے بارے میں اسی ریسٹورنٹ سے کچھ نہ کچھ ضرور معلوم ہو جائے گا۔" جمیل نے کہا۔ "ہمیں ایک مرتبہ پھر وہاں کوشش کرنا چاہیے۔"

"ہاں یاد آیا... ایک اور ویٹرس بھی تھی وہاں۔" میں چونک کر بولا۔ "عینا کے ساتھ ہی کام کرتی تھی۔ کیا نام تھا اس کا..."

"شیلی۔" جمیل نے کہا۔

"ہاں، کل ہم اس شیلی سے ملیں گے لیکن اس ریسٹورنٹ میں نہیں بلکہ اس کے گھر پر یا کسی اور جگہ۔" میں نے کہا۔ "مجھے تو وہ کالیا اچھی طرح پہچان گیا ہے لیکن شاید تمہیں نہ پہچانتا ہو۔ کل تم وہاں سے شیلی کا ایڈریس لے آنا۔"

"اوکے سر!" جمیل نے کہا۔

اسی وقت ماریہ کا ٹیلی فون آگیا۔ میں نے سیل فون کان سے لگا کر کہا۔ "ہاں ماریہ! کیسی ہو؟"

"تم کیسے ہو؟ تم تو وہاں جا کر بالکل ہی بھول گئے۔"

"میں تمہیں ٹیلی فون کرنے ہی والا تھا۔" میں نے کہا۔

"اچھا، اقبال صاحب سے بات کرو۔"

"کیا تم لوگ اب تک آفس میں ہو؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"تم شاید بھول گئے کہ یہاں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم آفس پہنچے ہیں۔"

"ہاں... وقت کے فرق کو تو میں بھول ہی گیا تھا۔"

پھر اقبال لائن پر آگیا۔

"ہاں خاور! کوئی پروگریس؟"

"یار! میں نے کام تو شروع کر دیا ہے لیکن ابھی کوئی پروگریس نہیں ہے۔"

اس کے بعد پھر ماریہ لائن پر آگئی۔ وہ مجھے ہدایات دیتی رہی کہ وقت پر کھانا، وقت پر سونا، سردی زیادہ ہو تو گرم

کپڑے استعمال کرنا وغیرہ وغیرہ۔

☆☆☆

میں بے چینی سے جمیل کا منتظر تھا۔ میں نے ہوٹل کے رینٹ اے کار سے ایک گاڑی بھی لے لی تھی کیونکہ بغیر گاڑی کے وہاں گزارہ نہیں تھا۔ میں ریسٹورنٹ سے کچھ فاصلے پر گاڑی میں بیٹھا جمیل کا انتظار کر رہا تھا۔

اچانک جمیل مخالف سمت سے آیا اور گاڑی میں بیٹھ گیا اور بولا۔ ''یہاں سے نکلیں سر! وہ نیگرو ابھی ابھی ریسٹورنٹ پہنچا ہے۔ شاید اس نے مجھے دیکھ بھی لیا ہے۔''

میں نے گاڑی آگے بڑھا دی اور اس سے پوچھا۔ ''اس ویٹریس کا ایڈریس ملا؟''

''جی سر!'' اس نے جواب دیا۔ ''میں شیلی کا ایڈریس لے آیا ہوں۔ وہ خود تو ابھی تھوڑی دیر پہلے ڈیوٹی آف کر کے گئی ہے۔ یہ ریسٹورنٹ چوبیس گھنٹے کھلا رہتا ہے۔ شیلی کی نائٹ ڈیوٹی تھی۔''

جمیل نے گود میں ورجینیا کا نقشہ پھیلا لیا۔ یہ نقشہ ہم نے اپنے ہوٹل سے حاصل کیا تھا۔ اس کی مدد سے وہ مجھے راستہ بتاتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد ہم ایک گنجان آباد علاقے میں پہنچ گئے۔ وہاں عمارتیں پرانی اور بوسیدہ تھیں۔

''سر! یہی بلڈنگ ہے۔'' جمیل نے ایک پرانی سی سات منزلہ عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ ''شیلی اسی بلڈنگ کے پانچویں فلور پر رہتی ہے۔ فلیٹ نمبر ایک سو پندرہ۔''

میں وہاں سے مین روڈ پر نکل آیا اور سپر اسٹور کے پارکنگ لاٹ میں گاڑی پارک کر دی۔

وہاں سے ہم پیدل ہی اس عمارت کی طرف بڑھے۔ اس بلڈنگ میں لفٹ تو تھی لیکن خراب تھی اس لیے مجبوراً ہمیں زینے کا رخ کرنا پڑا۔

پانچویں فلور کے کوریڈور میں ایک امریکن جوڑا اپنے اردگرد سے بے خبر راز و نیاز میں مصروف تھا۔ لڑکی نے نیم وا آنکھوں سے مجھے دیکھا اور لڑکے کی طرف متوجہ ہوگئی۔

ہمیں فلیٹ تلاش کرنے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ دروازے پر لکھا ہوا نمبر خاصا دھندلا گیا تھا لیکن اب بھی غور سے دیکھنے پر پڑھا جا سکتا تھا۔

میں نے کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھ دی۔ دو تین دفعہ گھنٹی بجانے کے بعد مجھے اندر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور ایک نسوانی آواز آئی۔ ''کون ہے؟'' اس کے ساتھ ہی اس نے دروازہ کھول دیا۔

اس نے ہم دونوں کو حیرانی سے دیکھا۔ وہ شاید سو چکی تھی یا سونے کی تیاری کر رہی تھی۔ اس کے جسم پر بہت مختصر لباس تھا۔ اس نے حیرت سے پوچھا۔ ''جی فرمایئے، میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟'' اس کا لہجہ خاصا مہذب تھا۔ شاید ریسٹورنٹ میں کام کرنے کی وجہ سے نرم لہجے میں بولنا اس کی عادت بن چکا تھا۔

''مس شیلی!'' میں نے کہا۔ ''مجھے آپ سے ایک ضروری کام ہے۔ اگر آپ مجھے صرف دس منٹ دے سکیں تو...''

''سوری مسٹر!'' اس مرتبہ اس نے قدرے درشت لہجے میں کہا۔ ''میں اس وقت سونا چاہتی ہوں۔'' اس نے دروازہ بند کرنا چاہا لیکن جمیل نے اپنا پیر اڑا دیا اور بولا۔ ''ہم بہت دور سے آئے ہیں مس شیلی! اتنی بے رخی اچھی نہیں ہوتی۔'' پھر وہ اسے دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے میں بھی اندر داخل ہوا اور دروازہ بولٹ کر دیا۔

''کک... کون ہو تم لوگ؟'' وہ خوف زدہ ہوگئی۔

''گھبراؤ مت شیلی!'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ بس ہمیں تھوڑی معلومات درکار ہیں۔''

''کیسی معلومات؟'' وہ اب بھی خوف زدہ تھی۔

میں نے اس کے فلیٹ کا جائزہ لیا۔ اس میں صرف ایک ہی کمرا تھا۔ کمرے کے سامنے چھوٹا سا لاؤنج تھا۔ اسی لاؤنج میں ایک طرف بہت مختصر سا کچن تھا جو انتہائی غلیظ تھا۔ لاؤنج میں بوسیدہ سا ایک کارپٹ پڑا تھا اور اس پر اس سے بھی زیادہ بوسیدہ ایک صوفہ سیٹ تھا۔

میں بہت احتیاط سے صوفے پر بیٹھ گیا، مبادا وہ میرا وزن سہارنے سے انکار کر دے۔ پھر میں نے شیلی کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اپنی جیب سے پچاس ڈالر کا ایک نوٹ نکالا۔ نوٹ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی آگئی۔

''تم عینا کو جانتی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''کون عینا؟'' اس نے کہا۔

''تمہارے ساتھ ہی وہ بھی ویٹریس تھی۔'' میں نے کہا۔

''اچھا، وہ عینا۔'' اس نے کہا۔ ''وہ تو کافی عرصہ پہلے ملازمت چھوڑ کر جا چکی ہے۔''

''وہ اس وقت کہاں ہے؟'' میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے نوٹ سے کھیلتے ہوئے کہا۔

''میں نہیں جانتی۔'' شیلی نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم پچاس ڈالر کمانا نہیں چاہتیں۔" میں نے کہا اور نوٹ دوبارہ جیب میں رکھنے لگا۔

"ایک منٹ!" وہ اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے بولی۔ "عینا مجھے دو مہینے پہلے یہاں نظر آئی تھی۔ اب تو اس کے ٹھاٹ باٹ ہی کچھ اور ہیں۔ لگتا ہے وہ خاصی دولت مند ہوگئی ہے۔"

"وہ آج کل کہاں ہے؟" جمیل نے پوچھا۔

"اس سے بہت مختصر بات ہوئی تھی۔" شیلی نے کہا۔ "وہ کیلی فورنیا میں ہے۔"

"کیلی فورنیا میں کہاں؟" میں نے پوچھا۔ "وہ کوئی گاؤں نہیں ہے جو ہمیں اس کا سراغ مل جائے گا۔"

وہ چونک کر بولی۔ "ہاں، یاد آیا۔ اس کا بوائے فرینڈ ایڈی اس کے بارے میں جانتا ہے۔"

"ایڈی کون ہے اور کہاں ملے گا؟"

"ایڈی اسی علاقے میں رہتا ہے، سولہویں اسٹریٹ پر کنگ اسٹیٹ بلڈنگ میں ساتویں فلور پر اس کا فلیٹ ہے۔ فلیٹ نمبر سات سو دو۔" اس نے ایک ہی سانس میں بتا دیا۔

"یہ ایڈی کرتا کیا ہے؟" جمیل نے پوچھا۔

"دو ماہ پہلے ایک نائٹ کلب میں گٹار بجاتا تھا لیکن آج کل بے روزگار ہے۔"

اس نے پھر للچائی ہوئی نظروں سے نوٹ کی طرف دیکھا۔ میں نے وہ نوٹ اس کے حوالے کر دیا۔ اس نے جلدی سے وہ نوٹ گویا میرے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ "ایڈی کو بتایئے گا مت کہ اس کا پتا میں نے آپ کو دیا ہے۔"

"تم فکر مت کرو۔" میں نے کہا۔ "اور اب سکون سے سو جاؤ۔"

ہم شیلی کے فلیٹ سے باہر نکل آئے۔

ہم وہاں سے پیدل ہی روانہ ہو گئے۔ سولہویں اسٹریٹ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔

ہمیں کنگ اسٹیٹ بلڈنگ بھی بہت آسانی سے مل گئی۔ وہ کبھی واقعی "کنگ اسٹیٹ" رہی ہوگی لیکن اب تو وہ بدبختی کی علامت لگ رہی تھی۔ بے رنگ دیواریں، بوسیدہ دروازے اور کھڑکیاں۔ وہاں لفٹ بھی تھی اور وہ چل بھی رہی تھی۔ لیکن میں نے زینے ہی سے اوپر جانا مناسب سمجھا۔

ساتویں فلور تک پہنچتے پہنچتے میرا سانس پھول گیا۔ زینے کی لینڈنگ کے پاس بڑی سی ایک کھڑکی تھی۔ میں کچھ دیر وہاں کھڑا تازہ ہوا اپنے پھیپھڑوں میں بھرتا رہا۔ پھر ہم نمبر دیکھتے ہوئے فلیٹ نمبر سات سو دو تک پہنچ گئے۔

جمیل نے ڈور بیل پر انگلی رکھ دی۔ اندر گھنٹی بجنے کی تیز آواز سنائی دی پھر.... آہٹ سنائی دی اور دروازہ کھل گیا۔

دروازہ کھولنے والا ایک نوجوان تھا۔ وہ خاصا خوب رو تھا لیکن اس وقت اس کا حلیہ خراب تھا۔ اس کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔ اس نے غالباً دس بارہ روز سے شیو نہیں کیا تھا بلکہ شاید منہ بھی نہیں دھویا تھا۔

"جی فرمایئے؟" اس نے غور سے ہم دونوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"مسٹر ایڈی؟" میں نے کہا۔

"ہاں، میں ہی ایڈی ہوں۔" بات کرتے ہوئے اس کے منہ سے شراب کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ وہ شاید اس وقت بھی پی رہا تھا۔

"ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔

"میری مدد؟" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ "میں تو خود اپنی مدد نہیں کر سکتا۔"

"لیکن تم ہماری مدد کر سکتے ہو۔" میں نے کہا۔

"پچاس ڈالرز کمانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟" جمیل نے کہا۔

"پچاس ڈالرز؟" اس نے حیرت سے کہا پھر چونک کر بولا۔ "تم لوگوں کا تعلق پولیس سے ہے؟"

"نہیں، ہمارا تعلق پولیس سے نہیں ہے۔" جمیل نے کہا اور جیب سے پچاس ڈالر کا ایک نوٹ نکال لیا۔ "کیا ہم اندر بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟"

"اگر تم برداشت کر سکو تو شوق سے اندر آؤ۔" اس نے کہا۔

اس کا فلیٹ شیلی کے مقابلے میں کچھ بڑا تھا لیکن شاید مہینوں سے اس کی صفائی نہیں ہوئی تھی۔ لاؤنج میں جگہ جگہ میلے کپڑے نظر آ رہے تھے۔

ایڈی ہمارے سامنے ہی کارپٹ پر بیٹھ گیا اور بولا۔ "اب بتاؤ، میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟ میں تو صرف گٹار بجا سکتا ہوں۔ پورے شہر میں چند ہی لوگ ایسے ہوں گے جو مجھ سے اچھا گٹار بجا سکیں گے۔"

"تم عینا کو جانتے ہو؟" اچانک جمیل نے پوچھا۔

وہ بُری طرح چونک اٹھا۔ "کیا ہوا عینا کو؟"

"اسے کچھ نہیں ہوا۔" میں نے کہا۔ "ہم صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ آج کل کہاں ہے؟"

"کیا تمہیں بھی اس سے اپنا کوئی قرض وصول کرنا ہے؟" ایڈی نے کہا۔ "آج کل اس کے پاس بہت دولت ہے۔ وہ تمہارا قرض چکا دے گی۔"

"اس کے لیے اس سے ملنا ضروری ہے ایڈی۔" جمیل نے کہا۔

"وہ بہت بے وفا لڑکی ہے۔ دولت ہاتھ آتے ہی وہ مجھے بھول گئی۔"

"ہم نے سنا ہے کہ وہ کیلی فورنیا میں ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ کیلی فورنیا میں تھی لیکن اب لاس اینجلس میں ہے۔" ایڈی نے کہا۔ "وہاں اس نے محل نما ایک مکان خرید لیا ہے اور ملازموں کی ایک فوج کے ساتھ وہاں رہتی ہے۔ اب تو اس کی شخصیت ہی بدل کر رہ گئی ہے۔ اس نے تو مجھے پہچاننے سے ہی انکار کر دیا تھا۔"

"تمہیں وہ کہاں ملی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"میں اس کے گھر گیا تھا لیکن گیٹ پر موجود گارڈز نے مجھے اندر ہی نہیں جانے دیا۔ انٹر کام پر گارڈز نے میرا نام بتایا تو عینا نے صاف کہہ دیا کہ میں کسی ایڈی کو نہیں جانتی۔"

"وہ کہیں ہمیں بھی پہچاننے سے انکار نہ کر دے۔" جمیل نے کہا۔ "ہماری تو ساری رقم ڈوب جائے گی۔"

"کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔" میں نے کہا۔ پھر ایڈی سے کہا۔ "تم ہمیں عینا کا پتا بتاؤ۔" یہ کہتے ہوئے میں نے نوٹ جمیل کے ہاتھ سے لے کر اس کے سامنے نچایا۔

"میں ابھی لکھ کر دیتا ہوں۔" ایڈی نے نوٹ دیکھ کر پُرجوش لہجے میں کہا۔

اس نے جلدی جلدی عینا کا پتا لکھا اور جمیل کے حوالے کر دیا۔

میں نے پچاس ڈالر کا نوٹ ایڈی کو دے دیا۔

ہم جانے لگے تو وہ بولا۔ "وش یو گڈ لک۔"

ہم اس خستہ حال اور غلیظ عمارت سے باہر نکلے تو میرا ذہن خاصا ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ ہمیں غیر متوقع طور پر کامیابی ہو گئی تھی۔

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے جیب سے سیل فون نکالا تو اسکرین پر کوئی اجنبی نمبر تھا۔

"ہیلو!" میں نے سیل فون آن کرنے کے بعد کہا۔

"ہیلو خاور!" دوسری طرف سے ڈان کارلوس کی آواز آئی۔ "میں کارلوس بول رہا ہوں۔"

"ہاں کارلوس! کیسے ہو؟" میں نے کہا۔ "تم نے عینا سے معلوم کیا؟"

"ہاں، میں نے اس سے معلوم کیا تھا۔" کارلوس نے کہا۔ "لیکن مجھے افسوس ہے دوست، وہ تم سے ملنا ہی نہیں چاہتی۔"

"ملنا ہی نہیں چاہتی؟" میں نے اپنے لہجے میں مایوسی پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی۔

"ہاں، میں نے اسے سمجھایا کہ وہ شخص اتنی دور سے آیا ہے، اس سے ملنے میں حرج ہی کیا ہے؟ لیکن وہ نہیں مانی۔"

"تھینکس کارلوس!" میں نے لہجہ شکستہ کر لیا۔ "ویسے وہ خیریت سے تو ہے نا؟"

"ہاں، وہ بالکل خیریت سے ہے۔"

"اوکے کارلوس! اب ہمارا یہاں رکنا فضول ہے۔ میں آج ہی..."

"ایسی بھی کیا جلدی ہے؟" کارلوس نے کہا۔ "کیا تم بھول گئے کہ میرے دوست بھی ہو؟"

"مجھے یاد ہے لیکن..."

"تم اس وقت ہو کہاں؟" اس نے سرسری انداز میں پوچھا۔

"میں وقت گزاری کے لیے یونہی ہوٹل سے نکلا تھا۔ اس وقت ایک معروف شاہراہ پر ہوں۔ مجھے یہاں کے راستوں کا علم نہیں ہے اس لیے یہ نہیں بتا سکتا کہ اس وقت کہاں ہوں؟" میں نے ہنس کر کہا۔ "لیکن تم سے ملے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ کیا آج تم سے ملاقات ہو سکتی ہے؟"

"بالکل ہو سکتی ہے۔" کارلوس نے کہا۔ "تم اسی ریسٹورنٹ میں آ جاؤ پھر ہم کسی بہترین جگہ ڈنر کریں گے۔"

"اوکے، میں پہنچ جاؤں گا۔" میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

"یہ غالباً اسی نیگرو کا ٹیلی فون تھا؟" جمیل نے کہا۔

"ہاں، وہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے اور ڈنر کی دعوت دے رہا ہے۔"

"آپ اس کے ساتھ ڈنر پر جائیں سر! میں دور رہ کر اس کی نگرانی کروں گا کیونکہ وہ قابلِ اعتبار نہیں ہے۔"

باتیں کرتے ہوئے ہم اپنی گاڑی تک پہنچ گئے۔ میں نے گاڑی پارکنگ سے نکالی اور دوبارہ ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

میں اس مخصوص ریسٹورنٹ میں داخل ہوا تو کارلوس مجھے دور ہی سے نظر آ گیا۔ اس نے مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور تیزی سے میری طرف بڑھا۔ اس نے بہت گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور بولا۔ "تم وقت کے بہت پابند ہو۔ تمہاری یہ

بات مجھے پسند آئی۔" پھر وہ چونک کر بولا۔ "تم گاڑی لے کر آئے ہو یا پیدل ہی آئے ہو؟"

"اس وقت تو میں پیدل ہی ہوں۔" میں نے کہا۔ "ہاں اگر گاڑی کی ضرورت پڑی تو میں ہوٹل سے لے سکتا ہوں۔"

"تم ڈان کارلوس کے دوست ہو۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "یہاں کی ہر گاڑی تمہاری گاڑی ہے۔ میرے خیال میں ہمیں چلنا چاہیے۔ تمہیں بھوک بھی لگ رہی ہوگی۔"

"ہاں، بھوک تو لگ رہی ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

ڈان کارلوس میرے ساتھ باہر نکلا اور پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے سرسری انداز میں اردگرد کا جائزہ لیا لیکن مجھے جمیل کہیں دکھائی نہیں دیا۔ ہوٹل کی گاڑی اس وقت جمیل کے پاس تھی۔ وہ کہیں چھپ کر ہمارا انتظار کر رہا تھا۔

کارلوس پارکنگ سے گاڑی نکال لایا اور میرے نزدیک لا کر روک دی۔ میں نے پسنجر سیٹ کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گیا۔

میرے بیٹھتے ہی اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ کچھ دیر بعد گاڑی میں خوش گوار حرارت پھیل گئی۔ مجھے کچھ سکون محسوس ہوا۔ باہر تو اچھی خاصی سرد ہوا چل رہی تھی۔

"کہاں چلو گے؟" کارلوس نے پوچھا۔

"میں پہلی دفعہ آیا ہوں اس لیے مجھے یہاں کے ریسٹورنٹس، ہوٹلز اور نائٹ کلبس کے بارے میں کچھ بھی علم نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں، مجھے یاد آیا۔" کارلوس مسکرا کر بولا۔ "میں تمہیں ایسی جگہ کا کھانا کھلاؤں گا کہ تمہیں ہمیشہ اس کا ذائقہ یاد رہے گا۔"

"بس یہ خیال رکھنا کہ میں ویجیٹیرین ہوں۔ سبزیاں کھاتا ہوں، گوشت نہیں کھاتا۔"

"جو تم چاہو گے، وہ تمہیں ملے گا۔" کارلوس نے کہا۔ "لیکن وہ ریسٹورنٹ یہاں سے کچھ دور ہے اور مخصوص لوگوں کے لیے ہے۔"

اب آبادی پیچھے رہ گئی تھی اور ہم ورجینیا کے مضافات میں داخل ہو گئے تھے۔ میری چھٹی حس بار بار خطرے کی گھنٹی بجا رہی تھی۔

اب وہ ایسے علاقے میں داخل ہو گیا تھا جہاں بنگلے ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے۔

اس نے ایک گیٹ کے سامنے گاڑی روک دی اور ہارن بجایا لیکن گیٹ نہ کھلا۔ وہ بکتا جھکتا گاڑی سے اتر کر گیٹ تک پہنچا اور اسے بُری طرح پیٹ ڈالا۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اس کا ڈیش بورڈ کھولا تو مجھے اس میں ایک ریوالور نظر آیا۔ میں نے جلدی سے وہ ریوالور نکال کر اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا اور ڈیش بورڈ بند کر دیا۔

گیٹ کھلا تو وہ بُری طرح دہاڑنے لگا۔ "تم سب کیا نشہ کر کے پڑے ہوئے تھے؟ سب نکمے اور ناکارہ ہو گئے ہو۔ تم لوگوں سے میں بعد میں نمٹوں گا۔ دروازہ کھولو۔"

کوئی اندھا بھی بتا سکتا تھا کہ وہ کوئی ریسٹورنٹ نہیں تھا۔ میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور ایک دم باہر نکل کر ایک طرف دوڑ لگا دی۔

مجھے بھاگتے دیکھ کر کارلوس چیخا۔ "اسے پکڑو، نکلنے نہ پائے۔" بوکھلاہٹ میں اسے یہ خیال نہیں آیا کہ وہ گاڑی میں بیٹھ کر میرا پیچھا کرے۔

میں جان توڑ کر بھاگ رہا تھا۔ ایک بنگلے کے سامنے سے ایک گاڑی مین روڈ پر آئی اور رک گئی۔ وہ جمیل تھا۔ مجھے بھاگتے دیکھ کر اسے صورتِ حال کا اندازہ ہو گیا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا اور سرعت سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔

جمیل نے گاڑی یکدم آگے بڑھا دی پھر وہ تیز رفتاری کے ریکارڈ توڑنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ کارلوس میرا پیچھا ضرور کرے گا اور وہ سیدھا میرے ہوٹل پہنچے گا۔

میں نے جمیل سے کہا۔ "گاڑی کو کسی پارکنگ لاٹ میں چھوڑ دو اور کوئی ٹیکسی پکڑو۔"

"ہم شہری حدود میں داخل ہو جائیں تو میں گاڑی کو چھوڑ دوں گا۔" جمیل نے کہا اور جیٹ فائٹر کی رفتار سے گاڑی دوڑاتا رہا۔

دس منٹ بعد ہم پھر ورجینیا کی شہری حدود میں داخل ہو گئے۔ وہاں سڑک پر گاڑیوں کا رش تھا۔ آوازوں کا شور، مجھے اچھا لگ رہا تھا۔

ایک شاپنگ مال کے پارکنگ لاٹ میں جمیل نے گاڑی پارک کی اور ہم دونوں وہاں سے پیدل ہی ایک طرف روانہ ہو گئے۔

"اب کہاں چلنے کا ارادہ ہے سر؟" جمیل نے کہا۔

"ہوٹل میں تمہارا کوئی ضروری سامان تو نہیں ہے؟"

"میرے کپڑے ہیں اور لیپ ٹاپ ہے۔" جمیل نے کہا۔

"میرا بھی لیپ ٹاپ ہے۔ کپڑے تو اتنے اہم نہیں ہیں۔"

"ہم یہاں سے ہوٹل والوں کو ٹیلی فون کر سکتے ہیں کہ ہم ایمرجنسی میں یہاں سے جا رہے ہیں۔ ہمارے کمرے بک رہیں گے اور سامان کی حفاظت کرنا ہوٹل والوں کا کام ہے۔ میں انہیں یہ بھی بتا دوں گا کہ ان کی گاڑی شہر میں کس جگہ پارک ہے تاکہ وہ اپنی گاڑی وہاں سے لے جائیں۔"

یہ بھی غنیمت تھا کہ میرا پرس میرے پاس ہی تھا..... ....تمام ٹریولرز چیکس اور اے ٹی ایم کارڈز کے ساتھ ساتھ میری چیک بک بھی پاس تھی۔ جمیل کا پرس بھی موجود تھا۔

اسی وقت جمیل نے ایک ٹیکسی روک لی۔

میں نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہی کہا۔ "ایئرپورٹ چلو۔"

ڈرائیور نے گردن ہلائی اور ٹیکسی روانہ ہو گئی۔

ایئرپورٹ پہنچ کر معلوم ہوا کہ لاس اینجلس کے لیے پرواز ہمیں آدھے گھنٹے بعد ملے گی۔

ہم لاؤنج میں بیٹھ گئے۔ وہ جگہ قطعی غیر محفوظ تھی لیکن اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

"سر! آپ کا پاسپورٹ کہاں ہے؟"

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا پھر بُری طرح چونک اٹھا اور بولا۔ "شٹ! میرا پاسپورٹ تو بریف کیس میں ہے اور بریف کیس ہوٹل کے کمرے میں ہے۔"

"میرا پاسپورٹ بھی وہیں رہ گیا ہے۔" جمیل نے کہا۔

اچانک مجھے ہوٹل کے چیف سیکیورٹی آفیسر کا خیال آیا۔ میں نے جمیل سے کہا۔ "تم ہوٹل کا ٹیلی فون نمبر ملاؤ۔"

"میں ہوٹل والوں کو پہلے ہی ہدایات دے چکا ہوں سر!"

"مجھے وہاں کے چیف سیکیورٹی آفیسر سے بات کرنا ہے۔" میں نے کہا۔

"مسٹر آرنلڈ سے؟" جمیل نے پوچھا۔

"تم اس کا نام بھی جانتے ہو؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"اس کی جیب پر ہمیشہ نام کی پٹی لگی ہوتی تھی۔ آپ نے کبھی اس پر غور نہیں کیا ورنہ آپ کو بھی معلوم ہوتا۔" جمیل مسکرا کر بولا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر ہوٹل کا نمبر ملایا اور بولا۔ "مجھے مسٹر آرنلڈ سے بات کرنا ہے... جی ہاں، چیف سیکیورٹی آفیسر!" اس نے سیل فون میری طرف بڑھا دیا۔

سیل فون پر موسیقی کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی، پھر چند لمحے بعد مجھے آرنلڈ کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو۔"

"مسٹر آرنلڈ! میں خاور بول رہا ہوں۔ آپ کے ہوٹل کے کمرا نمبر..."

"میں پہچان گیا مسٹر خاور!" وہ ہنس کر بولا۔

"مسٹر آرنلڈ! میں اس وقت ایک مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ کارلوس میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔ آپ میرا ایک کام کر دیں۔"

آرنلڈ گھبرا گیا اور بولا۔ "آپ ٹھیک تو ہیں مسٹر خاور؟"

"ہاں، ابھی تک تو ٹھیک ہی ہوں۔" میں نے کہا۔

"بتائیے، میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟" اس نے پوچھا۔

"میرے اور میرے ساتھی کے کمرے میں ہمارے لیپ ٹاپ اور پاسپورٹ ہیں۔ اگر آپ وہ چیزیں وہاں سے نکال کر محفوظ کر لیں تو آپ کا احسان مند رہوں گا۔"

"لیپ ٹاپس، پاسپورٹ اور؟" اس نے پوچھا۔

"اور ہمارے بریف کیس بھی ہیں۔" میں نے کہا۔ "باقی سامان آپ کمروں میں ہی چھوڑ دیں۔ وہ کمرے ابھی تک ہمارے نام پر بک ہیں، ہم نے ابھی تک چیک آؤٹ نہیں کیا ہے۔"

"اوکے مسٹر خاور! میں ان چیزوں کو محفوظ جگہ پر پہنچا کر آپ سے بات کرتا ہوں۔" آرنلڈ نے کہا۔ "آپ کا سیل نمبر میں نے نوٹ کر لیا ہے۔"

فلائٹ کا اعلان ہوا تو مجھے ایک اور پریشانی نے گھیر لیا۔ مجھے بروقت اس ریوالور کا خیال آ گیا تھا جو میں نے کارلوس کی گاڑی سے نکالا تھا اور وہ اب تک میری جیب میں موجود تھا۔ اگر وہ ریوالور فلائٹ میں سوار ہونے سے پہلے میری جیب سے برآمد ہو جاتا تو میں بہت مصیبت میں پھنس جاتا۔

میں ٹہلتا ہوا باتھ روم تک گیا۔ باتھ روم کے اندر جا کر میں نے ریوالور جیب سے نکالا، اسے رومال سے اچھی طرح صاف کیا اور ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔

ہم فلائٹ کی طرف جا رہے تھے کہ میرے سیل فون کی گھنٹی بج گئی۔

میں بُری طرح چونک اٹھا۔ وہ کال یقیناً کارلوس کی ہو گی۔ میں نے سیل فون جیب سے نکالا۔ اسکرین پر اجنبی نمبر تھا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ بات نہ کروں، پھر میں نے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

میں نے سیل فون کان سے لگایا۔ "ہیلو!"

"مسٹر خاور!" آرنلڈ کی آواز سن کر مجھے سکون محسوس ہوا۔ "میں نے آپ کا سامان محفوظ کر لیا ہے۔ آپ نے بہت بروقت اطلاع دی تھی۔ میں نے فوراً ہی آپ دونوں کا سامان وہاں سے نکال کر اپنے سیف میں محفوظ کر لیا تھا۔ اسی وقت وہاں کارلوس پہنچ گیا اور بولا... مجھے خاور سے ملنا ہے۔ میں

نے اسے بتایا کہ مسٹر خاور اس وقت موجود نہیں ہیں۔ یہ تو غنیمت ہے کہ اس نے کمروں کی تلاشی پر اصرار نہیں کیا ورنہ ہوٹل کی انتظامیہ بھی مجبور ہو جاتی۔ اس نے صرف اتنا کہا، خاور جیسے ہی واپس آئے مجھے اطلاع دے دینا۔"

"تھینک یو مسٹر آرنلڈ!" میں نے کہا۔

"یو آر ویلکم سر!" اس نے کہا۔ "لیکن آپ ہیں کہاں؟"

"میں اس وقت جہاں بھی ہوں، کارلوس کی پہنچ سے دور ہوں۔" میں نے کہا۔ "جلد ہی آپ سے ملاقات ہوگی۔" یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس بھاگ دوڑ میں تقریباً ساری رات گزر گئی تھی۔ میں طیارے میں بیٹھتے ہی سو گیا۔ پھر جمیل نے مجھے بیدار کیا اور بولا۔ "سر! ہمارا طیارہ لاس اینجلس ائرپورٹ پر اتر چکا ہے۔" میں نے جلدی سے سیٹ بیلٹ کھولی اور دوسرے مسافروں کے ساتھ ساتھ ہم بھی طیارے سے باہر آ گئے۔

"میرا دل تو چاہ رہا تھا کہ یہاں سے سیدھا کسی ہوٹل جاؤں اور لمبی تان کر سو جاؤں لیکن اس وقت میں کسی بھی عیاشی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ ہمیں آج ہی عینا سے ملنا تھا۔

جمیل نے ٹیکسی ڈرائیور کو اس علاقے کا پتا سمجھا دیا تھا۔ وہ سیدھا ہمیں اس علاقے میں لے گیا۔

وہ لاس اینجلس کا خاصا پوش علاقہ تھا۔ وہاں واقعی بنگلوں کے بجائے محل تھے۔ ایکڑوں پر پھیلے ہوئے وہ وسیع و عریض محل دیکھ کر انسان یوں بھی مرعوب ہو جاتا ہے۔

ٹیکسی ڈرائیور نے ہمیں ایک وسیع و عریض محل کے سامنے اتار دیا۔ وہاں ابھی تک لوگ خواب خرگوش میں تھے۔ وہ پورا علاقہ مجھے اونگھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اب سب سے بڑا مرحلہ عینا سے ملاقات کرنے کا تھا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ میں عینا سے کیوں ملنا چاہتا ہوں؟ چانڈیو نے مجھے صرف عینا کی تلاش کا کام سونپا تھا۔ میں نے اپنا کام کر دیا تھا لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ مجھے یہ تصدیق بھی تو کرنا پڑے گی کہ میں واقعی عینا تک پہنچ گیا ہوں۔ ممکن ہے ایڈی نے مجھ سے جھوٹ بولا ہو۔ ممکن ہے یہ وہ عینا نہ ہو جس کی مجھے تلاش تھی۔

"ہم کسی اور جگہ سے اس محل میں داخل ہوں گے۔" میں نے جمیل سے کہا۔

"سر! ابھی میں بھی سوچ رہا تھا۔" جمیل نے جواب دیا۔ "ہم بنگلے کی عقبی دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہو سکتے ہیں۔" جمیل نے کہا۔

ہم دونوں تیزی سے بنگلے کی پشت پر پہنچے لیکن باؤنڈری وال خاصی بلند تھی۔ وہاں کوئی ایسا درخت بھی نہیں تھا جس کے سہارے ہم لوگ اندر داخل ہو سکتے۔

میں دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ جمیل میرے کندھوں پر چڑھا اور میں آہستہ آہستہ دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔

میں پوری طرح کھڑا ہو گیا تو اچانک میرے شانوں پر وزن ختم ہو گیا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا، جمیل اوپر دیوار پر پہنچ چکا۔ پھر وہ بلی کی طرح تیزی سے دوسری طرف کود گیا۔ میں دروازے کے پاس پہنچ گیا لیکن دروازہ نہ کھلا۔

چند منٹ بعد جمیل مجھے پھر دیوار پر دکھائی دیا اور بولا۔ "سر! دروازے پر تالا لگا ہے۔ تالا شاید کافی عرصے سے لگا ہوا ہے اس لیے وہ زنگ آلود ہو گیا ہے۔"

"تم دوبارہ دیوار پر کیسے پہنچے؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"ایک بانس کے ذریعے۔" اس نے جواب دیا۔ "میں آپ کو بانس دے رہا ہوں۔ آپ بھی اس کے ذریعے اندر آ سکتے ہیں۔"

اس نے بانس اٹھا کر میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے دوڑ کر بانس زمین پر ٹکایا اور اس کے ذریعے لمبی زقند بھری۔ دوسرے ہی لمحے میں بھی دیوار پر تھا۔ میں نے وہ بانس دوبارہ اندر کی طرف کھینچ لیا کہ واپسی میں بھی ہمیں اس کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔

ہم دبے پاؤں بنگلے کے اقامتی حصے کی طرف بڑھے۔ وہ حصہ بھی وہاں سے کافی دور تھا۔ بیچ میں چاروں طرف خاصی اونچی باڑ تھی اس لیے اندر کا منظر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہم باڑ کے نزدیک پہنچے تو مجھے کچھ فاصلے پر چھوٹا سا ایک راستہ نظر آیا جو اس گھاس کو تراش کر بنایا گیا تھا۔

میں نے جونہی اس راستے میں سے اندر داخل ہونے کی کوشش کی، مجھے بنگلے کے وسیع و عریض لان پر ایک لڑکی دکھائی دی۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ پھر وہ پلٹی اور دوبارہ اسی طرف آنے لگی جدھر سے گئی تھی۔

میں پھرتی سے زمین پر لیٹ گیا۔ وہ لڑکی ننگے پیر گھاس پر ٹہل رہی تھی۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھا تو میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ وہ عینا تھی۔ جوان ہو کر وہ خاصی خوب صورت اور پرکشش دوشیزہ میں تبدیل ہو گئی تھی لیکن اس کے چہرے کے نقوش وہی تھے جو میں نے گیارہ سالہ عینا کی تصویر میں دیکھے تھے۔

میں تیزی سے پیچھے ہٹ گیا اور جمیل سے بولا۔ "یہ لڑکی عینا ہی ہے۔"

"یس سر!" جمیل نے کہا۔ "میں نے بھی اسے پہچان لیا ہے۔ یہ عینا ہی ہے۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "کیا اس سے ملنا بھی ضروری ہے؟"

"نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں ایک دفعہ پھر اسی طرح باہر آ گئے۔

ہم دونوں نے اپنا لباس جھاڑا اور ایک مرتبہ پھر ٹہلتے ہوئے بنگلے کے مرکزی دروازے کی طرف چلے گئے۔ وہاں نیم پلیٹ پر کسی کلارا ڈکسن کا نام لکھا تھا۔

ٹیکسی کی تلاش میں ہمیں کافی دور تک پیدل چلنا پڑا۔ میں وہاں سے سیدھا ایک فائیو اسٹار ہوٹل پہنچا اور ایک کمرا بک کر لیا۔

کمرے میں پہنچ کر میں نے جمیل سے کہا۔ "تم بھی کچھ دیر آرام کر لو۔ ہاں، اٹھنے کے بعد پہلا کام یہ کرنا کہ مارکیٹ سے میرے اور اپنے لیے کپڑے اور ضروری سامان خرید لانا۔"

پھر میں لمبی تان کر سو گیا۔

میری آنکھ کھلی تو دیوار گیر گھڑی ڈھائی بجا رہی تھی۔ جمیل بیڈ پر نہیں تھا۔ میں نے اٹھ کر کھڑکی کا پردہ ہٹایا تو کمرے میں روشنی پھیل گئی۔

میں باتھ روم سے نکلا تو جمیل آ چکا تھا۔ وہ کپڑوں کے علاوہ ضرورت کی تمام چیزیں لے آیا تھا۔ اس میں ایک سوٹ بھی شامل تھا۔

میرے کپڑے یوں بھی بہت میلے ہو رہے تھے۔ میں نے پہلے شیو کیا، پھر جمیل کے لائے ہوئے کپڑے پہنے تو مجھے ایک مرتبہ پھر اپنے معزز ہونے کا احساس ہوا۔

میں نے سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ سیل فون نکال کر چانڈیو کا نمبر ڈائل کیا۔ میں جانتا تھا کہ اس وقت کراچی میں خاصی رات بیت چکی ہوگی لیکن چانڈیو کو فون کرنا بھی ضروری تھا۔

تین چار گھنٹیاں بجنے کے بعد اس نے کال ریسیو کی اور خمار آلود لہجے میں بولا۔ "ہیلو!"

"ہیلو چانڈیو صاحب! میں خاور بول رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"جی خاور صاحب!" اس کی آواز سے نیند ایک دم غائب ہو گئی۔ "آپ نے تو کوئی رابطہ ہی نہیں کیا۔ کیا عینا کا کوئی سراغ ملا؟"

"جی ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "میں نے عینا کا سراغ لگا لیا ہے۔"

"کہاں ہے وہ؟" چانڈیو کے لہجے میں اضطراب تھا۔

"وہ یہیں امریکا میں ہے۔"

"مجھے اس کا ایڈریس بتائیں۔" چانڈیو نے کہا۔

"اس کے لیے آپ کو یہاں آنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔ "عینا نہ جانے کس سے خوف زدہ ہے۔ وہ چند دن بعد اپنا ٹھکانا بدل لیتی ہے۔"

"وہ اس وقت کہاں ہے؟"

"اس وقت تو وہ ٹیکساس میں ہے۔" میں نے دانستہ غلط بیانی سے کام لیا۔ "لیکن ممکن ہے جب تک آپ وہاں پہنچیں، وہ نیویارک جا چکی ہو۔ میرے آدمی اس کی نگرانی کر رہے ہیں۔ وہ اب تک تین ٹھکانے بدل چکی ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں پہلی میسر پرواز سے پہنچ رہا ہوں۔" چانڈیو نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے سیل فون جیب میں رکھتے ہوئے جمیل سے کہا۔ "اب تم پوچھو گے کہ میں نے چانڈیو سے غلط بیانی کیوں کی؟"

"نو سر!" جمیل نے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ آپ نے ایسا کیوں کیا ہے۔ میں بھی یہی کرتا۔ مجھے چانڈیو کی بات پر یقین تو آ گیا تھا لیکن یہاں آ کر جب میں نے عینا کے مالی حالات دیکھے تو الجھ کر رہ گیا۔ ابھی چانڈیو نے اسے اپنی جائداد دی نہیں ہے۔ وہ تو اسے تلاش کر رہا ہے پھر عینا کے پاس اتنی دولت کہاں سے آ گئی؟"

"گڈ!" میں نے کہا۔ "تم واقعی بہت دور تک دیکھتے ہو۔" میں نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ "میں بھی اسی وجہ سے الجھ کر رہ گیا ہوں کہ عینا کے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی؟"

"اس سلسلے میں معلومات ہو سکتی ہیں سر!" جمیل نے کہا۔ "مجھے عینا کا ایڈریس زبانی یاد ہے اور میرے پاس نوٹ بک میں بھی موجود ہے۔ ہم لاس اینجلس کی میٹروپولیٹن کارپوریشن کے ذریعے معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ بنگلا کس کے نام پر ہے؟"

"تو پھر پہلی فرصت میں یہ کام کر لو۔"

"او کے سر!" اس نے کہا۔ "میں کل شام تک سب کچھ معلوم کر لوں گا۔"

وہ دن تقریباً گزر ہی چکا تھا۔ میں نے ڈائننگ ہال میں جانے کے بجائے روم سروس سے کمرے ہی میں کھانا منگوا لیا۔ کھانے کے بعد میں دیر تک ٹی وی کے مختلف چینلز کی نشریات دیکھتا رہا۔

دوسرے دن جمیل اپنے مشن پر روانہ ہو گیا اور میں وقت گزاری کے لیے مقامی مارکیٹ میں گھس گیا۔

میں نے ماریہ کے لیے بہترین پرفیوم خریدے کہ خوشبو اس کی کمزوری تھی۔ اس کے علاوہ بھی میں نے بلا مقصد بہت سی چیزیں خرید لیں۔

میں آوارہ گردی کے بعد ہوٹل واپس پہنچا۔ جمیل ابھی تک نہیں آیا تھا۔

میں کپڑے تبدیل کر کے بیڈ پر نیم دراز ہوا ہی تھا کہ دروازے پر دستک دے کر جمیل اندر آ گیا۔ وہ خاصا تھکا ہوا لگ رہا تھا۔

وہ خود ہی بولا۔ ”سر! میں نے عینا کی دولت مندی کا سراغ لگا لیا ہے۔“

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”یہ دولت اصل میں عینا کے سوتیلے باپ کی ہے۔“ جمیل نے بتایا۔ ”عینا کی ماں فلورا نے چانڈیو سے علیحدگی کے بعد ڈکسن نام کے ایک صنعت کار سے شادی کر لی تھی۔ شادی کے چند سال بعد ایک حادثے میں ڈکسن مر گیا۔ یوں اس کی ساری دولت فلورا کو مل گئی۔ عینا اپنے سوتیلے باپ کو شدید ناپسند کرتی تھی۔ اس نے تین چار سال تو اپنے سوتیلے باپ کے ساتھ گزارے پھر گھر چھوڑ دیا۔ ماں اپنی عیاشیوں میں مگن تھی اس لیے اسے بھی عینا کا خیال نہیں آیا۔ عینا نے بہت چھوٹی عمر میں خود ملازمت کر کے تعلیم بھی حاصل کی پھر وہ عارضی طور پر اس ریسٹورنٹ میں کام کرنے لگی۔

”اس دوران میں اس کی ماں بھی مر گئی۔ ڈکسن سے اس کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس نے زندگی بھر عینا کی خبر نہیں لی لیکن شاید زندگی کے آخری دنوں میں اسے بیٹی کا خیال آ گیا ہو۔ اس نے اپنی وصیت میں اپنی تمام جائداد، بینک بیلنس اور کاروبار سب کچھ عینا کے نام کر دیا۔ اس کے مرنے کے بعد فلورا کے وکیل نے عینا کو اطلاع دی کہ تمہاری ماں نے وصیت میں تمہارے لیے کروڑوں ڈالرز کی جائداد، بینک بیلنس اور کاروبار چھوڑا ہے۔ عینا نے ملازمت چھوڑی اور پوری جائداد اپنی تحویل میں لے لی۔“

”لیکن چانڈیو کو اتنی شدومد سے عینا کی تلاش کیوں ہے؟“ میں نے کہا۔ ”مجھے تو اب اس کی اس بات پر بھی یقین نہیں ہے کہ وہ اپنی جائداد عینا کے نام کرنا چاہتا ہے۔ بس یہی نکتہ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے جمیل میاں!“ میں نے بے تکلفی سے کہا۔

”سر! اب ایک کام اور کیجیے گا۔“ جمیل نے کہا۔ ”چانڈیو سے اپنی محنت کا پورا معاوضہ وصول کرنے کے بعد ہی اسے عینا کے بارے میں کچھ بتایئے گا۔“

”ہاں، اگر وہ ہمیں صاف صاف سب کچھ بتا دیتا تو شاید میں اس کے ساتھ کوئی رعایت بھی کرتا لیکن اب نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”وہ تو مجھے بلینک چیک دے رہا تھا۔ میں چانڈیو سے کہوں گا کہ آپ مجھے چیک نہ دیں بلکہ یہ رقم میرے اکاؤنٹ میں جمع کرا دیں۔ آن لائن بینکنگ کے ذریعے یہ کام فوراً ہی ہو جائے گا۔ پھر ماریہ سے تصدیق کرنے کے بعد ہی میں اسے عینا کا پتا بتاؤں گا۔“

☆☆☆

چانڈیو کے نیویارک پہنچنے سے پہلے ہی ہم لوگ نیویارک پہنچ گئے تھے۔

چانڈیو کی فلائٹ ایک گھنٹے کی تاخیر سے نیویارک پہنچی۔ میں نے اس سے پہلے ہی نیویارک کے اس فائیو اسٹار ہوٹل میں ایک کمرا بک کرا لیا تھا جس میں ہم دونوں مقیم تھے۔ میں نے جمیل کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ چانڈیو کی نظروں سے دور رہے۔ جمیل اس وقت میرے ساتھ موجود تھا لیکن جیسے ہی چانڈیو ارائیول لاؤنج سے باہر نکلا تو وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر چلا گیا۔

حسب توقع چانڈیو بھی تنہا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ دو آدمی اور بھی تھے جو اپنے حلیوں سے اس کے ملازم لگ رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے انہیں کوٹ اور پینٹ زبردستی پہنایا گیا ہو۔ ان کے چہروں پر بڑی بڑی مونچھیں تھیں جو ان کے لباس سے ذرا بھی میل نہیں کھا رہی تھیں۔

چانڈیو نے والہانہ انداز میں مجھ سے ہاتھ ملایا اور بولا۔ ”خاور صاحب! میں آپ سے کہنا بھول گیا کہ کسی ہوٹل میں میرے لیے...“

”میں نے آپ کا کمرا بک کرا دیا ہے سر!“ میں نے جواب دیا۔ ”ہاں کمرا صرف ایک ہے۔ اگر آپ مجھے بتا دیتے کہ آپ کے ساتھ کوئی اور بھی ہوگا تو میں مزید کمرے بک کرا لیتا۔“

”نو پرابلم!“ چانڈیو ہنس کر بولا۔ ”یہ دونوں میرے ملازم ہیں۔ ان کے لیے میں خود ہی کوئی بندوبست کر لوں گا۔“

ہوٹل کے رینٹ اے کار سے میں نے ایک گاڑی بھی حاصل کر لی تھی۔

میں نے چانڈیو سے انتظار کرنے کو کہا اور پارکنگ لاٹ سے گاڑی نکال لایا۔ ائرپورٹ سے مین ہٹن تک میں

چانڈیو سے ادھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ اس نے ایک آدھ دفعہ عینا کا تذکرہ کرنے کی کوشش بھی کی لیکن میں اسے بہت خوب صورتی سے ٹال گیا۔

ہوٹل پہنچ کر میں نے اس سے کہا۔ ”سر! آپ آرام کریں۔ آپ نے بہت لمبا سفر کیا ہے۔ اب شام کو آپ سے ملاقات ہوگی۔“

”خاور صاحب!“ چانڈیو مسکرا کر بولا۔ ”مجھ سے شام تک صبر نہیں ہوگا۔ آپ پلیز ایک گھنٹے بعد میرے کمرے میں آ جائیں۔“

”او کے سر!“ میں بھی مسکرا دیا۔

چانڈیو سے فارغ ہو کر میں اپنے کمرے میں آ گیا اور جمیل کو بھی بلا لیا۔

”سر! چانڈیو کے ساتھ جو آدمی ہیں، وہ کوئی نیک نام لوگ نہیں ہیں بلکہ جرائم پیشہ ہیں۔ میں ان دونوں کو پہچانتا ہوں۔“

”اس کے زیادہ تر ملازم اسی قسم کے ہوں گے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ خود بھی تو ایک وڈیرا ہے۔“

”لیکن یہ لوگ اس کے ساتھ نہیں ہوتے ہیں۔“ جمیل نے کہا۔ ”ایسا لگتا ہے جیسے چانڈیو انہیں خاص طور پر یہاں لایا ہے۔ ممکن ہے ان لوگوں کے یہاں کچھ رابطے بھی ہوں۔ انہیں اسلحے کی ضرورت بھی تو پڑ سکتی ہے۔ وہ اسلحہ اپنے ساتھ تو لے کر نہیں آ سکتے تھے۔ میں ان دونوں پر نظر رکھتا ہوں۔“

”ابھی تو وہ دونوں یہیں موجود ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”چانڈیو نے مجھے ایک گھنٹے بعد بلایا ہے۔ میں نے تو اس سے کہا تھا کہ میں شام کو اس سے ملوں گا، وہ آرام کرے لیکن وہ فوری طور پر مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔“

”جب وہ خود ہی آرام نہیں کرنا چاہتا تو آپ کو کیا ضرورت ہے اس کی فکر کرنے کی؟“ جمیل نے کہا۔

ایک گھنٹے بعد جمیل وہاں سے چلا گیا اور میں لفٹ کے ذریعے گیارھویں فلور پر پہنچ گیا۔ چانڈیو کا کمرا اسی فلور پر تھا۔

چانڈیو گویا میرے ہی انتظار میں بیٹھا تھا۔ دروازے پر دستک دیتے ہی اس نے مجھے کمرے میں بلا لیا۔

”خاور صاحب!“ اس نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ ”اب زیادہ صبر نہیں ہوتا۔ مجھے بتائیں، میری عینا کہاں ہے؟“

”عینا بالکل ٹھیک ہے۔“ پھر میں نے چونکنے کی اداکاری کی اور کہا۔ ”چانڈیو صاحب! یہاں آپ کے بھی تو ذاتی ہوٹل اور ڈپارٹمنٹل اسٹورز ہیں؟“

وہ لمحے بھر کو گڑبڑا کر رہ گیا پھر سنبھل کر بولا۔ ”ہاں، میرے اسٹورز تو یہاں ہیں لیکن نیویارک میں کوئی ہوٹل نہیں ہے۔“

”آپ کو اپنا وعدہ تو یاد ہوگا؟“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔

”کون سا وعدہ خاور صاحب؟“ اس نے الجھ کر پوچھا۔

”آپ کو یاد ہے، آپ مجھے بلینک چیک دے رہے تھے؟“

”اچھا وہ...“ چانڈیو جبراً مسکرایا۔ ”ہاں مجھے یاد ہے۔“

”وہ چیک تو آپ کے پاس موجود ہوگا؟“ میں پھر مسکرایا۔

”آپ فکر نہ کریں، میں آپ کو نیا چیک بنا دوں گا۔ آپ...“

”سر! ایسا کریں کہ آپ مجھے چیک دینے کے بجائے رقم میرے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دیں۔“ میں نے کہا۔ یہ سب کہتے ہوئے مجھے شدید کوفت ہو رہی تھی کیونکہ میں اس قسم کی فطرت کا مالک نہیں تھا۔

”وہ تو سب ہو جائے گا۔“ چانڈیو کچھ جھنجلا گیا۔ ”آپ مجھے عینا کا پتا تو بتائیں۔“

”سر! میں اپنے سارے کام چھوڑ کر یہاں تک آیا ہوں تو آپ کو اس کا پتا بھی ضرور بتاؤں گا۔ اس وقت میرے حالات کچھ خراب ہیں۔ کئی دفعہ میری سیکریٹری کا ٹیلی فون آ چکا ہے۔ مجھے رقم کی شدید ضرورت ہے۔ آپ اپنے بینک کو ٹیلی فون کر دیں تو اسی وقت میری مشکل آسان ہو جائے گی۔“

”بابا، ایسی بات تھی تو آپ مجھے ٹیلی فون پر بتا دیتے۔ میں رقم آپ کے اکاؤنٹ میں کچھ دن پہلے ہی ٹرانسفر کرا دیتا۔“

”صورتِ حال اچانک ہی بگڑی ہے۔“ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے خاور صاحب!“ چانڈیو نے کہا۔ ”آپ نے محنت کی ہے تو آپ کو اس کا پورا معاوضہ بھی ملے گا۔ آپ بتائیں، آپ کتنی رقم لکھنا چاہتے تھے اس چیک میں؟“

”دس لاکھ۔“ میں نے یوں کہا جیسے دس روپے کی بات کی ہو۔

”اچھا، میں اپنے بینک منیجر کو ٹیلی فون کر دیتا ہوں۔“ اس نے سیل فون اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”وہ دس لاکھ روپے آپ کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دے گا۔“

”سر! روپے نہیں دس لاکھ ڈالرز۔“ میں نے کہا۔

چانڈیو چند لمحے تک مجھے گھورتا رہا پھر بولا۔ ”میں آپ کی محنت سے دگنا بلکہ اس سے بھی زیادہ معاوضہ ادا کر چکا ہوں۔ ہاں، آپ کو پانچ دس لاکھ کی مزید ضرورت ہو تو میں

آپ کو دے رہا ہوں۔ اس سفر میں آپ کے جو اخراجات ہوئے ہیں، ان کا بل بنا کر مجھے دے دیں۔"

"سوری سر!" میں نے خشک لہجے میں کہا۔ "آپ سے وعدہ تو کچھ اور ہوا تھا۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" چانڈیو سنجیدہ ہو کر بولا۔

"آپ مجھے بلینک چیک دے رہے تھے یا نہیں؟"

"ہاں، میں دے رہا تھا لیکن آپ نے تو خود ہی پانچ لاکھ کا چیک لیا تھا۔" چانڈیو کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

"وہ تو ابتدائی اخراجات تھے۔" میں نے کہا۔ "آپ نے خود ہی کہا تھا۔"

"کیا آپ کے خیال میں وہ رقم کم تھی؟" چانڈیو نے حیرت سے کہا۔

"ابتدائی اخراجات کے لیے کم نہیں تھی۔" میں نے جواب دیا۔

"تم مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہو؟" وہ اچانک آپ سے تم پر آ گیا۔

"میں بھلا آپ کو کیسے بلیک میل کر سکتا ہوں سر!" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "آپ مجھے معاوضہ دے کر اپنا کام کرا رہے ہیں۔ آپ معاوضہ نہیں دیں گے تو ہمارا معاہدہ ختم!"

"یہ تو زیادتی ہے خاور صاحب!" اس نے کہا۔

"آپ میری مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔"

"میں نے ایسی تو کوئی بات نہیں کی۔ سب کچھ پہلے سے طے تھا۔" میں نے کہا۔

وہ کچھ دیر تک مجھے گھورتا رہا پھر بولا۔ "ٹھیک ہے، آپ اپنا اکاؤنٹ نمبر مجھے دے دیں۔"

میں نے سیل فون نکالا اور اس میں محفوظ اکاؤنٹ نمبر اسے بتا دیا۔

"دس لاکھ کی جگہ اگر میں آپ کو پانچ لاکھ ڈالرز دے دوں تو؟"

"سر! آپ اتنے بڑے آدمی ہیں، آپ کو اس قسم کی گفتگو زیب نہیں دیتی۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"اچھا بابا! جیسے تمہاری مرضی۔" اس نے کہا پھر بولا۔ "اس وقت تو پاکستان میں رات ہوگی۔ اب یہ کام رات ہی کو ہو سکے گا۔"

"میں نے تو آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ آپ آرام کریں۔" میں ہنس کر بولا۔ "میں رات کو آ جاؤں گا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ پیسے لینے سے پہلے تم مجھے کچھ نہیں بتاؤ گے؟" وہ ایک مرتبہ پھر بپھر گیا۔

"آپ تو خود بزنس مین ہیں۔" میں نے کہا۔ "ڈیل تو ڈیل ہوتی ہے۔ اور پلیز، مجھ سے اس لہجے میں بات مت کریں۔ میں آپ کا ملازم نہیں ہوں۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے پھر رات کو ملاقات ہوگی۔" اس نے کہا اور مجھے یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ اب دفع ہو جاؤ یہاں سے۔

میں باہر آ گیا۔ اپنے کمرے میں آ کر میں نے ایک مرتبہ پھر جمیل کو بلایا اور اسے اس صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

"چانڈیو کی نیت میں پہلے ہی سے کھوٹ تھا۔" جمیل نے کہا۔ "آپ اگر یہ بات نہ کرتے تو وہ آپ کو کسی بھی قیمت پر ادائیگی نہ کرتا۔" جمیل نے کہا۔

"اب میں رات کے دس بجے سے پہلے اس کے پاس نہیں جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "اس وقت تک تو پاکستان میں بینک کھل چکے ہوں گے۔"

"آپ میڈم ماریہ سے بات کر لیں۔" جمیل نے کہا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے ان کا ٹیلی فون آیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ آپ کا سیل فون آف ہے۔"

"میرا فون آف ہے؟" میں نے حیرت سے کہا اور جیب سے اپنا سیل فون نکال لیا۔ وہ واقعی آف تھا۔ اس کی بیٹری لو ہو چکی تھی۔

"میرے سیل فون کی بیٹری لو ہو گئی ہے۔" میں نے کہا۔ "تم ذرا ماریہ کا نمبر ملا کر مجھے دو اور میرا سیل فون چارج پر لگا دو۔" میں نے کہا۔

میں نے ماریہ سے بات کی تو وہ چھوٹتے ہی اکھڑ گئی۔ "تم تو وہاں جا کر مجھے بالکل بھول ہی گئے ہو۔ اب تو اپنا سیل فون بھی آف رکھتے ہو۔"

"ایسی بات نہیں ہے ماریہ جان!" میں نے اسے چڑانے کو کہا۔ وہ جان، جانو، جانی وغیرہ سے بہت چڑتی تھی۔

"پھر شروع کر دی تم نے فضول گفتگو؟" اس نے جھلا کر کہا۔

"یار! میرے سیل کی بیٹری لو ہو گئی ہے اس لیے وہ آف تھا۔ ہاں، صبح نو بجے کے قریب مجھے کال کر لینا۔" میں نے کہا۔ "چانڈیو یہاں پہنچ چکا ہے۔ میں صبح اس سے اپنے اکاؤنٹ میں رقم منتقل کراؤں گا۔"

"کتنی؟" ماریہ نے پوچھا۔

"بس ہماری محنت رائگاں نہیں جائے گی۔" میں نے گول مول جواب دیا۔

"میں رقم پوچھ رہی ہوں؟" اس نے کہا۔

"رقم تو وہ صبح ہی بتائے گا۔" میں نے کہا۔

"دیکھو، پانچ لاکھ ڈالرز سے کم پر راضی مت ہونا۔"
"پانچ لاکھ ڈالرز تو..."
"بہت زیادہ تھے۔" ماریہ نے میری بات کاٹ دی۔ "لیکن یہ بھی تو دیکھو کہ ہم نے اس کا کتنا بڑا کام کیا ہے۔ ہاں، یہ تو بتاؤ کہ کام واقعی ہو گیا؟"
"ہاں۔" میں نے کہا۔ "میں نے اس کی بیٹی کا سراغ لگا لیا ہے۔" میں نے کہا۔ "باقی تفصیل وہیں آ کر بتاؤں گا۔ تم بھی شاید سو رہی ہو گی۔"
"او کے، میں صبح ٹیلی فون کروں گی۔" اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔
جمیل میرا سیل فون چارج پر لگا چکا تھا۔ میں نے اس کا سیل فون اس کے حوالے کیا۔ وہ بولا۔ "میں ذرا چانڈیو کے دونوں آدمیوں کی خبر لے لوں۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔
میں بھی وقت گزاری کے لیے ہوٹل کے لاؤنج میں چلا آیا۔ چانڈیو کے دونوں آدمیوں کو وہاں دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ وہ ایک طویل سفر کر کے آئے تھے اور اب بھی بیٹھے جاگ رہے تھے۔ میں ٹہلتا ہوا ان کے پاس چلا گیا۔ وہ دونوں مجھے دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔
"آپ لوگ بھی جا کر آرام کریں۔" میں نے ان سے کہا۔ "آپ بھی تھک گئے ہوں گے۔"
"جب بڑا سائیں کہے گا تو ہم بھی چلے جائیں گے۔" ان میں سے ایک بولا۔
میں نے انہیں آزمانے کے لیے کہا۔ "یار! یہاں ایک بات کی بہت پریشانی ہے۔"
"کیا سائیں؟" ان میں سے ایک بولا۔
"آدمی اپنے ساتھ کوئی ہتھیار نہیں رکھ سکتا۔ ہتھیار ہوتا ہی نہیں ہے تو رکھے گا کیا؟"
"سائیں، یہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" ان میں سے ایک بولا۔ "آپ کو یہاں بھی ہر قسم کا ہتھیار مل جائے گا۔"
"اچھا، وہ کیسے؟"
"آپ حکم کرو سائیں۔" اس نے جواب دیا۔ "ہتھیار آپ کے پاس پہنچ جائے گا۔"
میں نے کچھ فاصلے پر جمیل کو دیکھا لیکن اسے نظر انداز کرتا ہوا ہوٹل کے ریسٹورنٹ کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

رات کے دس بجے تھے۔ چانڈیو میرے سیل فون پر دو دفعہ کال کر چکا تھا لیکن میں نے اس کی کال کا جواب نہیں دیا۔ ساڑھے دس بجے کے قریب میرے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے کہا۔ "کم ان۔"
چانڈیو کا ایک آدمی دروازہ کھول کر اندر آ گیا اور بولا۔ "سائیں! بڑا سائیں آپ کو بلا رہا ہے۔"
"اچھا، تم چلو میں آ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔
چانڈیو غصے میں بھرا بیٹھا تھا۔ اس نے مجھ سے اکاؤنٹ نمبر پوچھا اور اپنے بینک کو ہدایت کی کہ مسٹر خاور کے اکاؤنٹ میں دس لاکھ ڈالرز ٹرانسفر کر دو۔ پھر اس نے میرا اکاؤنٹ نمبر بتایا اور سیل فون آف کر کے جیب میں رکھ لیا۔
اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں چانڈیو سے معذرت کر کے کمرے میں ایک طرف چلا گیا۔ وہ ماریہ کی کال تھی۔
"ہیلو!" میں نے کہا۔
"خاور! ابھی ابھی بینک سے ٹیلی فون آیا ہے کہ ہمارے اکاؤنٹ میں دس لاکھ ڈالرز جمع ہو چکے ہیں۔"
"وہ لوگ کب سے اطلاع دینے لگے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔
"میں نے منیجر سے کہا تھا کہ رقم اکاؤنٹ میں آتے ہی مجھے ٹیلی فون کر دے۔"
"ٹھیک ہے ماریہ۔" میں نے کہا۔ "اس وقت تو میں ایک میٹنگ میں ہوں، تم سے بعد میں بات کرتا ہوں۔" میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔
"اب بتاؤ عینا کہاں ہے؟" چانڈیو نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔
"عینا اس وقت لاس اینجلس میں ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نے آپ کو بتایا تو تھا کہ وہ اپنے ٹھکانے تبدیل کرتی رہتی ہے۔" پھر میں کچھ سوچ کر بولا۔ "چانڈیو صاحب! آپ کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت ہے کہ عینا آپ کی بیٹی ہے؟" میں نے کہا۔
"میرے پاس تمام ثبوت موجود ہیں۔" اس نے کہا۔ "عینا کا برتھ سرٹیفکیٹ، میونسپل کا سرٹیفکیٹ اور نکاح نامہ؟" پھر وہ منہ بنا کر بولا۔ "تمہیں ان باتوں سے کیا غرض؟ یہ میرا دردِ سر ہے کہ عینا میری بیٹی ہے یا نہیں۔"
"میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ مجھ سے اس لہجے میں بات نہیں کریں۔" میں نے ترش روئی سے کہا۔
"سوری!" وہ جلدی سے بولا۔ اس موقع پر وہ مجھ سے بگاڑنا نہیں چاہتا تھا ورنہ کسی سے معذرت کرنا تو وڈیروں کی شان کے خلاف ہوتا ہے۔
"ہم ابھی لاس اینجلس کے لیے روانہ ہوں گے۔"

اس نے کہا۔ "ابھی کوئی فلائٹ ہو تو ابھی چلے جائیں۔" میں نے کہا۔ "میں آپ کو عینا کا پتا بتا دیتا ہوں۔"
"ٹھیک ہے، مجھے ایڈریس دے دو۔" چانڈیو نے کہا۔ "لیکن یاد رکھو، اگر تم نے مجھے... آپ نے مجھ سے غلط بیانی کی ہو گی تو..."
"میں کبھی اپنے کسی کلائنٹ سے غلط بیانی نہیں کرتا۔" میں نے کہا پھر ہوٹل کا رائٹنگ پیڈ اٹھا کر اس پر عینا کا ایڈریس لکھ دیا۔ "میں ابھی امریکا ہی میں ہوں۔ جب تک آپ نہیں کہیں گے، میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔" میں نے کہا۔
"آپ کو جانا بھی نہیں چاہیے۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔
میں اس کے کمرے سے باہر نکل آیا۔
اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے فلائٹ انکوائری ٹیلی فون کی اور ورجینیا کی دو سیٹیں بک کرا لیں۔ فلائٹ صبح پانچ بجے کی تھی۔ میں نے لاس اینجلس کی فلائٹ کے بارے میں پوچھا تو معلوم ہوا کہ لاس اینجلس کی فلائٹ صبح سات بجے یہاں سے روانہ ہو گی۔ میں نے جمیل کو بلا کر اسے بھی بتا دیا کہ ہم صبح پانچ بجے ورجینیا کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔

☆☆☆

ہم ورجینیا پہنچے تو آرنلڈ مجھے دوبارہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں نے کاؤنٹر پر آ کر ادائیگی کی اور اپنے کمرے کی چابی مانگی۔ کاؤنٹر کلرک نے چابی میرے حوالے کر دی۔
آرنلڈ مجھے ایک طرف لے گیا اور بولا۔ "مسٹر خاور! آپ یہاں کیوں آ گئے؟ آپ کی جان کو خطرہ ہے۔ کارلوس کئی دفعہ یہاں آ چکا ہے۔ وہ سخت طیش کے عالم میں ہے۔ اب تک اسے علم ہو چکا ہو گا۔"
"آپ پریشان نہ ہوں مسٹر آرنلڈ!" میں نے کہا۔ "کارلوس میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"
میں کمرے میں پہنچا تو تھوڑی دیر بعد آرنلڈ بھی بریف کیس، ہمارے لیپ ٹاپ اور پاسپورٹ وغیرہ لے آیا۔
اسی وقت جمیل بھی کمرے میں آ گیا۔ میں نے اس کا لیپ ٹاپ اور پاسپورٹ اس کے حوالے کیا اور آرنلڈ سے پوچھا۔ "مسٹر آرنلڈ! آپ لوگوں نے اپنی گاڑی وہاں سے منگوا لی تھی؟"
"ہاں، وہ تو میں نے تھوڑی دیر بعد ہی منگوا لی تھی۔" آرنلڈ نے کہا۔
اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھا لیا۔ "یس!"
"سر! مسٹر کارلوس آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔" ڈیسک کلرک نے بتایا۔
"مسٹر کارلوس؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "وہ کب آئے؟"
"وہ ابھی آئے ہیں سر!" کلرک نے جواب دیا۔
"او کے، انہیں میرے کمرے میں بھیج دو۔"
آرنلڈ فوراً کمرے سے باہر نکل گیا۔
تھوڑی دیر بعد کارلوس میرے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ شدید غصے میں تھا۔ "تم کیا سمجھتے تھے مسٹر خاور! تم مجھ سے بچ کر فرار ہو جاؤ گے؟"
"میں ایسا سمجھتا تو یہاں کبھی واپس نہ آتا۔" میں نے کہا۔
"تو پھر اس دن کیوں فرار ہوئے تھے؟" وہ بلند لہجے میں بولا۔
"اس دن نہ جانے مجھے کیا ہوا تھا؟" پھر میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "کارلوس! تم یہ بتاؤ کہ عینا سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟"
"کیوں؟" اس نے پوچھا۔
"اس لیے کہ مجھے اس کی طرف سے فکر ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نے اس کا سراغ لگا لیا ہے۔"
وہ بری طرح چونکا۔ "تم نے اس کا سراغ لگا لیا؟"
"ہاں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔ "اب مجھے لگ رہا ہے کہ وہ خطرے میں ہے۔"
"تم اس کی فکر مت کرو۔" کارلوس نے کہا۔ "وہاں میرے بہترین آدمی موجود ہیں۔ میں ابھی انہیں مزید ہدایت دے دیتا ہوں۔" اس نے سیل فون نکالا اور کسی کو کچھ ہدایات دینے لگا۔

☆☆☆

دوسرے دن شام کو ٹی وی کا ہر نیوز چینل ایک ہی خبر بار بار نشر کر رہا تھا۔ "معروف صنعت کار...... ڈکسن کی بیٹی عینا پر قاتلانہ حملہ! حملہ آوروں میں سے دو عینا کے گارڈز کے ہاتھوں مارے گئے۔ چار آدمی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ حملہ آوروں کا ایک ساتھی پولیس کی حراست میں ہے۔"
اسی شام کارلوس میرے پاس آیا اور بولا۔ "خاور! تمہاری اطلاع کا بہت بہت شکریہ۔ میں اگر اپنے آدمیوں کو الرٹ نہ کرتا تو عینا کو واقعی نقصان پہنچ جاتا۔" پھر وہ کچھ جذباتی ہو کر بولا۔ "عینا میرے لیے سب کچھ ہے خاور! میں اسے اسی وقت سے چاہتا ہوں، جب میں نے اسے دیکھا تھا۔ اب یہ ضروری تو نہیں ہے کہ جسے چاہا جائے، اسے

حاصل بھی کرلیا جائے۔ عینا نے کبھی میری محبت کا جواب محبت سے نہیں دیا۔ گزشتہ دنوں اس نے مجھ سے یہ درخواست ضرور کی تھی کہ مجھے کچھ نامعلوم لوگوں کی طرف سے خطرہ ہے۔ میں نے اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا اور عینا تک پہنچنے والے ہر آدمی کو ناکامی ہوئی۔ ایک آدمی اس تک پہنچ بھی گیا تھا لیکن پھر وہ ایسا غائب ہوا کہ اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ تم واحد آدمی ہو جو عینا تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے اور زندہ واپس بھی آگئے۔ بس دوسروں میں اور تم میں یہی تو فرق ہے اسی لیے میں تمہیں اپنا دوست سمجھتا ہوں۔"

"دوست سمجھتے ہو؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اس دن تم مجھے اس ویرانے میں کیوں لے گئے تھے؟"

"وہ..." کارلوس ہنس کر بولا۔ "میں تمہیں اپنے کچھ آدمیوں سے ملانا چاہتا تھا اور تمہیں اپنے ساتھ کام کرنے کی آفر کرنے والا تھا۔" پھر وہ چونک کر بولا۔ "میں لاس اینجلس جارہا ہوں، تم چلنا پسند کرو گے؟"

"میں ضرور چلوں گا، میں بھی تو دیکھوں کہ پولیس نے کسے گرفتار کیا ہے۔"

☆☆☆

میرے سامنے وہ شخص عام قیدی کے روپ میں تھا جس کے ایک اشارے پر بڑے سے بڑا کام ہوجاتا تھا۔ جو اپنے علاقے کا بے تاج بادشاہ تھا۔ وہ علی حسن چانڈیو تھا۔ وہ اس وقت ایک مجرم کی طرح سر جھکائے میرے سامنے کھڑا تھا۔

"آپ نے ایسا کیوں کیا چانڈیو صاحب۔ عینا تو آپ کی بیٹی ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ تو اس سے ملنے کے لیے تڑپ رہے تھے؟"

"میں بتاتی ہوں۔" اچانک میری پشت سے ایک مترنم آواز سنائی دی۔

میں نے گھوم کر دیکھا، وہ عینا تھی۔

"یہ شخص واقعی میرا باپ ہے، بہت دولت مند ہے لیکن انسان کی ہوس کبھی ختم نہیں ہوتی۔ میرے سوتیلے باپ ڈکسن کی طرف سے مجھے جو دولت اور جائداد ملی ہے، اس پر میرے اس باپ کی... اس سگے باپ کی نظریں تھیں۔ یہ جانتا تھا کہ مجھے ختم کرنے کے بعد قانونی طور پر جائداد اسی کو ملے گی کیونکہ یہی میرا قانونی وارث ہے۔ اس کے لیے اس نے مجھے ختم کرنے کا پلان بنایا۔ پہلے اس نے یہاں کے سراغ رساں اداروں کی خدمات حاصل کیں لیکن وہ کارلوس کی وجہ سے مجھ تک نہیں پہنچ سکے، پھر اس نے ایک پیشہ ور قاتل کی خدمات حاصل کیں لیکن وہ بھی مجھ تک پہنچنے سے پہلے مارا گیا۔ پھر شاید اس نے آپ کی خدمات حاصل کی تھیں۔"

"ہاں، اس نے صرف مجھ سے آپ کا سراغ لگانے کہا تھا۔ قتل کرنے کا حکم نہیں دیا تھا ورنہ شاید میں اس کی بات ماننے سے انکار کردیتا کیونکہ میں پیشہ ور قاتل نہیں ہوں۔"

"مجھے لگتا ہے کہ تم پیشہ ور عاشق ہو۔" کارلوس بولا۔

"وہ تو خیر ہر شخص ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا تم نہیں ہو؟"

اچانک چانڈیو بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "مجھے معاف کردو بیٹی! میری آنکھوں پر اس وقت طمع اور لالچ کی پٹی بندھ گئی تھی۔"

"میں آپ کو معاف بھی کردوں تو قانون آپ کو معاف نہیں کرے گا۔" عینا نے کہا۔

"قانون کی یہ سزا مجھے منظور ہے، بس تم ایک دفعہ معاف کردو۔"

"میں نے آپ کو معاف کیا پاپا۔" عینا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "لیکن میں یہ کبھی نہیں بھول سکوں گی کہ آپ نے میری تلاش کے لیے کسی کو بلینک چیک بھی دیا تھا۔ وہ بلینک چیک اگر آپ نے میری محبت میں دیا ہوتا تو میں زندگی بھر خود پر ناز کرتی رہتی لیکن... وہ بلینک چیک تو میری موت کا پروانہ تھا لیکن اس کے باوجود میں نے آپ کو معاف کردیا۔ دعا کرتی ہوں کہ اللہ بھی آپ کو معاف کردے۔" یہ کہہ کر عینا آنسو پونچھتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ چانڈیو بھی رو رہا تھا۔

میں نے وہاں سے باہر نکل کر ماریہ کو ٹیلی فون کیا۔ "میں اگلے ہفتے تک کراچی پہنچ رہا ہوں۔ اپنے ابو اور امی سے کہنا کہ تیار رہیں۔"

"کس لیے؟" ماریہ نے حیرت سے کہا۔

"بھئی، کیا وہ تمام عمر تمہارا بوجھ سینے پر اٹھائے رہیں گے۔ میں تمہیں..."

"بکواس مت کرو۔" ماریہ نے کہا۔ "ایک بلینک چیک کیا مل گیا کہ تمہارا دماغی توازن بگڑ گیا۔"

"میرا بلینک چیک تو تم ہو ماریہ!" میں نے کہا۔ "اب اس چیک پر کراچی پہنچ کر میں اپنے ہاتھوں سے رقم لکھوں گا۔ بس تمہارے دستخط کی ضرورت ہے۔"

"تم کراچی پہنچو پھر دیکھتے ہیں۔" ماریہ نے ہنس کر کہا اور سلسلہ منقطع کردیا۔

میرے چاروں طرف رنگ ہی رنگ بکھر گئے۔

خراجِ جنگ

سیر نینارض

مجازِ محبت ہو... یا محاذِ جنگ ہو... کامیابی کا سنہرا خواب ہو... یا ناکامی کا عذاب ہے۔ حصولِ جذبہ و جاں کے لیے کچھ خراج دینا ہی پڑتا ہے... جنگِ عظیم دوم کے منظر اور پس منظر میں چھپے حقائق اور افسانے کی طرح جوڑ توڑ... جہاں ہر سو گردباد کی شامتیں تھیں... اور کسی بھی پل سب بکھرنے کو تھا...

اُس روز موسم خوش گوار اور آسمان بادلوں سے صاف تھا۔ دن کی چہل پہل پوری طرح نظر آرہی تھی۔ وہ ہفتہ وار بازار کا دن تھا۔ پوری سڑک پر خریداروں کا ہجوم تھا۔ سڑک کے دونوں طرف خوانچہ فروشوں کی بھیڑ تھی اور عارضی دکانیں سجی ہوئی تھیں۔ پنیر، مکھن، شہد، پھل اور سبزیوں سے لے کر گوشت اور استعمال شدہ کپڑوں تک، ہر طرح کا سامان ان عارضی دکانوں پر دستیاب تھا جنہیں سستی خریداری کے متلاشی ذوق و شوق سے خرید رہے تھے۔

جب سے جنگ عظیم دوم چھڑی تھی اور فرانس پر نازی جرمن فوج نے حملے شروع کیے تھے، تب سے زندگی کا ڈھب ہی بدل گیا تھا۔ چیزوں کی قلت ہو چلی تھی۔ جنگ کے سبب بازار بند تھے۔ غربت بہت زیادہ ہو گئی تھی اور اب لے دے کے اس طرح کے عارضی ہفتہ وار بازار ہی لوگوں کی ضرورت پوری کرنے کا وسیلہ تھے۔

اس وقت لیز پولیٹ قصبے کی حالت اتنی اچھی نہیں تھی۔ ...ویسے بھی جب سے جرمنوں کے حملہ کرنے کی اطلاعات پھیلی تھیں، تب سے قصبے میں بھی سناٹے کا عالم تھا۔ لوگ گھروں سے نکلتے ہوئے ڈرتے تھے کہ نہ جانے کب جرمن جہاز آسمان سے موت برسانے کے لیے نمودار ہو جائیں۔ اُن دنوں موت کا خوف ہر شہری کے سر پر سوار تھا۔

کارل ہاف نے چمڑے کے بنے اس پرس میں کاغذ بھرے اور اس پر جمی دھول کو صاف کر کے رکھ دیا۔ وہ یہ پرانا پرس صوفیہ کے لیے لینا چاہتا تھا مگر قیمت اس کی جیب پر بہت ہی بھاری تھی۔ اس نے ایک شرٹ اٹھائی اور اسے پہن کر بٹن بند کرنے لگا مگر وہ بٹن بڑے تھے اور اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ کافی تگ و دو کے بعد آخر وہ بٹن لگانے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ شرٹ اسے ذرا چھوٹی تھی، ویسے بھی جب وہ شرٹ نئی ہوگی تب خریدار نے اپنے ناپ سے اسے خریدا ہوگا۔ شرٹ دیکھ کر لگتا تھا کہ کارل کا قد اس سے دو تین انچ بڑا ہی رہا ہوگا۔ وہ اسے تھوڑی اونچی تھی۔ آستینیں بھی ذرا سی چھوٹی تھیں۔

کارل کی بیوی صوفیہ بھی وہیں قریب کھڑی تھی۔ وہ بہت نرم مزاج اور پیار کرنے والی عورت تھی۔ شاید کارل بٹن نہ لگا پاتا اگر وہ آگے بڑھ کر اس کی مدد نہ کرتی۔ وہ اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس نے بڑے پیار سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے صوفیہ کے ہاتھوں کی گرمی نے اس کے وجود میں حرارت بھر دی ہو۔ اس نے بڑے پیار سے بیوی کا ہاتھ تھپتھپایا۔

کارل نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنے قریب کیا اور آنکھیں موند لیں۔ وہ اس کے بالوں، پرفیوم اور کپڑوں کی مہک کو اپنے اندر بسا لینا چاہتا تھا۔ وہ تہ خانے میں رہتے تھے جہاں کا پلاستر جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ اس کے کپڑوں میں تہ خانے کی نمی بسی ہوئی تھی مگر کارل کو اپنی جوان بیوی سے ہم آغوش ہونے کے بعد بھی وہ بو محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ صوفیہ سے شادی کر کے وہ خود کو بہت خوش نصیب سمجھنے لگا تھا۔ صوفیہ بھی ہر طرح سے اس کا خیال رکھنے کی کوشش کرتی تھی اور اب ان کے گھر میں بہت جلد نیا مہمان آنے والا تھا۔ طویل عرصے کے بعد، کارل کو ایک بار پھر اپنے خاندان کے مکمل ہونے کا احساس ہونے لگا تھا۔ کارل کا خیال تھا کہ جب وہ اتنی پیار کرنے والی بیوی ہے تو ماں کتنی اچھی ثابت ہوگی۔ کارل بہت رومانی مزاج تھا۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ اسے یونہی ہم آغوش لیے، کھڑے کھڑے ساری زندگی گزار دیتا مگر وہ فی الوقت ایسا نہیں کر سکتا تھا۔

صوفیہ کا باپ ان سے کافی دور ایک قصبے میں رہتا تھا اور پچھلے دن ہی وہ ان سے ملنے آیا تھا۔ اسے کتابوں کا جنون تھا۔ وہ بھی ان کے ساتھ ہی بازار چلا آیا اور اس وقت برابر کے اسٹال پر پرانی کتابوں کے ڈھیر سے اپنی پسند کی کتابیں ڈھونڈ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ سسر کی موجودگی میں وہ دیر تک اپنی بیوی سے پیار نہیں جتا سکتا۔ کارل نے آہستگی سے صوفیہ کو خود سے علیحدہ کیا۔

"اے کارل... ذرا ادھر آؤ۔" اس دوران ایبے نے اسے پکارا۔ کارل تیزی سے کتابوں کے اسٹال کی طرف بڑھا۔

"کچھ ملا آپ کو اپنی پسند کا؟" اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"یہ دیکھو۔" بوڑھے نے ایک کتاب اس کی طرف بڑھائی۔ کارل نے چند لمحوں تک ورق گردانی کر کے کتاب واپس کی۔ "میرا خیال ہے کہ آپ زولا کو پڑھیں، ویسے بھی آپ نے اب تک اسے نہیں پڑھا ہے۔" اس نے سسر کو مشورہ دیا۔

ایبے مسکرا دیا۔ وہ جانتا تھا کہ زولا اس کے داماد کا پسندیدہ فکشن رائٹر ہے۔ وہ اس کے گھر پر زولا کے کئی ناول دیکھ چکا تھا۔

"ویسے مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں، اگر آپ چاہتے ہیں تو یہ کتاب خرید لیں۔" کارل نے اس کے مسکرانے پر خفت محسوس کی اور جھٹ سے ایک اور مشورہ دیا۔

"بہتر ہے تم اپنی بیوی کے پاس جاؤ۔" ایبے نے کہا اور مسکرایا۔ "میں اپنی پسند کی کتابیں خود ہی ڈھونڈ لوں گا۔" یہ کہہ کر اس نے اسے جانے کا اشارہ کیا۔ کارل تیزی سے صوفیہ کی طرف لپکا جو سامنے والے اسٹال پر کھڑی پنیر خرید رہی تھی۔

کچھ دیر بعد ایبے بھی آگیا۔ "یہ لو پکڑو۔" اس نے خاکی رنگ کا ایک بڑا لفافہ اسے تھمایا جس میں کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ "خریداری ہو گئی ہو تو پھر چلو۔" اس نے صوفیہ سے کہا۔

"بس دو منٹ... ذرا پیسے دے دوں۔" اس نے پرس ٹٹولتے ہوئے جواب دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ تینوں گھر لوٹ رہے تھے۔

"اے کارل! سنو..." چلتے چلتے ایبے کو کچھ یاد آیا۔ اس نے بھی اپنے ہاتھ میں ایک شاپنگ بیگ تھام رکھا تھا۔ "یہ جو میں نے پیکٹ دیا تھا، تم اسے فوراً مسز ڈیروکس تک پہنچا دو، یہ ان کے لیے ہے۔ ہم دونوں گھر چلتے ہیں۔"

کارل نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ اس وقت دوپہر ہو رہی تھی۔ کارل کو یقین تھا کہ وہ چند منٹ میں ہی میڈم کے گھر تک پہنچ جائے گا۔ وہ اس کے سسر کی رشتے میں بہن تھی۔

وہ پیکٹ پہنچا کر لوٹا تو صوفیہ لنچ بنا چکی تھی۔ وہ بھی فوراً بیٹھ گیا۔ بیس منٹ بعد اس نے صوفیہ کو گلے لگا کر الوداع کیا اور باہر نکل آیا۔ اس کی سائیکل گلی میں کھمبے سے بندھی کھڑی تھی۔

جس وقت وہ سائیکل سے بندھی زنجیر کا تالا کھول رہا تھا، عین کھمبے کے سامنے والے گھر کے کچن کی کھڑکی سے میڈم کریپی اسے دیکھ رہی تھی۔ شاید اس وقت وہ لنچ تیار کر رہی ہوگی۔ چند لمحوں تک تو وہ اسے دیکھتی رہی اور پھر کہنے لگی۔ "ارے دافیر! اس دوپہر میں کہاں جا رہے ہو۔" اس کا لہجہ کاٹ کھانے والا اور آواز نہایت بھونڈی تھی۔

وہ مسکرا دیا۔ "یہ تو ابھی تک مجھے خود نہیں پتا۔"

اس کا جواب سن کر میڈم کریپی نے زور کا قہقہہ لگایا۔

"مذاق مت اڑائیں، میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ سائیکل پر بیٹھ۔

"ذرا دیکھ بھال کر رہنا، کہیں بچا ڈھونڈنے کے لیے ہر دروازے پر دستک دینے نکلو۔" یہ کہہ کر وہ پھر زور سے ہنسی۔

"ایسی بات نہیں، اب مجھے راستے ذہن نشین ہو چکے ہیں۔"

"مگر پھر بھی... اپنا خیال رکھنا۔" وہ بھی کہاں باز آنے والی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے پیڈل پر پاؤں مارا۔

دافیر، کارل کا نقلی نام تھا۔ اس نے اس نام سے اپنی تمام جعلی شناختی دستاویزات تیار کرا رکھی تھیں، جن پر اس کا نام کارل میں دافیر، رہائش مکان نمبر 33 ریو ڈاؤن ٹاؤن، ڈیٹروٹ، کلیر مونٹ درج تھا۔ قصبے میں سب لوگ کارل کو اسی نام سے پکارتے تھے۔ کسی کو اس کا اصل نام معلوم نہ تھا سوائے صوفیہ کے۔

کارل تیزی سے پیڈل پر پاؤں چلا رہا تھا۔ وہ مرکزی سڑک کی طرف جا رہا تھا۔ وہ راستہ کافی لمبا لیکن محفوظ تھا۔ وہ شارٹ کٹ بھی لے سکتا تھا مگر وہ غیر محفوظ تھا۔ اکثر فیکٹری مزدوروں کے بھیس میں لوٹ مار کرنے والے اس راستے پر پھرتے رہتے تھے اور جو تنہا آدمی اُن کے ہتھے چڑھ جاتا، لوٹ مار کر لیتے تھے۔ جنگ کی وجہ سے کارخانے بند تھے اور بے روزگاری عروج پر تھی۔ ویسے بھی وہ راستہ سائیکل کے لیے تھوڑا نامناسب تھا۔ کارل کا خیال تھا کہ غیر ہموار اونچے نیچے راستوں پر سائیکل چلانے سے بہتر تھا کہ لمبے لیکن ہموار اور محفوظ راستے پر سفر زیادہ مناسب ہوتا ہے۔

پچھلی مرتبہ اس نے وہی راستہ استعمال کیا تھا لیکن جن سے وہ ملنے گیا، انہوں نے اسے خبردار کر دیا مگر اس نے دوسری بار بھی وہی راستہ استعمال کیا۔ وہ تو خوش قسمتی تھی کہ اچانک اسے احساس ہو گیا کہ سامنے کھڑے جو لوگ اسے روک رہے تھے، دراصل وہ لٹیرے تھے۔ بس، پھر کیا تھا۔ اس نے جلدی سے سائیکل کا رخ جنگل کی طرف موڑا اور پھر کئی روز تک وہ اس طرف گیا ہی نہیں۔ اس کے بعد ایک بار پھر گیا تھا مگر فیصلہ کر لیا کہ وہ راستہ مناسب نہیں۔ اب وہ وہاں کب جائے گا، یہ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔

کارل اور صوفیہ، دونوں کو صرف ایک رات پہلے ہی شہر سے فرار کے منصوبے کا علم ہوا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ایسا کرنا ہی بہتر ہوگا۔ اس بات کا شدید خطرہ تھا کہ کسی بھی وقت جرمن بمبار جہاز شہر پر گولہ باری کر سکتے تھے۔ دراصل یہ شہر راہداری پر تھا جہاں سے گولہ بارود، ادویات، آلات اور دوسرا امدادی سامان سپلائی کرنے والے فوجی ٹرک گزرتے تھے۔ اس راستے کی بربادی کا مطلب، جرمنوں کے نزدیک دشمن کی سپلائی لائن کو نقصان پہنچانا تھا۔ بات کچھ بھی ہو مگر ایک بات سچ تھی کہ جرمنوں کے خلاف ہونے والی مزاحمت میں قصبہ ایک اہم حیثیت رکھتا تھا۔

دو چار روز کی بات تھی، صوفیہ اور وہ قصبے سے فرار ہونے ہی والے تھے۔ قصبے کی خفیہ یہودی جماعت نے فرار کا منصوبہ تیار کر لیا تھا اور انہیں ہدایت کی تھی کہ وہ تیاریاں کر لیں، کسی بھی وقت فرار ہونا پڑے گا۔

کارل کو یقین تھا کہ فارم ہاؤس کے لیے یہ سفر اس کا آخری سفر ہے۔ وہ فرار ہو کر کہاں جائیں گے، یہ وہ نہیں جانتا تھا۔ وہ بچوں کی تمام کتابیں بھی لے آیا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ واپسی میں مادام سے فیس بھی لیتا آئے گا۔

جب کارل سائیکل کے پیڈل زور زور سے چلاتا ہوا جا رہا تھا، تب سڑک کنارے بیٹھی میڈم ہرمن اسے دیکھ رہی تھی۔ میڈم ہرمن سڑک کنارے فروٹ کا اسٹال لگاتی تھی۔ صوفیہ اکثر ان سے فروٹ خریدتی تھی مگر ہر بار وہ دوسرے درجے کے سیب خریدتی تھی۔ جنگ کے ان دنوں میں میڈم ہرمن کے اسٹال پر لگے چھوٹے سے بلیک بورڈ پر سیب اور دوسرے درجۂ اوّل کے پھلوں کی قیمت کم از کم صوفیہ کی پہنچ سے بالکل ہی باہر تھی۔ ویسے بھی اسے مہنگے سیب خریدنے کا شوق نہیں تھا۔ وہ سیب کا مربّا بناتی تھی جس کے لیے دوسرے درجے کے سیبوں سے بھی کام چل جاتا تھا۔

وہ جنگِ عظیم دوم کے سب سے تاریک لمحات تھے۔ جرمنوں نے برٹنی کے ساحل سے لے کر اسٹالن گراڈ کے مضافات تک، یورپ کے بڑے حصے کو فتح کر لیا تھا لیکن اس کے باوجود انہیں مختلف حصوں میں مزاحمت کا سامنا تھا۔ فرانس کے سرحدی علاقے میں بھی ان کے خلاف مزاحمت تھی لیکن وہاں لڑنے والے فوجیوں کو جرمنوں کے ساتھ ہاتھ ملانے پر کچھ زیادہ تردّد نہ تھا مگر ان کی فوجی قیادت ایسا نہیں چاہتی تھی، سو وہ بڑھتے ہوئے جرمن قدموں کو روکنے کے لیے مزاحمت کیے جا رہے تھے۔

جب وہ شہر کے کنارے پر پہنچا تو وہاں دو نازی فوجی کھڑے تھے۔ یہ علاقہ کسی حد تک جرمنوں کے قبضے میں تھا مگر پھر بھی وہاں فرنچ مزاحمت جاری تھی۔ ایک نے اسے ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا۔ کارل نے اس کی طرف دیکھا اور پیڈل پر پاؤں چلانا بند کر کے بریک دبا دیے۔ دوسرے فوجی نے اپنی بندوق کی نال اس کے سینے کی طرف کی ہوئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ بس وہ ابھی گولی داغ دے گا۔ وہ لمحہ بھر کو سہم گیا۔ اس وقت دونوں فوجی شہر کے معروف سینما کے قریب موجود تھے۔ جیسے ہی اس نے رکنے کا اشارہ کرنے والے کے پاس پہنچ کر سائیکل روکی، اس نے فرنچ میں پوچھا۔ ”کون ہو تم؟“ کوئی بھی فرنچ جاننے والا یہ سن کر بتا سکتا تھا کہ وہ لہجہ اس زبان کا نہ تھا۔ کارل نے خاموشی سے اس کی بات سنی اور جیب سے اپنی شناختی دستاویزات نکال کر اس کی طرف بڑھا دیں۔

سنہری بالوں والے جرمن فوجی نے لمحہ بھر کو کاغذات الٹ پلٹ کر دیکھے اور پھر اپنے ساتھی کی طرف... بڑھا دیے۔ ”اس نے تو مجھے ڈائنٹ ہیمر تھما دیے ہیں، مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہے۔“ اس نے یہ بات جرمن زبان میں کہی تھی۔ اس کے ساتھی نے خشمگیں نگاہوں سے اسے گھورا۔

اس کی بات سن کر کارل نے دونوں ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔ وہ بڑی مشکل سے اپنی ہنسی قابو میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جرمن کارل کی مادری زبان تھی مگر اس وقت وہ اس کا اظہار کر کے اپنے لیے کوئی مصیبت نہیں کھڑی کرنا چاہتا تھا۔ اگر وہ جرمن زبان بول دیتا تو پھر اسے کئی مشکل سوالوں کے جوابات دینا پڑتے۔ وہ اس وقت اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔

دوسرے فوجی نے ایک اچٹتی ہوئی نظر کاغذات پر ڈالی اور ہاتھ کے اشارے سے اسے جانے کی اجازت دے دی۔

کارل نے سکون کا سانس لیا اور تیزی سے پیڈل پاؤں چلانے۔ وہ فرانس کے مضافات میں واقع اس نواحی قصبے سے، جلد سے جلد باہر نکل کر گھنے جنگلوں کے درمیان سے گزرنے والی سڑک تک پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ شہر کی حدود سے باہر نکل کر جنگل والے راستے پر آیا تو اس کے تنے ہوئے اعصاب پُرسکون ہوئے۔ تناؤ کے سبب اس کی گردن کے اکڑے پٹھوں کو بھی اب کچھ راحت ملی تھی۔

کچھ ہی دیر میں وہ اوریگن کے گھنے جنگل کے برابر سے گزر رہا تھا۔ پُرسکون اور خاموش فضا میں صرف پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ لمحہ بھر کے لیے کارل کو یہ ماحول جنت جیسا لگا مگر اگلے ہی لمحے اسے خیال آیا کہ جنگی جہازوں سے گرائے جانے والے بم جنتِ ارضی کے اس نمونے کو کسی بھی وقت جہنم میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ کب... یہ اسے پتا نہیں تھا مگر خدشہ تھا کہ کسی بھی وقت ایسا ہو سکتا ہے۔ امید ہر شخص کی یہی تھی کہ ایسا نہ ہو کم از کم شہروں پر تو بمباری نہیں ہونی چاہیے۔ جنگ لڑنی ہے تو محاذِ جنگ اس کام کے لیے کافی ہونا چاہیے مگر حقیقت یہی ہے کہ جنگ کے دوران بموں اور توپوں کی گھن گھرج میں شہریوں کی پکار امن کوئی نہیں سنتا۔ پرندوں کی چہچہاہٹ بھی اسے امن کی خواہش اور کسی ایسے شاعر کا نغمہ لگا جو جنتِ ارضی کی تعریف میں ہو۔ وہ سائیکل چلاتے ہوئے کچھ دیر کے لیے فطرت کے رومانی سحر میں کھو چکا تھا۔ خوش گوار ماحول نے اس کے ہیجان اور تنے ہوئے اعصاب کو بڑی حد تک پُرسکون کر دیا تھا۔

☆

اسے شہر کے جنگ زدہ ماحول سے باہر نکل کر بہت سکون ملتا تھا۔ کھلی فضا اسے اچھی لگ رہی تھی۔ اکثر صوفیہ اس سے شکوہ کرتی تھی کہ وہ مطمئن نظر نہیں آتا۔ سچ بات ہے کہ وہ پریشان رہتا تھا، آج سے نہیں برسوں سے۔ وہ یہودی تھا اور

جب جرمنی پر ہٹلر کا دور آیا اور یہودیوں پر مظالم شروع ہوئے تو وہ فرار ہو کر فرانس آ گیا۔ وہ چھ سال سے یہاں تھا۔ وہ جرمن کے سوا کوئی اور زبان نہیں جانتا تھا۔ اسے مقامیوں کے لب و لہجے میں فرنچ بولنے اور یہاں کے ماحول میں خود کو رچ بس جانے کے قابل بنانے میں چھ برس لگ گئے تھے۔ اس دوران میں اس نے بہت ساری مصیبتوں کا سامنا کیا۔ وہ رومان پسند تھا لیکن زندگی کی مصیبتوں اور خاندان کے بچھڑ جانے سے اس کے اعصاب اور نفسیات پر برا اثر پڑا تھا۔ اب گزشتہ سات آٹھ ماہ سے اس کی زندگی میں صوفیہ آئی تھی، جس کے بعد اس کی بے رونق زندگی میں محبت کی کچھ حرارت بیدار ہوئی تھی۔ جب سے اس نے بچے کی پیدائش کا سنا تھا، تب سے وہ اپنے خاندان کے بکھر جانے کا دکھ بھی بھولنے لگا تھا۔

ہوا یہ تھا کہ جب ہٹلر نے جنگِ عظیم دوم چھیڑی تو فرنچ حکومت نے فرانس میں موجود تمام جرمنوں کو ناپسندیدہ قرار دے کر، انہیں بطور جرمن شہری کے، گرفتار کیا اور نظر بندی کیمپوں میں بھیج دیا۔ کارل بھی گرفتار ہو کر کیمپ پہنچنے والوں میں شامل تھا۔

اگرچہ بہت سارے جرمنوں کو طویل عرصہ فرنچ کیمپوں میں رہنا پڑا تاہم بہت جلد کیمپ کی فرنچ فوج کو یقین ہو گیا کہ کارل کم از کم جرمنی کی موجودہ حکومت کا ہمدرد نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ صاف تھی۔ وہ یہودی تھا اور اس بنا پر اس کی ہٹلر سے نفرت یقینی تھی۔ ویسے بھی اس نے جرمنی سے اپنے فرار کی روداد سچ سچ بیان کر دی تھی۔ جس کے بعد اسے رہا تو کر دیا گیا مگر ایک شرط پر کہ وہ فرنچ فوج میں بطور ترجمان شامل ہو جائے۔ اسے یہ سودا سستا لگا۔ ویسے بھی ان دنوں فرنچ فوج میں ہٹلر مخالف ایسے جرمنوں کی بہت گنجائش تھی جو گرفتار جرمن فوجیوں سے گفتگو کا فرنچ میں ترجمہ کر سکیں۔ کارل کو دونوں زبانوں پر عبور تھا۔

اسے فوج جوائن کیے ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے۔ وہ جس محاذ پر تھا، وہاں ایک دن جرمنوں کا حملہ ہوا اور فرنچ فوج کو شکست ہوئی۔ جنگی قیدیوں میں وہ بھی شامل تھا۔ بس ایک بات اس کے لیے اطمینان کا سبب تھی۔ اسے بطور فرنچ قیدی کے گرفتار کیا گیا تھا اور جرمن یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ یہودی ہے۔ کارل نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے، وہ جرمن زبان کا ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالے گا اور نہ ہی ایسی کوئی حرکت کرے گا جس سے انہیں لگے کہ اصل میں وہ ان کے ملک کا ہی بندہ ہے۔

وہ جنگ کے ابتدائی ایّام تھے اور جرمن چاہتے تھے کہ فرنچ اور اس کی نوآبادیات میں شامل ملکوں کے شہریوں پر ان کا اچھا تاثر قائم ہو۔ اسی لیے انہوں نے کچھ عرصے بعد الجزائر اور مراکش سے تعلق رکھنے والے قیدیوں کو یہ کہہ کر رہا کر دیا کہ ان کی لڑائی فرانس سے ہے، ان کے ملکوں سے نہیں۔

کچھ دنوں بعد انہوں نے چند اور فرنچ قیدیوں کو بھی رہا کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کے خیال میں وہ قیدی بے ضرر تھے، کارل بھی ان میں شامل تھا۔ کارل کے ساتھ چند وہ سیاہ فام بھی تھے جو فرنچ شہری تھے مگر نسلاً الجزائر سے تعلق رکھتے تھے۔ انہیں سر پر تولیا لپیٹ کر، ہاتھ پیچھے باندھ کر نازی فوجیوں کی بندوقوں کی نوک پر کیمپ سے باہر نکالا گیا۔ وہ انہیں اس طرح جنگل میں چھوڑنا چاہتے تھے کہ وہ کیمپ کا راستہ یاد نہ رکھ سکیں۔ کارل کی رہائی کا سبب یہ تھا کہ اس نے گرفتاری کے وقت خود کو عام شہری بتایا تھا جسے جرمن فوجی شبے میں پکڑ کر پوچھ گچھ کے لیے لائے تھے۔ اس کا جھوٹ، نجات کا باعث بن گیا تھا۔

اپنی دھن میں مگن بیتی یادوں کو ذہن میں دہراتے دہراتے، اسے جرمن قید سے رہائی کے لمحات یاد آ گئے تھے۔ ”عقل بڑی چیز ہے۔“ وہ بڑبڑایا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

اسی دوران میں وہ مادام ڈیروکس کے فارم ہاؤس تک پہنچ چکا تھا مگر پھر بھی اس سے اتنے فاصلے پر ضرور تھا کہ اسے فارم ہاؤس کی طرف سے کوئی نہیں دیکھ پاتا مگر فارم ہاؤس کو وہ اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔

فارم ہاؤس کے سامنے نازی فوج کی ایک اسٹاف کار کھڑی تھی جس سے کچھ فاصلے پر سیاہ یونیفارم میں ملبوس ایک افسر مادام ڈیروکس سے باتیں کر رہا تھا۔ کار کے قریب گرے کوٹ میں ملبوس شخص مستعد کھڑا تھا۔ ”یقیناً ڈرائیور ہو گا۔“ کارل بڑبڑایا۔ پیڈل تھم چکے تھے اور بریک پر اس کی گرفت مضبوط ہونے لگی تھی۔

اسی دوران میں کارل نے پلٹ جانے کا سوچا مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ اسے دیکھ چکے تھے۔ اسے یقین ہو گیا کہ اب پلٹ کر جانے سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا بلکہ الٹا لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

ڈرائیور نے سیٹی بجا کر اسے متوجہ کیا اور قریب آنے کا اشارہ کیا۔ کارل کا تو جیسے دم ہی نکل گیا۔ وہ پیڈل پر نیم دلی سے پاؤں مارتا ہوا ان کے قریب پہنچا اور سائیکل کھ

فاصلے پر کھڑی کر کے مرے مرے قدموں سے ان کے پاس پہنچا۔

فوجی ڈرائیور نے گہری نظروں سے، اوپر سے نیچے تک اس کا جائزہ لیا۔ کارل کا دم خشک ہوا جا رہا تھا۔ وہ تھوک نگلنا چاہتا تھا مگر جب ہٹلر کا کوئی فوجی کسی یہودی کی کلائی تھام کر اپنے افسر کی طرف بڑھ رہا ہو تو کوئی یہ کیسے کر سکتا تھا۔ کارل بہت خوف زدہ تھا۔ اندر کا خوف اس کے چہرے پر جھلک رہا تھا اور دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔

کارل کا قصہ یہ تھا کہ وہ مادام ڈیروکس کے بچوں کو ہفتے میں تین دن ریاضی پڑھانے کے لیے آتا تھا اور آج کا دن اس کی ملازمت کا آخری دن ثابت ہونے جا رہا تھا۔ اس وقت بھی اس کی باسکٹ میں رف پیڈ اور کئی نوٹ بکس رکھی تھیں۔ یہ بچوں کے ٹیسٹ کی نوٹ بکس تھیں اور رف پیڈ پر پچھلی کلاسوں میں پڑھائی جانے والی ریاضی کے حل شدہ جوابات تھے۔ ان سے ہی وہ بچوں کو ریاضی کے فارمولے سمجھاتا تھا۔ اس کی بات کو درست ثابت کرنے کے لیے یہ کافی تھا مگر ڈرائیور نے کوئی سوال نہ کیا بلکہ اسے لے کر اپنے افسر کے پاس پہنچا۔ ”یہ اسی طرف آ رہا تھا۔“ اس نے کارل کو افسر کے سامنے سیدھا کھڑا کرتے ہوئے کہا اور پستول اس کی طرف تان لیا۔ وہ چاہ رہا تھا کہ مادام اس کی صفائی پیش کرے مگر وہ دم سادھے کھڑی تھی۔

افسر نے ایک نظر اس پر ڈالی اور جرمن لب و لہجے میں فرنچ بولتے ہوئے سخت لہجے میں سوال کیا۔ ”اس طرف ہی آ رہے تھے؟“

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”مگر کیوں؟“

”ان کے بچوں کا ٹیوٹر ہوں۔“ اس نے تھوک نگل کر کہا۔ اس کی آواز سے بھی خوف عیاں تھا۔

”شناخت...“

کارل نے اپنی شناختی دستاویزات جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھائیں۔ جرمن افسر غور سے انہیں پڑھنے لگا۔

”تمہارا عقیدہ کیا ہے؟“ اس نے دستاویزات پر سے نظر اٹھائے بغیر کہا۔

”کیتھولک عیسائی۔“ اس نے کہا۔ دستاویزات میں یہی لکھا تھا۔

”اچھا...“ اس نے نظریں اوپر اٹھا کر استفساریہ لہجے میں کہا۔ ”مگر پروٹسٹنٹ کیوں نہیں؟“

”میں پیدائشی کیتھولک ہوں۔“

”تمہارے باپ کا نام جیکوئز ہے؟“ اس کا لہجہ بدستور استفساریہ تھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”جی ہاں۔“ اس کی آواز میں اب تک کپکپاہٹ تھی۔

”تو وہ لوئے لا بریر میں جوتا سازی کا کام کرتے ہیں؟“

کارل نے پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ دستاویز کے مطابق یہی جواب بنتا تھا۔

”یہ تو بہت اچھا ہوا۔“ اس نے کارل کی طرف دیکھ کر ذرا نرم لہجے میں کہا۔ ”تو کیا میں ان کا بنایا ہوا ایک آرام دہ، نرم اور مضبوط جوتا استعمال کر سکتا ہوں؟“ اس نے کارل کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”کافی عرصے سے مجھے ایک اچھے جوتے کی تلاش ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے انگلی سے فوجی لانگ بوٹ کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ اس سے مختلف مگر آرام دہ ہونا چاہیے۔“

کارل نے بنا کچھ سوچے سمجھے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ اب تک خوف زدہ تھا۔

”بہت خوب...“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”یہ اچھا ہوا، ہم ابھی ان کے پاس چلتے ہیں۔“ افسر نے کہا۔

یہ سنتے ہی جیسے کارل کے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔ وہ جیکوئز کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا مگر اس کی شناختی دستاویزات پر یہی نام درج تھا۔ یہ ایک ایسے شخص کے برتھ سرٹیفکیٹ پر بنائی گئی دستاویزات تھیں جو شاید اپنی پیدائش کے پانچ ماہ یا پچیس سال بعد فوت ہو گیا ہوگا۔ کارل کو اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ چونکہ اس نام کے شخص کی موت ہو چکی تھی اور ریکارڈ میں موت کا اندراج تھا، لہٰذا اس کے برتھ سرٹیفکیٹ پر دستاویز لے کر گھومنے پھرنے میں کوئی قباحت نہیں تھی مگر اب مسئلہ بن چکا تھا۔

نازی افسر اس کے باپ سے ملنا چاہتا تھا اور وہ دستاویزات پر لکھے اس نام والے شخص کو پہچاننا تو دور کی بات، جانتا بھی نہیں تھا جسے وہ سارے جہان میں باپ بنائے پھر رہا تھا۔ اسے کبھی یہ خیال بھی نہیں آیا کہ ایسی صورت حال کا سامنا بھی کرنا پڑ سکتا ہے مگر اب ایسا ہو چکا تھا۔ دستاویزات کے مطابق وہ زندہ تھا اور جوتا سازی کرتا تھا۔ ادھر وہ جان بچانے کے لیے اس کے ساتھ جاتا بھی تو وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ دستاویزات پر جوتا ساز کی دکان کا جو پتا درج تھا، وہ دکان اب بھی وہاں ہے یا نہیں اور یہ کہ جوتا ساز

زندہ بھی ہے یا مر چکا ہے؟

کارل سخت مشکل میں پھنس گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا، اس کے ساتھ جائے بنا بات نہیں بنے گی اور اس کا کاغذی باپ نہ ملا تو پھر جرمن کے ہاتھوں پکڑے جانے اور مارے جانے سے اسے کوئی بچا نہیں سکتا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے تھوک نگلا اور اٹکتے اٹکتے کہا۔ ”اگر آپ ابھی چلنا چاہتے ہیں تو میں تیار ہوں۔“ یہ اور بات ہے کہ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس کی چال کامیاب نہ ہوئی تو؟ اس نے موہوم امید کے سہارے یہ کہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شاید افسر نے آزمانے کے لیے ایسا کہا ہو اور جب وہ آمادہ ہوگا تو شاید اسے یقین آ جائے کہ میں جھوٹ نہیں بول رہا۔

”کوئی مشکل تو نہیں ہوگی نا؟“ افسر نے استفساریہ لہجے میں پوچھا۔

”میرے خیال میں ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ اس بار اس کے لہجے میں اعتماد بھی جھلک رہا تھا۔

”سر...“ قریب کھڑے ڈرائیور نے یہ سن کر اپنے افسر کو مخاطب کیا۔ ”اس وقت ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ کہیں اور جا سکیں لیکن اگر آپ چاہیں تو...“ اس نے بات ادھوری چھوڑ کر بال واپس افسر کے کورٹ میں اچھال دی۔

ڈرائیور کا مشورہ سن کر کارل کو اطمینان محسوس ہوا۔ اسے یقین تھا کہ یہ چال کامیاب رہے گی۔

”یقیناً ہمارے پاس اتنا تو وقت ہوگا ہی۔“ اس نے ڈرائیور کی طرف دیکھا۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مگر کرنل نے آرڈر کیا تھا کہ شام پانچ بجے سے پہلے کار واپس کر دی جائے۔“ ڈرائیور نے وضاحت کی۔ ”مجھے واپس جا کر کار کی سروس بھی کرانی ہے تاکہ رات کو تقریب میں شرکت کے لیے اسے ہر طرح سے تیار کر سکوں۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکا۔ ”آپ تو کرنل کی بدمزاجی جانتے ہیں، ایسا نہ ہوا تو خواہ مخواہ مجھے سزا ملے گی۔“

اب کارل کو اپنے بچنے کی امید صرف اس میں دکھائی دی کہ افسر جیتتا ہے یا ڈرائیور۔ وہ دل ہی دل میں خدا سے دعا مانگ رہا تھا کہ ڈرائیور اسے ایسا نہ کرنے پر مجبور کر دے۔ ویسے اسے ڈرائیور کا جواز مضبوط لگا۔ اس نے افسر کو دیکھا۔ کم از کم وہ کرنل سے بڑا افسر تو کسی طور دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

کارل نے ڈرائیور کی طرف کن انکھیوں سے دیکھا۔ اس کا لباس اور چشمہ گرد آلود تھا اور جوتے بھی کیچڑ میں لتھڑے تھے جو اب سوکھ گئے تھے۔ اس نے دوسری نظر کار کی طرف ڈالی۔ وہ بھی بہت گندی ہو رہی تھی۔ کار کی حالت دیکھ کر تو یہی لگتا تھا کہ اسے کئی گھنٹوں تک سروس کی ضرورت ہوگی۔

ڈرائیور کا جواز سن کر افسر کچھ دیر تک سوچتا رہا اور پھر کہنے لگا۔ ”اگر ہم اس کے پاس ابھی نہیں جائیں گے تو کیا یہ یہیں کھڑا کھڑا دوبارہ ہمارے آنے کا انتظار کرتا رہے گا؟“ اس کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ ہر حال میں دکان پر جانا چاہتا ہے، بس رکاوٹ تھی تو ڈرائیور۔

”لیکن سر وہ آرڈر...“ ڈرائیور نے ادھورا جواب دیا۔

”میں تمہیں ابھی دوسرا آرڈر دے رہا ہوں... کارپورل۔“ افسر نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”یس سر...“ ڈرائیور نے فوجی لب و لہجے میں جواب دیا۔

”ہم ابھی لوئے لا بریر جائیں گے۔“

یہ سنتے ہی کارل کا دل دھک کر کے رہ گیا مگر اگلے ہی لمحے اس کی امید پھر جاگ اٹھی۔

”مگر سر...“ ڈرائیور نے کہنا شروع کیا۔ ”وہ پورا راستہ دوسری سمت میں ہے اور یہاں سے کافی دور بھی۔ ہمیں وہاں جانے اور پھر کیمپ واپس پہنچنے تک کئی گھنٹے لگ سکتے ہیں۔ وہ راستہ بھی ٹھیک نہیں ہے۔“ ڈرائیور بھی ضد پر اڑا تھا۔

”یہ میرا حکم ہے۔“ افسر نے سر جھٹک کر کہا۔ ”ہم اسی وقت چل رہے ہیں۔“

اس کا لہجہ اٹل تھا۔ کارل کو لگا کہ بس اب پھنسنے ہی والا ہے۔ اس نے مادام ڈیروکس کی طرف دیکھا۔ اس نے منہ دوسری جانب کر لیا تھا۔

افسر نے انہیں واپس چلنے کا اشارہ کیا اور مادام سے گفتگو کرنے لگا۔ وہ کیا باتیں کر رہے تھے، کارل کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اس کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ ڈرائیور اسے بازو سے تھام کر کار کی طرف لے گیا۔

چند لمحوں کے بعد وہ آگے بڑھا۔ کارل اور ڈرائیور دونوں بدستور کار کے پاس کھڑے تھے۔ افسر گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ والے دروازے کی طرف بڑھا۔ ڈرائیور کو آگے کی دوسری سیٹ جبکہ کارل کو پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ

کیا۔ تھوڑی دیر بعد کار لوئے لابریر کے راستے پر بڑھ رہی تھی۔ گھنے جنگلوں کے درمیان سے سڑک اوپر پہاڑی والے علاقوں کی طرف جارہی تھی۔

"ذرا شیشے کھول کر اس فضا کو محسوس کرو۔" افسر نے اپنی طرف کا شیشہ نیچے کرتے ہوئے کہا اور پھر جھانک کر گہری سانس لی۔ "درخت اور جنگل کی خوشبو بالکل منفرد ہوتی ہے۔"

اُدھر وہ رومانی احساسات میں مشغول تھا تو دوسری طرف کارل کا دل خوف سے ڈوبے جارہا تھا۔ وہ اپنی ٹانگوں کی کپکپاہٹ صاف محسوس کررہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسی وقت سے بچنے کے لیے وہ جرمنی سے فرار ہوا تھا، جرمنوں کے فرانس پر حملے کے بعد بچنے کے لیے جعلی دستاویزات بنائیں مگر ہوا وہی جس سے وہ خوف زدہ ہو کر بھاگتا رہا تھا۔ صوفیہ کا چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوم گیا۔ وہ اس سے بہت محبت کرتا تھا مگر اب وہ جان چکا تھا کہ جدائی کی گھڑی آن پہنچی ہے۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اب جرمن اسے نہیں چھوڑیں گے۔ جھوٹ کھلنے کے بعد وہ مشکوک ہوجائے گا اور پھر جرمنوں کا تشدد... یہ سوچتے ہی وہ لرز گیا۔ اسے یقین ہوگیا کہ وہ بہت جلد سب کچھ اس سے اُگلوالیں گے اور اس کے بعد... جرمن یہودیوں کا جو حشر کرتے تھے، اس کے قصے کارل بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے آنسو روکے۔ وہ دل ہی دل میں خدا سے مدد مانگ رہا تھا۔ وہ دونوں جرمن فوجی اپنے آپ میں مگن تھے۔ کارل اب بھی بظاہر پُرسکون نظر آنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس نے تہیہ کرلیا تھا کہ وہ آخری لمحے تک اپنے بچاؤ کی لڑائی لڑے گا، تاہم اسے امید کم نظر آرہی تھی۔ "گڈ بائے صوفیہ... میرے بچے سے کہنا میں اس سے بہت پیار کرتا تھا اور شدت سے اس کی آمد کا منتظر تھا... گڈ بائے میرے بچے۔" اس نے دل ہی دل میں کہا اور ذہن خالی چھوڑ کر سیٹ کی پشت سے سر لگادیا۔ وہ ذہنی طور پر پیش آنے والے حالات کے لیے خود کو تیار کرچکا تھا۔

"اے تجھر..." فوجی افسر نے اسے پکارا تو کارل نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ سے گردن موڑ کر اسے دیکھ رہا تھا۔ "یہ خالص جرمن چمڑا ہے۔" اس نے مسکرا کر سیٹ کُشن کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کی خوشبو محسوس کی تم نے مسٹر فریج؟"

کارل نے زبردستی کی مسکراہٹ لبوں پہ طاری کی اور اثبات میں سر ہلایا۔ فی الحال وہ ان کے رحم و کرم پر تھا اور اسے ہاں میں ہاں ملانی تھی۔

"تمہارا باپ تو چمڑے کے جوتے بناتا ہے۔ تمہیں تو چمڑے کی مہک سے آشنائی ہونی چاہیے۔"

اس نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔ "جرمن چمڑا بہت عمدہ ہوتا ہے۔" وہ اس پر جرمنوں کے اعلیٰ ہونے کا تاثر قائم کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

"ویسے یہ کس جانور کا چمڑا ہوسکتا ہے؟" کارل نے منمناتے ہوئے پوچھا۔

"تم خود اسے محسوس کرو اور بتاؤ کہ فریج چمڑا اس سے زیادہ عمدہ ہوسکتا ہے کیا؟" وہ اس کے سوال کا جواب گول کرگیا۔

اس سے پہلے کہ کارل کچھ کہتا، پہاڑی راستے کا ایک تنگ موڑ آگیا۔ ڈرائیور نے موڑ کاٹنے کے لیے اسٹیئرنگ کو پورا گھمایا۔ گرائنڈر جیسی آواز آئی اور پھر انجن بند ہوگیا۔

وہ بار بار گاڑی اسٹارٹ کرنے کی کوشش کررہا تھا مگر وہ ہو نہیں رہی تھی۔ کارل کی جان میں جان آئی۔ وہ کار کے خراب ہونے کو غیبی مدد سمجھا۔ اسے یقین ہوگیا تھا کہ اوپر والا اس کی دعائیں سن چکا ہے، بنا کار کے وہ لوئے لابریر تک تو پہنچ ہی نہیں سکتے تھے۔

"آپ اتریں۔" یہ کہتے ہوئے ڈرائیور باہر نکلا، بونٹ کھولا اور پھر اِدھر اُدھر ہاتھ مار کر پلٹا۔ افسر اس کی جگہ پر جاکر بیٹھ گیا تھا۔

"میں نے پیٹرول زیادہ کھول دیا ہے۔" ڈرائیور کے لہجے سے ناگواری جھلک رہی تھی۔ یہ کہتے ہوئے اس نے اگنیشن میں چابی گھمائی۔ "شاید اب اسٹارٹ ہوجائے۔" مگر دو تین بار چابی گھمانے کے بعد بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ وہی گرائنڈر جیسی آواز آرہی تھیں۔

کارل دل ہی دل میں بہت خوش ہورہا تھا۔ وہ دعا مانگ رہا تھا کہ وہ اسٹارٹ نہ ہو۔ پہلی بار اسے لگا کہ اس کی دعا قبول ہوئی ہے ورنہ تو آج تک اس نے جتنی دعائیں کی تھیں، اُن سب کا نتیجہ اُلٹ ہی نکلا تھا۔

کئی منٹ یونہی گزر گئے۔ ڈرائیور بار بار اترتا، بونٹ کھولتا اور پھر واپس آکر اسے اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرتا مگر نتیجہ کچھ نہیں تھا۔

"مکینک کو بلانا پڑے گا۔" افسر نے ڈانٹ پلانے والے لہجے میں کہا۔

کارل دروازہ کھول کر باہر اتر آیا۔ وہ ایک طرف کھڑا یہ سوچ رہا تھا کہ اس ویرانے میں اگر کسی مکینک کو لے کر آیا جائے تو اسے یہاں تک پہنچنے اور پھر کار کو ٹھیک کرنے میں کتنی دیر لگ سکتی ہے۔ کیا اس کے بعد ان کے پاس اتنا وقت بچے گا کہ وہ نئے جوتے بنوانے کے لیے لوئے لابریر جاسکیں؟ اس کے دماغ میں ڈرائیور کی بات بھی گونج رہی تھی کہ اسے گاڑی کی سروس کراکے رات کو کرنل کو تقریب میں بھی لے جانا تھا۔ اس کے لیے خود کرنل نے حکم دیا تھا۔ کارل کو یقین تھا کہ اگر مکینک مل بھی جائے اور وہ اسے ٹھیک بھی کردے، تب بھی اب تو ڈرائیور کا اصرار واپس چلنے پر ہی ہوگا۔

اسی دوران میں افسر نے ایک اور حکم صادر کیا۔ "ڈکی سے موٹر سائیکل نکالو۔" یہ سنتے ہی ڈرائیور ڈکی کی طرف لپکا۔ "اب ہم موٹر سائیکل پر جائیں گے، مکینک آکر گاڑی دیکھ لے گا۔"

یہ سنتے ہی کارل کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ موت اسے ایک بار پھر نظروں کے سامنے نظر آرہی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہٹلر کی فوج اتنی تیاریوں کے ساتھ سرحدوں سے باہر نکلی ہوگی۔

"اے... اِدھر آؤ، جلدی سے۔" ڈرائیور نے اسے پکارا۔

کارل لپک کر پہنچا۔

"اسے باہر نکلواؤ۔" ڈکی میں ایک بڑا سا ٹرنک تھا۔ ان دونوں نے بڑی مشکل سے اسے باہر نکالا۔

ڈرائیور ٹرنک کھول کر حصوں میں رکھی، کھلی موٹر سائیکل کے پرزے باہر نکالنے لگا۔

"ذرا جلدی ہاتھ چلاؤ۔" افسر نے حکم دیا۔

کارل نے پھرتی دکھانی شروع کی مگر اگلے ہی لمحے اس کے ہاتھ پھر سست پڑ گئے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ اس پر بیٹھ کر مجھے قتل گاہ میں لے جانا چاہتے ہیں اور میں مرنے کے لیے خود پھرتی دکھاؤں۔

ڈرائیور نے موٹر سائیکل فٹ کرنا شروع کی۔ کارل کو سست دیکھ کر اب وہ خود موٹر سائیکل فٹنگ میں اس کا ہاتھ بٹانے لگا تھا۔

"لو ہوگئی..." ڈرائیور نے چمڑے کی بڑی سیٹ فکس کرتے ہوئے کہا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ دوبارہ اوزار اور خالی صندوق ڈکی میں رکھنے لگے۔ کچھ دیر میں تمام کام مکمل ہوگیا مگر پہاڑوں میں دھوپ کم ہونے لگی تھی۔ اس پورے کام میں ایک ڈیڑھ گھنٹا لگ گیا تھا۔

ڈرائیور ایک کین سے موٹر سائیکل کی ٹنکی میں پیٹرول بھر رہا تھا۔ اب تک کارل یہ سمجھ نہیں سکا تھا کہ ان کے

ارادے کیا ہیں۔ اسے وہی ڈر تھا کہ وہ اسے موٹر سائیکل پر بٹھا کر آگے چل دیں گے۔

"میرا خیال ہے کہ اب تو ہم نہیں جاسکیں گے۔" افسر نے گہری نظروں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جاسکتے ہیں مگر..."

"واپس کیمپ تک رات میں ہی پہنچیں گے۔" اس نے ڈرائیور کی بات کو بیچ سے اُچک کر لقمہ دیا۔ "یہی کہنا چاہ رہے تھے نا تم؟"

ڈرائیور نے سر ہلایا۔ "اب تو مناسب یہی ہے کہ واپس چلا جائے، وہاں پھر کبھی چلیں گے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ اب جانا مناسب نہیں پھر کبھی دیکھیں گے۔"

یہ سن کر کارل جیسے ہی اٹھا۔ "بالکل سر! جب کہیں گے، میں چلا چلوں گا۔" وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ وہ تو یہی چاہتا تھا کہ ایک دفعہ جان چھوٹے تو پھر وہ اس علاقے سے ہی فرار ہونے کی کوشش کرے گا۔

"مجھے امید ہے کہ تم رات تک تو گھر پہنچ جاؤ گے؟" افسر نے موٹر سائیکل پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "یہ راستے میرے دیکھے بھالے ہیں۔ میری سائیکل مادام کے ہاں کھڑی ہے، میں وہاں تک پہنچ جاؤں گا۔"

"پھر ملیں گے۔" اس نے کارل کی طرف ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ وہ مسکرا دیا اور دل ہی دل میں کہا... ہرگز نہیں۔

ڈرائیور نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور لمحہ بھر میں وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ کچھ دیر بعد اس کا شور بھی سنائی دینا بند ہوگیا۔ البتہ موڑ والے کچے راستے پر دھول اب تک اڑ رہی تھی۔

کارل کو جیسے دوبارہ زندگی مل گئی تھی۔ اس کی جسمانی توانائی لوٹ آئی تھی۔ کہنے کو تو وہ کہہ چکا مگر سچ تو یہ تھا کہ اسے اس علاقے کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھیں۔ وہ کھڑا سوچ رہا تھا کہ پیدل مادام کی طرف جانے کی کوشش کرے یا کہیں اور۔ "ارے... میڈم شاید اسی جگہ کے لیے کہتی تھیں کہ قریب میں مون ڈی یو قصبہ ہے۔" وہ بڑبڑایا۔ "وہاں جاؤں تو کسی طرح سائیکل مل سکتی ہے۔"

"یہاں ایسا کیا تھا جس کی تلاش میں وہ یوں پھر رہے ہیں؟" کارل نے چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے ذرا اونچی آواز میں خود سے کہا۔

"وہ مجھے تلاش کر رہے ہیں؟"

کارل کو اپنے عقب سے آواز سنائی دی۔ وہ حیرت سے پلٹا۔ اس کا خیال تھا کہ یہاں کوئی انسان نہیں ہوسکتا مگر یہ آواز سن کر وہ چونک گیا۔

وہ پائلٹ جیسا لباس پہنے ہوئے تھا جو پوری طرح دھول مٹی میں اَٹ چکا تھا۔ کارل اس کے حلیے سے سمجھ گیا کہ اس کا جہاز مار گرایا ہوگا اور اب نازی دشمن فرنچ پائلٹ کی لاش نہ ملنے پر اس کی تلاش میں ہوں گے۔

"مجھ سے خوف زدہ مت ہو۔" کارل مسکرایا۔ وہ ڈر رہا تھا کہ کوئی نئی مصیبت نہ کھڑی ہوجائے۔ اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔

وہ چند قدم آگے بڑھا۔ "کیپٹن آرک...۔" اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

"میں گورجیس ہوں۔" کارل نے اپنی نقلی شناخت بتائی۔ ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے دیکھا کہ کیپٹن کے دوسرے ہاتھ میں تانبے کی پتلی سی تار تھی۔ وہ یہ سوچ کر لرز اٹھا کہ اس نے نازیوں کے ساتھ اسے دیکھ لیا تھا اور اگر وہ پیچھے سے آکر خاموشی سے اس تار سے اس کا گلا گھونٹ دیتا تو...

"ہمیں اس کھلے راستے پر یوں کھڑا نہیں رہنا چاہیے۔ اس سے تمہیں خطرہ ہوسکتا ہے۔" کارل نے دوستانہ لہجے میں کہا۔

"کیا ہمیں چلنا چاہیے؟"

"محفوظ جگہ؟"

"ہاں، ایسی جگہ ہے۔"

"چلو مگر راستے سے ہٹ کر۔" یہ کہتا ہوا وہ پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ کارل اس کے پیچھے تھا۔ شام ڈھلنے سے پہلے وہ اسے ساتھ لے کر مادام کے فارم ہاؤس پر پہنچ گیا۔

کیپٹن دو روز سے بھوکا پیاسا تھا۔ مادام نے اسے کھانے کے لیے چائے، اُبلے انڈے، ڈبل روٹی، شہد اور پنیر پیش کیا۔

"تمہارے ساتھ ہوا کیا تھا؟" کھانے پینے سے فراغت ہوئی تو اس نے کیپٹن سے پوچھا۔ اس وقت وہاں کوئی اور نہیں تھا۔

کیپٹن کے مطابق نازیوں نے اس کا جہاز مار گرایا اور بدقسمتی سے یہ اس علاقے میں تباہ ہوا جو ان کے قبضے میں تھا۔ کیپٹن نے بتایا کہ اس نے نازی فوجیوں کے ساتھ اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ پہاڑی آڑ میں بیٹھا، سب کچھ سن رہا تھا۔ کارل نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ وہ فرنچ ہے اور نازی اسے جوتا بنوانے کے لیے ساتھ لے جارہے تھے مگر گاڑی خراب

ہونے کی وجہ سے کام ادھورا رہا۔ وہ اپنے جرمن ہونے کا معاملہ پوری طرح گول کرچکا تھا۔

کیپٹن نے اعتراف کیا کہ ایک ایسا اجنبی جو اس کے دشمن نازیوں کے ساتھ تھا، اس کے ہمراہ یہاں آتے ہوئے وہ خوف زدہ تھا مگر اب لگ رہا تھا کہ اسے کارل پر اعتماد ہو چکا ہے۔

"اگر وہ جرمن تمہیں دیکھ لیتے تو مجھے ڈر ہے کہ موقع پر ہی گولی مار دیتے۔" کارل نے ہلکی سی جھرجھری لے کر اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

یہ سن کر کیپٹن نے سر کو جھٹکا دیا اور پھر سرگوشی میں بولا۔ "یہی کام تم میرے لیے کرو گے... درست؟"

"کیا..." یہ سنتے ہی کارل نے حیرت سے کہا۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکا کہ کیپٹن کیا چاہتا ہے۔ اس کی زبان گنگ ہوچکی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی اسے کسی کی جان لینے کا کہہ سکتا تھا۔ جان لینا تو درکنار اس کے لیے تو ایسا سوچنا ہی محال تھا۔ جنگ کی تباہ کاریوں اور انسانی ہلاکتوں نے تو اسے ویسے بھی دنیا کی طرف سے بددل کردیا تھا۔ اب صوفیہ اور آنے والا بچہ ہی اس کی کل دنیا کا محور تھے۔

کافی دیر تک سناٹا رہا۔ دونوں چپ تھے پھر پائلٹ نے اپنی خاموشی توڑی۔ "مجھے یقین ہے کہ تم کسی کی جان نہیں لے سکتے اور ایسا کرنا بھی نہیں چاہیے۔" کیپٹن مسکرایا۔ "میں مذاق کررہا تھا۔"

"پھر تم نے ایسی بات کیوں کی؟" کارل کے لہجے میں ناراضی تھی۔

"تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا اور یہ کسی کی جان لینے کے لیے نہیں ہے۔" یہ کہہ کر پائلٹ اسے سمجھانے لگا۔

مادام نے وعدہ کیا کہ کیپٹن فی الحال وہیں رہے گا اور وہ کسی کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دے گی۔ مادام بھی سارا قصہ سمجھ چکی تھی۔ صبح نازی فوجی اس پائلٹ کے بارے میں ہی تفتیش کے لیے فارم ہاؤس آئے تھے۔ مادام نے اس کے نہانے دھونے کا انتظام کردیا۔ اس کے پہننے کے لیے اپنے شوہر کا ایک سوٹ بھی نکال دیا تھا۔

کچھ دیر بعد کارل اٹھا۔ اس نے مادام کے بچوں کی کاپیاں واپس کیں اور وہاں سے اپنی سائیکل اٹھا کر چل پڑا۔

گرمیوں کا خوش گوار موسم تھا۔ وہ ایک بار پھر انہی راستوں پر سے ہوتا ہوا واپس جارہا تھا جہاں سے دوپہر کو

ہوتا ہوا مادام کے فارم ہاؤس پر پہنچا تھا۔ شام ڈھلتی جارہی تھی۔ پرندے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ جنگل کے قریب ایک بڑا سا قبرستان تھا اور ڈھلتے سورج کی سرخ روشنی میں وہ بھی بہت اداس لگ رہا تھا۔ کارل بہت دل گرفتہ تھا۔ اگرچہ آج ایک بار پھر اس کی جان بچ گئی تھی مگر جنگ کی ہلاکت خیزی ایک بار پھر اس کے سامنے تھی۔ کئی سال میں پہلی بار آج اسے اپنا آبائی قصبہ اور جرمنی شدت سے یاد آرہا تھا۔ اس کا دل بوجھل تھا اور وہ آہستہ آہستہ پیڈل پر پاؤں چلا رہا تھا۔

جب وہ چلتا ہوا اس مقام پر پہنچا جہاں دوپہر کو جرمن فوجیوں نے اسے روکا تھا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ جرمن فوجی ٹرک سے لوگوں کو اتار کر، گھیرے میں لے کر ایک دائرے میں کھڑا کر رہے تھے۔ اس نے کوشش کی کہ وہ جتنا قریب ہوسکے، ہو کر دیکھے کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور پھر بہت جلد بات سمجھ آگئی۔

اس کے قصبے پر نازی جرمنوں کا پورا قبضہ ہوچکا تھا اور وہ اب تمام یہودیوں کو گرفتار کر کے کیمپ میں لا رہے تھے۔ یہ دیکھ کر تو وہ شدید حیران رہ گیا کہ فروٹ سیلر مسز ہرمن جرمن فوجیوں کی مدد کر رہی تھی۔ وہی انہیں بتا رہی تھی کہ ان میں کون کون یہودی ہیں۔

مسز ہرمن خود یہودی تھی اور اکثر خفیہ طور پر منعقد کی گئی یہودیوں کی عبادت میں شریک ہوتی تھی۔ بظاہر وہ کارل اور دوسرے روپوش یہودیوں کی طرح خود کو کیتھولک عیسائی کہتی تھی لیکن اس وقت وہ اپنی جان بچانے کے لیے پورے جوش و خروش سے قصبے کے یہودیوں کی شناخت میں نازیوں کی مدد کر رہی تھی۔ ”تم بھی...“ کارل دکھی دل کے ساتھ بڑبڑا کر رہ گیا۔

اسی دوران میں اس نے ایک گھنے درخت کی اوٹ میں کھڑے ہو کر پکڑے گئے لوگوں کو دیکھنا شروع کیا اور پھر اگلے ہی لمحے اس کا دل بیٹھتا چلا گیا۔ صوفیہ اور اس کا باپ بھی ان لوگوں میں موجود تھے۔

اس وقت کارل کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا چکا تھا۔ چند لمحوں کے بعد جب اس کے اوسان ذرا بحال ہوئے تو صرف ایک سوال اس کے سامنے تھا... میرے خاندان کا کیا ہوگا؟

اس وقت اسے فرنچ فوج کے ایک خفیہ کیمپ پہنچ کر پائلٹ کیپٹن آئزک کے ساتھیوں کو اس کے حوالے سے اطلاع دینی تھی۔ یہ اس کا وعدہ تھا مگر دوسری طرف اس کی محبت تھی۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ کیا کرے۔

اچانک اسے خیال آیا۔ کیپٹن، مادام کے فارم ہاؤس پر تھا اور بہ آسانی فرار ہوسکتا تھا مگر صوفیہ ایک بار اس کی نظروں سے اوجھل ہوجاتی تو پھر اس کا سراغ شاید ہی ملتا۔

اسی دوران میں اس کی نظریں صوفیہ سے چار ہوگئیں۔ وہ اسے دیکھ چکی تھی۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے کیے مگر وہ کچھ سمجھ نہیں پایا۔ صوفیہ اسے نکل جانے کا اشارہ کر رہی تھی۔ وہ اسے بچانا چاہ رہی تھی مگر کارل کے لیے صوفیہ اس کی محبت تھی۔ اس کی زندگی میں وہ سب سے قیمتی شے تھی۔

کارل اس کا اشارہ سمجھ رہا تھا مگر ساتھ ہی وہ اپنے دل میں بھی فیصلہ کر رہا تھا۔ آخر اس نے طے کرلیا۔ ”صوفیہ سے علیحدہ ہو کر آزاد رہنے سے بہتر ہے کہ اس کے ساتھ ہی مر جایا جائے۔“

اس نے سائیکل درخت سے لگائی اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا فوجیوں کے قریب پہنچا اور جرمن زبان میں چیخ کر کہا۔ ”میں یہودی ہوں اور وہ میری بیوی ہے۔“

سب اس کی طرف حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ مسز ہرمن کا منہ کھلا ہوا تھا۔ صوفیہ لپک کر آئی اور اس کے سینے سے لگ گئی۔ جرمن فوجی حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اس کے نقوش جرمنوں جیسے تھے اور لہجہ بھی سو فیصد وہی تھا۔ ایک فوجی لپک کر اس کے قریب پہنچا۔ ”تم جرمن ہو؟“ اس کے لہجے سے شدید نفرت عیاں تھی۔

”ہاں ہاں، میں جرمن تھا اور جرمن ہی رہوں گا!“

یہ سنتے ہی فوجی نے اس پر تھوک دیا مگر کارل کو اب کسی چیز کی کوئی فکر نہیں تھی۔ اس نے صوفیہ کو زور سے اپنے گرد لپٹا لیا اور پھر اگلے ہی لمحے اس فوجی کی بندوق نے گولیاں اگلنا شروع کردیں۔

خون میں لت پت دو لاشیں، ایک دوسرے کی بانہوں میں لپٹی سڑک پر پڑی تھیں۔

زندگی بچانے کے لیے جرمنی سے فرار ہونے والے نے محبت کے آگے زندگی وار دی تھی... اسے اس کی ہم مسلک نے اس دردناک انجام سے دوچار کیا تھا۔ اگر مسز ہرمن یہودی ہوتے ہوئے صوفیہ اور اس کے باپ سے غداری کر کے ان کی نشان دہی نہ کرتی تو شاید وہ اس انجام سے بچ سکتے تھے۔

نجات

کاشف زبیر

کوئی ایک حادثہ... ہنستی کھلکھلاتی... جگمگاتی زندگی کے سفر کو اتنا مشکل بنا دیتا ہے کہ جینے کی خواہش رفتہ رفتہ دم توڑنے لگتی ہے... ایک معصوم بچے کے اغوا اور ماں کے قتل کا سنسنی خیز قصہ... اسے نہیں معلوم تھا کہ آزاد پرندے فضاؤں میں کس طرح پرواز کرتے ہیں... بچپن میں ہی اس کے پر کاٹ کے اسے ایک پنجرے میں قید کر دیا گیا... اور پھر قید حیات میں رہتے رہتے اسیری اس کے روح و جسم کو جکڑتی چلی گئی...

مارٹی سسک سسک کر سو گیا تھا۔ وہ ایک کاؤچ پر سکڑا سمٹا پڑا تھا۔ سردی سے زیادہ وہ خوف سے لرز رہا تھا۔ گزشتہ چھ گھنٹے اس کے لیے بہت بھیانک گزرے تھے۔ وہ دوپہر میں اپنی ماں اور باپ کے ساتھ گھر سے نکلا تھا۔ اس کے باپ چارلی نے اسے اور ماریہ کو تھیٹر ہال چھوڑا تھا جہاں ماریہ بہ طور اسسٹنٹ منیجر کام کرتی تھی۔ اس روز چھٹی تھی لیکن اگلے روز ایک ڈرامے کے سلسلے میں کچھ کام تھا اس لیے ماریہ کو بلا لیا گیا۔ مارٹی بہت دن سے اس سے تھیٹر چلنے کو کہہ رہا

تھا۔ اس دن زیادہ کام نہیں تھا اس لیے ماریا اسے ساتھ لے آئی۔ چارلی نے جانے سے پہلے کہا کہ وہ انہیں لینے بھی آئے گا مگر ماریہ نے اسے منع کر دیا۔ "اس کی ضرورت نہیں ہے، ہم ٹیکسی میں آجائیں گے۔"

جب تک ماریہ کام میں مصروف رہی، مارٹی ایک طرف بیٹھا رہا۔ اس نے گھوم پھر کر تھیٹر دیکھا لیکن جلد وہ بور ہو گیا۔ اب وہ شدت سے واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ شام چھ بجے ٹی وی پر اس کا پسندیدہ کارٹون آتا تھا۔ ماریہ نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ چھ بجے سے پہلے گھر واپس آجائیں گے۔ پانچ بجے ماریہ نے اپنا کام مکمل کر لیا۔ اس وقت تک بیشتر لوگ جا چکے تھے۔ ماریہ مارٹی کو لے کر باہر آئی تو وہاں سناٹا تھا۔ تھیٹر آبادی سے ذرا ہٹ کر ایک ہائی وے سے نزدیک تھا۔ ماریہ پریشان ہو گئی۔ دور دور تک کسی ٹیکسی کا پتا نہیں تھا۔ اس نے چارلی کو کال کی لیکن وہ کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ اسی لمحے ایک ٹیکسی تھیٹر ہال کے پاس سڑک پر نمودار ہوئی۔ ماریہ نے سکون کا سانس لیا۔ اس نے جلدی سے ہاتھ ہلایا تو ٹیکسی ان کے سامنے رکی۔ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک تنومند آدمی بیٹھا تھا لیکن اس کے بڑے سے گول چہرے پر نرمی تھی۔ ماریہ مارٹی سمیت پچھلی نشست پر آگئی اور اس نے درمیانی شیشہ بجا کر ڈرائیور کو پتا بتایا۔ اس نے سر ہلایا اور ٹیکسی آگے بڑھا دی۔

وہ لوگ ایک نواحی قصبے سر سیٹ ٹاؤن میں رہتے تھے۔ ٹیکسی ہائی وے پر آکر اس طرف روانہ ہو گئی۔ کچھ دیر بعد وہ لنک روڈ آئی جو سر سیٹ ٹاؤن تک جاتی تھی لیکن ٹیکسی اس پر گھومنے کے بجائے سیدھی چلتی رہی۔ ماریہ نے درمیانی شیشہ بجایا۔ "اے مسٹر! تم غلطی سے آگے نکل گئے ہو..... سر سیٹ ٹاؤن کی طرف جانے والی سڑک پیچھے رہ گئی ہے۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے سر ہلایا مگر اس نے ٹیکسی واپس نہیں موڑی۔ اس کے بجائے اس نے رفتار تیز کر دی۔ ماریہ اس بار تیز لہجے میں بولی۔ "اے! تم سن کیوں نہیں رہے ہو؟ ٹیکسی واپس موڑو۔"

جب ٹیکسی ڈرائیور نے پھر کوئی جواب نہیں دیا تو ماریہ نے موبائل نکالا۔ وہ پولیس کا نمبر ملانے جا رہی تھی کہ ٹیکسی ڈرائیور نے ڈیش بورڈ میں لگا ایک بٹن دبایا تو موبائل سے سگنل غائب ہو گئے۔ ماریہ پریشان ہو گئی۔ "یہ تم نے کیا کیا ہے؟ تمہارا کیا ارادہ ہے؟" ماریہ نے کہتے ہوئے دروازہ کھولنا چاہا لیکن پتا چلا کہ ہینڈل کام نہیں کر رہا۔ صرف ہینڈل ہی نہیں بلکہ شیشے اتارنے والے ہینڈل بھی کام نہیں کر رہے تھے۔ وہ اس ٹیکسی میں قید ہو کر رہ گئے تھے۔ ٹیکسی ڈرائیور کے عزائم درست نہیں تھے۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد اس نے ٹیکسی ہائی وے سے ایک کچے راستے پر اتار دی۔ یہ جھاڑیوں سے بھرا ہوا غیر آباد علاقہ لگ رہا تھا۔ ٹیکسی کوئی دو کلومیٹرز کے بعد ایک مکان کے سامنے رکی۔ ڈرائیور نے ڈیش بورڈ میں لگے ریموٹ کا بٹن دبایا تو گیراج کا خودکار دروازہ اوپر ہو گیا۔ وہ ٹیکسی اندر لے گیا تو دروازہ بند ہو گیا۔

"ماما! یہ ہمیں یہاں کیوں لایا ہے؟" مارٹی نے پہلی بار سوال کیا۔

ماریہ خوف زدہ تھی۔ اس نے مارٹی کو آغوش میں سمیٹ لیا۔ ٹیکسی والا اتر کر پیچھے آیا۔ اس نے عقبی دروازہ کھولا اور ماریہ سے بولا۔ "نیچے اترو۔"

مگر جب وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلی تو ڈرائیور نے اچانک اندر گھس کر اسے بالوں سے پکڑا اور باہر کھینچ لیا۔ ماریہ تکلیف سے چیخ اٹھی۔ اس کے ساتھ مارٹی بھی باہر آرہا تھا مگر ڈرائیور نے اسے ٹھوک کر واپس دھکیل دیا اور ٹیکسی کا دروازہ بند کر دیا۔ ماریہ اپنے بال چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی مگر ڈرائیور بہت طاقتور آدمی تھا۔ وہ آرام سے ماریہ کو کھینچتا ہوا مکان کے اندر لے گیا۔ اس کی چیخیں مارٹی کے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں اور وہ رو رہا تھا۔ ایک چھ سات سال کا لڑکا رو سکتا تھا، وہ اپنی ماں کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ ماریہ کی چیخیں وقت گزرنے کے ساتھ دل دوز ہوتی جا رہی تھیں اور ایسا لگ رہا تھا کہ وہ شدید اذیت سے گزر رہی ہو۔ پھر کسی وقت وہ خاموش ہو گئی۔ مارٹی گھٹنے سمیٹے اور سر ہاتھوں میں چھپائے کانپ رہا تھا۔ اچانک ٹیکسی کا دروازہ کھلا اور ڈرائیور نے اسے بازو سے پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔ وہ چیخ اٹھا۔ اس کا خیال تھا کہ اب اس کی باری ہے لیکن ڈرائیور اسے مکان میں لایا۔ گیراج سے متصل لاؤنج اور کچن تھا۔ اس نے مارٹی کو کاؤچ پر دھکیل دیا اور بولا۔ "یہاں سے ہلنا مت۔"

"میری ماما کہاں ہیں؟ تم نے ان کے ساتھ کیا کیا ہے؟" مارٹی نے روتے ہوئے پوچھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ ڈرائیور نے جو بنیان پہن رکھی تھی، اس پر جا بجا خون کے دھبے تھے۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور اندر کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ پھر مارٹی نے دیکھا، وہ کمرے سے ماریہ کو کھینچتا ہوا ایک طرف لے گیا۔ وہ بے جان لگ رہی تھی اور اس کا جسم خون آلود ہو رہا تھا۔ مارٹی سسکیاں لینے لگا۔ اسے لگا کہ اس کی ماں زندہ نہیں ہے، ٹیکسی ڈرائیور نے اسے مار دیا تھا۔ وہ ماریہ کو مکان کے اندر ہی کہیں لے گیا تھا۔ مارٹی اتنا

خوف زدہ ہوا کہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکا۔ ڈرائیور نصف گھنٹے بعد آیا تو اس کا جسم مٹی میں اٹا ہوا تھا۔ وہ مارٹی کو دیکھ کر کمرے میں چلا گیا۔ وہاں صفائی کرتا رہا پھر خود نہا دھو کر آیا اور بیئر کی بوتل لے کر ٹی وی کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے کوئی شریف آدمی سارے دن کام کے بعد اب فرصت کے لمحات سے لطف اندوز ہو رہا ہو۔ مارٹی کو پتا نہیں چلا کہ کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ وہ جاگا تو ڈرائیور اس کے پاؤں سے ایک لمبی، پتلی لیکن مضبوط فولادی زنجیر کا کڑا باندھ رہا تھا۔ تالا بند کر کے اس نے کھینچ کر چیک کیا اور مطمئن ہو کر سر ہلاتا ہوا گیراج کی طرف چلا گیا۔ کچھ دیر بعد مارٹی نے ٹیکسی اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی جو دور چلی گئی اور پھر سناٹا چھا گیا۔ مارٹی نے زنجیر کھینچ کر دیکھی، وہ گیراج کے دروازے تک جا سکتا تھا۔ اسی طرح ذرا آگے دونوں بیڈ رومز کے دروازوں تک جا سکتا تھا۔ وہ اسی راہداری میں بنے واش روم میں بھی جا سکتا تھا۔ زنجیر فرش سے ایک فولادی کڑے سے منسلک تھی اور وہ کسی صورت اسے کھول نہیں سکتا تھا۔ وہ اس جگہ بھی نہیں جا سکتا تھا جہاں ڈرائیور اس کی ماں کو لے گیا تھا۔ یہ مکان کا آخری حصہ تھا۔ مارٹی نے دیکھا کہ وہاں سے سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ تہہ خانہ تھا۔

مارٹی کو بھوک لگ رہی تھی لیکن لاؤنج کے ساتھ کچن میں کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ اس نے اوپر چڑھ کر کیبنٹ کا معائنہ بھی کیا لیکن وہاں سوائے کافی کے ڈبوں کے کچھ نہیں تھا۔ ایک ڈبے میں کچھ شکر کیوبس رکھے تھے۔ فریج میں صرف بیئر کی بوتلیں تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور باہر ہی کھاتا پیتا تھا مگر مارٹی اس وقت یہ سب نہیں سوچ رہا تھا۔ ماں کے بعد اب اسے بھوک نے پریشان کر دیا تھا۔ وہ دوبارہ کاؤچ پر سکڑ سمٹ کر لیٹ گیا۔ شام کے وقت ڈرائیور واپس آیا۔ اس نے مارٹی کو دیکھا پھر زنجیر کا معائنہ کیا۔ اس نے ایک بڑا سا شاپر کچن کاؤنٹر پر رکھا۔ مارٹی نے آہستہ سے کہا۔ "مجھے بھوک لگی ہے۔"

جواب میں ڈرائیور اپنے بیڈ روم کی طرف چلا گیا۔ اس نے کپڑے بدلے۔ اس نے پہلے بیئر کی بوتل نکالی اور... ٹی وی کے آگے بیٹھ گیا۔ وہ چینل بدل بدل کر ٹی وی دیکھتا رہا پھر اس نے مارٹی کی طرف دیکھا۔ "ادھر آؤ۔"

وہ زنجیر سمیٹتا ہوا اس کے پاس آگیا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"مارٹی!"

"مارٹی۔" اس نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "نہیں، یہ تمہارے کا نام نہیں ہے۔ اب تم میرے غلام ہو اس لیے تمہارا نام بھی میں رکھوں گا۔ آج سے تمہارا نام چوہا ہے۔ تم دیکھنے میں بھی چوہے جیسے لگتے ہو۔" اس کا لہجہ مذاق اڑانے والا تھا۔ "دیکھو چوہے... اب تم ایک صورت میں زندہ رہ سکتے ہو کہ تم میرے غلام بن جاؤ اور جیسا میں کہوں بالکل ویسا ہی کرو۔ اس صورت میں تمہیں سب ملے گا لیکن اگر تم نے میرے کسی حکم پر عمل نہیں کیا تو تمہیں سزا ملے گی اور تمہارا کھانا بھی بند ہو جائے گا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

مارٹی نے سر ہلایا۔ "یس سر۔"

"سر نہیں ماسٹر... آج سے میں تمہارا آقا ہوں۔"

"یس ماسٹر۔" مارٹی نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

"گڈ بوائے۔" وہ خوش ہو گیا۔ "وہ شاپر دیکھ رہے ہو، اس میں تمہارے لیے کھانا ہے۔"

مارٹی شاپر کی طرف لپکا۔ اس نے بے تابی سے اندر جھانکا۔ اس میں ایک بڑا زنگر برگر تھا اور ساتھ میں فرنچ فرائز تھے۔ مارٹی بے تابی سے کھانے لگا۔ جب وہ کھا پی کر فارغ ہو گیا تو ڈرائیور نے اس سے کہا۔ "اس پورے گھر کی صفائی تمہاری ذمے داری ہے۔ گیراج والا دروازہ بھی تم کھولو گے اور جیسے ہی میری ٹیکسی کا ہارن سنو گے، اس کے آدھے منٹ کے اندر تمہیں دروازہ کھولنا ہوگا۔"

"یس سس... ماسٹر۔"

مارٹی کے لیے اس شخص کے کسی حکم سے انحراف کرنا ناممکن تھا۔ اس نے ذہنی طور پر تسلیم کر لیا تھا کہ اس کی ماں اس دنیا میں نہیں رہی اور اب اسے اپنی جان بچانی ہے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس شخص کی ہر بات مانے اور اسے ناراض ہونے کا موقع نہ دے۔ وہ روزانہ صبح سویرے ٹیکسی لے کر کام پر چلا جاتا اور پھر شام کو واپس آتا۔ وہ عام طور سے تینوں وقت کا کھانا باہر ہی کھاتا تھا اور واپس آتے ہوئے مارٹی کے لیے ڈنر اور پھر ناشتے کے لیے کچھ لیتا آتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد مارٹی لاؤنج، کچن اور جہاں تک وہ بیڈ رومز میں جا سکتا تھا، وہاں کی صفائی کرتا تھا۔ یہ کام زیادہ مشکل نہیں تھا۔ وہاں گند کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ گھر بھی بند تھا اس لیے باہر سے دھول مٹی آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ڈرائیور اتوار کے دن چھٹی کرتا تھا اور اس دن وہ مارٹی کی زنجیر کھول کر اس سے پورے گھر کی صفائی کراتا تھا۔ اس دن اسے نہانے دھونے اور دوسرے کاموں کی اجازت ملتی۔ اس کا لباس بہت گندہ ہو رہا تھا۔ ڈرائیور اس کے لیے کچھ کپڑے

بھی لایا تھا۔ یوں اسے کپڑے بدلنے کا موقع بھی ملتا تھا۔ چھٹی والے دن وہ اپنے اور ڈرائیور کے گندے کپڑے بھی دھوتا۔ اس دن وہ بارہ گھنٹے کے لیے آزاد ہو جاتا۔ رات سونے سے پہلے ڈرائیور اسے دوبارہ زنجیر سے باندھ دیتا۔

ڈرائیور اکیلا آدمی تھا۔ نہ کوئی اس سے ملنے آتا تھا اور نہ کوئی اسے کال کرتا تھا۔ شاید وہ بھی کسی سے نہیں ملتا تھا۔ اتوار والے دن وہ اپنی ٹیکسی کی مرمت اور دیکھ بھال بھی خود کرتا۔ رفتہ رفتہ مارٹی کا شعوری خوف کم ہوتا جا رہا تھا۔ وہ ڈرائیور سے مانوس ہو رہا تھا لیکن اندر سے اس کا خوف برقرار تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مارٹی اسے خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتا تھا۔ ایک شام ٹیکسی کے ہارن کی آواز آئی تو وہ ٹی وی بند کر کے تیزی سے دروازے کی طرف آیا اور کنڈی کھول دی۔

جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا، اسے کسی عورت کے چلانے کی آواز آئی۔ وہ لرز گیا۔ ڈرائیور ٹیکسی کے پچھلے حصے سے ایک کسی قدر موٹی سی لڑکی کو نکالنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ چیختے ہوئے بھرپور مزاحمت کر رہی تھی۔ مشتعل ہو کر ڈرائیور نے اس کے منہ پر مکا مارا اور پھر لگاتار کئی مکے مارے۔ لڑکی اس کے طاقتور مکوں کی تاب نہ لا سکی اور اس بار وہ بہ آسانی اسے کھینچ کر اندر لے آیا۔ مارٹی خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا اور جا کر کاؤچ پر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور اس کے سامنے لڑکی کو کھینچتا ہوا اپنے بیڈ روم میں لے گیا اور اندر دھکیل کر دروازہ بند کر دیا۔ پھر وہ پلٹ کر آیا اور فریج سے بیئر کی بوتل نکال کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ کسی درندے کی طرح ہانپ رہا تھا اور اس کے تاثرات بڑے خوفناک تھے۔

یہ رات مارٹی نے بڑی مشکل سے گزاری۔ بیڈ روم سے اس موٹی لڑکی کے بے پناہ چلانے کی آواز آ رہی تھی۔ اس کی چیخوں میں ایسا کرب تھا کہ مارٹی اسے اپنے جسم پر محسوس کر رہا تھا۔ وہ کانوں پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا لیکن چیخیں اس کے دماغ میں گھسی جا رہی تھیں۔ پھر کسی وقت لڑکی خاموش ہو گئی۔ مارٹی نے سکون کا سانس لیا۔ کچھ دیر بعد ڈرائیور باہر آیا تو اس کے لباس پر جا بہ جا خون لگا ہوا تھا۔ اس نے بیئر کی ایک بوتل نکالی اور اسے چند گھونٹ میں خالی کر دیا پھر وہ بیڈ روم میں گیا اور موٹی لڑکی کو اسی طرح کھینچتا ہوا تہ خانے کی طرف لے گیا جیسے کبھی مارٹی کی ماں کو لے گیا تھا۔ فرش پر خون کی موٹی سی لکیر بن رہی تھی۔ مارٹی گھٹنے سمیٹے بیٹھا تھا۔ ڈرائیور واپس آیا اور اس نے مارٹی کی زنجیر کھولتے ہوئے کہا۔ ”خون صاف کرو۔“

مارٹی نے پوچھا اور بالٹی اٹھائی۔ خون بیڈ روم سے لے کر تہ خانے کی سیڑھیوں تک پھیلا ہوا تھا۔ وہ خون صاف کرنے لگا۔ اس نے دیکھا بیڈ کی چادر بھی خون آلود ہو رہی تھی۔ لیکن ڈرائیور نے اسے چادر اور بیڈ کو صاف کرنے سے منع کیا تھا۔ اس کا کام صرف فرش کی صفائی کرنا تھا۔ پہلی بار اس نے سیڑھیاں صاف کرتے ہوئے تہ خانہ دیکھا۔ وہ بہت بڑا تہ خانہ تھا جو شاید پورے مکان کے برابر تھا۔ اس کا فرش کچا تھا اور اس میں جا بہ جا قبروں جیسے ابھار تھے۔ موٹی لڑکی کی لاش ایک طرف پڑی تھی۔ وہ صفائی کر کے اوپر آیا تو ڈرائیور نے اسے باندھ دیا اور خود صرف نیکر اور بنیان میں تہ خانے کی طرف چلا گیا۔ شاید وہ لڑکی کی لاش دفن کرنے والا تھا۔ ایک گھنٹے بعد وہ اوپر آیا اور واش روم میں گھس گیا۔ مارٹی نے صفائی کر کے پوچھا اور بالٹی دھو کر رکھ دیے تھے۔ وہ لیٹ گیا اور کچھ دیر سویا ہو گا کہ ڈرائیور نے اسے اٹھا دیا۔

”میں جا رہا ہوں، دروازہ بند کر لو۔“

وہ بالکل تازہ دم لگ رہا تھا۔ اس کے جانے کے بعد مارٹی دروازہ بند کر کے پھر سو گیا۔ وہ اٹھا تو اس کے ذہن سے رات والا واقعہ نکل گیا تھا پھر اسے اچانک یاد آیا۔ لڑکی کی لاش تہ خانے میں دفن تھی، اور وہاں نہ جانے کتنی لاشیں دفن تھیں؟ شاید کبھی ان لاشوں میں ایک اس کا اضافہ بھی ہو جائے۔ یہ سوچ کر وہ کانپ گیا مگر شام کو ڈرائیور اس کے لیے پیزا لایا اور دونوں نے ساتھ بیٹھ کر ٹی وی دیکھا تو سب پہلے جیسا ہو گیا۔ اس کے بعد یہ معمول بن گیا۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے ڈرائیور کسی عورت یا لڑکی کو لے آتا تھا اور اسے قتل کر کے تہ خانے میں دفن کر دیتا تھا۔ مارٹی نہیں جانتا تھا کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے اور نہ ہی اس نے کبھی پوچھنے کی جرأت کی۔ ایک دن وہ ٹی وی دیکھ رہے تھے، اس میں اسکول دکھایا گیا۔ ڈرائیور نے مارٹی کی طرف دیکھا۔

”چوہے... تم اسکول جاتے تھے؟“

”یس ماسٹر! میں تیسری کلاس میں پڑھتا تھا۔“

”تمہیں پڑھنا آتا ہے؟“

مارٹی نے سر ہلایا۔ وہ نہیں سمجھ سکا کہ ڈرائیور اس سے کیوں پوچھ رہا ہے۔ وہ اگلے روز شام کو واپس آیا تو اس نے رسالوں اور کتابوں کا ایک بنڈل اس کے حوالے کیا۔ ”یہ تمہارے لیے ہیں۔ یہاں تم باقاعدہ تعلیم تو حاصل نہیں کر سکتے لیکن ان رسالوں اور کتابوں سے تمہاری معلومات میں اضافہ ہو گا۔“

اس کے بعد ڈرائیور ہر ہفتے اس کے لیے کتابیں اور رسالے لے آتا تھا۔ اس نے کاؤچ کے ساتھ ایک شیلف بھی لا کر رکھ دیا تھا جس میں مارٹی کتابیں رکھ سکتا تھا۔ وہ اس کے لیے مزید کپڑے لے آیا تھا۔ کچھ عرصے بعد اس نے مارٹی کی زنجیر میں اضافہ کر دیا۔ اب وہ دوسرے بیڈ روم میں آسانی سے آ جا سکتا تھا لیکن اسے اس میں ٹھہرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اسے کاؤچ پر سونا پڑتا تھا۔ مارٹی کے دودھ کے دانت ٹوٹنے لگے تو ڈرائیور نے اسے دانتوں کے بارے میں بتایا اور اسے ٹوتھ برش اور پیسٹ لا کر دیا۔ اب وہ سوتے وقت اور صبح برش کرتا تھا۔ شروع میں اس کے دانت بہت گندے تھے لیکن جیسے جیسے نئے دانت نکلتے رہے، وہ صاف ستھرے ہو گئے۔ ڈرائیور اس کے کھانے پینے کا خیال بھی رکھتا تھا، اس کے لیے اس کی پسند کی چیزیں لاتا تھا۔

دوسری طرف اس نے مارٹی کی ذمے داری میں اضافہ کر دیا تھا۔ اب صبح کا ناشتا مارٹی بناتا تھا۔ ڈرائیور کو گوشت پسند تھا۔ کبھی وہ بھنا ہوا گوشت کبھی گردے اور کبھی کلیجی سے ناشتا کرتا تھا۔ اس نے مارٹی کو یہ ساری چیزیں بنانا سکھائیں۔ خود مارٹی دودھ اور کارن فلیکس کا ناشتا کرتا تھا۔ جب ڈرائیور کام پر چلا جاتا تو مارٹی صفائی ستھرائی سے فارغ ہو کر ٹی وی لگا لیتا یا پھر کوئی کتاب یا رسالہ لے کر بیٹھ جاتا۔ قید اس کے لیے پہلے جیسی مشکل نہیں رہی تھی بلکہ وہ اس ماحول کا عادی ہو گیا تھا۔ وہ خوش بھی رہتا تھا البتہ جب ماں باپ کی یاد آتی تو ایک لمحے کے لیے دل میں ہوک سی اٹھتی مگر عارضی ہوتی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ماں باپ کی یادیں اس کے ذہن میں دھندلی ہوتی جا رہی تھیں۔

مارٹی کے لیے اس مکان میں سب سے مشکل وقت وہ ہوتا تھا جب ڈرائیور کسی لڑکی یا عورت کو لے کر آتا تھا اور اسے اپنے بیڈ روم میں لے جا کر تشدد کا نشانہ بناتا۔ وہاں سے آتی چیخیں مارٹی کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتیں۔ شاید اسے ماں کی چیخیں یاد آ جاتی تھیں۔ جب ڈرائیور کسی عورت یا لڑکی کو لے کر آتا، مارٹی اس وقت تک اذیت میں رہتا جب تک وہ عورت یا لڑکی مر نہیں جاتی تھی۔ پھر اسے خون صاف کرنا پڑتا۔ البتہ لاش ڈرائیور خود دفناتا تھا۔ جب صفائی ہو جاتی تو سب پہلے جیسا ہو جاتا اور مارٹی پرسکون ہو جاتا۔ جب ڈرائیور اپنے بیڈ روم میں کسی عورت یا لڑکی کو اذیت دے رہا ہوتا تھا تو اس وقت مارٹی کو اس سے شدید نفرت محسوس ہوتی تھی اور کئی بار اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ اسے قتل کر دے۔ مگر جب یہ مرحلہ گزر جاتا تو مارٹی کو سب خواب و خیال کی طرح لگنے لگتا اور وہ ڈرائیور کے لیے اپنی نفرت بھول جاتا۔

ایک بار ڈرائیور نے اسے اناٹومی کی کتاب لا کر دی۔ وہ مارٹی کو بہت دلچسپ لگی۔ اس میں انسانی جسم کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ اس نے ڈرائیور سے فرمائش کی کہ وہ اسے اس موضوع پر مزید کتابیں لا کر دے۔ ڈرائیور اس کی فرمائش پر مزید اناٹومی کی کتابیں اور اس موضوع پر شائع ہونے والے ماہانہ رسالے لانے لگا۔ ان رسالوں میں جسم کے ساتھ ساتھ ذہن اور اس کی نفسیات کے بارے میں مضامین بھی آتے تھے۔ مارٹی کا بیشتر وقت اب ان کے بارے میں پڑھتے ہوئے گزرنے لگا۔ اب اسے ٹی وی سے بھی زیادہ دلچسپی نہیں رہی تھی۔

☆☆☆

ہارن کی آواز آئی تو مارٹی پھرتی سے دروازے کی طرف لپکا۔ اس میں اندر کی طرف تین لاک اور دو کنڈیاں لگی تھیں۔ اس نے تینوں لاک کھولے اور پھر دونوں کنڈیاں بھی کھول دیں۔ ڈرائیور ٹیکسی سے سامان اتار رہا تھا۔ مارٹی نے مستعدی سے آگے جا کر اس سے شاپرز لیے۔ ڈرائیور تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ ویسے بھی اب وہ بوڑھا ہو چلا تھا۔ اس کے کنپٹیوں کے سارے بال سفید ہو گئے تھے اور سر کے وسط میں گنج نمودار ہو گیا تھا جو رفتہ رفتہ پھیلتا جا رہا تھا۔ مگر اس کے تن و توش اور صحت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ پہلے کی طرح مضبوط اور طاقتور تھا۔ البتہ اسٹیمنا پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔ وہ شام کو آتا تو تھکا ہوتا تھا۔ اس وقت بھی وہ اندر آ کر صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ مارٹی نے شاپرز رکھ کر اسے فریج سے بیئر نکال کر دی اور پھر شاپرز سے سامان نکال کر اپنی جگہ رکھنے لگا۔ ڈرائیور بیئر پیتے ہوئے غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پکار کر کہا۔ ”اے چوہے... تم تو جوان اور بڑے ہو گئے ہو۔“

”یس ماسٹر... میں اگلے مہینے پورے اٹھارہ سال کا ہو جاؤں گا۔“

”اٹھارہ سال۔“ ڈرائیور نے حیرت سے کہا۔ ”تمہیں یہاں آئے ہوئے دس سال ہو چکے ہیں؟“

”دس سال نو مہینے اور بارہ دن ماسٹر۔“ مارٹی نے جواب دیا۔ اب وہ پونے چھ فٹ قد کا صحت مند نوجوان لڑکا تھا۔

”تمہیں تو دن تک یاد ہے۔“

”یس ماسٹر! میرے پاس یاد رکھنے کو زیادہ کچھ نہیں ہے۔“

بیئر کی بوتل خالی کر کے وہ اٹھ کر کمرے کی طرف بڑھا۔ ”میں نے کھا لیا ہے، تم کھا لینا اور اگر ٹی وی دیکھنا ہو تو آواز آہستہ کر لینا۔ میں سونے جا رہا ہوں۔“

مارٹی نے اپنے لیے کھانا نکال کر گرم کیا اور ٹی وی کے سامنے آبیٹھا۔ اس نے ٹی وی کی آواز آہستہ کر لی تھی۔ وہ اس وقت اپنا پسندیدہ شو دیکھ رہا تھا۔

مارٹی ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ اسے بیڈ روم سے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ اس نے ٹی وی کی آواز بند کر دی۔ آوازیں ڈرائیور کی تھیں اور ایسا لگ رہا تھا کہ وہ سوتے میں کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہے۔ مارٹی اس سے پہلے بھی کئی بار اس کے منہ سے یہ آوازیں سن چکا تھا اور وہ جانتا تھا کہ اب جلد وہ کسی عورت یا لڑکی کو لے کر آئے گا اور اذیت ناک ..... طریقے سے قتل کر دے گا۔ مارٹی نے آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ ڈرائیور کروٹ کرلیٹا ہوا تھا اور اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ اس کے منہ سے ڈری ڈری آوازیں نکل رہی تھیں۔ مارٹی کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر دروازہ بند کر کے واپس آگیا۔ اگلے روز ڈرائیور ذرا دیر سے آیا اور اس کے ساتھ ایک گداز بدن والی جوان لڑکی تھی اور وہ نشے میں دھت تھی۔ اسی وجہ سے ڈرائیور کو اس کے ساتھ زبردستی نہیں کرنا پڑی۔ اس نے اندر آ کر مارٹی کو دیکھا اور ہنس پڑی پھر اس نے ڈرائیور کی طرف دیکھا۔

"بڈھے! تم نے یہ تو بتایا نہیں تھا کہ یہاں ایک اور ہے۔ کیا تم دونوں...؟" لڑکی نے معنی خیز انداز میں کہا اور لہرا کر مارٹی کی طرف آئی۔ "ویسے یہ زیادہ ہینڈسم اور نوجوان ہے۔"

ڈرائیور کا چہرہ تن گیا۔ اس پر سفاک تاثرات نمودار ہو رہے تھے۔ مارٹی کو لڑکی کا انجام معلوم تھا لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ وہ خود اپنے انجام کو قریب لا رہی ہے۔ ڈرائیور آگے آیا تو مارٹی دیکھ نہیں سکا۔ اس نے لڑکی کو اپنی طرف گھماتے ہوئے ایک چھوٹا سا چاقو اس کے گلے پر سامنے کی طرف مارا۔ اس کی نوک نے لڑکی کے گلے میں سوراخ کر دیا جس سے خون ابل پڑا۔ لڑکی نے اپنا گلا تھام لیا اور اس کی آنکھیں تکلیف سے زیادہ حیرت سے پھیل گئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ فرش پر گری اور ساکت ہو گئی۔ ڈرائیور نے جھک کر لڑکی کے لباس سے چاقو صاف کیا اور اسے بند کر کے جیب میں رکھ لیا پھر اس نے مارٹی کی طرف دیکھا۔ "اسے تم ٹھکانے لگاؤ گے؟"

"یس ماسٹر!" مارٹی نے تھوک نگل کر کہا۔

"قبر کھودنے کا سامان نیچے موجود ہے۔ قبر کم سے کم تین فٹ گہری کھودنا۔" یہ کہہ کر اس نے مارٹی کے پاؤں سے زنجیر کھولی اور اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ لڑکی نے اسے اس لذت سے محروم کر دیا جو اسے اذیت دے کر ملتی تھی اس لیے اس کا موڈ آف ہو گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد مارٹی لڑکی کی لاش کھینچتا ہوا تہ خانے میں لے گیا۔ سیڑھیوں سے اترتے ہوئے اسے بہت مشکل پیش آئی تھی۔ اس نے اپنے کپڑے اتارے اور صرف انڈرویئر میں نیچے آیا۔ تہ خانہ اتنا بڑا تھا کہ ساری قبریں اس کے ایک گوشے میں آگئی تھیں۔ مارٹی نے وہیں آخری قبر کے ساتھ زمین کھودنا شروع کی۔ زمین نرم تھی، اسے تین فٹ گہرا، دو فٹ چوڑا اور چھ فٹ لمبا گڑھا کھودنے میں ایک گھنٹا لگا۔

اس نے پہلی بار کوئی اتنی مشقت والا کام کیا تھا۔ اس کا جسم خاصے سرد موسم میں بھی پسینے پسینے ہو گیا۔ قبر تیار کر کے اس نے لڑکی کی لاش کو اس میں ڈالا اور اوپر سے مٹی ڈالنے لگا۔ نصف مٹی ڈال کر اس نے بیلچے سے مار مار کر مٹی کو دبایا اور پھر باقی مٹی بھی ڈال دی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ یہاں ایک قبر کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اچانک اسے خیال آیا کہ ان میں سے کسی ایک قبر میں اس کی ماں دفن ہو گی۔ وہ اندازہ لگانے لگا کہ ان میں سے کون سی قبر اس کی ماں کی ہو سکتی ہے۔ اس کے یہاں آنے کے بعد ڈرائیور بیس عورتوں اور لڑکیوں کو لے کر آیا تھا جبکہ یہاں اب اکتیس قبریں ہو گئی تھیں۔ اس حساب سے گیارھویں قبر اس کی ماں کی ہونی چاہیے تھی۔ یہاں قبریں تین قطاروں میں تھیں اور ہر قطار میں دس قبریں ضرور تھیں۔ آخری قطار میں اس نے گیارھویں قبر کھودی تھی۔

"چھوکرے!" اچانک اوپر سے ڈرائیور کی آواز آئی۔ "تم نے کام مکمل کر لیا؟"

"یس ماسٹر!" وہ جلدی سے بولا۔ ڈرائیور سیڑھیوں پر نمودار ہوا۔ اس نے قبر کا معائنہ کیا اور تعریفی انداز میں سر ہلایا۔

"تم نے اپنا کام اچھی طرح کیا ہے۔ اب اوزار صاف کر کے اوپر آؤ اور شاور لے لو۔"

مارٹی نے اوزار صاف کر کے ایک کونے میں رکھے اور اوپر آگیا۔ اس نے غسل کر کے لباس پہنا اور واپس لاؤنج میں آگیا۔ اسے توقع تھی کہ کچھ دیر میں ڈرائیور آ کر اسے دوبارہ زنجیر سے باندھ دے گا مگر خلافِ توقع ڈرائیور نے اسے نہیں باندھا۔ اس رات وہ بغیر زنجیر کے سویا۔ صبح ڈرائیور نے زنجیر فرش سے بھی کھول کر گیراج میں ڈال دی۔ اس نے مارٹی سے کہا۔ "میں تمہارے کام سے خوش ہوا ہوں اس لیے انعام میں زنجیر کھول دی ہے۔ لیکن تم بس گھر سے باہر نہیں جا سکتے، اس بات کا خیال رکھنا۔"

"یس ماسٹر!" اس نے حسبِ عادت کہا۔ ڈرائیور کے کام پر جانے کے بعد اس نے گیراج میں کھلنے والا دروازہ

اندر سے بند کیا اور پہلے پورے گھر کا معائنہ کیا۔ وہ تہ خانے میں گیا اور اپنی ماں کی قبر کا اندازہ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ قبر کھود کر دیکھتا۔ اسے معلوم تھا کہ اس عرصے میں لاش کی صرف ہڈیاں باقی رہ گئی ہوں گی اور ہڈیاں یہ نہیں بتاتیں کہ وہ کس کی ہیں۔ وہ واپس اوپر آیا۔ مکان اس ساخت کا تھا کہ اس میں کہیں کوئی کھڑکی یا روشن دان نہیں تھا۔ آخر میں وہ گیراج میں آیا لیکن اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش نہیں کی۔ بس چیزوں کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ واپس آگیا۔ گیراج کا خودکار طریقے سے کھلنے اور بند ہونے والا دروازہ فولادی تھا اور اسے شاید صرف ٹیکسی میں موجود ریموٹ سے کھولا جا سکتا تھا۔ شام کو ڈرائیور آیا تو اس نے خاصے شاپرز اٹھا رکھے تھے اور وہ خود انہیں اٹھا کر اندر لایا تھا۔ کچھ شاپرز اس نے کچن کاؤنٹر پر رکھے اور ایک بڑا سا سوٹ اور الا کیس اس کی طرف بڑھایا۔

"یہ تمہارے لیے ہے۔"

"میرے لیے؟" مارٹی نے حیرت سے کہا۔ "اس میں کیا ہے؟"

"اب تم بڑے ہو گئے ہو۔ اس میں تمہارے لیے سوٹ ہے اور یہ اس کے ساتھ جوتے اور موزے ہیں۔" اس نے ایک اور شاپر اس کی طرف بڑھایا۔ "امید ہے یہ سب تمہارے سائز کے ہوں گے۔"

مارٹی جلدی سے یہ سب لے کر دوسرے بیڈ روم میں آیا۔ اس نے کیس سے سوٹ نکالا۔ یہ مکمل سوٹ تھا اور بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔ اس نے سوٹ پہنا تو وہ اسے بالکل فٹ آیا۔ پھر اس نے موزے اور جوتے پہنے۔ یہ بھی ناپ کے تھے۔ اس نے تیار ہو کر خود کو آئینے میں دیکھا تو زندگی میں پہلی بار اسے اپنا آپ بہت اچھا لگا۔ ڈرائیور ہر دو مہینے کے بعد اس کے سر پر مشین پھیر دیتا تھا۔ اس کے بال مختصر ہو جاتے تھے۔ آخری بار اس نے بیس دن پہلے مشین پھیری تھی اس لیے سر کے بال معقول حد تک بڑے ہو گئے تھے۔ اس کے رخساروں پر سنہری رواں آگیا تھا لیکن اس نے آج تک شیو نہیں بنائی تھی۔ وہ باہر آیا تو ڈرائیور نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا۔ اس رات اس نے مارٹی کے بال سیٹ کیے اور خود استرے سے اس کی شیو بنائی۔ اگلے روز کام پر جانے سے پہلے اس نے مارٹی سے کہا۔ "شام کو تیار رہنا، میں تمہیں باہر لے جاؤں گا۔"

"باہر؟" مارٹی نے خوش ہو کر کہا۔ اسے بچپن کے کچھ منظر یاد تھے جو اس نے باہر گزارے تھے لیکن وہ سب اب دھندلا سا ہو گیا تھا۔ بعض اوقات اسے شبہ ہوتا کہ شاید باہر کچھ بھی نہیں ہے... دنیا بلکہ کائنات اسی گھر تک محدود ہے۔ اس کے باہر جو ہے وہ حقیقی نہیں ہے۔ اس لیے جب ڈرائیور نے اسے باہر لے جانے کو کہا تو وہ خوش ہو گیا۔ اس دن وہ شام سے پہلے تیار ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ شام کو آیا اور اس کا تنقیدی نظروں سے جائزہ لیا۔ "ایک منٹ رکو..." وہ اندر گیا اور پرفیوم نکال کر لایا۔ اس نے سر سے پاؤں تک اس پر اتنا اسپرے کیا کہ وہ خوشبو میں نہا گیا۔ وہ گیراج میں آئے، ڈرائیور نے اندر بیٹھ کر فرنٹ سیٹ والا دروازہ کھول دیا۔ وہ اس کے برابر میں آبیٹھا۔ ڈرائیور نے بٹن دبا کر گیراج کا دروازہ کھولا۔ تقریباً گیارہ سال بعد مارٹی نے آسمان دیکھا تھا۔ سوائے مغربی افق کے باقی آسمان تاریک ہو گیا تھا لیکن وہ پھر بھی آسمان تھا۔ ہوا میں ایسی تازگی تھی جو اس سے پہلے مارٹی نے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ وہ بند گھر کی ہوا کا عادی تھا۔

مارٹی اس جنگل نما علاقے کو دیکھ رہا تھا۔ اسے تھوڑا سا یاد آیا جب وہ یہاں لایا گیا تھا تب بھی یہ علاقہ ایسا ہی تھا اور یہاں سوائے ڈرائیور کے مکان کے اور کچھ نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ہائی وے پر تھے اور ٹیکسی کا رخ لندن کی طرف تھا۔ مارٹی ایک ایک چیز کو دیکھ رہا تھا پھر وہ سڑک آئی جو سر ہیف ٹاؤن کی طرف جاتی تھی جہاں اس کا گھر تھا۔ آگے کا علاقہ خاصا بدل گیا تھا جہاں پہلے آبادی نہیں تھی، اب وہاں بھی آبادی ہو گئی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ ایک بارونق سڑک پر تھے۔ یہاں نائٹ کلبس اور بار تھے۔ وہاں لڑکے اور لڑکیوں کا ہجوم تھا جو آپس میں گفتگو کر رہے تھے، ان میں سے کچھ اکیلے بھی نظر آ رہے تھے۔ ڈرائیور نے ایک ایسی ہی نوجوان لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ کیسی ہے؟"

لڑکی نوجوان تھی شاید اٹھارہ سال کی... دلکش نقوش اور متناسب جسامت کی۔ اس نے تنگ اسکرٹ کے ساتھ سویٹر پہن رکھا تھا اور ایک طرف کھڑی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا کوئی ساتھی نہ ہو۔ "اچھی ہے۔"

"جا کر اس سے ملو اور پھر اسے لے کر ٹیکسی میں آؤ لیکن یہ مت ظاہر کرنا کہ تم مجھے جانتے ہو۔"

مارٹی ہچکچایا لیکن پھر لڑکی کی طرف بڑھا۔ وہ قریب آیا تو لڑکی نے اس کی طرف دیکھا۔ "ہائے... میرا نام مارٹی ہے۔"

"ہائے۔" لڑکی بولی۔ "لیزا..."

"تم اکیلی ہو؟"

"ہاں، میری دوست نے آنا تھا لیکن وہ نہیں آئی ہے۔"

"پھر تم کیا کرو گی؟"

”کچھ نہیں، میں سوچ رہی ہوں واپس گھر چلی جاؤں۔ میری دوست کال بھی ریسیو نہیں کر رہی ہے۔“ لیزا نے کہا اور باہر نکل کر ایک طرف چل پڑی۔ مارٹی بھی اس کے ساتھ چلنے لگا۔

”سنو، ایک ڈرنک کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”نہیں شکریہ۔“ لڑکی نے کہا اور تیز قدموں سے چلنے لگی۔ وہ کچھ گھبرا گئی تھی۔ مارٹی نے پلٹ کر ڈرائیور کی طرف دیکھا۔ وہ ٹیکسی اسٹارٹ کر کے ان کی طرف لانے لگا۔ نہ جانے کیوں مارٹی کا دل چاہا کہ لیزا یہاں سے چلی جائے۔ وہ ان کے ساتھ نہ جائے۔ اسے معلوم تھا کہ وہ ان کے ساتھ گئی تو اس کے ساتھ کیا ہوگا؟ ڈرائیور نے ٹیکسی لیزا کے پاس لے جا کر روکی اور اتر کر سامنے سے فٹ پاتھ پر آیا۔ بہ ظاہر اس کا انداز ایسا لگ رہا تھا کہ وہ لیزا کے مخالف سمت میں جا رہا ہو لیکن لیزا کے پاس سے گزرتے ہوئے اچانک اس نے ایک ہاتھ لیزا کے منہ پر رکھ دیا اور دوسرے ہاتھ سے اسے قابو کر لیا۔ لیزا تڑپی لیکن فوراً ہی... ڈھیلی پڑ گئی۔ یہ جگہ سنسان تھی اور کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ مارٹی لپکا۔ جب تک وہ پاس آتا، ڈرائیور لیزا کو ٹیکسی کی پچھلی نشست پر ڈال چکا تھا۔ مارٹی نے پاس آ کر کہا۔

”پلیز! اسے چھوڑ دو۔“

ڈرائیور نے سخت نظروں سے اسے دیکھا۔ ”بکومت اور گاڑی میں آؤ۔“

مارٹی اندر آیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا، لیزا بے سدھ تھی اور اس کے پاس سے کلوروفارم کی بو آ رہی تھی۔ ڈرائیور نے اسے کلوروفارم کی مدد سے بے ہوش کیا تھا۔ اس نے... ٹیکسی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔ مارٹی نے پھر التجا کی۔ ”پلیز ماسٹر! اسے چھوڑ دو۔“

ڈرائیور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ٹیکسی کی رفتار بڑھا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ آبادی سے باہر نکل آئے۔ مارٹی بے چین تھا، وہ بار بار مڑ کر بے ہوش لیزا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آدھ گھنٹے بعد وہ دوبارہ گھر میں تھے۔ گیراج کا دروازہ بند ہوتے ہی ڈرائیور نیچے اترا اور اس نے مارٹی سے کہا۔

”اسے اندر لاؤ۔“

مارٹی نے اتر کر لیزا کو اٹھایا۔ وہ بہت ہلکی پھلکی سی تھی۔ مارٹی نے پہلی بار کسی لڑکی کو چھوا تھا۔ وہ ریشم کی طرح نرم تھی۔ مارٹی اسے اندر لایا اور کاؤچ پر لٹانے لگا کہ ڈرائیور نے کہا۔ ”اسے دوسرے بیڈروم میں لے جاؤ۔“

مارٹی اسے دوسرے بیڈروم میں لایا اور بیڈ پر لٹا دیا۔

نزدیک سے لیزا اسے اور بھی حسین اور دلکش لگی۔ اسے دیکھتے ہوئے مارٹی کا دل کٹنے لگا۔ یہ سوچ کر کہ وہ بھی ڈرائیور کی درندگی کا شکار ہو جائے گی۔ اس نے لیزا کے ہاتھ پاؤں سیدھے کیے اور پھر اس کے بال بھی سنوارے۔ وہ بوجھل دل کے ساتھ باہر آیا تو ڈرائیور صوفے پر بیٹھا ٹی وی دیکھتے ہوئے حسب معمول بیئر پی رہا تھا۔ مارٹی کاؤچ پر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے اچانک پوچھا۔ ”لڑکی کیسی لگی؟“

مارٹی چونکا۔ ”اچھی ہے... اچھی لگی۔“

”وہ تمہاری ہے۔“

مارٹی پھر چونکا۔ ”میری...؟ کیا مطلب ماسٹر؟“

”مطلب واضح ہے۔ وہ تمہارے لیے ہے۔ جیسے میں اب تک اپنے لیے لاتا رہا ہوں، اس بار تمہارے لیے لایا ہوں۔“

”تم... میں اس کا کیا کروں گا؟“

ڈرائیور نے سر گھما کر اسے دیکھا۔ ”وہی جو میں کرتا ہوں۔“

مارٹی کانپ گیا۔ ”نہیں۔“ اس نے بے ساختہ کہا۔

”کیا نہیں؟“ ڈرائیور کا لہجہ سخت ہو گیا۔

”میرا مطلب ہے... م... میں کیسے؟“

”یہ بہت آسان ہے۔ بس ایک نرم و نازک جسم تمہارے قابو میں ہونا چاہیے اور ایک چھوٹا تیز دھار والا چاقو ہو پھر دیکھو کتنا لطف آتا ہے۔“

لطف تو ایک طرف رہا، مارٹی کو یہ سوچ کر ہی ہول آ رہا تھا کہ وہ لیزا کے نرم و نازک بدن پر چاقو چلا سکتا ہے۔ اس نے خوف زدہ نظروں سے ڈرائیور کی طرف دیکھا۔ ”میں... یہ نہیں کر سکتا۔“

اس نے ایک چھوٹا سا چاقو مارٹی کی طرف اچھال دیا۔ ”یہ لو...“

مارٹی نے چاقو پکڑ لیا۔ اس نے بٹن دبا کر اسے کھولا اور اس کی تیز دھار دیکھ کر اس کے جسم میں سردی لہر دوڑ گئی۔ اس نے چاقو بند کر دیا اور نفی میں سر ہلایا۔ ”میں نہیں کر سکتا۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس کا لہجہ سرد ہو گیا۔ ”تم نہیں کر سکتے، تب یہ کام میں کروں گا۔“

وہ کانپ گیا۔ ”پلیز ماسٹر! اسے جانے دو۔“

”کوئی یہاں سے زندہ نہیں جا سکتا ہے۔“ ڈرائیور کا لہجہ سفاک ہو گیا۔ ”اسے مرنا ہوگا۔ تم یہ کام کرو گے یا میں کروں گا۔“

چاقو مارٹی کے ہاتھ میں کانپنے لگا۔ اسے خیال آیا کہ شاید اسی چاقو نے اس کی ماں کو موت کے گھاٹ اتارا ہوگا۔ اس نے

ڈرائیور کی طرف دیکھا۔ ”تم یہ سب کیوں کرتے ہو ماسٹر؟“

”کیونکہ میں نے بھی سب دیکھا ہے۔“ اس نے بیئر کی بوتل خالی کر کے ایک طرف اچھال دی۔ ”میرا باپ بھی کرتا تھا۔ اس نے میری ماں کو اسی طرح اذیت دے دے کر مار ڈالا۔ پھر اس نے دوسری عورتوں کو لا کر قتل کرنا شروع کر دیا۔ ایک وقت تھا جب میں تمہاری طرح چوہا تھا۔ عورتوں کی چیخیں سن کر کانوں پر ہاتھ رکھ لیتا تھا۔ مجھے معلوم ہے جب میں کسی عورت کو قتل کر رہا ہوتا ہوں تو اس کی چیخیں سن کر تم مجھے قتل کرنے کا سوچتے ہو۔ لیکن تم ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ تم ایک چوہے ہو۔ جیسے میں بھی چوہا تھا۔ اپنے باپ کو قتل کرنے کا سوچتا تھا لیکن میں اسے قتل نہیں کر سکا۔ پھر اس نے اسی طرح ایک لڑکی کو میرے ہاتھ سے قتل کروایا۔ وہ مجھے اچھی لگی تھی لیکن باپ کے مجبور کرنے پر میں نے اسے قتل کر دیا، تب سے میں قتل کرتا آ رہا ہوں۔“

”لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا۔“

”تم بھی ایسا ہی کرو گے۔ میں نے شادی نہیں کی، میں آج تک کسی عورت کے پاس نہیں گیا۔ میں نے جتنی عورتوں کو قتل کیا، ان کو حاصل نہیں کیا۔ میں اس سلسلے کو خود پر ختم کرنا چاہتا تھا لیکن پھر تم آ گئے اور اب تم اس سلسلے کو آگے بڑھاؤ گے۔“

”نہیں۔“ مارٹی رونے والے انداز میں بولا۔

”تمہیں ایسا کرنا ہوگا۔“

”نہیں۔“ مارٹی چلّایا۔

اسی لمحے بیڈروم کی طرف سے لیزا کی آواز آئی۔ وہ مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ اسے ہوش آ گیا تھا۔ ڈرائیور کھڑا ہو گیا۔ اس نے مارٹی کی طرف ہاتھ پھیلایا۔ ”چاقو مجھے دو۔“

”نہیں...“

”تم میرا حکم ماننے سے انکار کر رہے ہو؟“ وہ غرایا۔

مارٹی کھڑا ہو گیا۔ ”نہیں، میں تمہارا حکم مان رہا ہوں۔“ وہ بیڈروم کی طرف بڑھا تو ڈرائیور نے قہقہہ لگایا۔ ”گڈ بوائے! اب تم چوہے نہیں رہو گے۔“

وہ دوبارہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ مارٹی بیڈروم تک آیا، اس نے چاقو کوٹ کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ وہ اندر آیا تو لیزا خوف زدہ ہو کر بیڈ کے کونے میں سمٹ گئی۔ اس نے مارٹی اور ڈرائیور کی گفتگو سن لی تھی۔ وہ سرگوشی میں بولی۔ ”پلیز... پلیز۔“

”آئی ایم سوری۔“ مارٹی نے کہا۔ اسے لگا جیسے اس کا جسم کانپ رہا ہو اور روح رسا ہو رہا ہو۔

”مجھے مت مارو۔“

اعتماد

”ہماری نئی کار کو آئے ہوئے تھوڑے ہی دن ہوئے تھے۔“

ایک امریکی مصنفہ اپنی آپ بیتی میں تحریر کرتی ہیں۔ ”اور میں اس سے اچھی طرح واقف نہ ہو سکی تھی۔ میں نے ایک چوراہے کے قریب اخبار خریدنے کے لیے اسے روک کر کھڑکی کا شیشہ نیچے کرنے والا بٹن دبایا تو دوسری طرف کی کھڑکی کا شیشہ نیچے سرک گیا۔ دوبارہ کوشش کی تو پچھلی کھڑکیوں کے شیشے نیچے ہو گئے۔ تیسری بار کوشش کی تو سارے شیشے اوپر چڑھ گئے۔

”ٹریفک کانسٹیبل اس تماشے سے خوب لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میری جھنجلاہٹ اور پریشانی دیکھ کر وہ کار کے پاس آیا اور دروازہ کھول کر مطلوبہ شیشے کو نیچے گرا دیا۔

میں نے کہا۔ ”بہت بہت شکریہ آفیسر!“

بولا۔ ”شکریے کی ضرورت نہیں۔ کبھی کبھی مجھے اس بات پر پریشانی ہونے لگتی ہے کہ عورتیں دنیا کی حکومت کا نظام سنبھال لیں گی تو مردوں کا کیا حشر ہوگا؟ ایسے وقت میں آپ جیسی کوئی خاتون آتی ہیں اور میرا مردوں پر اعتماد بحال کر جاتی ہیں۔“

مرسلہ: طیب شاہین، کھیالہ شیخاں

مارٹی بیڈ پر ٹک گیا اور آہستہ سے بولا۔ ”میں تمہیں تکلیف دینا نہیں چاہتا۔“

لیزا کے چہرے پر امید جھلکنے لگی۔ وہ سرک کر اس کے پاس آ گئی۔ ”تم سچ کہہ رہے ہو؟“

مارٹی نے سر ہلایا۔ ”ہاں، تم مجھے اچھی لگی ہو۔“

”تم بھی مجھے اچھے لگے ہو لیکن پلیز... مجھے یہاں سے نکال دو۔“

”میں نہیں نکال سکتا۔“ مارٹی نے مایوسی سے کہا۔ ”میں خود اس کا قیدی ہوں۔“

لیزا کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ”تم بھی اس کے قیدی ہو؟“

”بچپن سے... میں سات سال کا تھا جب یہ مجھے میری ماں سمیت یہاں لایا تھا۔“

”تمہاری ماں کہاں ہے؟“

”اس نے ماں کو مار دیا تھا۔ یہ عورتوں اور لڑکیوں کو لاتا ہے اور پھر انہیں قتل کر دیتا ہے۔“

لیزا کانپنے لگی۔ اس نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔ ”میں مرنا نہیں چاہتی... پلیز مجھے بچا لو۔“ وہ مارٹی سے لپٹ

گئی۔ ”تم مجھ سے محبت کرتے ہو نا... مجھے بچالو۔“

”یہ ممکن نہیں ہے۔“ مارٹی بولا۔ ”اگر میں نے تمہیں چھوڑ دیا تو وہ مار دے گا۔ اس کا کہنا ہے کہ یہاں آنے والا کوئی فرد یہاں سے زندہ نہیں جاسکتا۔“

”تم کچھ تو کرسکتے ہو۔“ لیزا نے اس کا ہاتھ تھام کر ملتجی لہجے میں کہا۔

”چوہے۔“ اچانک ڈرائیور کی آواز آئی۔ ”تم نے اب تک کچھ نہیں کیا ہے، کوئی آواز نہیں آئی ہے۔“

لیزا کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اس نے لرزتے لہجے میں کہا۔ ”تم... مجھے مار دو گے؟“

”سوری لیزا! میں مجبور ہوں۔“ مارٹی نے کہا اور جیب سے چاقو نکال لیا۔ ”سنو کیا تم مجھ پر اعتماد کرسکتی ہو؟ میں تمہیں بچالوں گا۔“

لیزا اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی پھر اس نے سر ہلایا۔ ”میں تم پر اعتماد کرتی ہوں۔“

”چوہے! تم کیا کر رہے ہو؟“ ڈرائیور کی آواز آئی اور پھر وہ خود اٹھ کر بیڈ روم کی طرف آنے لگا۔ مارٹی نے لیزا کو کمر سے تھام کر اپنی طرف کھینچا۔

”مجھے معاف کر دینا۔“ اس نے سرگوشی میں کہا اور چاقو اس کے جسم میں اتار دیا۔ لیزا نے چیخ ماری۔ اسی لمحے ڈرائیور نے بیڈ روم کا دروازہ کھولا اور اندر جھانکا۔ مارٹی نے لیزا کو بستر پر گرا دیا، خون آلود چاقو اس کے ہاتھ میں تھا۔ ڈرائیور ساکت کھڑا دیکھ رہا تھا۔ مارٹی اس کی طرف گھوما اور چلّایا۔ ”چلے جاؤ یہاں سے... سنا تم نے، چلے جاؤ۔“

ڈرائیور نے دروازہ بند کیا اور وہاں سے چلا گیا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد مارٹی لڑکھڑاتا ہوا کمرے سے نکلا اور کاؤچ پر ڈھیر ہو گیا۔ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”میں نے اسے مار دیا۔“

”لیکن تم نے ایک ہی وار میں اسے ختم کر دیا۔“

”میں اسے اذیت نہیں دے سکتا تھا۔ اس لیے پہلا وار دل پر کیا، وہ فوراً مر گئی۔“

”اس کی لاش...؟“

”میں ٹھکانے لگاؤں گا۔“ مارٹی نے کہا اور اٹھ کر کچن کے سنک میں اپنے خون آلود ہاتھ اور چاقو دھونے لگا۔ چاقو دھو کر اس نے اپنے کوٹ میں رکھنا چاہا لیکن ڈرائیور نے اس سے مانگ لیا۔

”چاقو مجھے دے دو۔“

مارٹی نے چاقو اسے دے دیا۔ ”مجھے بھوک لگی ہے۔“

”آج تم اپنے لیے بھی گوشت بنا لو۔ ہم ساتھ ڈنر کریں گے۔ اس کے بعد تم لڑکی کو دفن کر دینا۔“

اس رات پہلی بار مارٹی نے اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اگر ڈرائیور گھر میں کھانا کھاتا تو وہ اکیلا ہی میز پر بیٹھ کر کھاتا تھا اور جب تک وہ کھاتا، مارٹی اس کے پاس کھڑا رہتا اور اس کے کھانے کے بعد کھاتا تھا۔ کھانے کے بعد اس نے کپڑے اتارے اور بیڈ روم میں چلا گیا۔ ڈرائیور صوفے پر بیٹھ کر ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد مارٹی لیزا کی لاش کو کھینچتا ہوا تہ خانے کی طرف لے گیا۔ ایک گھنٹے بعد وہ مٹی میں لت پت واپس آیا تو تھکا ہوا اور دکھی لگ رہا تھا۔ غسل کرکے اس نے کپڑے پہنے اور ڈرائیور سے پوچھا۔ ”کیا میں بیئر لے سکتا ہوں؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”آج سے میں تمہارے لیے بھی بیئر لاؤں گا۔“

”آج سے میں بیڈ روم میں سوؤں گا۔“ مارٹی نے فریج سے اپنے لیے بیئر نکالتے ہوئے کہا۔ ”کیا تمہارے لیے بھی بیئر نکالوں؟“

ڈرائیور نے سر ہلایا تو مارٹی اس کے لیے بھی بیئر لے آیا۔ وہ پہلے ہی کئی بوتلیں پی چکا تھا اس لیے اس کی آنکھیں کسی قدر بوجھل ہو رہی تھیں۔ یہ بوتل خالی کرکے وہ کھڑا ہو گیا۔ ”اب میں سوؤں گا۔“

اپنے بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے اس نے دوسرے بیڈ روم میں جھانکا۔ ”لگتا ہے خون کم نکلا تھا، بیڈ کی چادر صاف ہے۔“

”ہاں دل پر وار لگا تھا اس لیے وہ فوراً مر گئی اور خون بہت کم نکلا۔“ مارٹی نے جلدی سے کہا۔ ڈرائیور اپنے بیڈ روم میں چلا گیا اور دروازہ بند کرلیا۔ مارٹی اپنے بیڈ روم میں آیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ اس نے روشنی بجھا دی لیکن اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ اس کے کان دوسرے بیڈ روم کی آہٹوں پر مرکوز تھے۔ بیڈ کا کھٹا چرچرا رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ابھی سویا نہیں ہے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد بیڈ چرچرانا بند ہو گیا۔ مارٹی خاموشی سے اٹھا اور دبے قدموں باہر آیا۔ اس نے کان لگا کر سنا، ڈرائیور کے حلق سے خرخرانے کی آواز آرہی تھی۔ وہ نیند میں ایسی ہی آواز نکالتا تھا۔ مارٹی نے بہت آہستہ سے دروازے کا لٹو گھمایا۔ وہ کھل گیا، دروازہ لاک نہیں تھا۔ اندر ڈرائیور بیڈ پر چت لیٹا سو رہا تھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ مارٹی اندر آیا۔ اس نے بیڈ کی سائڈ دراز پر رکھا چابیوں کا گچھا آہستہ سے اٹھایا اور اسے ہاتھ میں دبا کر باہر آگیا۔

دروازہ بند کرکے وہ تیزی سے گیراج میں آیا۔ جب ڈرائیور گھر میں ہوتا تھا تو گیراج کا دروازہ آن لاک رکھا جاتا تھا۔ اس نے گیراج میں آکر ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور اندر گھسا۔ گیراج کا دروازہ کھولنے والا ریموٹ ڈیش بورڈ میں نصب تھا۔ اس نے بٹن دبایا تو گیراج کا دروازہ کھلنے لگا۔ جیسے ہی یہ اوپر ہوا، وہ باہر کی طرف لپکا مگر دروازے کے پاس آتے ہی اس کا پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا اور فوراً ہی مکان کے اندر کے حصے میں الارم بجنے لگا۔ مارٹی نے جھک کر دیکھا۔ یہ فرش پر پڑی ایک ربر میٹ جیسی چیز تھی۔ اس کا پاؤں اس پر آیا تھا اور شاید یہ الارم کا بٹن تھا۔ وہ باہر نکلا تو گیراج کا دروازہ خودکار طریقے سے بند ہو رہا تھا۔ اسے ڈرائیونگ نہیں آتی تھی ورنہ وہ ٹیکسی لے جاتا۔ مگر اب اسے پیدل ہی جانا تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ ڈرائیور اس کے پیچھے آئے گا۔ اس لیے وہ کچے راستے کی طرف جانے کے بجائے جھاڑیوں میں گھس گیا۔ اسی لمحے گیراج کا دروازہ کھلا اور ڈرائیور باہر آیا۔ اس نے چلّا کر کہا۔

”چوہے... مجھے معلوم ہے تم یہاں ہو۔ تم مکان سے نکل گئے ہو لیکن تم اس لڑکی کو نہیں بچا سکتے۔ میں جان گیا ہوں تم نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ تم نے اسے مارا نہیں ہے، صرف زخمی کیا تھا اور میں دھوکا کھا گیا۔ لیکن اب میں جا کر تمہارا ادھورا کام مکمل کروں گا اور جب تک تم پولیس کو لے کر آؤ گے میں یہاں سے جا چکا ہوں گا اور یہاں پولیس کو سوائے مٹی اور راکھ کے اور کچھ نہیں ملے گا۔ تم چوہے ہو، سچ مچ چوہے... ورنہ مجھے قتل کر دیتے لیکن تم چوہے کی طرح منہ چھپا کر بھاگ رہے ہو۔“

مارٹی کا دل ایک لمحے کو رک گیا۔ اس کا ارادہ یہی تھا کہ پولیس کی مدد حاصل کرتا۔ اس نے سچ مچ لیزا کو معمولی زخمی کیا تھا۔ اناٹومی پڑھنے کی وجہ سے اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ جسم کے کس حصے میں چاقو مارا جائے تو کوئی اعضا متاثر نہیں ہوتا اور نہ کوئی نس یا شریان کٹتی ہے۔ لیکن زخم بہت گہرا نظر آتا ہے۔ اس نے لیزا کو اسی طرح زخمی کیا تھا پھر اسے تہ خانے میں لے جا کر ایک تاریک گوشے میں لٹا دیا تھا۔ اس نے اسے تسلی دی تھی کہ وہ جلد مدد لے کر آئے گا۔ پھر اس نے ایک مصنوعی قبر تیار کی تھی تاکہ ڈرائیور اچانک دیکھنے کے لیے آجائے تو اسے شک نہ ہو۔ مگر اس کی ذرا سی غلطی سے ڈرائیور سب جان گیا تھا۔ جیسے ہی وہ اندر گیا، مارٹی جھاڑیوں سے نکل کر گیراج کی طرف لپکا مگر اس کے پہنچنے سے پہلے فوراً ہی دروازہ بند ہو گیا تھا۔

یہ بہت مضبوط تھا۔ وہ کسی صورت اسے نہیں کھول سکتا تھا۔ وہ بھاگتا ہوا مکان کے چاروں طرف گھوم کر دیکھنے لگا۔ چاند کی روشنی میں سب صاف نظر آرہا تھا لیکن اسے مکان میں داخل ہونے کا کوئی راستہ نظر نہیں آیا۔ مارٹی پاگل ہو رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لیزا کی زندگی کے امکانات کم ہوتے جائیں گے۔ ڈرائیور کسی وقت بھی تہ خانے میں جا کر اسے قتل کر دے گا اور وہ اسے بچانے کے لیے کچھ نہیں کرسکے گا۔ اچانک اس کی نظر مکان کے عقبی حصے میں واقع چمنی کی طرف گئی۔ یہ چمنی تہ خانے میں لگی بھٹی تک جاتی تھی مگر ان دنوں موسم گرم ہونے کی وجہ سے بھٹی بند تھی۔

مارٹی دیوار کے ساتھ آیا۔ اس نے اچھل کر ترچھی چھت کا کنارہ تھاما اور اوپر چڑھنے کی کوشش کی۔ یہ بڑا مشکل کام تھا لیکن وہ کسی طرح اوپر چڑھ گیا اور پھر ترچھی چھت سے ہوتا چمنی کی طرف بڑھا۔ یہ ٹین سے بنی چوکور چمنی تھی جس کی چوڑائی ڈیڑھ فٹ تھی اور موٹائی ایک فٹ تھی۔ مارٹی نے اس کا اوپری سرا اکھاڑ دیا اور پھر اس میں داخل ہوا۔ وہ پیروں کے بل گیا تھا۔ اگر چمنی اندر سے کھردری نہ ہوتی تو وہ بہت تیزی سے اندر جاتا۔ وہ رگڑ کھاتا ہوا کم رفتار سے نیچے بھٹی میں گرا جس میں راکھ جمع تھی۔ اس سے بھی اس کی بچت ہوئی اور اسے چوٹ نہیں لگی۔ بھٹی میں راکھ کا بادل اٹھا اور اس نے سانس روک لی ورنہ یہ ساری راکھ اس کے حلق میں جاتی۔ اس نے ٹٹول کر بھٹی کا دروازہ تلاش کیا اور اس کی سلاخوں سے ہاتھ نکال کر باہر سے کنڈی کھول دی۔

وہ کوشش کر رہا تھا کہ آہٹ نہ ہو تاکہ ڈرائیور تہ خانے میں آگیا ہو تب بھی اسے پتا نہ چلے۔ تہ خانے میں سیڑھیوں کے پاس ایک بلب جلتا تھا اور اس کی روشنی زیادہ تر قبروں والے حصے تک محدود رہتی تھی۔ مارٹی نے راکھ صاف کرنے والی سلاخ اٹھا لی تھی۔ مارٹی محتاط قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا۔ تہ خانے کے بڑے حصے میں تاریکی تھی۔ وہ لیزا کو بھی آواز نہیں دے رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں ڈرائیور نہ سن لے۔ اچانک تاریکی میں کسی کی سسکی گونجی۔ یہ لیزا تھی جو ایک طرف تھی۔ مارٹی اس طرف بڑھا۔ اس نے زمین پر بیٹھتے ہوئے ہاتھوں سے ٹٹولا اور جیسے ہی اس نے لیزا کو چھوا، وہ ڈر کر اچھل گئی، اس کے منہ سے ہلکی سی آواز نکلی۔ مارٹی نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور سرگوشی میں بولا۔

”ڈرو مت... یہ میں ہوں۔“

لیزا نے سکون کا سانس لیا۔ ”پلیز! مجھے یہاں سے نکالو۔“

"شش... بولو مت، اسے تمہارے بارے میں پتا چل گیا ہے اور میں باہر نکلا تو اس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ اس کا ارادہ تمہیں مار کر پورے گھر کو آگ لگا کر فرار ہونے کا ہے۔"

"میرے خدا... پھر تم اندر کیسے آئے؟"

"چمنی کے راستے سے بیسمنٹ میں اترا... بس یہی ایک راستہ تھا۔"

"یہاں سے نکلو، اس سے پہلے کہ وہ یہاں آ جائے۔"

"ہم نہیں جا سکتے۔" مارٹی نے کہا۔ "وہ اوپر موجود ہے۔ میں اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ وہ نیچے آئے گا تو میں اس پر قابو پانے کی کوشش کروں گا۔ اس کے بعد ہی ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں۔"

اسی لمحے سیڑھیوں کی طرف سے آہٹ ہوئی۔ مارٹی نے جلدی سے لیزا کو دیوار کی جڑ میں دھکیل دیا اور سرگوشی میں بولا۔ "یہاں سے ہلنا مت، نہ آواز نکالنا۔"

وہ تاریکی میں ایک طرف رینگ گیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ نیم تاریکی میں وہ اسے دیکھ لے گا۔ ڈرائیور سیڑھیوں سے نمودار ہوا۔ اس نے کہا۔ "لڑکی... مجھے معلوم ہے کہ تم زندہ ہو۔ تم یہیں کہیں چھپی ہو۔ تمہیں اس چوہے نے چھپایا ہے لیکن میں تمہیں تلاش کر لوں گا اور پھر تمہیں موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔ میں یہاں سے چلا جاؤں گا لیکن بعد میں اس چوہے کو تلاش کر کے مار دوں گا۔ اس نے مجھے دھوکا دیا۔ ایک لڑکی کی خاطر... وہ اس قابل نہیں ہے کہ میرا جانشین بنے۔"

یہ کہتے ہوئے ڈرائیور نے اچانک ٹارچ روشن کر لی۔ مارٹی جو اٹھ رہا تھا، دوبارہ زمین پر گر گیا۔ ٹارچ کی روشنی تہ خانے میں لہرا رہی تھی۔ اب کچھ دیر کی بات تھی کہ ڈرائیور مارٹی اور لیزا کو دیکھ لیتا۔ وہ ایک بار مارٹی کو دیکھ لیتا تو مارٹی کے لیے اس پر قابو پانا مشکل ہو جاتا۔ وہ اس کی نسبت کہیں طاقتور اور چاقو کے استعمال کا ماہر تھا۔ یہ بات شاید لیزا نے بھی محسوس کر لی اور اس نے ڈرائیور کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے ہلکی سی آواز نکالی۔ ٹارچ کی روشنی جو پورے تہ خانے میں سرسرا رہی تھی اور ایک بار مارٹی کے بہت پاس سے گزری تھی، لیزا کی آواز سنتے ہی اس کی طرف گئی اور وہ روشنی میں آ گئی۔

"لڑکی... میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے۔" وہ سیڑھیوں سے اتر کر لیزا کی طرف بڑھا۔ اس نے چاقو نکال لیا تھا۔ "وہ چوہا تمہیں چھوڑ کر فرار ہو گیا ہے مگر وہ مجھ سے دور نہیں جا سکے گا۔ میں اسے تلاش کر لوں گا۔"

لیزا لرزتی ہوئی دیوار کے ساتھ لگی تھی۔ اس کا سویٹر سامنے سے خون آلود ہو رہا تھا۔ ڈرائیور اس کے پاس رکا اور ٹارچ کی روشنی اس کے چہرے پر مرکوز کر دی۔ "میں نے آج تک جتنی عورتوں اور لڑکیوں کو ہلاک کیا ہے، ان میں سے کوئی تمہارے جیسی نہیں تھی۔ چوہا ٹھیک پاگل ہوا اور تمہاری خاطر وہ مجھ سے ٹکرانے کو تیار ہو گیا۔"

یہ کہتے ہوئے وہ چاقو لے کر لیزا کی طرف جھکا۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی اور اسی لمحے مارٹی نے عقب سے اس کے سر پر سلاخ دے ماری۔ وار بہت قوت سے کیا گیا تھا اس لیے ڈرائیور چکرا کر گر پڑا۔ مارٹی نے اسے لیزا سے دور دھکیل دیا اور پھر ٹارچ اٹھا کر چاقو تلاش کرنے لگا۔ دونوں چیزیں اس کے ہاتھ سے گر گئی تھیں، چاقو زمین پر پڑا تھا۔ مارٹی نے چاقو اٹھایا اور ڈرائیور کی طرف بڑھا۔ اس نے اسے گردن سے پکڑا اور بولا۔ "میں چوہا نہیں ہوں اور نہ فرار ہوا تھا۔ میں واپس آ گیا ہوں تمہیں ختم کرنے کے لیے۔"

مارٹی نے کہتے ہوئے اس پر پے در پے وار کیے۔ ڈرائیور پوری طرح ہوش میں نہیں تھا اس لیے اپنا دفاع نہیں کر سکا۔ مارٹی نے آخری وار اس کے دل پر کیا اور چاقو وہیں چھوڑ دیا پھر وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا تو لیزا نے اسے سہارا دیا۔ وہ ہمت کر کے اٹھ گئی تھی۔ مارٹی نے اسے دیکھا اور بولا۔ "اب فکر کی بات نہیں ہے۔ یہ مر چکا ہے۔"

وہ اوپر آئے، وہاں پیٹرول کی تیز بو پھیلی ہوئی تھی۔ ڈرائیور نے مکان کو آگ لگانے کا بندوبست کر لیا تھا اور اسے اسی کام میں دیر لگی تھی۔ پورے مکان میں جابجا پیٹرول چھڑک کر وہ نیچے آیا تھا۔ لیزا نے کہا۔ "پلیز یہاں سے چلو۔"

"ہاں لیکن پہلے ہم خود کو صاف ستھرا کر لیں۔"

مارٹی سر سے پاؤں تک راکھ میں نہایا ہوا تھا۔ اس نے نہا کر راکھ کی تہ اتاری۔ اس کے لباس پر خون بھی لگا ہوا تھا۔ پھر اس نے لیزا کے زخم کی مرہم پٹی کی۔ اسے ڈرائیونگ آتی تھی۔ مارٹی نے تہ خانے میں جا کر ڈرائیور کی جیب سے چابیاں لیں اور پھر وہ باہر آ گئے۔ مشرق کی طرف سے روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ وہ ٹیکسی میں ہائی وے کی طرف روانہ ہو گئے۔ مارٹی نے مڑ کر مکان کی طرف دیکھا۔ بالآخر اس نے طویل قید سے نجات حاصل کر لی تھی اور یہ نجات لیزا کی وجہ سے ہوئی تھی۔ اس نے تشکر آمیز نظروں سے اسے دیکھا اور سر پشت سے ٹکا لیا۔ لیزا نے اس کی طرف دیکھا اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

❖

مردہ قاتل

منظر امام

سائنس کی ترقی کے مدارج، انسانی زندگی میں آسانیاں ہموار کرنے کا ایک سلسلہ ہے... جو بتدریج بڑھتا ہے... گھٹتا نہیں... سراغرسی کے مداحوں کے لیے ایک دلچسپ کتھا... سائنس کے کرشمے نے ایک حادثے کو قتل میں بدل ڈالا...

وہ اپنے دادا کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور ہونٹوں پر ایک بے رحم سی مسکراہٹ بھی تھی اور ساتھ ہی اس کی سانسوں سے بدبو بھی آ رہی تھی۔ شراب کی بو۔

یہ بو اس کے بوڑھے اور مفلوج دادا کو بہت بُری لگتی تھی۔ اس نے کئی بار اپنے پوتے فرقان کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ ہر بار اس کا مذاق اڑا دیا کرتا تھا۔ "ارے دادا! تم کس زمانے کی بات کرتے ہو۔ میں جس سوسائٹی میں اٹھتا

بیٹھتا ہوں وہاں ایسی باتوں پر کوئی دھیان نہیں دیتا۔ چلو تیس ہزار نکالو۔ مجھے کسی کو دینے ہیں۔"

پوری دنیا میں اس بوڑھے اور مفلوج شخص کا فرقان کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اسی لیے وہ اس کی ہر بات ماننے پر ... مجبور ہو جایا کرتا تھا۔

بوڑھا عرفان ایک دولت مند شخص تھا۔ اس نے اپنی جوانی میں عقل مندی سے کام لیتے ہوئے ریئل اسٹیٹ میں سرمایہ کاری کر لی تھی۔ کئی مکانات اور کئی دکانیں کرائے پر چل رہی تھیں۔ جن سے ہر ماہ بہت اچھی آمدنی ہو جایا کرتی تھی۔ کروڑوں روپے کی پراپرٹی اس وقت لاکھوں ماہانہ دے رہی تھی۔

رہنے کے لیے ایک شاندار گھر تھا۔ گھر میں دو گاڑیاں تھیں۔ لیکن وہ خود ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ ایک بار اس پر فالج کا حملہ ہوا۔ یہ حملہ کمر سے نیچے تک ہی تھا جس کی وجہ سے اس کا آدھا دھڑ بیکار ہو چکا تھا۔ اب اس کی پوری دنیا ایک چھوٹے سے کمرے میں سمٹ کر رہ گئی تھی۔

خوب صورتی سے سجا ہوا کمرا نرم اور دبیز قالین، دیوار پر لگی ہوئی ڈوبتے سورج کی خوب صورت پینٹنگ، سامنے دیوار کے ساتھ ایک خوب صورت تجوری۔ جس میں لاکھوں کیش کے پرائز بانڈز بھی رکھے رہتے تھے۔ یہ سب کچھ تھا لیکن وہ خود مفلوج تھا۔

اس کے جسم کے اوپری حصے میں حرکت اور زندگی تھی۔ وہ اپنے ہاتھ سے کھانا کھایا کرتا۔ اپنے چیک پر سائن کرتا۔ کسی کو بلانے کے لیے سائڈ ٹیبل پر لگی ہوئی گھنٹی بھی بجا سکتا تھا۔ یہ سب کچھ اس کے اختیار میں تھا لیکن اپنے پوتے فرقان کی حرکتوں کے سامنے وہ بے اختیار ہو کر رہ جاتا تھا۔

اس کے بیٹے اور بہو کی اچانک ایک حادثے میں موت ہو گئی تھی۔ یہ ایک جان لیوا حادثہ تھا جس نے دونوں سے ان کی زندگی چھین لی۔

اس وقت فرقان اپنے دادا عرفان کے ساتھ گھر ہی پر تھا۔ اس وقت فرقان دس گیارہ برس سے زیادہ نہیں تھا۔

عرفان نے جب اپنے بیٹے اور بہو کی موت کی خبر سنی تو اپنا سینہ تھام کر رہ گیا۔ عمران اس کی اکلوتی اولاد تھا۔ جس طرح فرقان اس کا اکلوتا پوتا تھا۔

اب اس دنیا میں صرف وہی دونوں ایک دوسرے کے لیے رہ گئے تھے۔ ایک دادا اور ایک پوتا۔ عرفان نے صرف اس کی پرورش کی خاطر اپنے آپ کو محدود کر لیا تھا۔

اس نے فرقان کے لیے ایک گورنس کا بندوبست کر دیا تھا۔ ہر وقت اس کی دل جوئی میں لگا رہتا۔ اتنا سا بچہ اتنی چھوٹی سی عمر میں ماں اور باپ دونوں سے محروم ہو گیا تھا۔ اب اس کا دادا ہی اس کا سب کچھ تھا۔ اسی طرح عرفان کے لیے اس کا مستقبل فرقان کی صورت میں اس کے سامنے تھا۔

لیکن یہ سب کچھ اس وقت تبدیل ہو گیا جب جوان ہونے کے بعد فرقان بے راہ روی کے راستے پر چل پڑا۔ عرفان کو اس کے پرانے منیجر سلیم نے جب پہلی بار یہ سب بتایا تو عرفان کو اس کی بات پر یقین نہیں آیا۔

"سر! یہ میں بہت افسوس کے ساتھ بتا رہا ہوں کہ فرقان صاحب نے عیاشیاں شروع کر دی ہیں۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" عرفان چونک پڑا۔ "کیسی عیاشیاں؟"

"بے تحاشا شراب نوشی اور لڑکیاں۔" سلیم نے جھجکتے ہوئے بتایا۔ "میں نے خود انہیں کئی بار نشے کی حالت میں دیکھا ہے۔"

یہ ایسی خبر تھی جس نے عرفان کو توڑ کر رکھ دیا اور جب ایک دن اس نے خود فرقان کو نشے میں دھت دیکھا تو یہ صدمہ اس کے لیے خطرناک ثابت ہو گیا۔

وہ اس اچانک صدمے سے مفلوج ہو کر رہ گیا۔

☆☆☆

بہت دلچسپ کیس تھا۔

میڈیکل رپورٹ کے مطابق بوڑھے فالج زدہ عرفان کی موت ٹھیک گیارہ بجے دن میں ہوئی تھی جبکہ اس کے نوجوان پوتے کو گیارہ بج کر پندرہ منٹ پر گولیاں ماری گئی تھیں۔

گھر کی ملازمہ کے بیان کے مطابق فرقان گیارہ بجے اپنے دادا کے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اس نے اندر سے دروازہ بند کر لیا تھا۔

پندرہ منٹ کے بعد ملازمہ نے جب گولیاں چلنے کی آوازیں سنیں تو بری طرح بوکھلا گئی۔ اس نے زور زور سے دروازے پر دستک دی اور جواب نہ ملنے پر اس نے قریبی پولیس چوکی جا کر اطلاع دی۔ پولیس کے کچھ جوان اس کے ساتھ آ گئے۔

دروازہ توڑا گیا تو کمرے میں دونوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ بستر پر عرفان کی لاش تھی اور تجوری کے پاس فرقان پڑا ہوا تھا جس کی پشت میں گولیاں پیوست تھیں۔ تجوری کھلی ہوئی تھی۔ پرائز بانڈز غائب تھے۔

ایک پستول مرنے والے عرفان کے ہاتھ میں پھنسا ہوا تھا جس کا چیمبر خالی ہو چکا تھا۔ اسی پستول کی گولیاں

فرقان کے جسم میں پیوست ہوئی تھیں۔

میڈیکل رپورٹ کے مطابق بوڑھے عرفان کی موت دل کے اچانک شدید دورے سے ہوئی تھی۔ اس کے کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی پائی گئی تھی اور اندازہ لگایا گیا کہ قاتل اسی کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے فرقان کو گولیاں ماریں۔ پستول عرفان کی لاش کے ہاتھ میں پھنسایا اور خود تجوری سے بانڈز لے کر فرار ہو گیا۔

سوال یہ تھا کہ وہ کون تھا؟

اس گھر میں عرفان اور فرقان کے علاوہ دو افراد اور بھی رہتے تھے۔ ایک گھر کی ملازمہ نسرین اور دوسرا منیجر سلیم۔

ان دونوں کو اسی گھر میں ایک ایک کمرا دے دیا گیا تھا۔ قاتل انہی دونوں میں سے کوئی ایک ہو سکتا تھا۔ منیجر سلیم کے بیان کے مطابق ایک دن پہلے فرقان نے کسی بات پر نسرین کو تھپڑ مارا تھا اور دو دن پہلے منیجر نے نسرین کو ایک مشکوک قسم کے آدمی سے مکان کے گیٹ پر باتیں کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

منیجر سلیم نے اس وقت اس پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ لیکن یہ واردات کے بعد اس کے ذہن میں شکوک جنم لینے لگے۔ ہو سکتا ہے کہ نسرین نے اس شخص کو عرفان صاحب کی کھڑکی کا راستہ دکھایا ہو۔

پولیس کی پوچھ گچھ کے بعد نسرین نے اقبال کر لیا تھا۔ "وہ میرا میاں تھا جی۔ وہ کوئی کام وام نہیں کرتا ہے۔ بس ادھر ادھر سے پیسے پیدا کر کے اپنی زندگی گزار رہا ہے۔"

"کیا اس نے تم سے کہا تھا کہ تم کمرے کی کھڑکی کھول دینا تاکہ وہ آسانی سے اندر آ سکے؟" ایس ایچ او نے پوچھا۔

"نہ... نہیں تو۔ میں نے تو کچھ نہیں کیا۔ میں بالکل بے گناہ ہوں جی۔"

"بکواس نہیں کرو۔" ایس ایچ او غصے سے غرایا۔ "ابھی چھترول ہو گی تو سب بتا دے گی۔ بتا کیا ہوا تھا؟ کیا کہانی ہے؟"

نسرین نے رونا شروع کر دیا۔ "جی صاحب! ہم سب بڑی غربت سے تنگ آ چکے تھے۔ اس نے زور دیا تھا کہ میں اس گھر کے بارے میں بتاؤں۔ صاحب کے کمرے کے بارے میں بتاؤں۔"

"کیا تم یہ جانتی تھیں کہ عرفان صاحب کی تجوری میں کیا کیا ہوتا تھا؟"

"جی صاحب، جانتی تھی میں۔" نسرین نے بتایا۔ "میں نے صاحب کے کہنے پر کئی بار ان کی تجوری کھولی تھی۔"

"وہ کیوں؟"

"صاحب کو جب کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو وہ مجھ سے کہہ دیتے تھے۔"

"اور تم نے اپنے صاحب کے اس بھروسے کا یہ بدلہ دیا کہ فرقان کو جان سے مروا دیا؟"

"میں نہیں جانتی تھی جی کہ وہ خون کر دے گا۔" نسرین نے روتے ہوئے کہا۔ "میں نے صرف یہ کہا تھا کہ تجوری کی چابیاں صاحب کے تکیے کے پاس ہی ہوتی ہیں۔ تم ان سے چابیاں لے کر تجوری کھول کر ضرورت کے پیسے نکال کر کھڑکی کے راستے بھاگ جانا۔"

"اور اس نے بھاگنے سے پہلے فرقان کو گولیاں مار دیں۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ فرقان اسی وقت کمرے میں داخل ہوا ہو — جب تمہارا شوہر تجوری پر ہاتھ صاف کر رہا ہو۔"

نسرین نے پھر رونا شروع کر دیا۔

"خاموش۔" ایس ایچ او دہاڑا۔ "کیا تو نے اپنے میاں کو یہ بھی بتایا تھا کہ فرقان صاحب اپنے پاس پستول بھی رکھتے ہیں؟"

"جی، جی صاحب۔ اس کے پوچھنے پر میں نے یہ بھی بتا دیا تھا۔"

"بہت چالاک ہے تیرا شوہر۔ اس نے بہت اطمینان سے سارا کام کیا ہے۔ اس نے تجوری کی چابی کے ساتھ ساتھ پستول بھی قبضے میں کیا۔ تجوری کھولی، پرائز بانڈ نکالے۔ اس کا ارادہ کچھ اور چیزیں صاف کرنے کا بھی ہو گا لیکن اسی وقت فرقان کی آمد نے اسے گڑبڑا دیا۔ فرقان کو گولیاں ماریں اور کھڑکی کے راستے باہر چلا گیا۔"

"میں نہیں جانتی صاحب۔" نسرین نے کہا۔ "میں تو یہ سمجھی تھی کہ وہ صرف پیسے لے کر نکل جائے گا لیکن اس نے ایک خون کر دیا۔"

"یہ بتا، کہاں ہو گا تیرا میاں؟" ایس ایچ او نے پوچھا۔

"اپنے گھر میں ہو گا جی۔" نسرین نے بتایا۔ "بڑے میدان کی دوسری طرف جو کچی آبادی ہے ہمارا گھر وہیں ہے۔"

"چل ہمارے ساتھ۔" ایس ایچ او نے کہا۔ "چل کر بتا، کہاں ہے تیرا گھر۔"

چھاپا مار ٹیم جب کچی آبادی میں نسرین کے گھر پہنچی تو نسرین کا میاں اس وقت کہیں فرار ہونے کے لیے اپنا سامان باندھ رہا تھا۔

عرفان صاحب کی تجوری سے نکالے ہوئے سارے

پرائز بانڈز اس کے پاس سے برآمد ہو گئے تھے۔

☆☆☆

یہاں تک کیس واضح تھا۔

لیکن نسرین کے میاں صفدر نے ایک ہنگامہ مچا کر رکھ دیا۔ اس نے رو رو کر اپنا بُرا حال کر رکھا تھا۔ ''میرا خدا گواہ ہے صاحب! میں نے کوئی خون نہیں کیا۔''

''تو پھر کس نے خون کیا ہے، کس نے گولیاں ماری ہیں؟''

''یہ میں نہیں جانتا صاحب! میں جب کمرے میں آیا تو فرقان صاحب تجوری کے پاس پڑے ہوئے تھے۔ ان کی پیٹھ سے خون بہہ رہا تھا۔ تجوری کھلی پڑی تھی۔''

''اور تم تجوری سے پرائز بانڈز نکال کر بھاگ گئے؟''

''ہاں صاحب! میں نے بس یہی گناہ کیا ہے۔ صرف چوری کی ہے۔ اس قتل سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''تو پھر انہیں کس نے مارا ہے؟ کیا کوئی فرشتہ آ کر مار گیا؟''

''اب میں کیا بتاؤں صاحب۔'' اس نے پھر رونا شروع کر دیا۔ ''میں صرف چوری کا گناہ گار ہوں۔ موت سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''اچھا یہ بتا پرائز بانڈز کتنے کے تھے۔ تو نے حساب کتاب تو کر ہی لیا ہوگا؟''

''جی صاحب! دس لاکھ کے تھے۔'' صفدر نے بتایا۔ ''خدا کے لیے مجھ پر رحم کریں صاحب! میں نے کچھ نہیں کیا۔ چوری کی ہے۔ اس کی سزا دلوا دیں۔ قتل سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔''

پولیس کو اس کی بات پر یقین نہیں تھا۔ اس کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔ اس کمرے میں اس کے سوا اور کوئی داخل نہیں ہوا تھا۔ پرائز بانڈز بھی اسی کے پاس سے برآمد ہوئے تھے۔ سارا معاملہ صاف تھا۔ اس کا چالان کاٹ کر اسے عدالت میں پیش کر دیا گیا۔

عدالت کے لیے بھی یہ ایک سیدھا سادہ کیس تھا۔ بالکل واضح صورتِ حال تھی۔ صفدر کی بیوی نسرین نے اپنے میاں کے کمرے میں داخل ہونے کے لیے کھڑکی کھول دی تھی۔ وہ کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے بوڑھے مفلوج عرفان سے زبردستی تجوری کی چابی حاصل کی۔ اس کے پاس رکھا ہوا پستول اپنے قبضے میں لیا اور تجوری کھول لی۔ اسی وقت فرقان کمرے میں داخل ہوا۔

صفدر نے بوکھلاہٹ میں اس کو گولیاں مار دیں۔ وہ پستول عرفان کے ہاتھوں میں پھنسا کر پرائز بانڈز لے کر فرار ہو گیا۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ عرفان کی بھی موت واقع ہو چکی ہے۔ بس اتنی سی کہانی تھی۔ سارے کردار سامنے تھے۔ چوری کے پرائز بانڈز بھی برآمد ہو چکے تھے۔

اس کیس میں اب کوئی ابہام نہیں تھا۔

لیکن یہ کیس اس وقت دلچسپ ہو گیا جب میڈیکل بورڈ کے ایک ڈاکٹر نے اپنا بیان دیا۔ اس نے عدالت کو بتایا۔ ''جنابِ عالی! یہ شخص صفدر چوری کا تو مجرم ہے لیکن قتل کا نہیں ہے۔''

''بہت خوب! تو پھر یہ قتل کس نے کیا ہے؟'' عدالت نے پوچھا۔

''خود مرنے والے عرفان صاحب نے۔'' ڈاکٹر نے بتایا۔

''کیا مطلب؟'' عدالت چونک پڑی۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کیا آپ کو معلوم ہے کہ عرفان صاحب کی موت کس وقت واقع ہوئی تھی؟''

''جی جناب! ٹھیک گیارہ بجے ان پر دل کا شدید دورہ پڑا تھا جس میں وہ جانبر نہیں ہو سکے۔''

''اور فرقان کو گولیاں کس وقت ماری گئیں؟''

''گیارہ بج کر پندرہ منٹ پر۔''

''یعنی آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ عرفان صاحب نے اپنی موت کے پندرہ منٹ کے بعد اپنے پوتے کا خون کر دیا؟''

''جی جناب! بالکل ایسا ہی ہوا ہے۔''

''کیا آپ کو اندازہ ہے کہ آپ ایک معزز عدالت میں اپنا بیان ریکارڈ کرا رہے ہیں؟''

''جی جناب! جانتا ہوں میں اور میں اس کی وضاحت بھی کرنا چاہوں گا۔''

''کیا وضاحت ہے اس کی؟''

''جنابِ عالی! پوری کہانی کچھ یوں بنتی ہے کہ فرقان اپنے بوڑھے اور مفلوج دادا کے کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ ان سے رقم کا مطالبہ کرتا ہے۔ عرفان صاحب اس کی حرکتوں سے واقف ہو چکے تھے۔ وہ رقم دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ فرقان زبردستی چابی ان سے لے لیتا ہے۔ تجوری کی طرف جا کر تجوری کھولنے لگتا ہے۔ فرقان صاحب کو اس کی اس حرکت سے اتنا طیش آتا ہے کہ وہ اپنے پاس رکھا ہوا پستول اٹھا لیتے ہیں۔ لیکن اس وقت شدید ذہنی دباؤ اور صدمے کی وجہ سے ان پر دل کا خطرناک دورہ پڑتا ہے اور ان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔''

''اور وہ اپنی موت کے بعد فرقان کا خون کر دیتے ہیں؟''

''جی جناب! یہ خون پندرہ منٹ کے بعد ہوا ہے۔'' ڈاکٹر نے بتایا۔ ''اس دوران فرقان آرام سے ان کی تجوری میں رکھی ہوئی چیزوں کا جائزہ لیتا رہا ہوگا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کمرے میں کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔ پندرہ منٹ کے بعد عرفان صاحب نے گولیاں چلا کر اپنے پوتے کا خون کر دیا۔ اتفاق سے اس وقت بدقسمت صفدر کھلی ہوئی کھڑکی سے اندر آتا ہے۔ اس کے لیے میدان صاف اور واضح ہے۔ وہ تجوری سے پرائز بانڈز نکالتا ہے اور فرار ہو جاتا ہے۔''

''سوال پھر وہی ہے کہ موت کے بعد خون کس طرح کیا؟''

''ایک کیمیاوی عمل جناب والا۔'' ڈاکٹر نے بتایا۔ ''جو موت کے بعد ہونے لگتا ہے۔ یاد رہے کہ اس دن شدید گرمی تھی۔ درجۂ حرارت 45 ڈگری تھا اور گیارہ بجے لائٹ بھی گئی ہوئی تھی۔ اس لیے جب عرفان صاحب کی موت واقع ہوئی تو درجۂ حرارت کی شدت کی وجہ سے یہ عمل بہت تیزی سے ہو گیا۔ اس عمل میں مرنے والوں کی ہڈیاں سکڑنے لگتی ہیں۔ چونکہ پستول پہلے ہی سے ان کے ہاتھوں میں دبا ہوا تھا، اس لیے سکڑتی ہوئی انگلیوں نے پستول کا ٹریگر دبا دیا۔ نشانہ چونکہ بندھا ہوا تھا، اس لیے گولیاں سیدھی فرقان کی پشت میں پیوست ہوتی چلی گئیں اور وہ ہلاک ہو گیا۔ یہ ہے پوری صورتِ حال۔''

کیس اب بالکل الٹ گیا تھا۔

ڈاکٹر کی اس رپورٹ اور بیان نے پورا معاملہ الٹ دیا تھا۔ نسرین کا شوہر صفدر صرف چوری کا مرتکب قرار پایا تھا۔

عدالت نے اسے چوری کے جرم میں ایک سال کی سزا کا حکم سنا دیا۔ قتل کے الزام میں اس کی بے گناہی ثابت ہو چکی تھی۔

☆☆☆

ڈاکٹر کے فلیٹ میں ڈاکٹر کے علاوہ عرفان صاحب کا منیجر سلیم بھی موجود تھا۔

''ڈاکٹر! اسے کہتے ہیں قسمت کی مہربانی۔'' سلیم نے اپنے پاس رکھے ہوئے بریف کیس کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس میں بے چارے عرفان صاحب کے لاکھوں روپے اور زیورات موجود ہیں۔ تمہاری تاج ہمارے بہت کام آ گئی ہے۔''

''اب تم مجھے پوری تفصیل بتاؤ گے؟'' ڈاکٹر نے کہا۔

''کوئی خاص تفصیل نہیں ہے۔'' سلیم مسکرا کر بولا۔ ''نسرین یہ بتا چکی تھی کہ تجوری میں کیا کیا ہوتا ہے۔ اس نے جان بوجھ کر کھڑکی کھلی رکھی تھی۔ یہ کھڑکی اس نے اپنے شوہر کے لیے کھلی رکھی تھی لیکن اس کا فائدہ میں نے اٹھا لیا۔ تمہیں یاد ہوگا تم کسی کیس کے سلسلے میں ایک بار مجھے ایک مخصوص کیمیاوی عمل کے بارے میں بتا چکے تھے۔ بہرحال اس دن میں کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہونے ہی والا تھا کہ میں نے فرقان کو کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا۔ میں نے دیکھا کہ فرقان نے عرفان صاحب سے زبردستی چابی لی۔ تجوری کی طرف بڑھا۔ تجوری کھولی اور عرفان صاحب نے پستول سے اس کا نشانہ لے لیا۔ یہ سارا ڈراما میری آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا۔ میں نے عرفان صاحب کو مرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ صرف بے ہوش ہو گئے ہیں۔ بہرحال! میرے لیے یہ بہت مناسب موقع تھا۔ میں خاموشی سے واپس آ کر دروازے کے ذریعے کمرے میں داخل ہوا۔ اس وقت بے وقوف فرقان دنیا و مافیہا سے بے خبر تجوری کی دولت کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ میں نے آہستہ سے عرفان صاحب کی انگلیوں سے پستول نکالا۔ فرقان کو گولیاں ماریں اور پستول صاف کر کے دوبارہ عرفان صاحب کی انگلیوں میں پھنسا دیا۔ تمہاری بتائی ہوئی تاج میرے کام آ رہی تھی۔ اس کے بعد میں نے پرائز بانڈز کو چھوڑ کر باقی سب کچھ اپنے بریف کیس میں ڈالا اور خاموشی سے باہر آ گیا۔ اور اب یہ سب کچھ ہمارا ہے۔ ایمان داری کے ساتھ آدھا آدھا لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''وہ کیا؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''جب ہر طرح یہ ثابت ہونے جا ہی رہا تھا کہ فرقان کا خون نسرین کے شوہر نے کیا ہے تو پھر تم نے اس کیمیاوی عمل کی کہانی کے ذریعے اسے کیوں بچا لیا؟''

''اس لیے کہ میں ایک ڈاکٹر ہوں اور ڈاکٹر مسیحا ہوتا ہے، جلاد نہیں۔ شروع شروع میں تو میں بھی تمہارے ساتھ تھا۔ پھر جب میں نے نسرین اور اس کے شوہر کے آنسو دیکھے تو مجھ سے برداشت نہیں ہو سکا۔ میں نے اس شخص کو میڈیکل گراؤنڈ پر بچا لیا۔ اس کے بعد میں اصل کہانی کی تلاش میں تھا کہ آخر ہوا کیا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ تم نے اپنی زبانی اپنے اس جرم کا اقرار کر لیا ہے۔''

''ہوں۔'' سلیم نے ایک گہری سانس لی۔ ''تو اب تم مجھ سے کھیل کھیل رہے ہو۔ لیکن تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ میں نے تم سے ایسی باتیں کی ہیں؟''

''ثبوت یہ ہے کہ اس کمرے میں ایک طاقتور مائک نصب ہے جس کے ذریعے تمہارا اعتراف ریکارڈ ہو چکا ہے اور دوسرے کمرے میں پولیس بھی موجود ہے۔'' ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔
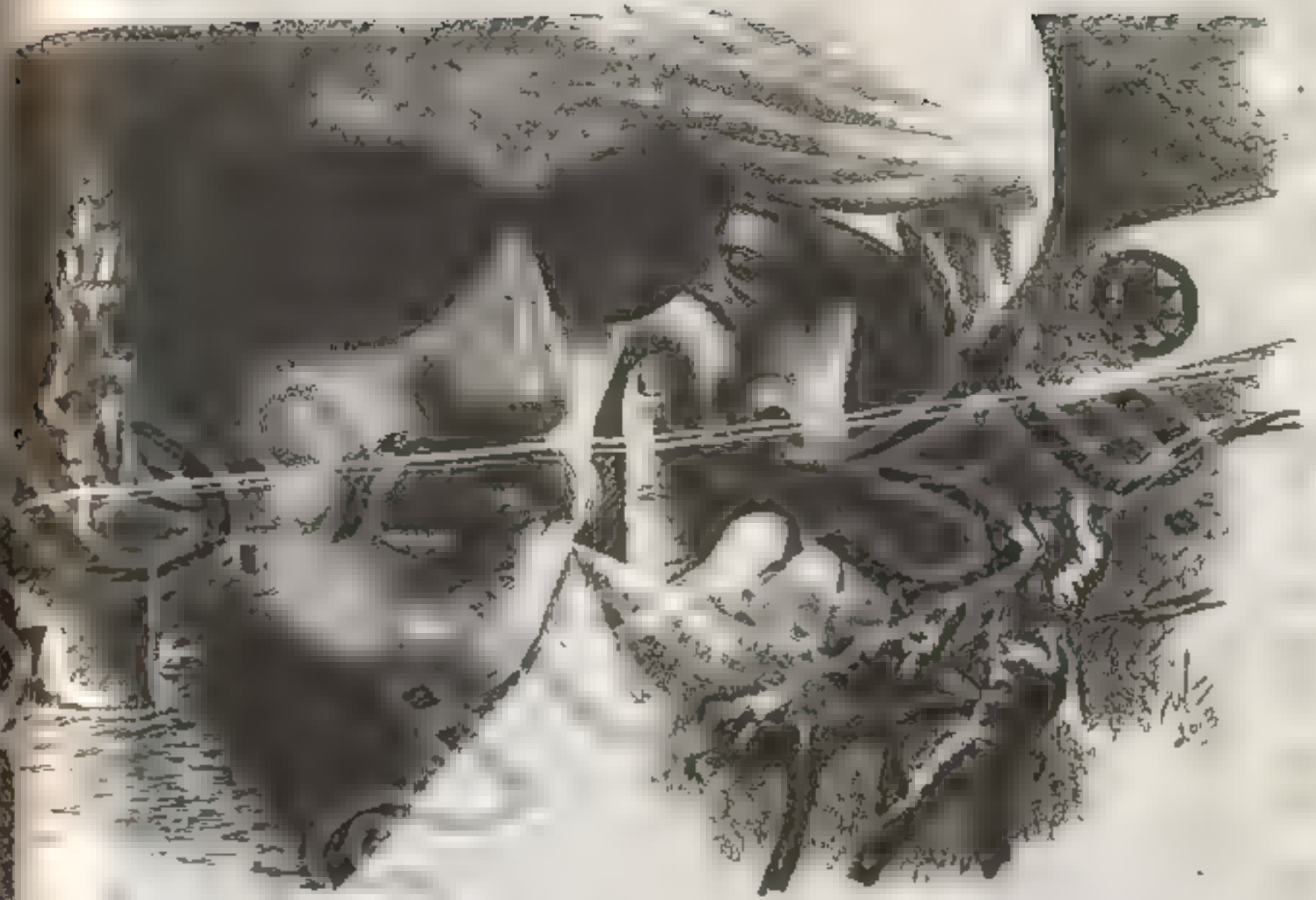
للکار

طاہر جاوید مغل

قسط 38

زمانہ قدیم سے عاشق وہ غبار خاک ہے جو یہاں سے وہاں اڑتا پھرتا ہے۔ خود داری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئے یار کے طواف میں محو رہتا ہے... مگر آج عشق کی اقدار میں تبدیلی... وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا ہے... جس نے عشق کا منظر نامہ بدل ڈالا ہے... کرداروں میں بھی تبدیلی آچکی ہے... سر پھرے عاشق نے اب ایسے شخص کا روپ دھارا جو اپنے جذبے اور شعور سے کام لے کر محبت اور محبت کے ساتھ ساتھ دیگر فرائض و منصب کو بھی پیش نظر رکھتا ہے... ایسے ہی عاشقوں کے گرد گھومتی داستان محبت جہاں ایک عاشق عشق پیشہ ہے... عشق میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی اور قدر ہے... جبکہ دوسرے عاشق کا مطمح نظر مختلف ہے۔ زندگی اور دنیا کی وسعت نے اس کے قلب و نظر... عقل و شعور اور جذب عشق میں کشادگی کو بھر دیا ہے... کائنات کا ہر مسئلہ اس کے پیش نظر... ایک للکار ہے۔

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ایک شرمیلا اور کم گو نوجوان تھا۔ ثروت میری محبت اور منگیتر تھی۔ سیٹھ سراج کے اوباش بیٹے واجد عرف واجی نے ثروت کو اغوا کرلیا۔ ثروت کے ماتھے پر ایک ایسا داغ لگ گیا جس نے نہ صرف اس کے والدین کی جان لی بلکہ اسے اور اس کے گھر والوں کو ملک چھوڑنے پر بھی مجبور کردیا۔ پھر میری ملاقات عمران دانش سے ہوئی۔ میرا اور ثروت کا بدلہ چکانے کے لیے عمران ہاتھ دھو کر سیٹھ سراج کے پیچھے پڑ گیا... جلد ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ سیٹھ سراج مال کوٹھیوں میں رہنے والی ایک میڈم صنوبر کے لیے کام کرتا ہے۔ عمران کے ہاتھوں نادیہ کی موت کے بعد میڈم کے ہرکارے ہمارے پیچھے لگ گئے۔ اسی دوران میں ماں کی اندوہناک موت نے میرے ہوش و حواس چھین لیے۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک اجنبی جگہ پایا۔ یہاں ایک راجپوت لڑکی سلطانہ نے مجھے بتا کر حیران کیا کہ وہ میری بیوی ہے اور ہمارا ایک بچہ بھی ہے اور میں پاکستان میں نہیں بلکہ انڈیا میں ہوں اور دو برسوں کے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور اپنے ساتھیوں سے جاملا۔ ہم نے جارج کی سوتیلی بہن ماریا کو اغوا کرلیا۔ ہم جوڈو کراٹے کے نامور چیمپئن جیکی کو اپنے ساتھ لے آئے۔ ہمارے ایک ساتھی کی غداری کی وجہ سے ماریا ہمارے ہاتھ سے نکل گئی۔ جیکی کی حالت خراب تھی۔ جیکی نے دم توڑ دیا۔ پھر سلطانہ اور آفتاب ایک گاؤں کے شفاخانے میں گھس گئے۔ انہوں نے وہاں موجود مریضوں اور اسٹاف کو یرغمال بنالیا اور اپنی باتیں منوانے کے لیے آفتاب نے ایک ایک کرکے یرغمالیوں کو مارنا شروع کردیا۔ پھر مقابلہ ہوا اور ماریا ماری گئی۔ آفتاب اور سلطانہ کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ہمیں زرگاں کی جیل میں پہنچا دیا گیا۔ ہم وہاں سے فرار ہوکر پہاڑی علاقے میں آگئے۔ پھر چھوٹے سرکار کی طرف سے ہمیں کمک مل گئی اور ہم لڑائی جیت گئے۔ ہم لوگ چھوٹے سرکار کے تعاون سے زرگاں سے نکلے اور اسلام آباد پہنچ گئے۔ پھر ہمیں ریحان ولیم کی جانب سے ایک کام کی آفر ہوئی۔ ہمیں سہراب جلالی نامی عمر رسیدہ شخص کے پاس کسی خاص شے کے موجود ہونے کا پتا لگانا تھا۔ میں اور عمران باورچی کے روپ میں سہراب جلالی کے ہاں پہنچ گئے۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے دو خوب صورت ڈاکٹرز بھی موجود تھیں۔ ڈاکٹر مہناز نے جلالی سے خفیہ نکاح کرلیا تھا۔ پھر ایک دن میں نے بوشیے میں فتح محمد کو کسی سے رازداری سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ میں نے اس کا پیچھا کیا اور ایک کوٹھی میں گھس گیا لیکن وہاں کئی لوگوں نے مجھے گھیر لیا اور ایک کمرے میں بند کردیا۔ فتح محمد بھی زخمی حالت میں وہیں پڑا تھا۔ بعد ازاں ان لوگوں نے فتح کو مار ڈالا۔ جلالی کے بیکری بیٹری ندیم کو وہاں دیکھ کر مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ جاوا گروپ سے ملا ہوا ہے۔ پھر وہاں میں نے جاوا کو دیکھا۔ میں وہاں سے بھاگ نکلا اور عمران تک پہنچ گیا۔ راجا کو ہوٹل میں چھوڑ کر میں اور عمران فارم ہاؤس آئے۔ ایک رات پتا چلا کہ مہناز فارم ہاؤس سے کسی کے ساتھ فرار ہوگئی ہے۔ جلالی صاحب موت کے قریب تھے۔ انہیں اسپتال پہنچایا گیا۔ ہم مہناز کی والدہ کو لے کر ڈیفنس والی کوٹھی پر آگئے۔ اسی دوران میں ہمیں مہناز کے حوالے سے تھوڑا سا سراغ ملا۔ ایک دن جیلانی کے ذریعے ہمیں پتا چلا کہ وہ ایک بنگلے میں کسی ذی حیثیت کے ساتھ رات گزار رہا ہے۔ وہاں سے واپسی میں اس کا جھگڑا ہوگیا۔ مجھے مدد کے لیے پہنچنا پڑا تاہم اس دوران میں یوسف زخمی ہوچکا تھا۔ اسے اسپتال پہنچایا گیا۔ پھر یوسف اسپتال سے غائب ہوگیا۔ میں نے نجو عرف کرشمہ کپور کو دیکھ لیا اور اس کا پیچھا کیا۔ میں ایک سرحدی گاؤں پہنچ گیا جہاں حویلی تھی۔ میں لطیف نامی شخص سے معلومات لے آگیا۔ پھر میں اور ثروت دوبارہ گاؤں پہنچے۔ ثروت نے حویلی میں وقتی ملازمت کرلی۔ ادھر لطیف کی بیوی نے چودھری کو ہمارے بارے میں آگاہ کردیا۔ ہمیں پکڑ لیا گیا تاہم راجا کی مدد سے ہم وہاں سے فرار ہوئے۔ راستے میں راجا کے گولیاں لگیں اور وہ مارا گیا۔ ہمیں چودھری کے گرگوں نے گھیر لیا تاہم میری جنونیت کے آگے وہ سب پسپا ہوگئے۔ ہم وہاں سے بھاگ کر ایک ٹیلے پر پہنچ گئے۔ یہاں پختہ اینٹوں سے بنا ایک پرانا کوٹھا سا تھا۔ ہم نے وہاں پناہ لے لی۔ ہم یہاں سے جگت سنگھ نامی ایک سکھ کی مدد سے نکل کر اس کے گھر پہنچ گئے۔ ہم پاکستانی بارڈر پار کرگئے تھے اور اس وقت انڈین علاقے میں تھے۔ جگت سنگھ کی مدد سے ہم نے یوسف کا سراغ لگایا جو ایک سکھ سردار کی حویلی میں قید تھا۔ میں اور ثروت ملازم بن کر سکھ سردار اوتار سنگھ کی حویلی میں پہنچ گئے۔ پتا چلا کہ یوسف سے کوئی خطرناک کام لیا جانا ہے اور اس کی جان جانا یقینی ہے۔ میں یوسف کو وہاں سے نکالنا چاہتا تھا۔ میں نے جگت سنگھ کی مدد لی۔ جس رات یوسف کو خطرناک سفر پر لے جایا جانا تھا، اس دن میں نے کارروائی کی۔ یوسف کی گاڑی میں بم نصب تھا۔ میں بم کو گاڑی سے علیحدہ کرنے لگا تاہم مجھے پکڑ لیا گیا۔ اوتار سنگھ کے مخالفین نے حویلی پر حملہ بول دیا جس کی وجہ سے ہم وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔ یوسف نے ثروت کو میرے خلاف بھڑکا دیا تھا۔ وہ دونوں مجھ سے اکھڑے اکھڑے تھے۔ ایک موقع پر وہ دونوں مجھے چھوڑ کر نکل گئے۔ تاہم پھر میں ہی ان کی مدد کو پہنچا۔ ہم بھاگ کر ایک گاؤں میں پہنچ گئے۔ جگت بھی ہمارے ساتھ تھا۔ پھر مخبری پر وہاں جاوا پہنچ گیا۔ جگت کی منہ بولی بیوی اور بھائی کو بندر مارے گئے۔ ثروت بھاگ نکلی تھی تاہم اسے بھی پکڑ لیا گیا۔ پھر جاوا نے مجھے الگ کمرے میں بات کرنے کے لیے بلایا اور کہا کہ وہ مجھے اور عمران کو بخش دے گا۔ ہمیں ایک گیم میں حصہ لینا تھا جس میں ریوالور اپنی کنپٹی پر رکھ کر گولی چلانی تھی اور اس کے پانچ خانوں میں گولیاں ہوتیں جبکہ ایک خانہ خالی ہوتا۔ تاہم اس حوالے سے عمران اور جاوا میں معاملات طے پاگئے۔ عمران یہ کھیل کھیلنے پر راضی ہوگیا۔ ادھر یوسف کو وہاں سے بھگا دیا گیا اور وہ پاکستان پہنچ گیا۔ ہمیں دوسری جگہ منتقل کردیا گیا۔ یہ ایک کوٹھی تھی۔ میں اور ثروت ایک ساتھ تھے۔ پھر مجھے ایک پارٹی میں لے جایا گیا جہاں آگ لگنے سے بھگدڑ مچ گئی۔ اس دوران میں نے وہاں فریز شدہ لاشیں دیکھیں۔ وہاں خونخوار ریچھوں کا جوڑا بھی تھا۔ ان میں سے ایک بپھر گیا اور اس نے ایک شخص کو ہلاک کردیا جبکہ ایک ڈانسر لڑکی شدید زخمی ہوگئی۔ وہ اسے بھی ہلاک کرنے کے درپے تھا جب عمران اپنی جادوئی شخصیت کے ساتھ نمودار ہوا اور ریچھ کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ بہرحال ریچھوں پر قابو پالیا گیا۔ پھر عمران سے میری فون پر بات ہوئی۔ اس نے مجھے ایکشن میں آنے کے لیے تیار رہنے کو کہا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

عمران ایکشن پیک، سچے ڈرامے کی بات کررہا تھا۔ پتا نہیں کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا۔ اگر اس کا مطلب ریوالور والے ہلاکت خیز کھیل سے تھا تو یہ بڑی بدقسمتی کی بات تھی۔ وہ مجھے اور ثروت کو جاوا کے چنگل سے نکالنے کے

لیے یک، ایسی شرط قبول کرنے جارہا تھا جس میں موت کا پلڑا ناقابلِ یقین حد تک بھاری تھا۔

رات گئے ثروت جاگ گئی۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے گہرے سائے اب بھی موجود تھے۔ اس نے ہاتھ روم کے اندر رہتے ہوئے دیوہیکل جانور کی خوفناک چنگھاڑیں سنی تھیں اور اس ساری توڑ پھوڑ کی صدائیں بھی اس تک پہنچی تھیں جو ہال کمرے میں ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے مسلسل سوالات پوچھ رہی تھی۔ ریچھ کہاں ہے؟ اسے مار دیا گیا ہے؟ اس نے کسی کی جان تو نہیں لی؟ وغیرہ وغیرہ۔

میں نے اسے ان سوالات کے تسلی بخش جوابات دیے اور بتایا کہ جانور کسی وجہ سے بپھر گیا تھا۔ اسے بے ہوش کرکے یہاں سے ہٹالیا گیا ہے اور کسی دوسری جگہ حفاظت سے بند کردیا گیا ہے۔ میں نے اصرار کرکے ثروت کو تھوڑا سا کھانا کھلایا اور چائے بھی پلائی۔ اس کا دھیان بٹانے کے لیے میں نے کمرے میں موجود ٹی وی آن کیا۔ ہم کچھ دیر تک مزاحیہ خاکوں کا ایک پروگرام دیکھتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔

اگلے روز صبح سویرے ہی ہمارے کمرے کا وہ سلائڈنگ دروازہ مرمت کردیا گیا جو بھورے ریچھ کی خوفناک ٹکر سے ٹیڑھا ہوگیا تھا۔ دونوں ریچھ یقیناً اب بھی اسی عمارت میں موجود تھے۔ ایک دو بار مجھے ان میں سے کسی ایک کی مدھم آواز بھی سنائی دی۔ یہ آواز یقیناً بالائی منزل کے کسی دور افتادہ کمرے سے آئی تھی۔ شکر کا مقام تھا کہ ثروت کے کانوں تک یہ مدھم آواز نہیں پہنچی۔

ثروت بالکل گم صم تھی۔ مجھے یاد آیا کہ آج وہی دن ہے جس کے بارے میں نصرت نے مجھے بتایا تھا۔ چند برس پہلے آج ہی کے دن ہماری منگنی ہوئی تھی۔ ہم نے ایک دوسرے کو انگوٹھی پہنائی تھی۔ آنکھوں میں روشن سپنے سجائے تھے... اور مرادوں والی رات تک پہنچنے کے لیے ایک ایک پل گننا شروع کیا تھا۔ ”کیا بات ہے ثروت! تم کوئی بات کیوں نہیں کررہی ہو؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

وہ خالی خالی نظروں سے سلائڈنگ دروازے کو دیکھتی رہی۔ ہولے سے بولی۔ ”نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں... بس... کل والی بات ذہن سے نہیں نکل رہی۔ اگر وہ جانور یہ دروازہ توڑ دیتا تو پھر؟“

”میرا خیال ہے، تم چھپانے کی کوشش کررہی ہو۔ آج کوئی اور بات ہے جو تم دل سے لگائے ہوئے ہو۔“

”نہیں تابش! میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ اس نے نارمل نظر آنے کی کوشش کی اور یہ ایک ناکام کوشش تھی۔

دوپہر کو میرے اصرار کے باوجود اس نے ایک لقمہ نہیں لیا۔ بس طبیعت کی خرابی کا بہانہ کرتی رہی۔ چادر اوڑھ کر لیٹی رہی۔ سہ پہر کے وقت اٹھی تو آنکھیں سرخ تھیں۔ صاف پتا چلتا تھا کہ روتی رہی ہے۔ میرے دل کے زخموں سے جیسے خون رِسنے لگا۔ اس نے واش روم میں جاکر منہ ہاتھ دھویا۔ آنکھوں کی سرخی کم تو ہوگئی لیکن ختم نہیں ہوئی۔

میں نے کہا۔ ”ثروت! تمہاری آنکھوں کو کیا ہوا؟“

”کچھ بھی نہیں۔“ وہ گڑبڑا گئی۔ ”شاید الرجی سی ہے۔“

میں کہنا چاہتا تھا... ”یہ الرجی نہیں ہے ثروت! یہ وہ روگ ہے جو میری تمہاری جان کو ایک زمانے سے لگا ہوا ہے۔ جس کا کوئی علاج نہیں اور اگر کوئی ہے بھی تو تم اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہو“ میں کہنا چاہتا تھا، ”یہ الرجی نہیں ہے ثروت... یہ آنسوؤں کی یلغار ہے۔ یہ اس دن کی یادیں ہیں جب ہماری نسبت ٹھہری تھی... جب ہمارے دل میں پنپنے والی آس، امیدوں کو ایک شکل ملی تھی۔ منزل کا تعین ہوا تھا اور منزل تک پہنچنے والے راستے پر قدم اٹھنا شروع ہوئے تھے۔ تمہاری طرح مجھے بھی سب یاد ہے ثروت! ایک ایک بات، ایک ایک جملہ، ایک ایک منظر...“ لیکن میں یہ سب کچھ اس سے کہہ نہ سکا۔ کہہ دیتا تو شاید وہ اپنے خول میں چھپ جاتی۔ میں اس کے چہرے پر اور اس کی سرخ آنکھوں میں اپنی محبت کے جو شواہد دیکھ رہا تھا، وہ معدوم ہوجاتے اور میں انہیں معدوم کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے یہ سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔

☆☆☆

یہ تیسرے روز کی بات ہے۔ میں بے چینی سے عمران کی فون کال کا انتظار کررہا تھا۔ وہ اسی عمارت میں موجود تھا لیکن اب تک اس نے صرف ایک بار مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ پتا نہیں تھا کہ وہ کن چکروں میں ہے۔ میں کریم چچا سے بھی دو تین بار کہہ چکا تھا کہ وہ عمران سے رابطہ کرائے لیکن اس نے سنی ان سنی کردی تھی۔ اوپر کی منزل پر فریزر میں پڑی ہوئی لاشوں کا منظر بھی ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے گھومتا رہتا تھا۔ ابھی تک وہاں ان لاشوں کی موجودگی کی ”وجہ“ کا پتا نہیں چل سکا تھا۔ ذہن میں رہ رہ کر یہی خیال آرہا تھا کہ شاید وہ انسانی لاشیں کوڈیاک ریچھوں کی خوراک کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں۔

مجھے پتا تھا کہ جب عمران ملے گا تو بہت سے سوالوں کا جواب مل جائے گا لیکن وہ گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح

غائب تھا۔ میں عمران ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا جب کمرے میں لگے ہوئے اسپیکر میں سرسراہٹ جاگی پھر جادوا کی بھاری بھرکم شگفتہ آواز سنائی دی۔ اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”بچے! کیا کررہے ہو؟“

”آپ کی اور اپنی جان کو رو رہا ہوں۔“ میں نے ترت جواب دیا۔

”بکواس نہیں۔“ وہ پھنکارا پھر خود کو سنبھالتے ہوئے بولا۔ ”ابھی تھوڑی دیر بعد نیٹ آن کرتا۔ وہاں تمہارے لیے ایک زبردست تماشا موجود ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”وہی ریوالور کا کھیل۔ مزہ آئے گا تمہیں۔“

میں سناٹے میں رہ گیا۔ پس منظر میں بہت سے لوگوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ موسیقی کی دھماد ھم بھی تھی۔

”عمران کہاں ہے؟“ میں نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

میرے فقرے سے پہلے ہی اسپیکر خاموش ہو چکا تھا۔ میری پیشانی پر پسینا آگیا۔ میں نے اسپیکر کی طرف منہ اٹھا کر کئی بار ”ہیلو... ہیلو“ کہا مگر جواب نہیں آیا۔

اسی دوران میں مختصر کھڑکی کے پینل نے سلائڈ کیا۔ مستطیل خلا میں پریم چوپڑا کا تمتمایا ہوا چہرہ نظر آیا۔ اس نے حسب معمول ثروت کو حکم دیا کہ وہ میرے ہاتھ الٹی ہتھکڑی میں جکڑے۔ میرے اشارے پر ثروت نے اس حکم پر عمل کیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ شاید مجھے پھر باہر لے کر جائیں گے لیکن اس بار ایسا نہیں ہوا۔ ہتھکڑی لگ چکی تو پریم چوپڑا خود اندر آگیا۔ اس کے ساتھ ایک کارندہ تھا۔ کارندے کے پاس ایک سی پی یو (کمپیوٹر) اور مانیٹر موجود تھا۔ اس نے یہ دونوں چیزیں میز پر سیٹ کر دیں اور تار وغیرہ لگا دیے۔ نیٹ آن ہو گیا۔ کارندہ کچھ دیر کی بورڈ سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہا تب اس نے مطمئن انداز میں سر ہلا دیا۔ پریم چوپڑا اور یہ کارندہ باہر چلے گئے اور دروازہ مقفل کر دیا۔ چوپڑا کی ہدایت پر ثروت نے میری ہتھکڑی کھول دی۔ میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ جاتے جاتے پریم چوپڑا مجھ کو ایک بٹن دکھا گیا تھا اور بتا گیا تھا کہ اسے پریس کرکے میں ”آن لائن“ تماشا دیکھ سکوں گا۔

دروازہ بند ہونے کے بعد میں بے دم سا ہو کر بستر پر بیٹھ گیا۔ ثروت کا رنگ بھی زرد ہو رہا تھا۔ وہ میرے تاثرات دیکھ کر سمجھ گئی تھی کہ کچھ برا ہونے والا ہے۔ دوسری طرف میری سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آگئی تھی کہ جادوا اور چوپڑا وغیرہ نے جس تماشے کا ذکر کیا ہے، وہ ریوالور والے کھیل کے سوا اور کچھ نہیں۔ ممبئی میں کسی خاص مقام پر یہ مہلک کھیل کھیلا جا رہا تھا اور اسے انٹرنیٹ کے ذریعے دکھایا بھی جا رہا تھا۔ تو کیا آج میں عمران کو مرتے ہوئے دیکھوں گا؟ یہ سوال ایک دہکتے ہوئے نیزے کی طرح میرے سینے میں پیوست ہو گیا تھا۔ میرا دل چاہا کہ میں یہ آہنی دروازہ توڑ کر نکل جاؤں۔ عمران تک پہنچوں اور اسے کسی بھی صورت اس جنونی عمل سے روک لوں۔

میں کافی دیر اسی طرح بے دم سا بستر پر پڑا رہا۔ ثروت بھی الجھی الجھی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں آن لائن کچھ بھی دیکھنا نہیں چاہ رہا۔ قریباً آدھ گھنٹا اسی طرح گزر گیا... آخر بہت ہمت کرکے میں نے بٹن پش کیا۔ مانیٹر کی اسکرین پر وہی منظر ابھرا جس کے اندیشے میرے دل و دماغ کو بے طرح جکڑے ہوئے تھے۔

میں نے ایک بڑا ہال دیکھا۔ ہال میں کم از کم ڈھائی تین سو تماشائی موجود ہوں گے لیکن ان سب کے چہرے تاریکی میں تھے۔ صرف ان کی موجودگی محسوس کی جا سکتی تھی۔ وہ ایک بڑے اسٹیج کے روبرو بیٹھے تھے۔ اسٹیج روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔ میری نظر سب سے پہلے عمران پر ہی پڑی۔ وہ اسٹیج پر موجود تھا۔ اس کے جسم پر وہی چست ٹراؤزر تھا جو وہ سرکس میں استعمال کیا کرتا تھا۔ بالائی جسم عریاں تھا... اور روشنیوں میں دمک رہا تھا۔ ثروت نے عمران کو فوراً ہی پہچان لیا۔ ”یہ آپ کا دوست عمران ہی ہے نا؟“ اس نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ میری تمام تر توجہ اسکرین پر تھی۔ دل، سینے میں وحشی گھوڑے کی طرح بھاگ رہا تھا۔ یہاں ریوالور کا کھیل ہونا تھا لیکن ابھی اس کھیل کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ ہاں، اسٹیج پر کچھ اور طرح کی مصروفیت تھی۔ عمران کے علاوہ... دیگر افراد بھی نظر آرہے تھے۔ سائیکل کے پہیے جیسا ایک ”رنگ“ ایک بڑے رذمی نصب کیا جا رہا تھا۔ اس ”رنگ“ کے اندر کی طرف کئی تیز دھار برچھیاں لگی ہوئی تھیں۔ سرکس میں بازی گر ایسے ”رنگ“ کے اندر سے جست لگا کر گزرتے ہیں۔ عام طور پر ”رنگ“ کو آگ بھی لگائی جاتی ہے۔ لیکن یہاں آگ کے بجائے برچھیاں تھیں۔

اندازہ ہو رہا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے تک اس اسٹیج پر اس طرح کے اور بھی خطرناک مظاہرے ہوئے ہیں۔ اسٹیج کے فرش پر ایک جانب خون کے دھبے صاف کیے جانے کے نشان نظر آرہے تھے۔

کچھ دیر بعد تماشا شروع ہو گیا۔ عمران نے تیز دھار برچھیوں والے اس ”رنگ“ میں سے جست لگا کر گزرنا تھا۔ ذرا سی غلطی اس کا پیٹ چاک کر سکتی تھی یا جسم کے کسی بھی حصے کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتی تھی۔ لیکن وہ عمران تھا۔ خطرات کو بڑی خوش دلی سے گلے لگانے والا۔ اس کا اعتماد دیدنی تھا۔ اس کا ورزشی جسم یقیناً ہر نگاہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ پھر وہ نپے تلے انداز میں اپنی جگہ سے بھاگا۔ اس نے جست کی اور کسی سبک بدن مچھلی کی طرح ہوا میں تیرتا ہوا خطرناک رنگ کے اندر سے گزر گیا۔ نیم تاریک ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

چند منٹ بعد اس کھیل کا دوسرا مرحلہ ناظرین کے سامنے پیش کیا گیا اور یہ زیادہ خطرناک تھا۔ برچھیوں والا ”رنگ“ پہلے سے چھوٹا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس میں بمشکل عمران کے جسم کے گزرنے کی جگہ ہی موجود ہے۔ تیز دھار نکیلی برچھیاں اب پہلے سے کہیں زیادہ خطرناک لگ رہی تھیں۔ اندازے کی ذرا سی غلطی جست لگانے والے کو جان لیوا طور پر زخمی کر سکتی تھی اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ چند ہی لمحوں میں سب کے سامنے جان ہار جاتا۔

عمران نے سرکس کے پروفیشنل انداز میں اپنا سر اور کندھے اس خطرناک رنگ کے اندر گھسائے اور ناظرین کو دکھایا کہ ان برچھیوں اور اس کے جسم کے درمیان کتنا مختصر فاصلہ ہے۔ ایک کیمرے نے زوم اِن کیا اور یہ فاصلہ دکھایا۔ یہ جان لیوا مارجن تھا۔

”یہ کیا کر رہا ہے؟“ ثروت لرزاں آواز میں بولی۔

میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ یقیناً کسی کے پاس نہیں تھا۔ ہال میں مکمل سناٹا تھا۔ یقیناً دل بے طرح دھڑک رہے تھے۔ نگاہیں جم کر رہ گئی تھیں۔ عمران بڑے اعتماد سے اپنے اسٹارٹنگ پوائنٹ کی طرف بڑھا۔ اس نے گھوم کر رنگ کی طرف دیکھا۔ چند گہری سانسیں لیں... اور پھر رنگ کی طرف بھاگا۔ اس کا انداز دیدنی تھا... خاص پوائنٹ پر پہنچ کر اس نے زقند لگائی۔ اس کا چیتے جیسا جسم کسی چیتے ہی کی طرح صاف، رنگ کے اندر سے گزر گیا۔ وہ دوسری طرف فوم کے گدے پر سر کے بل گرا اور پھر قلابازی لگا کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ داد طلب انداز میں... دونوں طرف پھیلا دیے تھے۔ ہال ایک بار پھر تالیوں سے گونج اٹھا۔ اس بار دیر تک تالیاں بجتی رہیں لیکن تماشا یہاں ختم نہیں ہوا تھا۔ ابھی کھیل باقی تھا۔ ابھی ایک نڈر دل نے اپنی دیوانی جرأت سے دیکھنے والوں کو کچھ اور ششدر کرنا تھا۔ کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ ایسا بھی ہوگا۔ ایک خوب صورت نیم برہنہ لڑکی نے ایک سیاہ پٹی عمران کو تھما دی۔ عمران کی زندگی بخش، مسکراتی ہوئی آواز ابھری۔ ”محترم حاضرین میں سے کوئی ایک شخص اسٹیج پر تشریف لے آئے۔“ اس نے یہ الفاظ انگریزی میں ادا کیے تھے۔

کچھ دیر بعد ایک درمیانی عمر کا ہٹا کٹا شخص اسٹیج پر آگیا۔ وہ اپنی شکل و صورت سے ایرانی یا ترک لگتا تھا۔ عمران نے سیاہ پٹی اس کی آنکھوں پر باندھی اور اس سے تصدیق کروائی کہ اس پٹی میں سے کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ بعدازاں عمران کے کہنے پر اس شخص نے یہی پٹی عمران کی آنکھوں پر باندھ دی۔ اس کے بعد حاضرین میں سے ہی کسی شخص کا رومال لیا گیا... اور مزید احتیاط کے طور پر یہ رومال بھی پٹی پر باندھ دیا گیا۔ اب یقیناً عمران دیکھنے سے قاصر تھا۔ اس کے سامنے پھر وہی رنگ تھا۔

وہ جو کچھ کرنے جا رہا تھا، اس کا تصور ہی رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیے کافی تھا لیکن اسے کون روک سکتا تھا؟ وہ جو ٹھان لیتا تھا، وہ کرکے رہتا تھا۔ دیکھنے والوں کی سانسیں روک دینا، ان کی دھڑکنوں کو منجمد کر دینا، اس کا مشغلہ تھا۔ وہ بڑے اعتماد اور وجدانی جوش کے ساتھ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا تھا اور اسے شکست دیتا تھا۔ ایک لڑکی سے جدا ہونے کے بعد وہ شاید ہمیشہ کے لیے شکست اور موت کے خوف سے بھی جدا ہو گیا تھا...... اندر کے کرب نے اسے کچھ ایسی توانائیاں بخش دی تھیں جو دیکھنے والوں کو انگشت بدنداں کر دیتی تھیں۔ میں حیرت اور صدمے سے دوچار تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا وہ آج رات بھی شکست کو شکست دے سکے گا۔ میں نے اسے بڑے بڑے معرکے سر کرتے دیکھا تھا... اور وہ شعبدہ بازی نہیں تھی، جیتی جاگتی حقیقتیں تھیں۔ پچاس فٹ کی بلندی پر بغیر کسی حفاظتی جال کے جھولے پر خطرناک کرتب دکھانا، ریوالور کا کھیل کھیلنا، ایک جیتے جاگتے انسان کے سر پر سیب یا مالٹا وغیرہ رکھ کر پستول اور چاقو سے ٹھیک ٹھیک نشانہ لگانا (جہاں ہدف سے ایک انچ نیچے جانے کا مطلب سیدھی سیدھی موت ہوتا ہے) وہ یہ سب کچھ کرتا تھا اور آج پھر ایک ناقابل یقین مظاہرہ کرنے جا رہا تھا۔

ثروت کراہی۔ ”تابش! یہ سب کیا ہے؟ اگر یہ سچ ہے تو پلیز اسے بند کر دو۔“

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں بیٹھا رہا۔ مجھے دیکھنا تھا۔ یہ بھی عمران نے ہی مجھے سکھایا تھا کہ موت سے

آنکھیں چار کیسے کی جاتی ہیں اور اب میں آنکھیں چار کرنے کے قابل ہو چکا تھا۔ مجھے اپنی جسمانی تکلیف کی طرح بدترین خطرات اور اندیشوں کو بھی جھیلنا آ گیا تھا۔

ثروت چادر اوڑھ کر لیٹ گئی۔ میں دیکھتا رہا۔ عمران کی آنکھوں پر دہری پٹی تھی۔ اس نے آہنی برچھیوں والے "رنگ" کو اپنے ہاتھوں سے چھوا پھر نہایت سے تلے دس بارہ قدم اٹھائے۔ اسٹارٹنگ پوائنٹ پر نشانی کے طور پر کوئی چیز رکھی۔ ایک بار وہ ٹرائی کے طور پر بھاگا اور برق رفتاری سے "رنگ" کو اپنے دائیں ہاتھ سے چھوتا ہوا گزر گیا۔

اب فیصلہ کن مرحلہ تھا۔ وہ اسٹارٹنگ پوائنٹ پر کھڑا ہو گیا۔ آنکھوں پر پٹی تھی۔ اس نے حسب سابق چند گہری سانسیں لیں۔ اپنے دونوں پاؤں جوڑے۔ دیکھنے والوں کی سانسیں اٹک گئی تھیں۔ دل سینوں میں ٹھہر گئے تھے۔ موسیقی کی لہریں بھی اضطرابی کیفیت کو ابھار رہی تھیں۔ اس صورت حال میں اگر کوئی پُرسکون تھا تو وہ عمران تھا... اس کا قول تھا... اگر ڈرنا ہے تو مرنا ہے اور اگر مرنا ہے تو پھر ڈرنا کیا۔ وہ اپنی جگہ سے بھاگا... مخصوص جگہ پر پہنچ کر ہوا میں اچھلا۔ اس نے اپنا قول سچ کر دکھایا۔ وہ اتنی صفائی سے برچھیوں کے درمیان سے گزرا کہ کسی کو یقین نہیں آیا۔ اس نے فوم کے گدے پر قلابازی کھائی اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ دونوں طرف پھیلا دیے۔ ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ لوگ یقیناً اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ تاریکی میں ان کے ہیولے بتا رہے تھے کہ وہ اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ عمران کے ایک کندھے پر ایک معمولی خراش کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

میری آنکھوں میں نمی تھی... لیکن میرا سینہ ابھی اندیشوں سے خالی نہیں تھا۔ مجھے پتا تھا، ابھی جنونی لوگوں کا یہ دیوانہ شو ختم نہیں ہوا۔ ابھی اس شو کا اہم ترین مرحلہ یعنی ریوالور والا کھیل باقی تھا۔ ریوالور والا کھیل میں پہلے لاہور میں بھی دو تین بار دیکھ چکا تھا لیکن یہاں اس کی شرائط کچھ اور تھیں۔

☆☆☆

قریباً ایک گھنٹے کے وقفے کے بعد اس شو کا اہم ترین کھیل شروع ہوا۔ ثروت منہ سر لپیٹ کر لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے ثروت کو پریشانی سے بچانے کے لیے، ٹیٹر کی آواز بہت کم کر دی تھی۔ اس کھیل کے آغاز میں ہی میری ہتھیلیوں پر پسینا آ گیا تھا اور دل چاہ رہا تھا کہ میں ٹیسٹ بند کر دوں۔ مگر بدترین مناظر کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے کا حوصلہ بھی مجھے عمران نے ہی دے رکھا تھا۔

اسٹیج پر ایک گول میز لا کر رکھ دی گئی۔ اس پر ایک شاندار کولٹ ریوالور رکھا تھا۔ ساتھ میں بہت سی گولیاں بھی شیشے کے ایک جار میں پڑی تھیں۔ مائک پر کئی طرح کے اعلانات ہوئے۔ ان اعلانات میں کھیل کے قواعد، کھلاڑی پر لگائی جانے والی ملین ڈالرز کی شرطوں کی تفصیل تھی۔ شرطیں باندھنے والوں میں مجھے فربہ اندام ریان دیگر کا نام بھی سنائی دیا۔ ممکن تھا کہ وہ بھی حاضرین میں موجود ہو لیکن نیم تاریکی کی وجہ سے کسی تماشائی کی صورت دکھائی نہیں دیتی تھی۔

سنسنی اور تناؤ کی شدید ترین کیفیت کے دوران میں پہلا کھلاڑی اسٹیج پر نمودار ہوا۔ اس نے چست لباس پہن رکھا تھا اور لباس پر سامنے کی طرف نمبر 1 لکھا ہوا تھا۔ کھلاڑی کا چہرہ بھی مکمل نقاب میں تھا، فقط آنکھیں نظر آتی تھیں۔ یعنی اس کھیل میں کھلاڑی کی شناخت صرف اس کا نمبر تھا۔ نمبر 1 اپنی زندگی کی بازی لگانے کے لیے میدان میں آ چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کیا کرنے جا رہا ہے۔ لہٰذا اس کی خواہش تھی کہ جو کچھ بھی ہونا ہے جلدی سے ہو جائے۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے ریوالور کا چیمبر کھول کر اس میں گولیاں چیک کیں۔ چند گہری سانسیں لیں۔ ریوالور کی چرخی کو کئی بار گھمایا اور پھر بیرل مین اپنی دائیں کنپٹی پر رکھ لیا۔ مائک پر اعلان ہوا۔ "کھلاڑی نمبر ایک، ریوالور کے چار خانوں میں گولی ہے۔ کھلاڑی دو دفعہ ٹریگر دبائیں گے۔"

وہ موت کا سناٹا تھا۔ وہ ناقابل فراموش مناظر تھے۔ اس صورت حال کی تصویر کشی کے لیے شاید کئی صفحات بھی ناکافی ہوں۔ ایک جیتا جاگتا شخص ہمارے سامنے بیٹھا تھا اور غالب امکان یہی تھا کہ اگلے ایک دو منٹ میں وہ موت کی وادی میں اتر چکا ہوگا۔ اس نے ٹریگر دبایا۔ چار خانوں میں گولی تھی، صرف دو خانے خالی تھے... پھر بھی "ٹرچ" کی مخصوص آواز ابھری۔ گولی نہیں چلی تھی۔ شور بلند ہوا۔ یقیناً یہ وہی حاضرین تھے جنہوں نے کھلاڑی نمبر ایک کے زندہ رہنے پر شرط لگائی تھی۔ کھلاڑی نے اپنا سر میز پر ڈال دیا اور کئی لمحے بالکل ساکت رہا۔ وہ موت کو چھو کر آیا تھا لیکن ابھی اس کا امتحان ختم نہیں ہوا تھا۔ ابھی اسے چرخی گھما کر دوسری دفعہ ٹریگر دبانا تھا...

میں بغور اس کھلاڑی کو دیکھ رہا تھا اور مسلسل یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ عمران ہے یا کوئی اور؟ جسامت اور قد کاٹھ سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا پھر بھی میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ عمران نہیں ہے۔

دو تین منٹ بعد شدید ترین سنسنی کی دوسری لہر آئی۔ کھلاڑی نمبر ایک نے چرخی گھمائی اور بیرل کنپٹی پر رکھ دیا... اس دفعہ دھماکا ہوا۔ کھلاڑی نمبر ایک کا سر ایک بے ساختہ جھٹکے سے بائیں طرف گیا اور کولٹ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل کر میز پر گرا۔ وہ خود بھی مردہ چھپکلی کی طرح ایک طرف ڈھلک گیا۔ خون کی لکیر اسٹیج کے سفید فرش پر رینگتی ہوئی نظر آئی۔

ہال سے ایک دفعہ پھر آوازیں بلند ہوئیں۔ یہ آوازیں یقیناً ان لوگوں کی تھیں جنہوں نے کھلاڑی نمبر ایک کی موت پر شرط باندھ رکھی تھی۔ ایک انسان کی ایسی ناگہانی موت پر نعرہ ہائے تحسین بلند کرنا بے شک نہایت سنگ دل لوگوں کا کام تھا۔

ایک طرف سے چاق و چوبند باوردی ملازم برآمد ہوئے۔ چار ملازمین نے مرنے والے کی لاش اٹھائی۔ باقیوں نے کچھ ہی دیر میں فرش کی صفائی کی اور دیکھتے ہی دیکھتے پہلے کی طرح چمکا دیا۔ کچھ خونی چھینٹے گول میز پر بھی پڑے تھے، اسے بھی پہلے کی طرح صاف ستھرا کر دیا گیا۔ ریوالور میں پھر سے گولیاں بھر دی گئیں۔

اسپیکر پر آواز ابھری۔ "حاضرین و ناظرین! اب کھلاڑی نمبر دو آپ کے سامنے آئیں گے۔ یہ پانچ چھ کا کھیل کھیلیں گے۔ یعنی پانچ خانوں میں گولی، ایک خالی۔ قاعدے کے مطابق ان کو صرف ایک دفعہ ٹریگر دبانا ہوگا۔"

دوسرا کھلاڑی اسٹیج پر آ گیا۔ میری سانس سینے میں اٹکی ہوئی تھی۔ بہرحال، کھلاڑی کا قد کاٹھ دیکھ کر میرے شدید اضطراب میں وقتی کمی آئی۔ کھلاڑی کا قد عمران کے قد سے کم تھا، اس کی چال بھی واضح اشارہ دے رہی تھی کہ وہ عمران نہیں ہے۔ یہ کھلاڑی بھی چست لباس میں تھا اور نقاب میں سے بس اس کی آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ صورت حال کی سنگینی کھلاڑی کے جسم و جان پر پوری طرح عیاں تھی۔ چست لباس کے اندر سے اس کے کشادہ سینے کا زیروبم صاف دکھائی دیتا تھا۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ اس نے کرسی پر بیٹھ کر سر کو جھکا لیا۔ یوں لگا جیسے کچھ پڑھ رہا ہے۔ اس شدید ترین خطرے میں کسی اور روحانی عمل کا سہارا لے رہا ہے۔

پھر اس نے چرخی گھمائی اور نال اپنی کنپٹی پر رکھ لی۔ پانچ خانوں میں موت... صرف ایک میں زندگی تھی اور معجزے تو کبھی کبھی ہی رونما ہوتے ہیں۔ شعلہ چمکا، دھماکا ہوا اور کھلاڑی نمبر دو بھی کرسی سے لڑھک کر اوندھے منہ سفید فرش پر جا گرا۔ اس کے سر سے بڑی تیزی سے خون نکلا اور دیکھتے ہی دیکھتے دو تین مربع فٹ میں فرش رنگین ہو گیا۔ گولی چلتے ہی ہال کا سکتہ ٹوٹا تھا اور ملا جلا شور بلند ہوا تھا... مرنے کے بعد بھی ریوالور بدنصیب شخص کے ہاتھ میں ہی رہا تھا۔ باوردی ملازمین نے ریوالور اس کے ہاتھ سے نکالا اور باقی کے امور انجام دیے۔ پانچ دس منٹ میں "موقع واردات" کو پھر سے صاف ستھرا کر کے چمکا دیا گیا۔

یہ دل دہلا دینے والا کھیل تھا۔ میں اسے اسکرین پر دیکھ رہا تھا پھر بھی یوں لگ رہا تھا کہ میرے جسم سے سارا خون نچڑ گیا ہے۔ کیا اگلا شکار عمران ہوگا؟ یہ سوال دہکتے ہوئے نیزے کی طرح میرے سینے میں اترا اور مجھے پوری جان سے تڑپانے لگا۔

پس پردہ موسیقی کے ساتھ مختلف اعلانات کیے جا رہے تھے جن میں شرطوں کے بھاؤ تاؤ بتائے جا رہے تھے۔ یہ لاکھوں ڈالرز کی شرطیں تھیں۔ شرطیں باندھنے والوں میں حاضرین کے ساتھ ساتھ ناظرین بھی شامل تھے۔ مختلف ممالک سے بڑے بڑے جواری اپنے اصلی یا نقلی ناموں کے ساتھ اس "گریٹ گیم" میں حصہ لے رہے تھے۔ اس کھیل میں "زندگی" کے لیے چانس بہت کم تھا مگر "زندگی" پر شرط لگانے والوں کو کامیابی کی صورت میں لامتناہی فائدہ ملتا تھا۔ یہ لالچ بڑی بڑی تجوریوں کے منہ کھول رہا تھا۔ بڑے بڑے بینک اکاؤنٹس سے چیک ڈرا ہو رہے تھے۔ یہ ایک نہایت منظم سیٹ اپ تھا اور اس کی تیاری یقیناً مہینوں پہلے سے کر لی گئی تھی۔

اسپیکر پر تیسرے کھلاڑی کے لیے اعلان ہوا۔ انگلش میں کہا گیا۔ "کھلاڑی نمبر تین اسٹیج پر آ رہا ہے۔ کھلاڑی نمبر تین چار چھ کا آپشن استعمال کرے گا۔ ریوالور کے چار خانوں میں گولی ہے۔ کھلاڑی نمبر تین کو خود پر دو دفعہ ٹریگر دبانا ہوگا۔"

کھلاڑی نمبر تین اسٹیج پر وارد ہوا۔ اسے دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا کہ زیادہ تر کھلاڑی اس مہلک کھیل میں اپنی مرضی سے حصہ نہیں لے رہے۔ انہیں مختلف طریقوں سے مجبور کر کے یہاں لایا گیا ہے اور اگر کوئی اپنی مرضی سے کھیل رہا ہے تو بھی وہ اپنے حالات سے ہی مجبور رہا ہوگا... کوئی ایسا شخص جو واقعی مرنے کی حد تک زندگی سے تنگ آ چکا ہو۔ کھلاڑی نمبر تین اچھے قد کاٹھ کا مالک تھا۔ مجھے اس پر عمران کا

قوی شبہ ہو سکتا تھا لیکن وہ بڑے بے ڈھنگے طریقے سے اسٹیج پر نمودار ہوا۔ یہی لگا جیسے اسے بیک اسٹیج سے دھکیل کر اسٹیج پر پہنچایا گیا ہو۔ وہ چند سیکنڈ تک تذبذب میں کھڑا رہا۔ وہ ہانپا ہوا تھا۔ اس کا چست کاسٹیوم بھی درہم برہم نظر آتا تھا۔ پھر اس نے ایک غیر متوقع حرکت کی۔ اس نے پلٹ کر اپنا رخ بیک اسٹیج کی طرف کیا اور کسی غیر ملکی زبان میں چلا کر کچھ کہا۔ تب وہ تیزی سے مڑا اور گول میز پر رکھے ریوالور کی طرف لپکا۔ اس کے انداز میں غم و غصہ، خوف، جھنجلاہٹ، سب کچھ یک جاں ہو گئے تھے۔ اسپیکر پر ایک تیز تحکمانہ آواز گونجی۔

”رک جاؤ... رک جاؤ۔“

اس کے ساتھ ہی دھماکے سے گولی چلی۔ یہ رائفل کا فائر تھا۔ میں نے دیکھا، سنہری لباس میں ملبوس، کھلاڑی نمبر تین اپنی ٹانگ پکڑ کر گھٹنوں کے بل گر گیا۔ اس کی سنہری پتلون ران کے اوپر سے رنگین ہوتی جا رہی تھی۔ تب وہ ایک دم اٹھا اور دوبارہ کولٹ ریوالور کی طرف بڑھا۔ اس دفعہ گولی اس کے پیٹ میں لگی۔ وہ کسی کیچوے کی طرح دوہرا ہو گیا۔ رائفل اسٹیج کے بالکل پاس سے چل رہی تھی... لیکن کہاں سے، یہ پتا نہیں چل رہا تھا۔ غالباً اسٹیج کی دائیں جانب دیوار کے پیچھے ایک یا دو رائفل مین تیار حالت میں موجود تھے۔

زخمی ایک بار پھر کسی غیر ملکی زبان میں دھاڑا۔ یقیناً وہ فائر کرنے والوں کو بدترین گالیوں سے نواز رہا تھا۔ پھر وہ ایک دم اٹھا اور اسٹیج کی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ غالباً تماشائیوں میں گھسنا چاہتا تھا۔ ابھی وہ سیڑھیوں سے آٹھ دس قدم دور ہی تھا کہ خفیہ مقام سے چلنے والی تیسری گولی اس کی کھوپڑی میں لگی۔ وہ سفید فرش پر گر کر بالکل ساکت ہو گیا۔ اس کا خون فرش کی سفیدی پر گل کاریاں کرنے لگا۔

چند سیکنڈ بعد باوردی ملازم نمودار ہوئے۔ انہوں نے مردہ شخص کو ٹانگوں سے پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے بیک اسٹیج پر لے گئے۔

ہال میں خاموشی تھی۔ صفائی ستھرائی کا عمل دہرایا گیا۔ مختلف اعلانات ہوئے اور قریباً پندرہ منٹ بعد چوتھا کھلاڑی اسٹیج پر نمودار ہو گیا۔ وہ مردہ سی چال چلتا ہوا موت کی کرسی پر آن بیٹھا۔ اس کے بارے میں اعلان ہوا تھا کہ وہ چار چھ کا کھیل کھیلے گا۔ یعنی چھ خانوں والے چیمبر میں چار گولیاں رکھے گا اور دو دفعہ خود پر فائر کرے گا۔ دوسری دفعہ فائر کی نوبت ہی نہیں آئی۔ پہلی بار ہی گولی اس کے بھیجے میں گھس گئی اور وہ آناً فاناً ایک جیتے جاگتے انسان سے لاش میں تبدیل ہو گیا۔

... اگلا تقریباً ڈیڑھ گھنٹا میری زندگی کا مشکل ترین وقت تھا۔ میں اپنی آنکھوں کو پتھر محسوس کر رہا تھا۔ جسم پسینے سے تر ہو چکا تھا۔ دل گاہے بگاہے وحشی گھوڑے کی طرح سرپٹ ہو جاتا تھا۔ اس دوران میں، میں نے صرف دو بار اپنی جگہ سے حرکت کی جب نیٹ بند ہوا اور میں نے اسے پھر سے آن کیا۔

ثروت نے ایک بار بھی اسکرین کی طرف نگاہ نہیں اٹھائی تھی۔ وہ چادر اوڑھ کر دیوار کی طرف منہ کیے لیٹی تھی۔ اسی طرح لیٹے لیٹے اس نے دو تین بار مجھے بدحالی آواز میں مخاطب کیا تھا اور کہا تھا۔ ”تابش! بند کر دیں اسے۔ کیوں تکلیف دے رہے ہیں خود کو؟“

میں بند نہیں کر سکتا تھا۔ نہ چاہنے کے باوجود دیکھنے پر مجبور تھا۔ یہاں میرا یار تھا اور موت کے منہ میں تھا۔ اگلے ڈیڑھ گھنٹے میں مزید 14 کھلاڑیوں نے اس خونی کھیل میں حصہ لیا۔ ان کھلاڑیوں میں سے کئی ایسے تھے جن پر مجھے عمران کا شبہ ہوا اور ان کی موت پر میری رگوں میں خون منجمد ہوا۔ میرے دل نے کام کرنا چھوڑا۔ درندگی کے اس تماشے میں جو پہلا کھلاڑی زندہ بچا، اس کا نمبر نواں تھا۔ اس نے چار خانوں میں گولی رکھ کر دو بار ٹریگر دبانے والا آپشن استعمال کیا تھا۔ دونوں دفعہ ریوالور کے اندر سے ”ٹرچ“ کی آواز آئی۔ ہال میں ایسا قیامت خیز شور بلند ہوا کہ کئی منٹ تک کان پڑی آواز سنائی نہیں دی۔ زندہ بچ جانے والا خود بھی خوشی سے رقصاں تھا۔ وہ گاہے بگاہے فرش پر دو زانو بیٹھ جاتا تھا اور مسرت کے عالم میں اپنے ہاتھ فرش پر مارتا تھا۔ اس کی جیت نے بے شمار لوگوں کو کنگال کر دیا تھا اور بہت سوں کو دولت میں غرق بھی کر ڈالا تھا۔ وہ خود بھی پلک جھپکتے میں نہ جانے کتنی دولت سمیٹ چکا تھا۔

”کیا یہ عمران ہے؟“ میرے دل کی آس میرے اندر کی آواز بن کر ابھری۔

میں نقاب پوش کی ایک ایک ادا کا جائزہ لینے لگا۔ دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اناؤنسر نے کامیاب ہونے والے کھلاڑی نمبر 9 کو اسٹیج کے وسط میں کھڑا کیا اور اس کی نقاب کشائی کی۔ مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا کہ وہ عمران ہے یا نہیں؟ وہ عمران نہیں تھا۔ یہ ایک سیاہ فام تھا۔ اناؤنسر نے پکار کر کہا۔ ”اسٹیفن ڈورے... فرام برازیل...“

ہال تالیوں اور نعروں سے گونج اٹھا تھا۔ دیر تک گونج

رہا تھا۔ نویں اٹھارہ کھلاڑیوں میں سے جو دوسرا خوش قسمت موت کے بے رحم پنجوں سے محفوظ رہا، وہ کھلاڑی نمبر 19 تھا... یعنی اس کھیل کا آخری کھلاڑی۔ (اس کھلاڑی کا اصل نمبر تو اٹھارہ تھا لیکن تیرہ نمبر کو منحوس خیال کر کے اسے نمبروں کی فہرست میں رکھا ہی نہیں گیا تھا)

اس آخری کھلاڑی کو پانچ خانوں میں گولی رکھ کر صرف ایک دفعہ ٹریگر دبانا تھا۔ اس نے تین چار منٹ کے نہایت سنسنی خیز و جاں گسل مرحلوں کے بعد ٹریگر دبایا۔ ریوالور میں سے ”ٹرچ“ کی زندگی بخش آواز نکلی اور اس نے سارے ہال کو گھما کر رکھ دیا۔ جیتنے والوں کے فلک شگاف نعروں سے در و دیوار گونجنے لگے۔ باقی سب اعلانات اور انکشافات بھی ویسے ہی تھے جیسے کھلاڑی نمبر نو کے زندہ بچ جانے کے بعد ہوئے تھے۔

میرا گلا بالکل خشک ہو چکا تھا۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں۔ لگتا تھا کہ جان میری آنکھوں میں اٹکی ہوئی ہے۔ یہ بچ جانے والا کھلاڑی کون تھا؟ اس کی جسامت عمران جیسی ہی تھی۔ یہ عمران تھا... یہ عمران تھا۔ اگر یہ عمران نہیں تھا؟ تو پھر کیا تھا؟ اس ”کیا“ کے آگے ایک ایسی گہری تاریکی تھی جسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ اس کا تو پھر یہی مطلب تھا کہ بن سونے بے حد و خونچکاں مردہ کھلاڑیوں کو یہاں سے اٹھا کر لے جایا گیا ہے، ان میں سے ہی کوئی ایک عمران تھا۔ اس کا مطلب اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔

اب کھلاڑی... خوش بخت کھلاڑی کی نقاب کشائی کی رسم ادا ہونے والی تھی۔ یہ انتظار بالکل سولی پر لٹکنے جیسا تھا۔ میری ساری حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آ گئی تھیں۔ میری پتھرائی ہوئی نگاہ سنہری نقاب کے پیچھے عمران کے سوا کسی کا چہرہ دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اور پھر اس دوسرے خوش قسمت ترین شخص کے چہرے سے نقاب ہٹایا گیا... راکیش کمار فرام انڈیا...“ اناؤنسر کی آواز ہال میں ایک زہریلی پھنکار کی طرح گونجی۔ میری بے جان آنکھوں کے سامنے گھنگرالے بالوں اور لمبے پچکے چہرے والا ایک سانولا نوجوان کھڑا تھا۔ ہال تالیوں اور نعروں کے بے پناہ شور سے گونجا۔ میری نگاہوں میں ارد گرد کی ہر شے دھندلا سی گئی۔

فون کی گھنٹی بجتی جا رہی تھی۔ مجھے جیسے آس پاس کا ہوش ہی نہیں تھا۔ ثروت نے ہی کال ریسیو کی۔ ”ہیلو کون؟“ اس نے پوچھا۔

دوسری طرف سے عمران کی چہکتی ہوئی آواز فون کے اسپیکر پر ابھری۔ وہ پاٹ دار لہجے میں بولا۔ ”رشتے میں تو میں آپ کا بھائی ہوں... لوگ مجھے شہنشاہ کہتے ہیں۔“

”کیا؟“ ثروت سٹپٹائی۔

”مسس... سوری میری بہن! تابی کہاں ہے؟“

میں نے جھپٹ کر فون ثروت کے ہاتھ سے لیا۔ میرا سارا جسم لرز رہا تھا۔ ”ہیلو عمران! کہاں ہو تم؟“ میں نے چلّا کر کہا۔

وہ بولا۔ ”عالم بالا میں بھی ہوتا تو تمہاری یہ چنگھاڑ سن کر بدک جاتا۔ آہستہ بولو یار! میں تم سے زیادہ دور نہیں ہوں۔ بس یہیں ذرا ممبئی تک آیا ہوا ہوں۔ یہ سلمان خان ہے نا... وہی کالے ہرن کا شکاری۔ اس نے ڈنر پر بلایا ہوا تھا۔ وہی اپنے پرانے قصے سنا رہا تھا۔ اس کی پہلی محبت کون سی تھی اور ایشوریا رائے سے اس کی کیسے بگڑی وغیرہ وغیرہ...“

”عمران! تم میرے سامنے ہوتے نا تو سچ مچ تمہارا سر توڑ دیتا۔ جان سے مار دیتا تمہیں۔ تم نے مجھے ختم کر دیا تھا۔ جان کھینچ لی تھی میری...“ میری آواز بھرا گئی۔

”اچھا سمجھ گیا... تم انٹرنیٹ پر وہ تھرڈ کلاس قتل پروگرام دیکھ رہے ہو... چار خانوں میں گولی اور پانچ خانوں میں گولی...“

”میں سمجھ رہا تھا کہ تم اس کھیل میں شریک ہو۔“ میں نے کانپتی آواز میں کہا۔

”شریک تو تھا لیکن وہاں تک جہاں تک تم نے دیکھا ہے۔ آنکھوں پر پٹی باندھ کر برچھیوں والے ”رنگ“ میں سے گزر رہا تھا۔ اس کے بعد وہ آ گیا...“

”وہ کون؟“

”وہی جو بہت تیز آتا ہے۔ کبھی کبھی پتلون کی زپ کھولنی بھی مشکل ہو جاوت ہے۔ میں باتھ روم میں چلا گیا۔ دروازہ کھول کر باہر نکلا تو سامنے سلو بھائی کھڑا تھا۔ وہی اپنا سلمان خان۔ کہنے لگا چھوڑو یار اس گندے ناٹک کو۔ آؤ تمہیں اپنا گھر دکھاؤں اور اپنی ایک منہ بولی گھر والی بھی۔ اب میں اسی کے بنگلے سے بات کر رہا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”عمران! دل چاہتا ہے کہ تمہیں جان سے مار ڈالوں یا پھر تم مجھے مار ڈالو۔ تم بہت دکھ دینے والے شخص ہو۔ اگر تم اس کھیل میں شامل نہیں تھے تو تمہیں مجھے بتانا تو چاہیے تھا۔ تمہیں کیا پتا میں نے پچھلے دو ڈھائی گھنٹے کس طرح گزارے ہیں۔“ میری آواز غصے سے لرزنے لگی۔

”میں ممبئی سے واپس فرید کوٹ آ رہا ہوں۔ کل تم سے ملاقات ہو گی... پھر ساری بات بتاؤں گا۔ اس وقت میری پیاری بہن (ثروت) کے سامنے مجھے اس

طرح ذلیل نہ کرو۔''

دو تین منٹ کی مزید گفتگو کے بعد ہمارا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

میں بے دم سا ہو کر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ شدید ترین کرب سے گزرنے کے بعد جب سکون کا سانس آتا ہے تو بندہ نڈھال سا ہو جاتا ہے۔ میرا بھی یہی حال تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور سوچنے لگا کہ عمران موت کے اس گھیرے سے کس طرح بچ پایا ہے۔ بدبخت جاوا کی تو پہلی شرط ہی یہ تھی کہ عمران اس کی طرف سے ریوالور والے کھیل میں حصہ لے گا۔ یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ عمران نے میری اور ثروت کی زندگی کو خطرے میں ڈال کر اس شرط سے چھٹکارا حاصل کیا ہو۔ پھر کیا صورت حال بنی تھی؟ یہ بات تو طے تھی کہ عمران بدترین مشکلات میں سے رستہ نکالنے کا خداداد ہنر رکھتا ہے مگر جاوا جیسے شخص کو شیشے میں اتارنا بھی آسان کام نہیں تھا۔ اگر عمران نے اس سے کچھ حاصل کیا تھا تو یقیناً کچھ دیا بھی ہوگا یا دینے کا پختہ وعدہ کیا ہوگا...

میں سوچتا رہا اور الجھتا رہا۔ اس کھیل میں حصہ لینے کی شرط پر انڈین ڈان نے کئی ناقابل فراموش باتوں کو فراموش کیا تھا جن میں نادرنی ٹی کا قتل، سیکریٹری ندیم کی معذوری اور ہوٹل لالہ زار کا خونی ہنگامہ شامل تھا۔ اب اس شرط سے پیچھے ہٹنا اس کے لیے ہرگز آسان نہیں تھا۔

ثروت جانتی تھی کہ پچھلے ڈھائی تین گھنٹے میں، میں شدید ترین ہیجان سے گزرا ہوں۔ لیکن اس ہیجان کی تفصیل پوچھ کر وہ مجھے مزید پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے مجھ سے دل جوئی کی باتیں کیں پھر اس نے مجھ پر چادر کھینچ دی۔ لائٹ آف کر دی اور مجھے سونے کا مشورہ دیا۔ میری آنکھوں میں مسلسل... ممبئی کے جوا خانے کے خونی منظر گھوم رہے تھے۔

☆☆☆

اگلے روز دوپہر کے بعد جب ثروت اور میں اپنی اپنی سوچوں میں گم خاموش بیٹھے تھے اور شاید سوچ رہے تھے کہ اس بوجھل خاموشی کو کیسے توڑا جائے تو مختصر کھڑکی کا تختہ سلائڈ کر کے کھلا۔ میرا خیال تھا کہ حسب معمول دوسری طرف پریم چوپڑا کی چوڑی ناک اپنا جلوہ دکھائے گی... لیکن دوسری طرف عمران کا مسکراتا چہرہ تھا۔ ''ہیلو تابی، ہیلو ثروت!'' وہ بولا۔ ''کیسے ہیں آپ دونوں؟''

ثروت نے اسے دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا۔ میں منہ پھلائے کھڑا رہا۔ اس وقت میں اندر اور وہ باہر نہ ہوتا تو ہم دونوں میں یقیناً زبردست قسم کی کشتی ہو جاتی جس میں ہم دونوں کو چھوٹی بڑی چوٹیں آتیں۔

ثروت اور عمران میں یہ پہلی تفصیلی ملاقات تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو چند فٹ کی دوری سے دیکھ رہے تھے۔ عمران کے چہرے پر حیرت جلوہ گر ہوئی۔ وہ ہکلایا۔ ''میری نگاہیں دھوکا تو نہیں کھا رہیں... آپ ثروت ہی ہیں نا؟''

ثروت تعجب سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔ ''اتنی حیرت کیوں ہو رہی ہے تمہیں؟''

وہ بولا۔ ''آج ان کو دیکھا ہے اور اتنے قریب سے اور سکون سے دیکھا ہے۔ ان کو دیکھ کر مجھے اپنی چھوٹی بہن غزال یاد آ گئی ہے۔ ان کی شکل بڑی ملتی ہے غزال سے۔ بس تھوڑا سا آنکھوں کا... اور قد کاٹھ کا فرق ہے۔ وہ کافی صحت مند تھی۔ وہ مجھے بڑے پیار سے عمو بھائی جان کہا کرتی تھی... آہ...'' وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔

وہ یک ٹک ثروت کو گھورتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی۔ ثروت خاموش رہی لیکن پھر اس سے رہا نہ گیا۔ ''آپ کی بہن کہاں ہے عمران صاحب؟''

''جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ تیرہ، چودہ سال کی تھی جب وہ ہمیں چھوڑ کر چلی گئی۔ بس چند دن بخار رہا اور اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ ہم اکٹھے کھیل کود کر بڑے ہوئے تھے۔ بچپن میں وہ مجھے گود میں اٹھائے اٹھائے پھرتی تھی۔''

ثروت نے حیرت سے عمران کو دیکھا۔ ''آپ تو کہہ رہے تھے کہ وہ آپ سے چھوٹی تھی۔''

''ہاں... چھوٹی تو تھی... لیکن میں نے بتایا ہے نا کہ وہ کافی صحت مند تھی۔ میں اس کے سامنے چھوٹا سا لگتا تھا... بچونگڑا سا...'' اس نے ٹھنڈی ٹھار سانس بھری۔

میں جانتا تھا کہ اس کی کوئی بہن نہیں تھی۔ وہ عادت کے مطابق ثروت کو گولی دے رہا تھا۔ اگلے دو تین منٹ تک وہ ثروت کے ساتھ بڑی سنجیدگی اور روانی سے اپنی بہن غزال کی ہی باتیں کرتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ زبردست اداکار تھا۔ میں بڑی مشکل سے اسے ٹریک پر واپس لایا۔ میں نے کہا۔ ''عمران! یہ ساری گفتگو تو بعد میں بھی ہو سکتی ہے۔ فی الحال میں تم سے دو چار بہت ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''ضروری باتیں تو مجھے بھی کرنی ہیں تابی! چلو میں کوشش کرتا ہوں کہ ہم کہیں بیٹھ کر اطمینان سے بات کر سکیں۔''

''کتنی دیر میں؟''

''بس دس پندرہ منٹ میں۔'' اس نے کہا اور تب ایک بار پھر بڑی محویت سے ثروت کو دیکھنے لگا۔ ثروت گڑبڑا گئی۔

وہ بولا۔ ''ثروت! پتا ہے میرا دل کیا چاہتا ہے... میرا دل چاہتا ہے کہ تمہیں ثروت کے بجائے ثروال کہہ کر پکاروں۔''

''ثروال؟ اس کا کیا مطلب؟'' ثروت نے پوچھا۔

''ثروت اور غزال کی جمع، ثروال۔ سچ، مجھے لگ رہا ہے کہ میری کھوئی ہوئی بہن مجھے مل گئی ہے۔''

رسمی کلمات ادا کر کے وہ کھڑکی میں سے ہٹ گیا۔

''یہ کس طرح کے آدمی ہیں؟'' ثروت نے کہا۔

''بہت عجیب ہے... اور بہت انوکھا۔ میں سچ کہتا ہوں ثروت! تم سے دور ہونے کے بعد میں مرنے کی حد تک مایوس ہو چکا تھا۔ سونے پر سہاگا یہ ہوا کہ سیٹھ سراج کے غنڈوں سے لڑائی ہوئی۔ میں اپنی جان لینے کا ارادہ کر چکا تھا، اس وقت یہ بندہ رحمت کے فرشتے کی طرح میرے سامنے آیا۔ اس نے مجھ میں جینے کا، حالات سے ٹکرانے کا اور پھر جیتنے کا حوصلہ پیدا کیا۔ اس نے اب تک کی مشکلات میں قدم قدم پر میرا ساتھ دیا ہے ثروت... اور صرف میں ہی نہیں، وہ ہر مصیبت زدہ کے کندھے سے کندھا دینے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ وہ بہت خوش بخت بھی ہے ثروت! کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ خطرے خود اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ وہ جادو جیسا اس کے ہاتھ کا کھیل ہے۔ لاہور شہر میں درجنوں نہیں، سیکڑوں ضرورت مند ہوں گے جن کے گھروں کے چولہے اس کی مدد سے جلتے ہیں۔ اس کا سینہ انسان دوستی اور ہمدردی سے بھرا ہوا ہے ثروت! وہ اب بھی ہمارے لیے بہت کچھ کر رہا ہے۔ جاوا جیسے شخص کو شیشے میں اتارنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ پتا نہیں، اس کے لیے وہ کیا قیمت دے رہا ہے۔''

''ان کے والدین؟''

''والد اس کی کم عمری میں ہی فوت ہو گیا تھا۔ والدہ بچھڑ گئی جسے آج تک ڈھونڈ رہا ہے۔ کبھی ایک لڑکی سے محبت ہوئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہا مگر ایک دوسرے کے ہو نہ سکے۔ لڑکی کی شادی ہو گئی پھر وہ اپنے شوہر کی گولی سے زخمی ہو کر مر گئی۔''

''شادی نہیں کی انہوں نے؟''

''شادی تو نہیں کی لیکن اب برسوں بعد ایک لڑکی اس کی زندگی میں آ چکی ہے۔ شاہین نام ہے اس کا۔ جس سرکس میں عمران پرفارم کرتا تھا، وہیں وہ بھی تھی۔ دھیرے دھیرے دونوں ایک دوسرے کے قریب ہو چکے ہیں۔ آپس میں لڑتے بھی بہت ہیں لیکن ایک دوسرے کو چاہتے بھی ہیں۔ خاص طور سے شاہین تو ہزار جان سے فدا ہے اس پر۔''

''ہاں، نصرت نے مجھے بتایا تھا کہ فریح اور عاطف کے ساتھ ایک شوخ سی لڑکی بھی رہتی ہے۔ وہ آپ کے ایک دوست کی گرل فرینڈ ہے۔''

''ہاں، یہ وہی ہے... بہت اچھی فن کارہ ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ امور خانہ داری بھی خوب جانتی ہے۔ باتوں باتوں میں دل موہ لیتی ہے۔''

اسی دوران میں مختصر کھڑکی کی دوسری طرف کھٹ پٹ ہوئی۔ کھڑکی کھلی... وہی ناپسندیدہ چوڑی ناک نظر آئی۔ چوپڑا نے حسب معمول پھنکار کر احکامات جاری کیے۔ یہ سارا عمل ہم کئی بار دہرا چکے تھے۔ ثروت نے میرے ہاتھ الٹی ہتھکڑی میں جکڑے۔ سلائڈنگ دروازہ کھلا اور پھر بند ہو گیا۔ میں چوپڑا کے ساتھ عمران سے ملنے چل دیا۔

عمران اس خوب صورت عمارت کی بالائی منزل پر تھا۔ فرید کوٹ کوئی جدید شہر نہیں تھا لیکن اس عمارت پر جدید شہروں سے بڑھ کر سرمایہ خرچ کیا گیا تھا۔ یہ جاوا کے ایک امیر کبیر مقامی شخص کی رہائش گاہ تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہ فربہ اندام شخص کپاس کا ایک بڑا تاجر تھا... میں عمارت کی بالائی منزل پر پہنچا تو مجھے وہ منحوس فریزرز یاد آئے اور ان میں پڑی ہوئی انسانی لاشیں بھی۔ جی مالش کرنے لگا۔ چند راہداریوں سے گزر کر ہم ایک سلائڈنگ دروازے کے سامنے پہنچے۔ چوپڑا کے ساتھی نے ایک بٹن دبایا۔ اسٹیل کا دروازہ بے آواز کھل گیا۔ دروازہ کھلتے ہی میں نے تعجب خیز منظر دیکھا۔ ایک مضبوط جنگلے کی دوسری جانب دونوں دیوہیکل ریچھ نظر آ رہے تھے۔ حیوانی گوشت کے پہاڑ جنہیں دیکھ کر دل و دماغ پر ہیبت طاری ہوتی تھی۔ ایک ریچھ کشادہ پنجرے کے ایک گوشے میں سو رہا تھا۔ دوسرا جنگلے کے قریب تھا۔ پنجرے میں مختلف سبزیوں اور گوشت کے بچے کھچے ٹکڑے پڑے تھے۔ سارے چیمبر میں عجب سی حیوانی بو پھیلی ہوئی تھی۔ جنگلے سے باہر دو تین آرام دہ کرسیاں رکھی تھیں۔ ایک کرسی پر عمران نیم دراز تھا اور سگریٹ پھونک رہا تھا۔

''آؤ جگر آؤ... تمہارا ہی انتظار تھا۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی بانہیں پھیلا دیں۔

ہم ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔ وہ چپ تھا۔ میری آنکھوں میں بھی ہلکی سی نمی آ گئی۔ یہ نمی اپنے ساتھی راجا کے لیے تھی۔ راجا جو کل تک ہمارے کندھے سے کندھا

ملائے مشکلات کا مقابلہ کر رہا تھا، آج ہماری دشمنی کا شکار ہو کر منوں مٹی کے نیچے سو رہا تھا۔

ہم نے جدا ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ راجا کے دکھ نے ہمیں کچھ دیر کے لیے خاموش کر دیا۔ آخر عمران نے گہری سانس لی اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''راجا اب ماضی کی کہانی ہے تابی! حال اور مستقبل کی مشکلیں ہمارے سامنے کھڑی ہیں۔ اب ہمیں ان کے بارے میں سوچنا ہے۔''

''راجا کے ساتھ جو ہوا، وہ میری اور ثروت کی وجہ سے ہوا تھا۔ ہم یوسف کو ڈھونڈنا چاہتے تھے۔''

''کس کے ساتھ کیا ہوتا ہے اور کیوں؟ اس کا معاملہ قدرت بہتر جانتی ہے۔ بہر حال، وہ ہمارے کندھے سے کندھا ملا کر چل رہا تھا۔ ہم اسے یاد رکھیں گے۔''

''اس کے مرنے کی عمر نہیں تھی۔''

''تمہارے میزبانوں گوبندر سنگھ اور آشا کور کے مرنے کی عمر بھی کہاں تھی۔ یہاں عمر کا کوئی حساب نہیں ہے تابی! نہ ہی دنیا سے جانے کی کوئی ترتیب ہے... تم سناؤ ثروت کیسی ہے؟''

گوبندر اور آشا کے ذکر پر مجھے پھر وہ منحوس فریزر یاد آ گیا جس میں، میں نے گوبندر، آشا اور روہیل سنگھ کی لاشیں دیکھی تھیں۔ وہ جگہ یہاں سے زیادہ دور بھی نہیں تھی۔ مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ میں نے کہا۔ ''عمران! یہاں اس کوٹھی میں بہت کچھ عجیب و غریب ہو رہا ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔''

''مثلاً کیا؟''

''مثلاً ان جانوروں کو ہی دیکھو۔ اتنے بڑے ریچھ میں نے کبھی نہیں دیکھے اور نہ ہی اتنے خونخوار۔ یہ یہاں کیوں ہیں؟ کیا یہ جاوا کے پالتو ہیں؟''

وہ آواز دبا کر بولا۔ ''ایسی بُری چیزیں کسی بُرے بندے کی پالتو ہی ہو سکتی ہیں۔ پرسوں انہوں نے اپنے رکھوالے کو مار ڈالا ہے لیکن وہ جونیئر رکھوالا تھا۔ اصل رکھوالا کہیں گیا ہوا تھا... اور وہ بہاری لڑکی بھی بے چاری زخمی ہوئی ہے۔''

''میں نے سب دیکھا تھا عمران! اس کی جان تمہاری کوشش سے ہی بچی ہے۔ لیکن تم خود بھی تو مرتے مرتے بچے ہو۔ کچھ خدا کا خوف کرو یار! اپنی زندگی کو اس طرح ارزاں نہ کرو۔ کم از کم آج کل تو کچھ احتیاط کر لو۔ یہی سوچ لو کہ ہمیں ثروت کو یہاں سے زندہ سلامت نکالنا ہے۔''

''تو میں کیا کر رہا ہوں؟'' وہ سگریٹ کے دھوئیں کا چھلا بنا کر بولا۔

''تم وہ سب کچھ کر رہے ہو جو تمہارا وتیرہ بن چکا ہے۔ تم یہ سمجھتے ہو کہ خوش بختی تمہارے کندھوں پر چڑھ کر بیٹھی ہوئی ہے اور تمہارے لیے لگاتار معجزے اور کرشمے ہوتے چلے جائیں گے۔ ایسا نہیں ہوتا عمران! یہ دنیا دلیل اور سبب پر چلتی ہے۔ میں نے وہ ممبئی والا شو دیکھا ہے۔ سیلف شوٹنگ (ریوالور والے کھیل) سے پہلے تم نے جو تماشا کیا، وہ بھی خودکشی کے قریب قریب ہی تھا۔ برچھیوں والے ''رنگ'' میں سے تم آنکھیں باندھ کر گزرے۔''

وہ آواز دبا کر بولا۔ ''یار! تم ٹی وی اینکرز کی طرح بس ایک ہی بات کو پکڑ کر دھوبی پٹکے مارتے رہتے ہو۔ دوسرا پہلو بھی تو دیکھو نا۔ میں نے ''رنگ'' والا آئٹم دکھایا لیکن ریوالور والے آئٹم سے خود کو بچا لیا۔ وہ تو سیدھا سیدھا قبر میں لیٹنے کا پروگرام تھا۔ تم نے دیکھا ہی ہوگا۔ اٹھارہ میں سے فقط دو کی جان بخشی ہوئی ہے۔''

میں نے غور سے عمران کو دیکھا۔ ''لیکن عمران، جاوا کی تو پہلی شرط ہی یہی تھی کہ تم کھیلو گے۔''

''اور میں نے کہا تھا کہ میں کوئی رستہ نکال لوں گا۔'' اس نے سرگوشی کی۔

تب اس نے سگریٹ کا طویل کش لیا اور پنجرے کی سلاخوں پر ہاتھ مارنے لگا۔ دیوہیکل ریچھ تیزی سے سلاخوں پر جھپٹا۔ اس کو قریب سے دیکھنا ہیبت ناک تھا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں قاتل چمک تھی۔ اس نے سلاخوں پر اپنے دانت آزمائے اور انہیں جیسے اکھاڑ پھینکنا چاہا۔

عمران نے کہا۔ ''یہ نر ہے۔ پندرہ من کے قریب وزن ہے اس کا... مادہ وہ سو رہی ہے۔ اس کا وزن اس نر سے کچھ زیادہ ہی ہوگا... اس نسل کے براؤن ریچھوں کا ریکارڈ وزن اس سے بھی زیادہ ہے۔ شاید بائیس تئیس سو پونڈ تک یعنی بائیس تئیس من کے قریب۔ ہے نا ناقابلِ یقین بات۔ بہت وزنی ہونے کے باوجود یہ تیزی سے حرکت کرتے ہیں۔ وہ پریم چوپڑا بتا رہا تھا۔ یہ چالیس پچاس میل فی گھنٹا کی رفتار سے بھاگ سکتے ہیں۔''

''عمران! میں تم سے کچھ اور پوچھ رہا ہوں۔ تم نے جاوا کی شرط سے چھٹکارا کیسے حاصل کیا؟''

عمران مسکرایا۔ اس نے قریب رکھے ایک بڑے باکس کا ڈھکنا اٹھایا اور اس میں سے گوشت کا ایک بڑا ٹکڑا نکال کر پنجرے میں پھینکا۔ یہ بھیڑ کا گوشت تھا۔ ریچھ کی حس

شامہ حرکت میں آئی۔ اس کی آنکھوں میں بھوک ابھری اور وہ گوشت کی طرف متوجہ ہوا۔

اسی دوران میں عمران نے ایک بار پھر باکس میں ہاتھ ڈالا اور تین چار کلو وزن کی ایک مچھلی دُم سے پکڑ کر باہر نکالی۔ اس نے اسے آہنی سلاخوں کے سامنے لہرایا۔ ریچھ نے بو سونگھی اور گوشت کو چھوڑ کر تیزی سے مچھلی کی طرف آیا۔ وہ اپنی بھاری بھرکم تھوتھنی سلاخوں کے خلا میں گھسیڑتا چلا جارہا تھا۔ عمران نے مچھلی اندر پھینک دی۔ ریچھ اس پر جھپٹ پڑا۔ عمران پست آواز میں بولا۔ ”ریچھ کے لیے مچھلی بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے، اس لیے وہ بھیڑ کے گوشت کو بھول گیا۔ ہر جاندار اسی طرح اپنی ترجیح مقرر کرتا ہے۔ جاوا نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”ممبئی میں وہ ریوالور والا کھیل اس کے لیے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ یہ لاکھوں ڈالرز کی لاٹری تھی... لیکن... جب جاوا کو اس سے بھی زیادہ فائدہ بخش کام نظر آیا تو وہ یہ لاٹری بھول گیا۔“

”تم پہیلیاں بھجوا رہے ہو۔ سیدھی بات کرو عمران۔“

عمران نے کہا۔ ”فاسٹنگ بدھا کی مورتی... آرا کوئے۔“

”آرا کوئے؟“ میں حیرت زدہ تھا۔

”ہاں، میں نے جاوا سے آرا کوئے کا وعدہ کیا ہے۔“

”آرا کوئے؟ آرا کوئے تمہارے پاس ہے؟“

”پاس ہوتا تو اس وقت سر کے بل ناچ رہا ہوتا۔ لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ ہم اسے حاصل کرلیں گے۔ میں نے جاوا کو اس کی ضمانت دی ہے۔“

میں سناٹے میں تھا۔ ”آرا کوئے ہے کہاں؟“ میں نے پوچھا۔

”ڈاکٹر مہناز کے پاس۔“

”اور ڈاکٹر مہناز کہاں ہے؟“

”ہمارے آس پاس ہی ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے یہاں فریڈ کوٹ میں؟“

”نہیں یار! انڈیا میں۔“ عمران نے کہا اور سگریٹ کا گہرا کش لے کر پُرسوچ انداز میں چھت کو گھورنے لگا۔

”اس سے میں کیا سمجھوں؟ کیا تم جانتے ہو کہ مہناز اس وقت کہاں ہے؟ میرا مطلب ہے کہ تم جاوا کو اتنی بڑی گارنٹی دے رہے ہو۔“

”پتا تو نہیں لیکن پتا چلنے والا ہے۔“ وہ وثوق سے بولا۔

”کس طرح؟“

”انگلینڈ میں رہنے والے ایک ہمدرد کے ذریعے۔“

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔“

”نہ ہی آئے تو اچھا ہے۔ ابھی تم اپنا سارا دھیان ثروت پر رکھو۔ یار! تم اب بھی اسے اپنا نہ سکے تو پھر یہ ڈوب مرنے کا مقام ہوگا۔“

”سمجھو میں... میں ڈوب چکا ہوں عمران۔“ میں نے یاسیت سے کہا۔ ”لگتا ہے کہ وہ بہت دور جاچکی ہے مجھ سے۔“

”اوئے پھر وہی ہندی فلمیں۔ پھر وہی ولیپ کماری اور راجکپوری۔ میں سر توڑ دوں گا تمہارا۔ تم دونوں کے سامنے خود کو باقاعدہ آگ لگالوں گا۔“

”پھر بھی کچھ نہیں ہوسکے گا۔ یہ ایک بندگی ہے یار... اور یہاں سفر ختم ہوجاتے ہیں۔“

وہ پریشان نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ پھر گہری سانس لے کر بولا۔ ”اچھا اس موضوع پر پھر بات کریں گے۔ ابھی تم یہ بتاؤ، ڈنڈ بیٹھکیں وغیرہ نکالی ہیں نا... تیل شیل مل لیا ہے؟“

”لیکن کس لیے؟“

”یار! ڈنڈ بیٹھکیں کس لیے نکالی جاتی ہیں؟ شادی کے لیے یا لڑائی کے لیے۔ اور شادی کا ابھی دور دور تک پتا نہیں۔ ظاہر ہے کہ لڑائی کے لیے ہی کہہ رہا ہوں نا۔“

”کیا کرنا ہے؟“

”ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔ آرا کوئے تک پہنچنے کے لیے۔“

”اور ثروت؟“

”ثروت تو یہیں رہے گی۔ جیسے ٹیپو سلطان کے بیٹے رہے تھے انگریزوں کے پاس یرغمالی کے طور پر۔“

”یعنی ہمیں آرا کوئے کے بدلے ثروت کی رہائی ملے گی؟“

”ہاں، یہی طے ہوا ہے۔“ عمران نے گہرا کش لے کر کہا۔

”اور اگر ہم ناکام ہوئے تو؟“

”ناکامی کی گنجائش نہیں ہے۔ دادا جی فرماتے تھے۔ دنیا میں دو کاموں کے علاوہ ہر کام ممکن ہے۔ میزبانوں کے سامنے باعزت طریقے سے آم چوسنا اور سخت گرمی میں کھوئے ملائی والی قلفی کو گرنے سے بچانا۔ یہ اپنے نوپی کا جو مشہور قول ہے، وہ دراصل دادا جی نے ہی نوپی کے منہ میں دیا تھا۔ نوپی سمجھتے ہونا۔ نپولین بونا پارٹ، دادا جی کا لنگوٹیا

تھا۔ دونوں اکٹھے بیٹھ کر لڑکیوں کو لو لیٹر لکھتے تھے۔ نپولین نے کہا تھا کہ میری ڈکشنری میں ناممکن کا لفظ ہے ہی نہیں۔ ہمیں بھی یہی سوچ کر آگے بڑھنا ہوگا۔“

”لیکن کرنا کیا ہے؟“

”وقت سے پہلے کچھ نہیں بتاؤں گا۔ دیکھو، منو بھائی سے لے کر امجد اسلام امجد تک اور محی الدین نواب سے لے کر احمد اقبال تک کسی نے بھی وقت سے پہلے کچھ بتایا ہے؟ قبل از قسط کچھ پتا نہیں چلتا، کچھ نہیں۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”جن رائٹر لوگوں کا تم نے نام لیا ہے، ان کے بارے میں جانتے ہو؟“

”کسی کے بارے میں بات کرنے کے لیے اس کے بارے میں جاننا ضروری نہیں ہوتا۔ یار! لوگ تو بغیر جانے کسی شخصیت پر پوری کتاب لکھ مارتے ہیں۔ ایسے ایسے خفیہ گوشوں سے نقاب اٹھاتے ہیں کہ شخصیت بے چاری تڑپ تڑپ کر رہ جاتی ہے۔ کئی شخصیات تو صدمے سے اسپتال کے سی سی یو وغیرہ میں جا پہنچتی ہیں۔ دادا جی کا وصال بھی تو ایک ایسی حرکت کی وجہ سے ہوا تھا۔“

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”ان پر کس نے کتاب لکھی تھی؟“

”ان پر نہیں لکھی تھی، انہوں نے لکھی تھی۔ گوجرانوالہ کے ایک مشہور پہلوان کے بارے میں۔“

”کون سا پہلوان؟“

”نام نہیں بتاؤں گا۔ اس کے پوتے بھی بڑے غصیلے پہلوان ہیں اور لاہور میں ہی رہتے ہیں۔ کیا تم مجھے بھی دادا جی کے پاس پہنچانا چاہتے ہو؟“

وہ پٹری سے اتر چکا تھا۔ ایک بار اس کی قوت گویائی حرکت میں آئی تو پھر اس نے رکنے کا نام نہیں لیا۔ میرے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ پنجرے کے اندر خوں خوار ریچھ اب مچھلی کے بعد بھیڑ کے گوشت کا ٹکڑا بھی کھا چکا تھا اور ایک بار پھر بھوکی نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

ثروت ابھی تک اس صدمے سے سنبھلی نہیں تھی جس نے اسے پرسوں بے ہوش کیا تھا۔ اس کے بالکل سفید رنگ میں ایک نقاہت زدہ زردی گھلی ہوئی تھی۔ جب اسے پتا چلا کہ میں دو چار روز کے لیے اسے یہاں چھوڑ کر جارہا ہوں تو وہ دہل گئی۔ اس کی خوب صورت آنکھیں ایک دم کھنڈرات کی طرح ویران ہوگئیں۔

”نہیں تابش! میں یہاں اکیلی نہیں رہوں گی۔ میں آپ کے ساتھ جاؤں گی۔ آپ کہیں گے وہاں خطرہ ہے لیکن مجھے وہ خطرہ منظور ہے۔“

”ثروت! جس طرح میں اور عمران سچویشن کو سمجھ رہے ہیں، تم نہیں سمجھ رہی ہو۔ یہ ممکن نہیں ہے۔“ میں ثروت کو یہ بتانا نہیں چاہتا تھا کہ وہ یہاں ایک یرغمالی کے طور پر موجود ہے۔

وہ کسی صورت ماننے کو تیار نہیں تھی۔ آخر میں نے اسے بتایا۔ ”جاوا ہم سے جو کام لینا چاہ رہا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ تمہیں کسی طرح کا کوئی گزند نہ پہنچائے۔ اس نے گارنٹی دی ہے اور جاوا جیسے لوگ ایسی گارنٹیوں کا پاس کرتے ہیں۔“

وہ بڑی زود فہم تھی۔ سمجھ گئی کہ میری بات کے پیچھے کیا ہے۔ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میرا یہ اندازہ درست ہے کہ یہ شخص مجھے اپنے پاس رکھ کر آپ کو کسی بہت خطرناک کام کے لیے مجبور کررہا ہے۔ پلیز تابش! آپ اس کے چکر میں نہ آئیں۔ اگر آپ کو کوئی خطرہ ہی مول لینا ہے تو پھر اس بندے کے چنگل سے نکلنے کے لیے مول لیں۔“

”ثروت! ہم نے سب کچھ ناپ تول لیا ہے۔ جو رسک ہم لے رہے ہیں، وہ اس رسک سے بہت چھوٹا ہے جو ہم یہاں سے نکلنے کی کوشش میں لیں گے۔ تم اپنے دماغ کو ان سوچوں سے تکلیف مت دو۔ تم بس دعا کرو اور حوصلہ رکھو۔ سب ٹھیک ہوجانا ہے اور یہ بھی مت سمجھو کہ تم یہاں بالکل اکیلی رہو گی۔ عمران نے تمہاری سیفٹی کا بندوبست بھی کر دیا ہے۔ ایک دبنگ خاتون یہاں تمہارے ساتھ رہے گی۔ بہت ہوشیار اور بہت جی دار۔ تمہارا وقت اچھا گزرے گا اس کے ساتھ۔“

”آپ کس کی بات کررہے ہیں؟“

”میڈم صفورا۔ وہ بھی آرا کوئے کے لیے بھاگ دوڑ کرنے والوں میں شامل رہی ہے۔ بھانڈیل اسٹیٹ میں وہ ہمارے ساتھ ہی تھی۔ اب بھی وہ عمران کے ساتھ یہاں آئی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں وہ یہاں تمہارے پاس پہنچ جائے گی۔ ویسے بھی میں اور تم ہر وقت رابطے میں رہیں گے۔ جاوا سے بات ہوگئی ہے۔ میڈم صفورا اپنا سیل فون اپنے ساتھ رکھ سکے گی۔ میں اس پر وقتاً فوقتاً تم سے رابطہ کرتا رہوں گا۔“

کافی دیر کی بحث کے بعد آخر میں ثروت کو آمادہ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ میڈم صفورا اسی بلڈنگ میں عمران کے ساتھ موجود تھی۔ پروگرام کے مطابق وہ ثروت کے پاس پہنچ گئی۔ وہ حسب معمول پینٹ اور شرٹ میں ملبوس

تھی۔ بھانڈیل اسٹیٹ میں اس کا سر مونڈ دیا گیا تھا لیکن اب ہمیشہ کی طرح بوائے کٹ بال اس کی پیشانی پر لہرا رہے تھے۔ اپنی چھوٹی بہن کی موت کی وجہ سے وہ عمران کی جانی دشمن رہی تھی مگر اب دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح وہ بھی عمران کی گرویدہ تھی۔ زرگاں میں عمران نے جس طرح اس کے زخم پر ہونٹ رکھ کر سانپ کا زہر چوسا تھا اور اس کی جان بچائی تھی، وہ ناقابلِ فراموش تھا۔

میڈم صفورا مجھ سے باقاعدہ گلے ملی اور پھر ثروت کو بھی گلے سے لگا کر اس کا سر چوما۔ اس کی آنکھوں میں نمی دیکھ کر بولی۔ ''بالکل وری نہیں کرنا ڈیئر... سمجھو تابش کہیں نہیں جا رہا، وہ یہیں تمہارے پاس ہے۔ ہم بہت اچھا وقت گزاریں گے۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''اب یہاں کھڑے کیوں ہو؟ کیا پرابلم ہے... کیا جانے کو دل نہیں چاہ رہا؟'' اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

''بس چلتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

وہ ثروت کو بغور دیکھ کر بولی۔ ''مجھے نہیں پتا ثروت ڈیئر کہ تم دونوں میں اب کیا تعلق ہے... لیکن جب میں بھانڈیل اسٹیٹ میں تھی تو تمہارے ساتھ ایک زبردست قسم کا غائبانہ انٹروڈکشن ہو چکا تھا۔ تابش سب کچھ بھول چکا تھا لیکن تمہارا نام نہیں بھولا تھا۔ یہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر جنگل میں بھاگتا تھا اور تمہارا نام لیتا تھا۔ سلطانہ اس کو پکڑ پکڑ کر لاتی تھی...''

میں دہل گیا۔ سلطانہ کے بارے میں ثروت کو ابھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ ثروت بھی جیسے سوالیہ نظروں سے میڈم صفورا کو دیکھنے لگی۔ وہ اطمینان سے بولی۔ ''سلطانہ بگوڈا کی ایک بوڑھی ملازمہ کا نام تھا۔ بڑا خیال رکھتی تھی اس کا۔''

میں سمجھ گیا کہ صفورا نے مجھے جان کر پریشان کیا ہے، ورنہ عمران اسے سب کچھ سمجھا چکا تھا کہ ثروت کے سامنے کیا کہنا ہے اور کیا نہیں۔

میں نے ابھی تک ثروت کو اپنی اس شادی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا جو میری ''مکمل خود فراموشی'' کے زمانے میں ہوئی تھی۔ وہ ابھی تک میرے بیٹے بالو کی موجودگی سے بھی بے خبر تھی۔ میں یہ سب کچھ ثروت سے چھپانا نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی مجھے چھپانا تھا لیکن ابھی تک تیز رفتار حالات اور پریشانیوں نے مجھے اس کی مہلت ہی نہیں دی تھی۔

جاوا کے اہلکار مجھے لے جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ حسبِ معمول دروازہ سلائڈ کر کے کھل گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میرے ہاتھ الٹی ہتھکڑی میں نہیں جکڑے گئے۔ میں ثروت کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آیا۔ جب تک میں اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوا، وہ مجھے دیکھتی رہی۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھے دیکھ رہی ہے۔ اس کی نگاہ کسی مرئی چیز کی طرح میرے جسم پر سرسرا رہی تھی۔ مجھے چھو رہی تھی۔ اس نگاہ کو جیسے زبان مل گئی تھی اور یہ کہہ رہی تھی... اس دیارِ غیر میں... ان بدترین دشمنوں کے درمیان خدا کے اور تمہارے سوا میرا کوئی نہیں۔ اس بات کو بھول مت جانا۔

☆☆☆

کافی دنوں بعد میں نے نیلا آسمان دیکھا اور کھلی فضا میں سانس لیا۔ عمران میرے ساتھ تھا۔ ہم نے نہا دھو کر شیو کیا تھا اور پریم چوپڑا کے فراہم کردہ نئے کپڑے پہنے تھے۔ ہم دونوں ایک ہنڈا سٹی کار پر سوار تھے۔ جاوا کی طرف سے ہمیں پچیس ہزار روپے کیش دیا گیا تھا۔ اپنے کسی بھی مسئلے کے حل کے لیے ہمیں تین فون نمبرز دیے گئے تھے۔ دو موبائل، ایک لینڈ لائن۔ یہ نمبرز ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل تھے۔ ہم اس رابطے کے ذریعے جاوا سے کچھ بھی طلب کر سکتے تھے اور کسی بھی شکل میں مدد حاصل کر سکتے تھے اور یہ سہولت صرف فرید کوٹ یا پنجاب تک محدود نہیں تھی۔ اس کا دائرہ انڈیا کے ہر شہر تک پھیلا ہوا تھا۔ جاوا نے عمران کو ہدایت کی تھی کہ پولیس یا قانون نافذ کرنے والی کسی بھی ایجنسی کی مداخلت پر ہم کسی سے الجھنے کی کوشش نہ کریں بلکہ فون پر اسے صورتِ حال سے آگاہ کریں۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ دن روشن اور قدرے خنک تھا۔ ہم فرید کوٹ کی سڑکوں پر گاڑی چلاتے رہے اور شہر کا نظارہ کرتے رہے۔ یہاں گوردوارے کثرت سے دکھائی دے رہے تھے۔ کہیں کہیں سائیکل رکشا بھی نظر آئے۔ ہر طرف رنگ برنگی پگڑیوں کی بہار تھی۔ عمران ایک بار پھر سخاوت کے موڈ میں تھا۔ وہ کئی جگہ رکا اور اس نے بڑی خاموشی سے، محتاج دکھائی دینے والوں کی مدد کی۔

کچھ دیر بعد ہم ایک صاف ستھرے ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔ ہم نے ''ہائی ٹی'' لی اور عمران نے آتی جاتی سکھ خواتین کو تاڑا اور ٹھنڈی آہیں بھریں۔ اس قسم کی حرکات وہ صرف تفریحِ طبع کے لیے کرتا تھا۔ میں نے کہا۔ ''اداکاری چھوڑو اور حقیقت نگاری کی طرف آ جاؤ۔ اب منہ سے کچھ پھوٹو کہ کرنا کیا ہے؟''

خلافِ توقع اس نے بے پر کی نہیں اڑائی اور چائے کے کپ کو گھورتے ہوئے بولا۔ ''تابی! آرا کوئے ڈاکٹر مہناز کے پاس ہے... اور کھوج ملا ہے کہ ڈاکٹر مہناز اس وقت انڈیا میں ہے۔ شاید رتنا گری شہر کے آس پاس۔''

''یہ کھوج ملا کیسے ہے؟''

''پھر ایک فون کال۔ یہ فون کال، سیل فون کے ذریعے کوئی دو ہفتے پہلے انڈیا سے انگلینڈ میں کی گئی ہے۔ ڈنہم کے ایک پروفیسر ڈاکٹر اویس چوہان کے نمبر پر۔ ان ڈاکٹر صاحب نے بابے جلالی کو اطلاع دی ہے۔ یہ ڈاکٹر صاحب جانتے تھے کہ ڈاکٹر مہناز، جلالی کے فارم میں رہ رہی ہے اور اس کا علاج معالجہ کر رہی ہے۔''

''کال کس نے کی؟''

''ڈاکٹر مہناز نے۔ پروفیسر ڈاکٹر چوہان پاکستانی ہیں اور اس میڈیکل کالج میں پڑھاتے رہے ہیں جہاں سے ڈاکٹر مہناز نے ایم بی بی ایس کیا تھا۔''

''کیا بات ہوئی دونوں میں؟''

''یہی تو مسئلہ ہے کہ بات ہو نہیں سکی۔ ڈاکٹر مہناز بس چند فقرے ہی بول پائی... سلسلہ منقطع ہو گیا۔''

''کیا کہا اس نے؟''

''یہی کہ وہ رتنا گری میں ہے۔ بڑی مشکل میں ہے۔ اسے مدد کی ضرورت ہے... پروفیسر چوہان نے اس سے پوچھا کہ وہ کس جگہ ہے۔ وہ اس کا جواب نہیں دے سکی۔ وہ جلالی صاحب کی صحت کے بارے میں پوچھ رہی تھی جب لائن بند ہو گئی۔''

میں نے پوچھا۔ ''ڈاکٹر مہناز کے ساتھ اس کا ایک کلاس فیلو ڈاکٹر بھی تو تھا؟''

ہاں ڈاکٹر رسام۔ لیکن اس کے بارے میں مہناز نے کوئی بات نہیں کی۔''

''حیرانی کی بات ہے۔ تم ڈاکٹر مہناز کو لاہور اور راولپنڈی وغیرہ میں ڈھونڈتے رہے ہو اور وہ یہاں رتنا گری میں پائی جا رہی ہے۔ وہ کیا کرتی پھر رہی ہے؟''

''وہ کچھ نہیں کر رہی۔ شاید کچھ کرنے کے قابل ہی نہیں ہے۔ کچھ لوگوں کے ہتھے چڑھ چکی ہے۔''

''کون لوگ ہو سکتے ہیں؟''

''زیادہ امکان یہ ہے کہ ان کا تعلق بھی آرا کوئے والے معاملے سے ہی ہوگا۔''

''اگر ایسا ہے تو... پھر مہناز کو پکڑ کر رکھنے کا مطلب کیا ہے؟''

''یہی کہ آرا کوئے اب مہناز کے پاس نہیں ہے۔ وہ اسے کہیں کھو چکی ہے یا پھر اس نے اسے کہیں محفوظ کر دیا ہے۔ اب اسے پکڑنے والے اس کے ذریعے مورتی تک پہنچنا چاہتے ہیں لیکن تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہو سکتا ہے اور یہ رخ زیادہ خطرناک ہے...'' عمران کی کشادہ پیشانی پر تفکر کی لکیریں تھیں۔

''کیسا رخ؟''

اس نے سگریٹ کا کش لیا اور دھواں چھت کی طرف چھوڑتے ہوئے بولا۔ ''پروفیسر چوہان جنہوں نے مہناز کی کال سنی ہے، ایک خاص بات بتا رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کے اندازے کے مطابق مہناز کسی ایسی جگہ سے فون کر رہی تھی جہاں بیک گراؤنڈ میں ڈھول وغیرہ بجنے کی آواز آ رہی تھی اور یہ ایسے ڈھول نہیں تھے جو آرکسٹرا میں بجائے جاتے ہیں بلکہ یہ نقارے کی طرح تھے۔''

''نقارے کی طرح؟''

''میرا ذہن تو اس سلسلے میں بگوڈا کی طرف ہی جاتا ہے۔ یہ بات عین ممکن ہے کہ مہناز ان لوگوں کے ہتھے چڑھ چکی ہو جو اس سے پہلے بھی آرا کوئے کو پاکستان سے برآمد کر کے بھانڈیل اسٹیٹ لے گئے تھے۔ تمہیں یاد ہی ہوگا، وہاں عبادت گاہوں میں کس طرح کے ڈھول پیٹے جاتے تھے۔''

عمران بڑی سنسنی خیز بات کہہ رہا تھا۔ مجھے اپنے جسم میں سنسناہٹ محسوس ہوئی۔ بات قابلِ غور تھی۔ یہ ممکن تھا کہ مہناز اس وقت کسی بگوڈا کے بھکشوؤں کے پاس ہو اور اسے بگوڈا کے اندر ہی کہیں چھپا دیا گیا ہو لیکن سوچنے کی بات تھی کہ وہ یہاں تک پہنچی کیسے؟''

میں تیزی سے سوچ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''عمران! پھر تو ایک اور بات بھی ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ آرا کوئے اور مہناز دونوں بھکشوؤں کے قبضے میں ہوں۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''پہلے بھی تو ایسا ہو چکا ہے۔ بھکشوؤں نے نہ صرف آرا کوئے برآمد کیا بلکہ آرا کوئے کے ساتھ ساتھ مجھے، میڈم صفورا اور دیگر لوگوں کو بھی مجرم گردان کر اپنے ساتھ پاکستان سے بھانڈیل لے گئے۔ بھانڈیل میں ہمیں آرا کوئے چرانے کی سزا دی گئی۔ بگوڈا کا جبری خادم بنا دیا گیا۔ ممکن ہے کہ مہناز کو بھی کسی سزا کے لیے ہی کہیں بند رکھا گیا ہو۔''

''اس پہلو سے میں نے نہیں سوچا تھا۔ تمہاری بات میں وزن ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مورتی اور مہناز دونوں ان لوگوں کے پاس ہوں۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''پتا نہیں کیا شے ہے یہ مہناز۔ بوڑھے جلالی کے علاج میں اتنا آگے چلی گئی کہ اس سے شادی کر بیٹھی۔ اب ایک بیوی کی حیثیت سے اس کی بات نبھانے کی کوشش کر رہی ہے۔ مورتی کے پیچھے جان

جو کم میں ڈال رہی ہے بلکہ جان گنوا رہی ہے۔ مجھے تو کم ہی امید ہے کہ بچ پائے گی۔"

"صنفِ نازک کی بغاوت اسی طرح کی ہوتی ہے پیارے۔ انوکھے سے انوکھا کام کیا جاتا ہے اور پھر اسے پورا کرنے کے لیے سردھڑ کی بازی لگا دی جاتی ہے۔ مرنے سے پہلے بابے جلالی نے مہناز سے یہی فرمایا ہوگا کہ اس کا عہد نبھانا ہے۔ مورتی کو اس کے اصل مالک تک پہنچانا ہے۔ چوروں کے ہاتھ نہیں آنے دینا۔ اس نے کہا ہوگا جو حکم میرے بزرگ سرتاج۔ اب ہوا یہ ہے کہ بابا جلالی بسترِ مرگ سے اٹھ کر بیٹھ گیا ہے۔ اب عاشق شیخوپورہ میں اور محبوبہ رتنا گری میں پائی جارہی ہے۔ کم از کم اب تک تو پائی جارہی ہے۔ بابا جلالی اپنے پرانے گراموفون پر آج کل یقیناً یہی غزل سن رہا ہوگا، کیوں اداس پھرتے ہو سردیوں کی شاموں میں... اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔"

"اچھا چھوڑو ان باتوں کو... اب مہناز کو ڈھونڈنا کیسے ہے؟"

"ظاہر ہے، اگر وہ رتنا گری میں ہے تو اسے جہلم یا خانیوال میں تو نہیں ڈھونڈا جاسکتا۔ ہمیں رتنا گری ہی چلنا ہوگا۔ وہ اچھا خاصا شہر ہے لیکن ہوسکتا ہے کہ بدھ مت کی عبادت گاہیں زیادہ نہ ہوں۔ اگر ہمارا اندازہ درست ہے اور فون کال کے پیچھے سنائی دینے والے ڈھول کسی پگوڈا ہی کے تھے تو پھر ہمیں اپنی تلاش رتنا گری کے پگوڈوں سے شروع کرنی ہوگی۔"

"یہ رتنا گری ہے کس طرف؟"

"بات تو ایسے کر رہے تھے جیسے رتنا گری میں تمہارا ننھیال ہے۔ اب پوچھ رہے ہو یہ کس طرف؟"

"معافی چاہتا ہوں۔" میں نے چڑ کر کہا۔

"ہم میڈ بادا والے ہیں۔ ہم نے تو ٹی وی چینل پر بڑوں بڑوں سے معافی منگوائی ہے۔" وہ مسکرایا پھر قدرے سنجیدہ ہو کر بولا۔ "یہ مہاراشٹر کا ایک ساحلی شہر ہے۔ ممبئی سے بس کے ذریعے چھ ساڑھے چھ گھنٹے کا سفر ہے۔ وہاں ائرپورٹ نہیں ہے۔ بائی روڈ ہی جانا پڑے گا۔ ممبئی میں اتریں گے، وہاں سے بس پکڑیں گے۔"

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "جادا کو پتا ہے کہ تمہیں آراکوئے کے حوالے سے کلیو ہاتھ آیا ہے؟"

"کبھی کبھی بالکل گھامڑ ہو جاتے ہو۔ جادا کو بتا دیا تو پھر اپنے ہاتھ کیا رہ جائے گا۔ اسے کچھ نہیں بتایا۔ صرف یہ بتایا ہے کہ آراکوئے ڈھونڈیں گے اور اس کے منہ پر ماریں گے۔"

"میرا خیال ہے کہ ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ اگر مہناز کو اس علاقے سے کہیں اور پہنچا دیا گیا تو کام اور مشکل ہو جائے گا۔"

"میں دیر نہیں کرتا۔ ہمارے خاندان میں دیر کرنے کا رواج ہی نہیں ہے۔ ہم ہر کام میں جلدی کرتے ہیں بلکہ میرے ایک تایا تو اتنے پھرتیلے تھے کہ ر کشے میں ہی پیدا ہو گئے تھے۔"

"زبردست... انہوں نے ان کی شادی کا بھی انتظار کیا تھا یا نہیں؟"

"بکواس نہ کرو۔ دراصل [illegible] پر اپنے یار نپولین کے خیالات کا بڑا اثر تھا۔ وہ بھی ہر کام میں بڑی جلدی کرتا تھا۔ تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ نپولین اپنے بڑے بھائی سے پہلے ہی پیدا ہو گیا تھا۔ اسی وجہ سے دونوں بھائیوں میں آخر تک جھگڑا رہا۔ جھگڑا بڑھ جاتا تھا تو دادا جی ان کی صلح کراتے تھے۔ اس صلح کی خوشی میں اکثر زرالے کی مٹھائی کھائی جاتی تھی۔"

"یعنی اس زمانے میں بھی زرالے کی مٹھائی تھی؟"

"گھونچو! جو لوگ وقت سے آگے ہوتے ہیں، وہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ تم نے خود ہی تو ذکر کیا تھا ابن صفی صاحب کا۔ دیکھو، محترم نے میرے پیدا ہونے سے پہلے ہی مجھ سے ملتا جلتا کردار تخلیق کر لیا نا۔ چلو اٹھو۔ اب تم خود دیر کر رہے ہو۔"

اس نے ویٹر کو فراخ دلی سے ایک ہزار روپے کی ٹپ دی اور ہم اٹھ کر باہر گاڑی میں آ بیٹھے۔

☆☆☆

اگلے روز ہمارا سفر فرید کوٹ سے شروع ہوا۔ بذریعہ سڑک ہم دہلی پہنچے۔ پریم چوپڑا بنفس نفیس ہمارے ساتھ تھا۔ وہ ہمیں ہر قسم کی لاجسٹک سہولت فراہم کر رہا تھا۔ ہمارے ٹکٹ تیار تھے۔ چوپڑا نے ہمیں سی آف کیا۔ ہمارے بس میں ہوتا تو "اسے" سی آف کرتے اور عدم آباد کے لیے کرتے۔ اس خبیث نے آشا کور کو بے آبرو کیا تھا۔ بعدازاں وہ جادا کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر گئی تھی۔ لیکن ابھی ہم اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ چوپڑے پر اکثر لوگوں کو فلمی پریم چوپڑا کا ہی شبہ ہوتا تھا۔ وہ مڑ مڑ کر اس کی طرف دیکھتے تھے اور شدید حیران بھی ہوتے تھے کہ یہ بوڑھا ولن پھر سے جوان کیسے ہو گیا۔ وہ اس صورت حال سے لطف اٹھاتا تھا۔

ہم دہلی ائرپورٹ سے سہ پہر کے وقت اڑے اور ممبئی

میں پہنچے تو شام گہری ہو چکی تھی۔ فضا سے ممبئی کا نظارہ دلفریب تھا۔ بحرِ ہند کے کنارے دور تک یہ روشنیوں اور رنگوں کا شہر پھیلا ہوا تھا۔ اس شہر میں سب رنگ تھے۔ غلیظ بستیاں بھی تھیں اور عالی شان محلات بھی۔ یہاں گندی نالیوں میں کیڑوں کی طرح رینگتے ہوئے لوگ بھی تھے اور شان و شوکت کی اونچی مسندوں پر بیٹھے ہوئے بڑے بڑے سپر اسٹار بھی۔ یہ انڈیا کی فلم نگری تھی۔ تضادات سے بھری ہوئی اور جبر میں لتھڑی ہوئی اور ہم یہاں لینڈ کر رہے تھے۔ میں اور عمران دانش۔ ایک ایسا مشن ہمارے سپرد تھا جو کچھ لوگوں کو آراکوئے کی صورت میں بے انتہا دولت دے سکتا تھا اور جس کی کامیابی کئی بین الاقوامی طالع آزماؤں میں تہلکہ مچا سکتی تھی۔ گوشت کے پہاڑ ریان ولیم جیسے وہ سب لوگ جو آراکوئے کے پیچھے تھے، مال اور سردھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ بڑے بڑے ڈان، گینگسٹر، جواری اور فتنہ ساز۔ یہ لوگ آرٹ کے اس نادر نمونے کے پیچھے دیوانے ہو رہے تھے۔ اس نمونے کی خاص شہرت اس کی طلب میں مزید شدت پیدا کر رہی تھی۔ بھانڈیل اسٹیٹ میں ہمیں بتایا گیا تھا کہ آراکوئے کا مطلب وہ مورتی ہے جو اپنی حفاظت خود کرتی ہے اور اُن لوگوں کی حفاظت بھی کرتی ہے جن کے پاس ہوتی ہے۔ اس حوالے سے دوسری جنگ عظیم کے کچھ واقعات بھی بڑے وثوق سے بیان کیے جاتے تھے۔

عمران سارے راستے، چمکیلی ساڑی والی انڈین ایئر ہوسٹس سے آنکھیں لڑاتا رہا اور مجھے ہر گھڑی یہ دھڑکا لگا رہا کہ وہ سخت ڈانٹ کھائے گا لیکن خیریت گزری۔ ممبئی کے چھتر پتی ائرپورٹ پر ہمارا استقبال جادا ہی کے ایک سوٹڈ بوٹڈ کارندے نے کیا۔ ہمیں ایک شاندار گاڑی میں ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں پہنچا دیا گیا۔

ہوٹل کے شاندار سوئٹ میں پہنچ کر عمران نے ٹائی اتار کر ایک طرف پھینکی اور قمیص کے بٹن کھول کر گداز بستر پر گر پڑا۔

یہاں ہماری سہولت کا ہر سامان موجود تھا۔ وارڈ روب میں کپڑوں کے کئی جوڑے اور سلیپنگ گاؤن وغیرہ آویزاں تھے۔ ایک طرف دو بڑے شولڈر بیگ رکھے تھے۔ میں نے ایک بیگ کی زپ کھولی۔ سب سے پہلے نگاہ ایک زبردست پسٹل اور اس کے میگزینز پر پڑی۔ پسٹل کا ایک شاندار سائلنسر بھی دکھائی دیا۔ فالتو ایمونیشن بھی موجود تھا۔ اس کے علاوہ بھی کئی چیزیں تھیں۔ دستانے، دھوپ کا چشمہ، پی کیپس، ٹارچ، ٹیلی اسکوپ، ڈیجیٹل کیمرا وغیرہ۔

عمران نے اپنے پسندیدہ برانڈ کا سگریٹ سلگایا اور اپنی ٹھوڑی کا گڑھا کھجاتے ہوئے بولا۔ "سچ بتاؤ جگر! اس وقت ہم جیمز بانڈ نہیں لگ رہے۔ ایک خطرناک مشن پر ممبئی میں وارد ہوئے ہیں۔"

"جیمز بانڈ واحد ہے جمع نہیں۔" میں نے کہا۔

"یار! واحد ہی سمجھو۔ تم تو کسی گنتی میں ہی نہیں ہو۔ بس تمہاری عزت بڑھانے کے لیے تمہیں ساتھ ساتھ لیے پھرتا ہوں۔"

"تو ٹھیک ہے۔ میں چلتا ہوں۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"اررر... یہ غضب نہ کرنا۔ یہ ممبئی ہے پیارے۔ بچے راستہ بھول جاتے ہیں بلکہ جوان اور بوڑھے بھی بھول جاتے ہیں۔ ایسی ایسی کافر حسینائیں ہیں یہاں جو بندے کو چٹکیوں میں اڑاتی ہیں اور منٹوں میں اس کی مت مار کر اسے بیڈ روم تک پہنچا دیتی ہیں۔ خبردار، ہوشیار، یہ ممبئی ہے میرے جگر پارے... ممبئی۔"

"لیکن جیمز بانڈ جی! ہم ممبئی میں تو نہیں آئے۔ رتنا گری جانا ہے ہمیں۔"

"مگر آج کی رات تو ممبئی میں ہی گزرے گی۔ مستقبل کے بجائے حال پر... بلکہ کسی اچھے ڈانسنگ ہال پر نظر رکھنی چاہیے۔"

"تم رکھو نظر۔ میں تو سونے لگا ہوں۔ بشرطیکہ تم مزید بکواس نہ کرو۔"

"میرا خیال ہے کہ ثروت کی یاد ستانے لگی ہے۔ اس شہر کی آب و ہوا ہی ایسی ہے۔ چلو فون کر لو اسے۔"

"نہیں، اب صبح ہی کروں گا۔"

"اچھا تو میں کر لوں۔"

"کس کو؟"

"یار چند ایک فرشتے ہیں یہاں۔ تم ان کو میرے موکل بھی کہہ سکتے ہو۔ ان کو ذرا حرکت میں لانا ہے۔"

اس کے بعد وہ فون کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اس نے ممبئی میں اور رتنا گری میں چار پانچ بندوں کو فون کیا۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ ہم سے پہلے ہی رتنا گری پہنچ چکے ہیں اور اپنے کام میں مصروف ہو گئے ہیں۔ ان میں سے ایک بندے کا نام شیکھر بھی تھا اور یقیناً یہ مقامی ہی ہوگا۔ عمران نے شیکھر کے ساتھ بھی بے تکلفی سے بات چیت کی اور اندازہ ہوا کہ وہ اسے پہلے سے جانتا ہے۔

اس نے گفتگو ختم کی تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔ "عمران! آج مجھے ایک بات بتاؤ۔ مجھے اتنا عرصہ ہو گیا

تمہارے ساتھ رہتے ہوئے لیکن مجھے ابھی تک یہ پتا نہیں چلا کہ تمہارے لیے کون لوگ کام کرتے ہیں؟"

"کیا مطلب؟"

"یہی کہ یہ تمہارے موکل کہاں کہاں پائے جاتے ہیں؟ میں تو ان میں سے صرف دو چار کو ہی جانتا ہوں۔ ایک یہ جیلانی۔ اس کے علاوہ اقبال، امتیاز اور شاہین وغیرہ۔"

"شاید تمہارا خیال ہے کہ میں نے اپنی کوئی خفیہ ایجنسی وغیرہ بنا رکھی ہے۔ کوئی ایسی خفیہ سروس جو منہ پر نقاب چڑھا کر مجرموں کا پیچھا کرتی ہے اور ان کو چھاپتی ہے، وطن دشمنوں کی ناک میں نکیل ڈالتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ ایسا کچھ نہیں ہے یار! بس اپنے یار دوست ہیں، تعلق والے ہیں جو ضرورت پڑنے پر میری مدد کرتے ہیں۔ میں وقت پڑنے پر ان کی مدد کرتا ہوں۔"

"لیکن یہ لوگ تو ہر جگہ موجود ہیں۔ آسٹریا میں، انگلینڈ میں اور اب پتا چل رہا ہے کہ انڈیا میں بھی۔ یہ ہر بڑے شہر میں تمہاری آواز پر بوتل کے جن کی طرح حاضر ہو جاتے ہیں۔ مجھے تو کبھی کبھی لگتا ہے کہ یہ سب کچھ ایک سسٹم کی طرح ہے۔"

"سسٹم یہی ہے جو میں نے تمہیں ابھی بتایا ہے۔ تم دوسروں کی مدد کرو، وہ تمہاری مدد کریں گے۔ مجھے دوستیاں بنانا اور انہیں قائم رکھنا اچھا لگتا ہے۔ زندگی میں اور رکھا بھی کیا ہے یار؟"

مجھے پتا نہیں تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے یا غلط... لیکن میں پوری طرح مطمئن نہیں ہوا۔

ٹی وی پر کوئی فلم چل رہی تھی جس میں مار دھاڑ اور قتل و غارت کے مناظر تھے۔ میرے ذہن میں ایک بار پھر انٹرنیٹ پر دیکھے ہوئے خونی سین گھومنے لگے۔ 16 افراد کا قتل اور وہ بھی ایسے سنسنی خیز انداز میں۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے خود کو گولی ماری۔ صرف ایک بندے نے مزاحمت کی اور وہ اسٹیج کے بالکل پاس سے چلنے والی رائفل کی گولیوں کا شکار ہوا۔ میں ان میں سے بس ان دو بندوں کے چہرے ہی دیکھ پایا تھا جو بچ گئے تھے۔ میں اس بارے میں عمران سے مزید تفصیلات پوچھنا چاہتا تھا لیکن وہ ہر بار طرح دے گیا... اسی دوران میں اچانک میری نگاہ کھڑکی سے نیچے ہوٹل کے صحن میں گئی۔ ایک گاڑی پارکنگ میں کھڑی تھی۔ اس میں پچھلی نشست پر ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ دو تین ماڈرن لڑکیاں کچھ فاصلے پر کھڑی بڑے اشتیاق سے گاڑی میں بیٹھی لڑکی کو دیکھ رہی تھیں اور چہ میگوئیاں کر رہی تھیں۔ میں نے دھیان سے کار سوار لڑکی کو دیکھا اور چونک گیا۔ وہ مشہور ایکٹریس ایشوریا رائے تھی۔ ایشوریا رائے یا پھر اس کی ہم شکل۔ تب میری نگاہ اس کی سبز ساڑی پر پڑی۔ یہ خوب صورت ساڑی میں نے پہلے بھی دیکھی ہوئی تھی۔ سرحدی گاؤں میں جب چودھری انور کی پہلی حویلی میں ایشوریا، راجا کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کر رہی تھی، یہی شاندار ساڑی اس کے جسم پر تھی۔ اسی دوران میں کار سوار ایشوریا رائے کسی بات پر مسکرائی۔ یہ مسکراہٹ بھی میں پہلے دیکھ چکا تھا۔ یہ اصلی ایشوریا والی مسکراہٹ سے کچھ مختلف تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ وہی سویٹی عرف ایشوریا ہے جسے ہم پہلے شیخوپورہ میں اور پھر انڈین بارڈر کے قریب چودھری انور کے گاؤں میں دیکھ چکے ہیں۔ میں نے عمران کو دیکھا۔ وہ بھی لڑکی کو دیکھ چکا تھا۔ میں نے کہا۔ "عمران! میری نظر دھوکا نہیں کھا رہی۔ یہ وہی لڑکی ہے۔ ایشوریا کی ہم شکل۔ یہ پاکستان سے یہاں آگئی ہے۔"

عمران نے جلدی سے اپنا بیگ کھولا، اس میں سے ٹیلی اسکوپ نکالی۔ وہ بڑے دھیان سے لڑکی کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے ٹیلی اسکوپ میری طرف بڑھائی۔ میں نے فوکس درست کر کے دیکھا، وہ اب موبائل فون سن رہی تھی۔ اس کے چہرے پر چمک تھی۔ مجھے سو فیصد یقین ہو گیا کہ یہ وہی سویٹی ہے جو جاوا اور سلطان چنے کے ساتھ تھی۔ میں نے عمران کو اس بارے میں بتایا۔ وہ تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنا شولڈر بیگ کندھے سے لٹکایا اور بولا۔
"آؤ اس کا پتا کریں۔"

اس نے مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ میرا بازو پکڑا اور قریباً کھینچتا ہوا سوئٹ میں سے نکل آیا۔ ہم فرسٹ فلور کی سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے نیچے پہنچے۔ جس گاڑی میں ہمیں ہوٹل پہنچایا گیا تھا، وہ یہیں پارکنگ میں موجود تھی اور اس کی چابی عمران کے پاس تھی۔ ہم گاڑی تک پہنچے اور اسے کچھ آگے لے آئے۔ سویٹی عرف ایشوریا والی سفید گاڑی اب حرکت میں آچکی تھی تاہم خوش قسمتی سے زیادہ دور نہیں گئی تھی... سفید گاڑی سڑک پر پہنچی اور پھر ٹریفک کے سیل رواں میں شامل ہو گئی۔ ہم اس کے پیچھے تھے اور اپنے تعاقب سے باخبر رہنے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔ جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ ہمارا تعاقب نہیں ہو رہا۔ بس ایک خطرہ تھا کہ ہم رش میں سفید گاڑی کو کہیں کھو دیں گے۔ لیکن تعاقب کرنے والا عمران تھا۔ اس کی عقابی نظر اور ڈرائیونگ میں اس کی چابک دستی سے بچنا آسان نہیں تھا۔ نہایت مشکل ٹریفک کے باوجود ہم

کسی نہ کسی طرح سفید گاڑی کے پیچھے لگے رہے۔ گاڑی ایک نیم رہائشی علاقے میں داخل ہوئی اور ایک عمارت کے گیٹ میں چلی گئی۔

ہم نے اپنی گاڑی عمارت کے گیٹ سے کچھ فاصلے پر ایک منی مارکیٹ کے سامنے روک دی۔ مارکیٹ میں خریداروں کی آمدورفت تھی۔ کسی نے ہم پر توجہ نہیں دی۔ کچھ دیر تک گاڑی میں بیٹھنے کے بعد ہم باہر نکلے۔ ٹہلتے ہوئے عمارت کے سامنے سے گزرے۔ کسی سرکاری ٹھیکیدار انیل مہرہ کے نام کی پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ کوٹھی کے پورچ میں روشنی تھی۔ گیٹ کے نچلے حصے سے ایک کتا حرکت کرتا نظر آرہا تھا۔ اس کے سوا کوئی نقل وحرکت نہیں تھی۔

ہم نے ایک شاپ سے ناریل پانی پیا۔ پھر ایک اسنیک بار سے سبزی کے رول لیے اور وہیں سڑک پر کھڑے کھڑے کھائے۔ اس تمام وقت میں ہماری نگاہیں کوٹھی کے گیٹ پر ہی لگی رہیں۔ عمران کو شاید توقع تھی کہ سویٹی عرف ایشوریا جلد ہی کوٹھی سے نکلے گی اور ہم دوبارہ اس کا پیچھا کر سکیں گے لیکن عملاً ایسا ہوا نہیں۔ ہم دوبارہ گاڑی میں آبیٹھے۔

آخر میں نے کہا۔ ”عمران! یار ہم اپنی لائن سے ہٹ رہے ہیں۔ ہمیں صبح رتناگری کے لیے نکلنا ہے۔ وہاں اس سے کہیں زیادہ ضروری کام ہمارا انتظار کررہے ہیں۔“

”یار! اتنی خوب صورت پاکستانی لڑکی یہاں بدنیت اجنبیوں کے درمیان ہے۔ ہمیں اس کے بارے میں جاننے کا حق ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ اس کے پاکستانی ہونے سے زیادہ اس کا خوب صورت ہونا تمہارے لیے زیادہ اہم ہے۔“

”جو بھی سمجھو لیکن جستجو کرنا ہمارا حق ہے۔“

”یہ حق استعمال کرتے ہوئے ہمیں اب دو گھنٹے ہونے والے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ اس حق کو استعمال کرتے کرتے ہم اپنے رتناگری والے فرض سے غافل ہوجائیں۔ یہ کوئی بھولی بھالی دیہاتی ضیا رنہیں ہے۔ ہوشیار، چالاک لڑکی ہے اور ممبئی میں قسمت آزمائی کے لیے اپنی مرضی سے جاوا وغیرہ کے ساتھ یہاں آئی ہے۔ اس کے بارے میں بہت زیادہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس کے بارے میں اگر تمہیں زیادہ ہی تجسس ہے تو بعد میں جاوا سے معلوم کرلینا...“

دو چار منٹ میں، میں نے عمران کو نیم رضامند کرلیا۔ ہم کوٹھی کے سامنے سے روانہ ہونے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ کوٹھی کا گیٹ کھل گیا۔ ہم الرٹ ہوگئے۔ ہمیں توقع تھی کہ سویٹی عرف ایشوریا اپنی گاڑی پر باہر آرہی ہے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ کوئی گاڑی کوٹھی سے نہیں نکلی۔ ہاں، ایک گاڑی داخل ضرور ہوئی۔ وہ تیزی سے آئی تھی اور سیدھی اندر چلی گئی تھی۔ غالباً گاڑی کی آمد سے پہلے ہی گیٹ کیپر کو علم تھا کہ گاڑی آرہی ہے۔ گاڑی کے شیشے رنگ دار تھے۔ گاڑی جب گیٹ میں داخل ہورہی تھی... ایک لمحے کے لیے، صرف ایک لمحے کے لیے ہمیں ایک منظر کی جھلک نظر آئی۔ یہ جھلک شاید کسی اور نے نہ دیکھی ہو لیکن ہم دونوں چونکہ گہری نظروں سے گاڑی کو تاڑ رہے تھے، اس لیے ہم دیکھ پائے۔ گاڑی کا پچھلا دروازہ تیزی سے کھلا... مگر تھوڑا سا کھل کر دوبارہ کھٹاک سے بند ہوگیا۔ دروازے کے کھلنے اور بند ہونے کے درمیان ہم نے گلابی کپڑوں والی کسی عورت کی جھلک دیکھی۔ وہ جیسے گاڑی سے باہر نکلنا چاہ رہی تھی۔ لیکن کسی نے دروازہ بند کرکے اسے زبردستی روک دیا تھا۔

”ہائیں... یہ کیا تھا؟“ عمران نے دیدے گھمائے۔ ”کوئی گڑبڑ لگ رہی تھی۔“

عمران خاموش رہا۔ پھر سگریٹ کا طویل کش لے کر بولا۔ ”اب تو یہاں رکنا ضروری ہوگیا ہے۔ یقیناً کوئی چکر چل رہا ہے یہاں۔“

”رکنے سے کیا ہوگا؟“

”تو پھر اندر چلتے ہیں۔“

”کس طرح؟“

”ڈھونڈ لیتے ہیں کوئی راستہ۔“

میں نے کہا۔ ”تم بھی جانتے ہو عمران کہ ایشوریا اور دوسری لڑکیوں کو یہاں لانے والا جاوا ہی ہے۔ یہاں جو کچھ ہورہا ہے، جاوا کی زیرِنگرانی ہورہا ہے۔ اگر ہم مداخلت کریں گے تو جاوا کا ردِعمل کیا ہوگا۔ اس نے تو ہمیں رتناگری جانے کے لیے روانہ کیا تھا۔“

”جاوا صاحب کمینے کو کچھ پتا چلے گا تو پھر ہے نا۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب بھی تمہیں بتاتا ہوں۔ پہلے مجھے اس کوٹھی کا ایک راؤنڈ لگانے دو۔“

اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ایک بغلی سڑک سے گزر کر ہم کوٹھی کے عقب میں آگئے۔ یہاں تکون کی شکل کا ایک چلڈرن پارک تھا۔ پارک میں لائٹس کا انتظام نہیں تھا اور وہ سنسان پڑا تھا۔ کوٹھی کی عقبی دیوار پارک کی دیوار سے ملتی تھی۔ عمران نے اچھی طرح جائزہ لیا پھر بولا۔ ”چلو اندر گھستے ہیں۔“

”کس طرح؟“

”سلیمانی ٹوپی پہن کر۔ ہم کسی کو نظر نہیں آئیں گے۔“

اس نے شولڈر بیگ کی زپ کھولی۔ اس میں سے جدید پسٹل نکالا۔ اس پر سائلنسر فٹ کیا اور دو فالتو میگزین جیب میں رکھ لیے۔ تب اس نے بیگ کے اندر ہی سے دو نقاب نکالے۔ ایسے نقاب میں سے فقط آنکھیں ہی دکھائی دیتی ہیں اور یہ چہرے کو گردن تک ڈھانپ لیتا ہے۔ یہ اسکائی ماسک بڑے باریک میٹریل کے بنے ہوئے تھے ان میں تین سوراخ بنے ہوتے ہیں۔ عمران نے بتایا تھا کہ انہیں ”تھری ہول بالاک لاوا“ بھی کہا جاتا ہے۔

عمران نے نقاب چڑھایا اور پھر میرے چہرے پر بھی چڑھا دیا۔ یہ تجربہ زندگی میں پہلی بار ہورہا تھا۔ ہم کار کو لاک کرکے اترے۔ دیوار دس فٹ کے قریب بلند تھی۔ عمران کو اس پر چڑھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آسکتی تھی۔ اس نے پہلے مجھے ہاتھ کا سہارا دے کر اوپر چڑھایا پھر خود چڑھ آیا۔ ہم بے آواز اندر کے گراسی لان میں کودے۔ اچانک اندھیرے میں ایک سایہ حرکت کرتا نظر آیا۔ میرا دل اچھل کر رہ گیا۔ ہم کوٹھی میں موجود السیشین کتے کو فراموش کرچکے تھے۔ کم از کم میں تو فراموش کرچکا تھا۔ میری نگاہوں میں وہ ہیجان خیز منظر گھوم گیا جب کچھ عرصے پہلے میں اور شیخ محمد شیخوپورہ کے قریب انڈسٹریل ایریا کی کوٹھی میں داخل ہوئے تھے اور سلطان چٹا کے خوں خوار کتوں نے ہم پر حملہ کیا تھا۔

کتا تیزی سے ہمارے پاس آیا۔ اس کی آواز بلند اور انداز جارحانہ تھا لیکن پھر ایک دم ہی اس کے تیور بدل گئے۔ میں نے دیکھا، عمران اسے پچکار رہا ہے پھر وہ کتے کے بالکل قریب چلا گیا۔ اس کی گردن کو سہلانے لگا۔ اس کی تھوتنی پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اس کے ”جادو“ نے کام دکھایا۔ چند ہی سیکنڈ بعد کتا بالکل نارمل نظر آنے لگا۔ اس کی اوپر کو اٹھی ہوئی دم لٹک گئی پھر وہ کسی نادیدہ چیز کا پیچھا کرتا ہوا لان کے درختوں کی طرف چلا گیا۔ یہ سب کچھ ناقابلِ یقین لیکن میری آنکھوں کے سامنے تھا۔

ہم عمارت کے اندرونی حصے کی طرف بڑھے۔ ایک سنسان کوریڈور سے گزر کر ہم ایک ایسے کمرے کے سامنے پہنچے جہاں روشنی ہورہی تھی۔ یہ ایک عام رہائشی کوٹھی تھی۔ گردوپیش سے اندازہ ہوتا تھا کہ مکین خاصا خوش حال ہے لیکن زیادہ اعلیٰ ذوق نہیں رکھتا۔ نہایت قیمتی اشیا بے ترتیبی سے یہاں وہاں بکھری ہوئی تھیں۔

غالب گمان یہی تھا کہ سویٹی عرف ایشوریا رائے کو یہاں عیاشی کے لیے لایا گیا ہے۔ شاید نیم پلیٹ والا سرکاری ٹھیکیدار انیل مہرہ ہی آج کی رات سویٹی سے مستفید ہونے والا تھا... بالکل جیسے کچھ عرصے پہلے یوسف فاروقی لاہور میں ”چندو“ کے شباب سے ”فیض یاب“ ہوا تھا۔ ہم ایک ایسی روشن کھڑکی کے سامنے پہنچے جس کا اندرونی پردہ تھوڑا سا ہٹا ہوا تھا۔ عمران نے اندر جھانکا۔ سائلنسر لگا پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ عمران کے بعد میں نے کھڑکی سے چہرہ لگایا۔ اندر کوٹھی کے ڈائننگ ہال میں ایک شاندار کلاس روم کا منظر تھا۔ اندازہ ہوا کہ یہ حقیقی کلاس روم نہیں بلکہ کلاس روم کا ”سیٹ“ ہے۔ بہت سی لائٹس اور دو تین جدید مووی کیمرے نظر آرہے تھے۔ بچوں کی شاندار کرسیاں، ڈیسک، بلیک بورڈ، پروجیکٹر، اسکرین اور کمپیوٹرز وغیرہ سب کچھ اس کلاس روم میں موجود تھا۔ دو افراد اس سیٹ پر چکرا رہے تھے تاہم اداکار وغیرہ کوئی دکھائی نہیں دیتا تھا۔

”یہ تو اور معاملہ نکل آیا۔ کسی فلم کے سین شوٹ ہورہے ہیں۔“ عمران نے سرگوشی کی۔

”لیکن وہ عورت کون تھی جس نے کار سے نکلنے کی کوشش کی؟“ میں نے جوابی سرگوشی کی۔

”ہوسکتا ہے ہمیں غلط فہمی ہوئی ہو۔ دروازہ، اتفاق سے کھلا ہو۔“

مگر دو تین منٹ بعد عمران کا یہ اندازہ غلط ثابت ہوگیا۔ ہمیں سویٹی عرف ایشوریا نظر آئی۔ اس نے ایک ٹائٹ ساڑی باندھ رکھی تھی۔ کندھے پر شولڈر بیگ تھا۔ سیٹ پر لانے سے پہلے اس کا مناسب میک اپ بھی کیا گیا تھا۔ ابھی کوئی دو گھنٹے پہلے جب ہم نے سویٹی عرف ایشوریا کو ہوٹل کی پارکنگ میں دیکھا تو وہ کافی خوش وخرم تھی مگر اب صورتِ حال بالکل برعکس نظر آتی تھی۔ وہ بالکل گم صم تھی۔ اس کی کاجل بھری آنکھوں میں پریشانی اور ہراس کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ لگتا تھا کہ اسے بہت مجبور کرکے یہاں تک پہنچایا گیا ہے۔ گول چہرے والا ایک فربہ اندام گنجا پائپ پی رہا تھا اور کیمرامین کو مختلف ہدایات دے رہا تھا۔ دیگر دو تین افراد بھی اس کی ہدایات پر عمل کررہے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ شخص اس فلم کا ہدایت کار ہے۔

کچھ دیر بعد اس نے سویٹی عرف ایشوریا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”اپنا اسکرپٹ سمجھ رہی ہو نا تم؟ یہ ممبئی کا ہائی فائی انگلش میڈیم اسکول ہے۔ شہر کے باحیثیت ترین لوگوں کے بچے یہاں پڑھتے ہیں۔ تم یعنی ایشوریا رائے اپنی ایک دوست کے بچے کے داخلے کے لیے یہاں آئی ہو... پرنسپل کا شوہر جو دراصل اس ”اسکول چین“ کا مالک بھی ہے،

شراب کے نشے میں دھت دفتر میں بیٹھا ہے۔ وہ دفتر کا اندرونی دروازہ کھول کر تمہیں اس خالی کلاس روم میں لے آتا ہے۔ سب کچھ بڑے نیچرل انداز میں شوٹ ہوگا۔ بے حد نیچرل انداز میں۔ جیسے یہ کسی خفیہ کیمرے سے ریکارڈ کیا گیا ہے۔ حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے کبھی کبھی تم دونوں جزوی طور پر فریم سے آؤٹ بھی ہو جاؤ گے... حتیٰ صرف تمہارا بالائی یا نیچے کا دھڑ کیمرے میں نظر آئے گا۔ ہم باہر سے ابھرنے والی بے ڈھنگی آوازوں کو بھی "ڈبنگ" میں شامل کریں گے۔ بات سمجھ رہی ہو نا تم؟"

سویٹی عرف ایشوریا خاموش تھی۔ اس نے سر جھکا رکھا تھا۔ ڈائریکٹر نے غور سے اس کی طرف دیکھا پھر گرج کر بولا۔ "ابے، ٹسوے کیوں بہا رہی ہے؟ کس کا دیہانت ہو گیا ہے تیرے خاندان میں؟"

سویٹی ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے ڈائریکٹر کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ "پلیز راج صاحب... پلیز... مجھ سے یہ سب کچھ نہیں ہوگا۔ میں نہیں کرسکتی۔"

"کیوں نہیں کرسکتی... حرام زادی! کیوں نہیں؟ فلموں میں کام کرنے کے لیے نہیں آئی تھی یہاں؟ تجھے فلم میں ہی لے رہے ہیں نا۔"

"ایسی فلموں کے لیے نہیں آئی تھی۔ میں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔ پلیز! مجھے معاف کر دیں۔"

"کتے کی بچی! بات تو ایسے کر رہی ہے جیسے کسی مندر کی پوتر گوپی ہو۔ کیا کیا نہیں ہوا تیرے ساتھ؟ کتنے لوگ تیرے شریر کو شرابی کتوں کی طرح جھنجوڑتے رہے ہیں۔ اب یہ کیمرے کے سامنے ہو جائے گا تو کون سا آسمان ڈھے جائے گا۔"

"م... میرے لیے تو آسمان ہی ڈھے جائے گا جی۔ میری بدنامی کے اشتہار لگ جائیں گے۔ م... میں کیسے جاؤں گی پاکستان؟"

"تو نے اب وہاں جا کر کرنا بھی کیا ہے۔ یہیں پر تیری پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں جانے والا ہے۔ تیرے لیکھ چمکنے والے ہیں چندر مکھی۔" ڈائریکٹر راج نے دانت پیس کر کہا پھر میک اپ مین سے بولا۔ "چلو دوبارہ کرو اس کی لیپنگ۔ بیڑا غرق کر لیا ہے آنکھوں کا ٹسوے بہا کر۔"

اب سب کچھ واضح ہو رہا تھا۔ سویٹی عرف ایشوریا کو یہاں کسی عیاش کی شب رنگین کرنے کے لیے نہیں لایا گیا تھا۔ یہ اور ہی چکر تھا۔ اب وہ رو پیٹ رہی تھی اور ٹھیک ہی رو پیٹ رہی تھی۔ وہ دوسری لڑکی جو کار میں یہاں لائی گئی تھی اور جس نے کار میں سے نکلنے کی کوشش کی تھی، یقیناً اس کا معاملہ بھی یہی تھا۔

"اب کیا کرنا ہے؟" میں نے عمران کے کان میں سرگوشی کی۔

"کچھ بھی ہے، پاکستانی ہے۔ اس کو بچانا ہے۔" عمران بولا۔

اس سے پہلے کہ ہم مزید کچھ سوچتے یا کرتے، اندر کا منظر کچھ تبدیل ہوا۔ ڈائریکٹر راج کے سیل فون پر کال آ گئی۔ وہ کھڑکی کے قریب کھڑا تھا۔ اس کی آواز ہم تک صاف پہنچ رہی تھی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ "ہیلو۔"

پھر وہ ایک دم اٹین شین اور مؤدب ہو گیا۔ "جی سارو صاحب! میں بول رہا ہوں... جی جی... اوہ، یہ کیسے ہوا؟..." راج کے چہرے پر تاریکی سی پھیل گئی۔ وہ کچھ دیر تک دوسری طرف سے کی جانے والی بات سنتا رہا، تب پریشان لہجے میں بولا۔ "ٹھیک ہے سارو صاحب! میں پیک اپ کرواتا ہوں۔ او کے جی۔"

فون بند کر کے اس نے کھا جانے والی نظروں سے سویٹی کو دیکھا۔ تب اپنے کارندوں سے مخاطب ہو کر بولا۔ "پولیس کے چھاپے کی اطلاع ہے۔ جلدی نکلنا ہوگا یہاں سے، پندرہ منٹ کے اندر اندر۔ سامان سمیٹو فٹافٹ، گاڑیوں میں رکھو۔"

ایک دم کھلبلی سی نظر آئی۔ تمام کارندے مصروف ہو گئے۔ کلاس روم کا "سیٹ" آناً فاناً ختم کر دیا گیا۔ لائٹس، کیمرے، ساؤنڈ سسٹم سب کچھ اٹھا لیا گیا۔ چند ہی منٹ میں کلاس روم پھر سے ڈرائنگ روم نظر آنے لگا۔ سویٹی بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل تھی۔ خوش قسمتی سے ہم اپنی جگہ پر محفوظ کھڑے رہے۔ پورچ کی طرف گاڑیاں اسٹارٹ ہونے کی آوازیں آئیں۔ "میرا خیال ہے یہ راج یہیں رہے گا۔"

عمران ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ راج ابھی تک کمرے میں موجود تھا اور اطمینان سے ٹی وی لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ ایک ہٹا کٹا ملازم بھی اس کے آس پاس ہی موجود تھا۔

...گاڑیوں کی روانگی کے آٹھ دس منٹ بعد ہی پولیس اس کوٹھی میں آن موجود ہوئی۔ اندیشہ تھا کہ کوٹھی کا جائزہ لیتے ہوئے پولیس والے اس طرف بھی آ جائیں۔ ایسی صورت میں ہم پیچھے ہٹ کر کوٹھی کے پائیں باغ کی طرف نکل سکتے تھے۔ پولیس کے آنے کے فوراً بعد فربہ اندام راج اٹھ کر کسی دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اس

کمرے سے پولیس والوں اور راج کی مدھم آوازیں ہم تک پہنچتی رہیں۔ قریباً پندرہ بیس منٹ بعد ہم پر انکشاف ہوا کہ پولیس کوٹھی سے واپس جا رہی ہے۔ غالباً راج وغیرہ پولیس پارٹی کو مطمئن کرنے میں کامیاب رہے تھے۔ پولیس کی گاڑی واپس چلی گئی۔ بیرونی گیٹ بند ہونے کی آواز آئی۔ فربہ اندام گنجا راج پھر سے ڈرائنگ روم میں آن موجود ہوا۔ وہ اب کافی مطمئن نظر آ رہا تھا۔

اس نے ولایتی شراب کی بوتل کھولی۔ گلاس نکالا اور صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ ٹی وی پر کوئی تامل فلم چل رہی تھی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ کوٹھی میں راج کے سوا بس ایک دو ملازم ہی ہیں۔ عمران نے دبی آواز میں کہا۔ "چلو آؤ، ہدایت کار صاحب سے ہیلو ہیلو کریں۔"

ہم کھڑکی کے سامنے سے ہٹے اور گھوم کر اس حصے میں آئے جہاں سے ایک راہداری اندرونی حصے میں جاتی تھی۔ السیشین کتا برآمدے کی جالی کی دوسری جانب موجود تھا۔ اس نے ہمیں دیکھا لیکن شور مچانے کی کوشش نہیں کی۔ بس دوستانہ انداز میں دُم ہلاتا رہا۔ سنی سنائی پر شک و شبہ ہو سکتا ہے لیکن آنکھوں دیکھی کو کیونکر جھٹلایا جائے۔ ایرانی بلیوں کے بعد یہ کتا بھی عمران کی خداداد صلاحیت کا ٹھوس ثبوت فراہم کر رہا تھا۔

پستول عمران کے ہاتھ میں تھا۔ تاہم ہم دونوں چوکس تھے۔ ہمیں اندازہ ہوا کہ کچن میں کوئی موجود ہے۔ وہ دروازے کے بالکل پاس تھا اور کچھ گنگنا رہا تھا۔ عمران نے مجھے اشارہ کیا۔ میں تیزی سے اندر داخل ہوا اور ملازم پر جھپٹا۔ یہ وہی ہٹا کٹا شخص تھا جسے ہم نے کچھ دیر پہلے ڈرائنگ روم میں دیکھا تھا۔ میری کامیابی یہی تھی کہ میں اس شخص کو آواز نکالنے کا موقع نہ دوں اور میں کامیاب رہا۔ میں نے اس کی توانا گردن اپنے بازو میں جکڑی اور دوسرے ہاتھ سے اس کا منہ ڈھانپ دیا۔ اس نے چار پانچ سیکنڈ کے لیے بہت زور مارا پھر اسے پتا چل گیا کہ "کام بھاری" ہے۔ اس نے مزاحمت ترک کر دی اور ڈری ڈری نظروں سے عمران کو دیکھا۔ عمران نے پستول اس کے سر سے لگا دیا اور خاموش رہنے کی ہدایت کی۔ کچن کا دروازہ عمران پہلے ہی بند کر چکا تھا۔ چند سیکنڈ کے وقفے کے بعد جب اس شخص نے دوبارہ مزاحمت شروع کی تو عمران نے گھٹنے کی دو تین شدید ضربیں اس تنومند شخص کے پیٹ میں لگائیں اور اس کا دم خم ختم کر دیا۔

اگلے دو تین منٹ میں اس شخص نے وہی کیا جو ہم نے کہا۔ اس نے بتایا کہ پولیس واپس جا چکی ہے۔ کوٹھی میں راج صاحب اور اس کے سوا اور کوئی نہیں۔ وہ یہاں کچن میں راج صاحب کے لیے تکا بوٹی مائکروواوون میں تیار کر رہا تھا۔ اس کا نام نجیب تھا۔

ہمارے کہنے پر اس نے اوون بند کیا اور تکا بوٹی پلیٹ میں نکال لی۔ وہ ابھی کچی تھی۔ ہم اس پلیٹ سمیت راج کے پاس ڈرائنگ روم میں پہنچے۔ پلیٹ ملازم کے ہاتھ میں تھی۔ عمران پستول بدست اس کے پیچھے تھا۔ ہمارے اندر پہنچنے کے باوجود راج ہماری آمد سے باخبر نہیں ہوا۔ وہ ٹی وی دیکھ رہا تھا اور ہماری طرف اس کی پشت تھی۔ لرزتے کانپتے ملازم نے پلیٹ راج کے سامنے تپائی پر رکھ دی۔ گوشت تقریباً کچا تھا۔

راج نے پہلے حیرت سے گوشت کی طرف اور پھر ملازم کی طرف دیکھا۔ "اوئے، یہ اپنی ماں کا سر لایا ہے؟"

اچانک اسے احساس ہوا کہ گڑبڑ ہے۔ اس نے رخ پھیرا۔ عقب میں ہم تھے۔ راج کا چہرہ تاریک ہو گیا اور شراب کا گلاس اس کے ہاتھ میں ڈگمگا گیا... ہمارے چہرے نقاب کے پیچھے گم تھے۔ "کون ہو تم؟" اس نے سنبھل کر پوچھا۔

عمران قدرے بھاری آواز میں بولا۔ "تمہاری پھوپی کا اکلوتا بھائی ہوں۔ اب سمجھ لو کہ تمہارا کون ہوں... اور خبردار ہاتھ اپنی جیبوں سے دور رکھو۔ ورنہ گولی سیدھی سر میں جائے گی۔" وہ آخر میں پھنکارا۔

"ہاتھ سر سے اوپر کرو۔" میں نے حکم دیا۔

ملازم نجیب نے تو فوراً عمل کیا مگر راج کام دکھا گیا۔ اس نے تیزی سے شیشے کی وزنی میز عمران پر الٹ دی۔ وہ شاید دو تین گنا تیزی بھی دکھاتا تو اپنا مقصد حاصل نہ کر سکتا۔ عمران نے بہ آسانی خود کو میز کی زد سے بچایا۔ فربہ اندام راج نے کافی پھرتی دکھائی اور عمران پر جھپٹا لیکن راستے میں ہی اس کی ٹھوکر کھا کر دیوار سے جا ٹکرایا۔

میں نے نجیب کو اور عمران نے راج کو سنبھال لیا۔ پہلے ایک آدھ منٹ میں دونوں نے مزاحمت کی لیکن پھر ان کی وہ دھتائی ہوئی جواب تک نہ ہوئی ہوگی۔ راج کی کلائی ٹوٹ گئی اور ملازم نجیب کے ناک منہ سے پرنالے کی طرح خون بہنے لگا۔ وہ دونوں فرش پر گرے پڑے تھے۔ ٹی وی کی اسکرین بھی چکنا چور ہو چکی تھی۔ عمران نے راج کو گریبان سے پکڑ کر صوفے پر بٹھایا۔ پھر نجیب کو حکم دیا کہ وہ فرش پر بکھری ہوئی تکا بوٹی اکٹھی کر کے پلیٹ میں رکھے۔ چار و ناچار نجیب نے ہدایت پر عمل کیا۔ نجیب کا بالائی لباس

مکمل طور پر تار تار ہو چکا تھا۔ اس کے ورزشی جسم پر بڑے بے ہودہ ٹیٹو بنے ہوئے تھے۔ یہ ٹیٹو ان لوگوں کے کاروبار سے مکمل میل کھاتے تھے۔

عمران نے تکا بوٹی راج کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''کھاؤ اسے۔''

راج کراہت کا اظہار کرتا رہا لیکن جب عمران نے پستول اس کے سر پر رکھا تو اس نے عمران کو خونی نظروں سے دیکھتے ہوئے ایک بوٹی منہ میں رکھی۔ عمران نے دانت پیس کر کہا۔ ''کچا گوشت تو تمہیں بڑا پسند ہے۔ ہر وقت اس گوشت میں دھنسے رہتے ہو۔ اب ایسے برے منہ کیوں بنا رہے ہو؟ لڑکیوں کو نوچ سکتے ہو تو یہ گوشت بھی کھا سکتے ہو۔ کھاؤ ورنہ کھوپڑی اڑا دوں گا۔''

وہ ایک دم بھڑک اٹھا۔ اس نے بوٹی تھوک دی اور دیوانہ وار عمران پر جھپٹا۔ اس نے عمران کے سینے پر ٹکر رسید کی پھر اس کے ہاتھوں سے پستول چھیننا چاہا۔ عمران نے یہ کوشش ناکام بنائی اور اس کی گردن اپنے بازو کے شکنجے میں جکڑ لی۔ پستول اس کے سر سے لگا دیا۔ ''ٹھنڈے ہو جاؤ ورنہ بالکل ٹھنڈا کر دوں گا۔'' عمران گرجا۔

لیکن وہ ٹھنڈا کہاں ہوا۔ مغلظات بکتا رہا اور بڑی شدت سے ہاتھ پاؤں چلاتا رہا۔ عمران نے ایک بار پھر اسے وارننگ دی... اور پھر گولی چلا دی۔ گولی اس کے سر میں لگی تھی۔ ایک سیکنڈ میں راج نے ہاتھ پاؤں پھینک دیے۔ اس کی دیوانی جراحت یوں ختم ہوئی جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔ سائلنسر لگے پستول سے زیادہ آواز بھی نہیں آئی تھی۔ عمران نے بے پروائی سے اس کی لاش فرش پر پھینکی اور اب پستول ملازم نجیب کے سر پر رکھ دیا۔ ''ہاں تمہیں بھی ٹھنڈا ہونا ہے یا کچھ بکنا ہے؟''

نجیب کا چہرہ زرد ہو چکا تھا۔ اس کی پھٹی پھٹی نظریں اپنے باس ہدایت کار راج کی لاش پر مرکوز تھیں۔ ساری زندگی ایکشن اور کٹ کہنے والے کی اپنی زندگی کا سین پہلے ہی ٹیک میں اوکے ہو چکا تھا۔

اگلے دس پندرہ منٹ میں اس نجیب نامی ملازم نے وہ سب کچھ بتایا جو ہم نے پوچھا اور جو اسے معلوم تھا۔ اس کی باتوں سے ایک انکشاف یہ بھی ہوا کہ وہ ایک بنگلہ دیشی مفرور ہے اور پچھلے دس بارہ برس سے انڈیا میں رہ رہا ہے۔ بہر حال اس کی تصدیق نہ ہو سکی۔

عمران نے اس سے پوچھا۔ ''ایشوریا کی ہم شکل پاکستانی لڑکی اب کہاں ہے؟''

وہ بولا۔ ''میرا خیال ہے اسے اب گولڈن بلڈنگ لے گئے ہیں۔''

''یہ کون سی جگہ ہے؟''

''یہ سارو صاحب کا پروڈکشن ہاؤس ہے۔ ٹی وی ڈراموں اور ٹیلی فلموں وغیرہ کی شوٹنگ ہوتی ہے۔ وہاں سے ایکسٹرا بھی سپلائی کیے جاتے ہیں۔''

''یہ سارو کون ہے؟''

''بڑے باس ہیں۔ فلمیں بناتے ہیں۔''

''ایسی ہی فلمیں جیسی یہاں بننے لگی تھی؟''

''ہر طرح کا کام ہوتا ہے گولڈن بلڈنگ میں۔''

''تم بھی جاتے ہو گولڈن بلڈنگ؟''

''نہیں، وہاں ہر کسی کو جانے کی اجازت نہیں۔ کوئی خاص کام ہو تو پھر ہی بلایا جاتا ہے۔ میں بس ایک دو بار ہی گیا ہوں۔ لیکن، اندر کی جانکاری مجھے بالکل نہیں۔''

''یہ سارو صاحب اس وقت کہاں ہوگا؟''

''میرا آئیڈیا ہے کہ گولڈن بلڈنگ میں ہی ہوں گے۔ ابھی کچھ دیر پہلے راج صاحب کو ان کا فون وہیں سے آیا تھا۔'' یہ الفاظ کہتے ہوئے نجیب نے ایک بار پھر ڈری ڈری نظروں سے راج کی لاش دیکھی۔ لاش کے سر سے بہنے والا خون کمرے کی دہلیز تک جا رہا تھا۔

''اگر ہم گولڈن بلڈنگ میں جانا چاہیں تو پھر؟''

''اگر آپ کا مطلب ہے کہ آپ یہاں کی طرح وہاں بھی گھسنا چاہتے ہیں تو یہ کافی مشکل ہے۔ وہاں بہت سے گارڈز ہوتے ہیں، سی سی ٹی وی کیمرے بھی لگے ہوئے ہیں۔ راج صاحب کی ہتھیا کے بعد تو وہاں بالکل ریڈ الرٹ ہو جائے گا۔''

''اس کی فکر نہ کرو۔ راج کی اور تمہاری موت کا پتا ابھی کسی کو نہیں چلے گا۔''

نجیب کے چہرے پر پھر ہلدی پھر گئی۔ وہ لرزاں آواز میں بولا۔ ''میں بس ایک نوکر ہوں۔ جو حکم ملتا ہے، وہی کرتا ہوں۔ اس دھندے میں پھنس چکا ہوں۔ نکلنا چاہوں تو بھی نکل نہیں سکتا۔''

''ان فلموں میں کام بھی کرتے ہو؟'' میں نے اس کے کسرتی جسم پر بنے ٹیٹوز دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کی نگاہیں جھک گئیں۔ ''ج... جی ہاں... کبھی کبھی۔''

''اچھی نوکری ہے۔ عیش کے لیے پیسا اور پیسے کے لیے عیش۔ تمہیں، تمہارے ہدایت کار کے پاس پہنچا کر ہمیں

یقیناً کوئی دکھ نہیں ہوگا۔'' عمران نے ٹریگر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

نجیب کا دم خم بالکل ختم ہو چکا تھا۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر دی... ''م... میں مرنا نہیں چاہتا۔ آپ جو کہیں گے، میں کروں گا۔''

''سارو کے بارے میں اور کیا جانتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''سنا ہے وہ چندی گڑھ کے رہنے والے ہیں۔ سکھ ہیں لیکن داڑھی پگڑی وغیرہ نہیں ہے۔ ممبئی کے بڑے بڑے لوگوں سے ان کے تعلقات ہیں۔ ان میں فلمی لوگ بھی شامل ہیں اور فلموں سے باہر کے بھی۔ وہ چار پانچ سال پہلے ممبئی آئے تھے اور اب زیادہ تر یہیں رہتے ہیں۔ عام لوگوں سے بہت کم ملتے ہیں۔ میں نے بھی پچھلے چار پانچ سالوں میں انہیں تین چار بار ہی دیکھا ہوگا۔''

''جاوا کو جانتے ہو؟'' عمران نے پوچھا۔

وہ چونکا پھر سنبھل کر بولا۔ ''انہیں کون نہیں جانتا جی۔''

''جاوا اور اس سارو صاحب میں کیا تعلق ہے؟''

''جاوا صاحب، ممبئی کے چند بڑے ڈانوں میں سے ایک ہیں۔ سارو صاحب ایسے تمام ''بھائی لوگوں'' سے بنا کر رکھتے ہیں۔ جاوا صاحب سے بھی ان کا ملنا جلنا ہے۔''

''ملنا جلنا ہے یا کاروبار میں ساجھے داری ہے؟'' عمران نے زور دے کر پوچھا۔

''میں ایک چھوٹا ملازم ہوں۔ م... مجھے ٹھیک سے تو پتا نہیں۔ ہاں... کبھی کبھی کوئی لڑکی جاوا صاحب کے ذریعے بھی سارو صاحب تک پہنچتی ہے۔ یہ عام طور پر بڑی ایکٹرسوں کی ہم شکل لڑکیاں ہوتی ہیں۔''

''یہ ایشوریا رائے کی ہم شکل، کس کے ذریعے آئی ہے؟''

''مجھے اس کا بھی پتا نہیں۔ بس راج صاحب نے اتنا بتایا تھا کہ یہ پاکستانی مال ہے۔'' راج کا ذکر کرتے ہوئے نجیب نے ایک بار پھر ڈری ڈری نگاہ اس کی خونچکاں لاش پر ڈالی۔

''اس لڑکی کے علاوہ کوئی اور پاکستانی بھی یہاں ہے؟''

''پہلے تو کوئی نہیں تھی، آج کل کا پتا نہیں۔ سنا ہے کہ انڈین فلموں میں کام ملنے کا جھانسا کھا کر کئی پاکستانی اور بنگلہ دیشی فنکارائیں یہاں پہنچ رہی ہیں۔ ان میں سے کچھ کو تو واقعی کام مل جائے گا۔ باقی خراب ہو جائیں گی۔''

عمران نے سگریٹ سلگانے کے لیے جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن پھر فوراً ہی سمجھ گیا کہ وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ ہم دونوں کے چہروں پر ماسک تھے۔ وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے نجیب سے مخاطب ہوا۔ ''ہم آج رات اس گولڈن بلڈنگ کی سیر کرنا چاہتے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے... یہ کس طرح ممکن ہے؟''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا جی۔ اگر تو آپ کی فلم لائن کے کسی بڑے سے واقفیت ہے تو کوئی طریقہ نکل سکتا ہے...''

''ہماری کسی بڑے چھوٹے سے واقفیت نہیں۔'' میں نے کہا۔

عمران بولا۔ ''اچھا، اس بات کو ایک اور طریقے سے کرتے ہیں۔ میں تمہیں پورا یقین دلاتا ہوں کہ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تمہیں تمہارے اس کمینے ڈائریکٹر کے ساتھ لمبا لٹا کر یہاں سے جاؤں گا اور یہ بات سو فیصد طے ہے۔ تمہیں صرف ایک صورت میں رعایت مل سکتی ہے۔ تم ہمیں کسی طرح اس گولڈن بلڈنگ کے اندر پہنچا دو۔ بہتر ہے کہ تم یوں سمجھو کہ تمہیں خود اس بلڈنگ میں گھسنا ہے اور اپنی جان بچانی ہے۔''

''میں قسم کھاتا ہوں...''

''قسم کھانے سے کچھ نہیں ہوگا۔'' عمران نے سختی سے اس کی بات کاٹی۔ ''میں تمہیں سوچنے کے لیے صرف دس منٹ دیتا ہوں۔ اس کے بعد بغیر کسی وارننگ کے تمہیں شوٹ کر دوں گا۔'' عمران نے دھکا دے کر باڈی بلڈر نجیب کو کمرے کے باتھ روم میں پھینک دیا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ نجیب کی اچھی طرح تلاشی لی جا چکی تھی۔ اس کے پاس کوئی ایسی شے نہیں تھی جس سے وہ کسی سے رابطہ کر سکتا۔

''کیا تم واقعی اسے مار دو گے؟''

''اگر مدد کر سکنے کے باوجود اس نے مدد نہیں کی تو مار بھی دیں گے۔ خس کم جہاں پاک۔ اس کے جسم پر بنے ہوئے ٹیٹو دیکھے ہیں تم نے۔ ویسے مجھے امید ہے کہ وہ اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو جائے گا۔''

''یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو؟''

''یار چھٹی حس بھی کوئی چیز ہوتی ہے اور میرے پاس دو ڈھائی حسیں اور بھی ہیں۔ آخر چڑیا ہوں میں... اور وہ بھی ٹی وی چینل کا۔ ہم اڑتی چڑیا کے پر گنتے ہیں... ویسے یار! ایک بات میری سمجھ میں کبھی نہیں آئی۔ اڑتی چڑیا کے پر کیوں گنے جاتے ہیں، اڑتے چڑے کے کیوں نہیں گنے جاتے۔ جل بن مچھلی ہی کیوں ہوتی ہے، مچھلا کیوں نہیں

ہوتا۔ اللہ میاں کی گائے ہی کیوں ہوتی ہے، اللہ میاں کا بیل کیوں نہیں ہوتا۔ محاورے بنانے والوں کا زیادہ زور بھی صنفِ نازک پر ہی چلا ہے...“ ہم باتیں کر رہے تھے اور ماسک بدستور ہمارے چہروں پر موجود تھے۔

اسی دوران میں کتے کی آواز آئی۔ وہی السیشین جسے عمران نے پلک جھپکتے میں رام کر لیا تھا۔ وہ کسی طرح اندر آ گیا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ کمرے میں آ گیا اور ڈائریکٹر راج کی لاش کے خوفناک منظر پر توجہ دیے بغیر عمران کے قدموں میں لوٹ لگانے لگا۔ عمران بولا۔ ”دیکھا نا میری ساڑھے آٹھ حسیات کا کمال۔ اس کو کہتے ہیں ہاتھ کنگن کو آرسی کیا... لو دیکھو اس محاورے میں پھر صنفِ نازک آ گئی... آرسی۔“

”آرسی شیشے کو یعنی آئینے کو کہتے ہیں۔“

”تو یار آئینے سے زیادہ نازک اور کون ہوگا؟ آرسی کی بوتل کو ہی دیکھو، ایک سیکنڈ میں ٹوٹتی ہے...“ وہ بے تکی ہانک رہا تھا۔

اسی دوران میں اندر سے نجیب دروازہ کھٹکھٹانے لگا اور عمران کو چپ ہونا پڑا۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ عمران نے پستول ہاتھ میں لے لیا۔ نجیب کا چہرہ پسینے سے تر تھا۔ وہ ایک دم ٹوٹا ہوا نظر آتا تھا۔ اس نے اپنا خون آلود منہ اچھی طرح دھو لیا تھا پھر بھی نتھنوں اور ہونٹوں سے خون کا رساؤ موجود تھا۔

اس نے عمران سے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ عمران نے صرف ایک وارننگ کے بعد راج کو گولی مار دی تھی اور نجیب کو ایک وارننگ مل چکی تھی۔ وہ عمران کے اشارے پر کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا۔ ”یہ جگہ پولیس کی نظروں میں آ گئی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اب یہاں شوٹنگ نہیں ہوگی۔ سارو صاحب کو کوٹھیوں کی کون سی کمی ہے۔ شوٹنگ کا کچھ سامان ابھی یہیں پڑا ہے۔ کچھ دیر میں پروڈکشن ہاؤس... میرا مطلب ہے گولڈن بلڈنگ سے لوڈر سامان چھوڑ کر واپس آئے گا اور باقی کا سامان لے جائے گا۔ یہ کلاس روم کا فرنیچر اور دوسری چیزیں ہیں۔ آپ کسی طرح اس لوڈر میں سوار ہو جائیں، گولڈن بلڈنگ میں پہنچ جائیں گے۔“

اسی دوران میں ڈائریکٹر راج کے موبائل کی بیل ہونے لگی۔ موبائل چھوٹی میز پر دھرا تھا۔ عمران نے نجیب کو اشارہ کیا۔ اس نے کال ریسیو کی۔ ”جی ہاں... جی ہاں... وہ ذرا باتھ روم میں ہیں۔ ٹھیک ہے... آپ بھیج دیں۔ ہم یہیں ہیں۔ او کے... او کے...“

”کون تھا؟“ عمران نے پوچھا۔

”گولڈن بلڈنگ کے گودام کا منیجر۔ کہہ رہا تھا کہ لوڈر واپس آ رہا ہے۔“

”کتنی دیر میں پہنچ جائے گا؟“

”زیادہ سے زیادہ بیس منٹ میں۔“

”ٹھیک ہے۔ ہمیں کچھ اسلحہ چاہیے۔ کوئی چیز مل جائے گی یہاں سے؟“

نجیب کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد بولا۔ ”یہ کوٹھی راج صاحب کے بہنوئی کی ہے۔ وہ آج کل انڈیا سے باہر ہے۔ میرا خیال ہے کہ کم از کم ایک رائفل آپ کو یہاں سے ضرور مل جائے گی۔“

نجیب کی مدد سے ہم نے کوشش کی اور ایک بیڈ روم کی الماری میں سے ایک کے بجائے دو رائفلیں برآمد ہو گئیں۔ دونوں چھوٹی نال والی رشین رائفلیں تھیں۔ ایک آٹو میٹک دوسری سیمی آٹو میٹک۔ فالتو راؤنڈز بھی موجود تھے۔

کچھ ہی دیر بعد مین گیٹ کی طرف سے ہارن کی آواز سنائی دی۔ ہم سب کچھ پہلے ہی طے کر چکے تھے۔ نجیب نے اندر ہی سے بٹن دبا کر مین گیٹ کھول دیا۔ ہم نے کھڑکی میں سے دیکھا، لوڈر اندر آ کر پورچ میں رک گیا۔ تنومند ڈرائیور اترا۔ وہ شکل سے ہی چھٹا ہوا بدمعاش لگتا تھا۔ ممبئی کی جرم زدہ گلیوں کا مخصوص چہرہ۔ رنگ سانولا، کانوں میں مرکیاں، شوخ کلر شرٹ۔ نجیب نے کھڑکی میں سے اسے آواز دی۔ ”ادھر آ جاؤ موہن۔“

”کہاں ہو؟“ اس نے کہا اور جھومتا ہوا سا کمرے کی طرف بڑھا۔ وہ بے خبر تھا کہ یہاں ایک بڑی مصیبت اس کا انتظار کر رہی ہے اور اس کی آج کی رات سخت تکلیف اور اذیت کا شکار ہونے والی ہے۔ وہ کمرے میں آیا اور منظر دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ نجیب دیوار کے ساتھ لرزہ براندام کھڑا تھا۔ عمران کے ہاتھ میں رائفل تھی اور فرش پر راج کی بے گوروکفن لاش پڑی تھی۔

لاش دیکھ کر موہن بری طرح بدکا اور اضطراری کیفیت میں واپس بھاگا۔ میں راستے میں تھا۔ میں نے اسے اڑنگا لگایا اور وہ لڑھک کر کمرے کے دروازے تک پہنچ گیا۔ میں اس کی پشت پر سوار ہو گیا اور اس کی توانا گردن گرفت میں لے لی۔ اس نے پکارنے کی کوشش کی لیکن آواز گلے میں ہی گھٹ گئی۔ اگلے پندرہ بیس سیکنڈ میں اس نے بہت زور لگایا لیکن میں نے اسے ٹس سے مس نہیں ہونے دیا۔ بندہ سمجھ دار تھا۔ اسے پتا چل گیا کہ یہاں اس کی کوئی پیش نہیں چلنے والی۔ زیادہ پھڑکے گا تو کوئی ہڈی تڑوا بیٹھے گا۔ اس نے ہار

مان لی۔ میں نے اسے گریبان سے کھینچ کر اٹھایا اور دیوار کے ساتھ بٹھا دیا۔ اس نے کھل نائیک کے انداز میں لمبے بال رکھے ہوئے تھے بلکہ پورا حلیہ ہی ویسا بنا رکھا تھا۔ عمران نے مجھ سے کہا۔ ”دیکھو یار! اس کی چولی کے پیچھے کیا ہے؟“

میں نے اس کی تلاشی لی۔ کچھ دیگر اشیا کے علاوہ ایک شکاری چاقو بھی برآمد ہوا۔ یہ شخص اب وحشت زدہ نظروں سے بار بار ڈائریکٹر راج کی لاش کو دیکھ رہا تھا۔ عمران نے رائفل اس کے سر سے لگاتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”دیکھ پیارے... ہمارے سر پر خون سوار ہے۔ آج رات دو بندے اس ڈائریکٹر صاحب کے علاوہ بھی ٹپکا چکے ہیں۔ جو کہتے ہیں چپ چاپ کرتا جا ورنہ کھل نائیک کے بجائے کل نائیک ہو جائے گا۔ یعنی ماضی کا حصہ بن جائے گا...“

بندہ واقعی معاملہ فہم تھا۔ سمجھ گیا کہ ہم ان لوگوں میں سے ہیں جو کہنے کے مطابق کر گزرتے ہیں... قریباً دس منٹ بعد ہم نجیب بنگالی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے باتھ روم میں بند کر چکے تھے اور دیگر سامان کے ساتھ لوڈر کے عقبی حصے میں بیٹھے تھے۔ لوڈر کے کیبن اور پچھلے حصے کے درمیان ایک مستطیل شیشہ تھا اور اس میں سے ہمیں ڈرائیور موہن کی ہر حرکت نظر آ رہی تھی۔ موہن جانتا تھا کہ آٹو میٹک رائفل کی نال اس کی طرف اٹھی ہوئی ہے اور اس کی کوئی مزاحمتی کوشش اس کے جیون کا چراغ گل کر سکتی ہے۔ کوٹھی کا گیٹ ہم پہلے ہی کھول چکے تھے۔ عمران نے موہن سے کہا۔ ”انجن اسٹارٹ کر... اور چل نائیک۔“

لوڈر کوٹھی میں سے نکل آیا۔ میں نے ریموٹ کنٹرول کے ذریعے گیٹ بند کر دیا۔

اب رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ ممبئی کی سڑکوں پر رونق تھی۔ بازاروں میں آمدورفت تھی۔ سینماؤں کے بڑے بڑے ہورڈنگز جگمگا رہے تھے۔ سمندر کی طرف سے ایک نم ہوا چل رہی تھی۔ یہ کراچی سے ملتی جلتی ایک شب تھی... اور اس شب کے سینے میں ایک ہلچل پروان چڑھ رہی تھی۔

قریباً بیس منٹ بعد ہم مین روڈ سے ایک بغلی سڑک پر مڑے۔ دور ہی سے ہمیں گولڈن بلڈنگ نظر آ گئی۔ اس کی پیشانی پر ”سارو پروڈکشن“ کے الفاظ جگمگا رہے تھے۔ اس جگمگاہٹ کے پیچھے جو کچھ تھا، وہ ہمیں تھوڑی دیر بعد معلوم ہونے والا تھا۔ ہم دو چوکی گارڈز کے درمیان سے گزرے اور عمارت کے وسیع احاطے میں پہنچ گئے۔ ایک چھوٹا سا چکر کاٹ کر ہم عمارت کے پچھواڑے آئے اور گودام کے اونچے گیٹ میں داخل ہو گئے۔ ہم نے لوڈر کے اندر سے ہی دیکھ لیا۔ گودام میں گیٹ کیپر کے علاوہ ایک مسلح گارڈ بھی موجود تھا۔ اور یہ کوئی عام گارڈ نہیں تھا۔ ”خطرناکی“ اس کے کرخت چہرے پر درج تھی۔ عمران نے سرگوشی کی۔ ”گیٹ کیپر تمہارا... گارڈ میرا... لیکن پہلے اس کھل نائیک کو کل نائیک بنانا ہے، یعنی اس کا کل کھڑکانا ہے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ لوڈر رک چکا تھا۔ عمران نے کیبن کی مستطیل کھڑکی کا شیشہ ہٹایا اور پستول کی ایسی جچی تلی ضرب موہن کی کنپٹی پر لگائی کہ میں ششدر رہ گیا... جیسے کوئی جادو ہوا تھا۔ موہن بے آواز ڈھے گیا۔ عمران نے اسے پھر سے سیدھا کر کے بٹھا دیا۔ گارڈ گھوم کر کھڑکی کی طرف آیا۔ غالباً وہ ڈرائیور موہن سے بات کرنا چاہتا تھا۔ میں اس وقت تک لوڈر سے نیچے اتر چکا تھا۔ جب گارڈ قدرے حیرت سے ڈرائیور موہن کو دیکھ رہا تھا میں نے عقب سے اسے چھاپ لیا۔ دوسری طرف عمران نے دراز قد گیٹ کیپر کو دبوچ لیا۔ یہ مختصر جدوجہد فقط چند سیکنڈ ہی جاری رہی۔ میں نے تنومند گارڈ کا سر زور سے ایک ستون سے ٹکرایا۔ اس نے اپنا آپ ڈھیلا چھوڑ دیا۔ ستون کی دوسری ضرب نے اسے میرے ہاتھوں میں لٹکا دیا۔ میں نے اسے گھسیٹ کر ایک طرف ڈال دیا۔ خلافِ توقع گیٹ کیپر نے زیادہ مزاحمت کی مگر عمران جیسے مدمقابل سے چھٹکارا پانا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ عمران نے اس کی گردن یوں اپنے بازو میں جکڑی تھی کہ اس کے لیے آواز نکالنا ناممکن ہو گیا تھا۔ عمران اسے گھسیٹ کر لوڈر کے اندر لے آیا۔

میں نے گودام کا گیٹ اندر سے بند کر دیا تھا۔ میں لوڈر کے اندر گیا تو عمران نے گیٹ کیپر کو فرش پر بٹھا رکھا تھا اور اس کے سر پر سائلنسر لگا پستول تان رکھا تھا۔ گیٹ کیپر نے اپنا نام سرجیت کمار بتایا۔ وہ گیٹ کیپر اور اسٹور کیپر ہونے کے علاوہ گولڈن بلڈنگ کے گارڈز کا انچارج بھی تھا۔ اس کے مطابق بگ باس سارو صاحب گولڈن بلڈنگ میں ہی موجود تھے۔ وہ آج شام ہی دہلی سے یہاں تشریف لائے تھے۔ سرجیت سے ہماری گفتگو کے دوران میں ہی اس کے موبائل کی بیل ہونے لگی۔ عمران کے اشارے پر سرجیت نے کال سنی۔ اس کا انداز مؤدب تھا۔ اس سے کچھ کہا گیا جس کے جواب میں اس نے کہا کہ وہ روی صاحب کو گارڈ کے ساتھ چھوٹے ڈرائنگ روم میں بھیجتا ہے...

اس نے فون بند کیا تو عمران نے اسٹور کیپر سرجیت سے پوچھا۔ ”یہ روی صاحب کون ہے؟“

وہ بولا۔ ”ایک بڑا پروڈیوسر ہے۔ آج کل سخت مشکل

میں ہے۔ اسی سلسلے میں سارو صاحب سے ملنے آیا ہے۔ سارو صاحب نے اسے چھوٹے ڈرائنگ روم میں بلایا ہے۔''

اس کے بعد عمران کی اجازت سے اسٹور کیپر سرجیت نے کسی گارڈ ارشد کو فون کیا اور اس سے کہا کہ وہ سیٹھ روی پرشاد صاحب کو چھوٹے ڈرائنگ روم میں باس کے پاس پہنچا دے۔ اس نے فون بند کیا تو عمران نے پوچھا۔ ''کیا موت پڑی ہوئی ہے اس سیٹھ روی پرشاد کو؟''

''بس لین دین کا معاملہ ہے۔ سیٹھ روی صاحب نے باس سے کوئی لڑکی منگوائی تھی شوٹنگ کے لیے۔ اس لڑکی کو حفاظت سے واپس بھیجنا سیٹھ جی کی ذمے داری تھی لیکن وہ لڑکی کہیں نکل گئی۔ اب اسی کا ''سیاپا'' ہے۔''

''سیاپا ہے؟''

''باس لڑکی مانگ رہا ہے یا اس کے بدلے میں روپڑا۔ جاوا صاحب کو تو جانتے ہوں گے آپ۔ فلم لائن کے ایسے سارے ''لیٹے'' وہی ''سیٹل'' کرواتے ہیں۔ باس نے جاوا صاحب سے شکایت کر دی ہے اسی لیے سیٹھ روی صاحب بھاگا بھاگا پھر رہا ہے۔''

''لڑکی کون تھی؟'' میں نے پوچھا۔

اس کے جواب میں اسٹور کیپر سرجیت نے جو کچھ بتایا، اس سے سارا واقعہ سامنے آگیا۔

ہمارے اندازے کے عین مطابق سارو پروڈکشن سے فلم اسٹوڈیوز والوں کو ایکسٹرا بھی سپلائی کیے جاتے تھے۔ ''سارو پروڈکشن'' سے ایک خاص کام بھی کیا جاتا تھا اور وہ یہ کہ فلم میکرز کی ڈیمانڈ کے مطابق انہیں بہ وقت ضرورت مشہور اداکاروں کے ہم شکل بھی مہیا کیے جاتے تھے۔ ایسے لوگوں کو مشکل مناظر میں ڈپلی کیٹس کے طور پر استعمال کرنے کا رواج ہمیشہ سے موجود ہے۔ کچھ دنوں پہلے ایک معروف ہیروئن کو اپنے ہیرو کمل ہاسن کے ساتھ کچھ جذباتی رومانی مناظر فلمانے تھے۔ ایک دو شاٹس ایسے تھے جن کے لیے ہیروئن بالکل تیار نہیں تھی۔ اس مسئلے کے حل کے لیے سارو صاحب سے رابطہ کیا گیا۔ انہوں نے ایک ایسی لڑکی سیٹھ روی کو دی جو اسی نوّے فیصد ہیروئن سے ملتی تھی اور بیڈروم کی نیم تاریکی میں فلمائے جانے والے مناظر کے لیے بالکل فٹ تھی۔ معقول معاوضہ طے ہو گیا لیکن شوٹنگ کے فوراً بعد وہ لڑکی کہیں فرار ہو گئی۔ اب یہ اسی کا چکر چل رہا تھا۔

سرجیت نے ڈھکے چھپے لفظوں میں یہ اعتراف بھی کیا کہ گولڈن بلڈنگ میں دیگر دھندوں کے علاوہ فحش فلموں کی میکنگ بھی ہوتی ہے۔

ہم دونوں بڑے خطرناک موڈ میں تھے، خاص طور سے عمران... اگلے پانچ دس منٹ کے اندر عمران نے سرجیت کا وہی حال کیا جو نجیب بنگالی کا کیا تھا۔ سرجیت کو تھوڑے بڑے پرنیل پڑ چکے تھے اور پیٹ میں شدید ضربیں لگی تھیں۔ وہ کسی معمول کی طرح ہمارا ہر کہا ماننے کو تیار تھا۔ اس کے پاس ایک ایسے دروازے کی چابی تھی جو گودام کے عقب سے اندرونی عمارت کے پچھواڑے میں کھلتا تھا۔ سرجیت ہمیں اس دروازے سے گزار کر ایک خالی کوریڈور میں لے آیا۔ میرے ہاتھوں میں رائفل اور عمران کے پاس سائلنسر والا پستول تھا۔ عمران والی رائفل اس کے کندھے سے جھول رہی تھی۔ ہمارے چہروں پر ماسک تھے اور ہم ہر طرح کی صورت حال کے لیے یکسر تیار تھے۔ سرجیت جانتا تھا کہ وہ ہر لحظہ عمران کے پستول کی زد میں ہے۔

خیریت گزری کہ ہمیں اس طویل کوریڈور میں آیا بالکل تن تنہا شخص کے سوا اور کوئی نظر نہیں آیا، ورنہ ہمیں گولی چلانی پڑتی۔ تن شرابی نے ہمارا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا۔ ہم ایک حال نما کمرے سے گزرے۔ یہاں ایک لڑکا، لڑکی گٹار تھامے میوزک ترتیب دے رہے تھے۔ ہم ان سے کچھ فاصلے سے گزرے۔ انہوں نے یا تو ہمارے ماسک والے چہرے دیکھا ہی نہیں یا یہ سمجھے کہ ہم یہاں کسی سیٹ پر شوٹنگ میں مصروف ہیں۔

سرجیت ہمیں ایک وسیع دفتر میں لے آیا۔ دفتر کی شان شوکت مرعوب کر دینے والی تھی۔ یہاں مدھو بالا سے لے کر کرشمہ کپور تک اور بھارت بھوشن سے لے کر سنجے دت تک بہت سے اداکاروں کے پورٹریٹ سجے ہوئے تھے۔ حالانکہ جس قسم کے کام یہاں ہوتے تھے، ان اداکاروں سے اس پروڈکشن ہاؤس کا کوئی تعلق نظر نہیں آتا تھا۔ دفتر کے ایک حصے میں بار اور دوسرے میں سی سی ٹی وی کیمروں کے مانیٹر تھے۔ غالباً کروڑوں روپیا اس دفتر کی آرائش پر ہی صرف کر دیا گیا تھا... اور یہ چندی گڑھ کے سردار سارو کا مسکن تھا جس نے شکلوں کی مشابہت کو ایک بڑے کاروبار کی شکل دے رکھی تھی۔ سارو اس وقت دفتر میں موجود نہیں تھا۔

سرجیت کمار ہماری دیدہ دلیری پر حیران تھا۔ اسے بھی لگ رہا تھا کہ ہم شیر کی کچھار میں گھس آئے ہیں اور اپنے انجام سے قطعی بے خبر ہیں۔ اسی دوران میں ساتھ والے کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ کسی کے گرجنے برسنے کی آواز آئی۔ ''بکواس نہ کر روی صاحب! میں سوگند کھاتا ہوں۔ میری کڑی نہ ملی تو تیری دس سال کی چھوکری کو

تجھ سے لے کر آؤں گا۔ اپنے پیو کا نہیں جو اس کو گھنگرو نہ پہنا دوں تو... روپا سوسائٹی کے ولایتی انگلش اسکول وچ پڑھتی ہے نا وہ؟ بس وہاں سے گھر واپس نہیں جائے گی۔ سیدھی اِدھر آئے گی۔''

وہ پتا نہیں کس کس کا نام لے کر گالیاں بکنے لگا۔ کسی دوسرے شخص نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے سر کو جیسے ہوا چڑھی ہوئی تھی۔

''کون ہے یہ؟'' عمران نے سرگوشی میں سرجیت سے پوچھا۔

''یہی سارو صاحب ہیں۔ سیٹھ روی پرشاد پر برس رہے ہیں۔ وہی لین دین کا جھگڑا ہے...''

ایک اور آواز ابھری۔ ''سارو بھائی! تم حد سے بڑھ رہے ہو۔ مجھے جاوا صاحب کا خیال ہے۔ میں لڑنا نہیں چاہتا...''

''جاوا صاحب کو رکھو ایک طرف۔ تم نے جو توپ چلانی ہے چلاؤ۔ میں ویکھدا (دیکھتا) ہوں کون مائی دا لال یہاں سے پیسے دیے بغیر جاندا ہے... لتیں چیر دوں گا۔''

''پیسے نہ دینے کی بات کون کر رہا ہے۔ دے تو رہا ہوں پیسے۔'' دوسرے شخص نے شکست خوردہ آواز میں کہا۔

یقیناً یہی روی پرشاد تھا۔ وہ بھی کوئی معمولی شخص نہیں ہوگا لیکن یہاں بھیگی بلی بنا ہوا تھا۔

''مجھے ابھی کے ابھی چاہیے دے نے... اسی تھاں پر۔'' سارو گرجا۔

پتا نہیں کیوں اس کی آواز مجھے کچھ سنی ہوئی سی لگی۔ شاید یہ لہجہ کسی کے لہجے سے ملتا تھا۔

لین دین کا یہ جھگڑا دس پندرہ منٹ مزید رہا۔ اس دوران میں ہم پوری طرح الرٹ رہے۔ عمران نہ صرف الرٹ رہا بلکہ سرجیت سے سوال جواب بھی کرتا رہا۔ سرجیت ہمارے خوں خوار موڈ کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ہم بڑے خطرناک ارادوں سے یہاں گھسے ہیں اور جہاں کوئی کام ہماری مرضی کے خلاف ہوگا، ہم گولی چلا دیں گے۔ سرجیت یہاں کے سیٹ اپ کے بارے میں کافی کچھ جانتا تھا۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ کچھ عرصہ پہلے تک جاوا کا چھوٹا بھائی اور سارو صاحب اس کالے کاروبار میں پارٹنرز تھے۔ یہ لوگ ہم شکل چہرے تلاش کرتے تھے اور پھر انہیں مختلف طریقوں سے استعمال کرتے تھے۔ کوئی دو سال پہلے دونوں صبح صفائی سے علیحدہ ہو گئے۔ اب تھوڑا عرصہ پہلے جاوا کا چھوٹا بھائی مارا گیا اور اس سارے کاروبار

کا کرتا دھرتا پھر سارو ہی رہ گیا ہے۔

عمران اور سرجیت کمار کی گفتگو ابھی جاری تھی کہ فیصلہ کن لمحہ پہنچ گیا۔ ساتھ والے کمرے میں معاملہ طے ہو گیا اور روی پرشاد وغیرہ چلے گئے۔ دروازہ کھلا اور بھیم شحیم سارو صاحب اپنی تمام تر ہیبت کے ساتھ اندر آ گیا۔ اس نے سفید لٹھے کی کھڑکھڑاتی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ سر صفاچٹ تھا اور اس پر تیل چپڑا ہوا تھا۔ اس کے عقب میں ایک اور بدمعاش تھا۔ سارو نے دو رائفلیں اپنی طرف اٹھی ہوئی دیکھیں اور دنگ رہ گیا۔ اس کے عقب میں موجود سیاہی مائل بدمعاش نے اپنا ہاتھ تیزی سے اپنے ہولسٹر کی طرف بڑھانا چاہا۔

”خبردار۔“ عمران پھنکارا۔ ”سیدھی ماتھے پر گولی ماروں گا۔“

دونوں ٹھٹک گئے۔ میں سارو کو دیکھ رہا تھا اور میرے دل و دماغ شدید ترین حیرت کی زد میں تھے۔ میری بصارت دھوکا نہیں کھا رہی تھی۔ صفاچٹ سر والا جو شخص میرے سامنے کھڑا تھا، میں اسے پہلے سے جانتا تھا۔ میری ہنستی مسکراتی زندگی کو کانٹوں سے بھری راہ پر گھسیٹنے اور لہولہان کرنے میں اس شخص کا اہم کردار تھا۔ یہ سارو نہیں تھا۔ سراج تھا... سیٹھ سراج... جس کے بیٹے واجی نے اپنے یاروں کے ساتھ مل کر ثروت کو بس اسٹاپ سے اٹھایا تھا اور میرے شب و روز کو ایک نئے رخ پر ڈالا تھا۔

میرے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں سیٹھ سراج کو یہاں اور اس روپ میں دیکھوں گا۔ سیٹھ کے بارے میں مجھے جو آخری اطلاع ملی، وہ یہ تھی کہ وہ بیرون ملک ہے اور کبھی کبھار کراچی میں دیکھا جاتا ہے۔

اپنی طرف اٹھی ہوئی آٹومیٹک رائفلیں اور اپنے خاص ملازم کا زخمی تھوبڑا دیکھ کر سارو یعنی سیٹھ سراج سب کچھ سمجھ گیا۔ لیکن وہ گھبرایا بالکل نہیں۔ ”کون ہو تم؟“ اس نے دونوں ہاتھ اپنی کمر پر رکھ کر بھاری آواز میں پوچھا۔

”فرشتے، تمہارا حساب کتاب کرنے کے لیے آئے ہیں۔“ عمران بھی سکون سے بولا۔

”فرشتے تو مرنے کے بعد آندے ہیں۔“

”تو تم خود کو زندہ کیوں سمجھ رہے ہو۔ تم مر چکے ہو۔ بس تمہارا جنازہ اٹھنا باقی ہے۔“ پھر عمران مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”کیوں جگر! اس کا جنازہ اٹھنا ہی باقی ہے نا؟“

ماسک کی وجہ سے میں عمران کے تاثرات نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن میں سمجھ گیا کہ میری طرح وہ بھی اس پرانے دشمن کو پہچان چکا ہے۔ سیٹھ سراج سے عمران کا تعارف پانچ سال پہلے اس وقت ہوا تھا جب عمران نے لاہور کی ایک سڑک پر سیٹھ کی شاندار گاڑی کو اپنی گاڑی سے ٹکر ماری تھی اور پھر اس بہانے اس کی ٹھکائی کی تھی۔ اس وقت سیٹھ سراج ایک نسبتاً چھوٹا بدمعاش تھا لیکن آج وہ ایک بہت بڑا ”جرائم پیشہ“ بن چکا تھا۔ گناہوں کے نگر ممبئی میں وہ جاوا جیسے گینگسٹر کے ساتھ رابطے رکھتا تھا اور اس کے ارد گرد لٹیروں اور ڈاکوؤں کی فوج تھی۔

سراج بڑے سکون سے بولا۔ ”تم جنازے کی گل کیوں کر رہے ہو۔ میں تو سکھ ہوں اور خالصوں کا جنازہ نہیں ہوندا... ارتھی ہوندی ہے۔“

عمران نے کہا۔ ”لیکن میں تمہیں پورا وشواس دلاتا ہوں، تمہارا جنازہ ہی اٹھے گا کیونکہ تم سکھ ہو ہی نہیں۔ تم لاہور کی نالیوں میں گندے کیڑے کی طرح رینگتے رہے ہو اور اب یہاں آ کر سارو صاحب بن بیٹھے ہو۔“

میں نے سیٹھ سراج کے چہرے پر پہلی بار رنگ گزرتے دیکھا۔ اس نے اپنی شفاف ٹنڈ پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔ ”کون ہو تم... اور یہاں وڑنے کی بے وقوفی تم نے کس الو دے پٹھے کے کہنے پر کیتی ہے؟“

”تمہارے اس چھوٹے سے کھوپڑے میں شاید گوبر بھرا ہوا ہے۔ تمہیں بتایا تو ہے کہ ہم فرشتے ہیں اور تمہارا حساب کتاب کرنے آئے ہیں۔“

سیٹھ سراج کے عقب میں موجود شخص نے ایک بار پھر اپنا ہاتھ ہولسٹر کی طرف لے جانے کی کوشش کی۔ اس بار عمران نے سائلنسر لگے پستول سے فائر کیا۔ ”ٹھک“ کی آواز آئی اور گولی عین اس بدقسمت شخص کی پیشانی پر لگی۔ وہ مردہ چھپکلی کی طرح پٹ سے سیٹھ سراج کے پاؤں میں گرا اور ساکت ہو گیا۔ خون کی پتلی سی لکیر اس کے چہرے پر رینگنے لگی تھی۔

سیٹھ سراج نے اپنا ہاتھ دائیں طرف میز کی جانب بڑھانے کی کوشش کی۔ ”خبردار۔“ عمران دہاڑا۔

سیٹھ ساکت ہو گیا۔ عمران نے سیٹھ کو پیچھے ہٹنے کا حکم دیا۔ بعد میں پتا چلا کہ میز کے نیچے ایمرجنسی کال کا بٹن موجود تھا۔ عمران نے سیٹھ کو نشانے پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں نے کہا تھا نا کہ ماتھے کے درمیان گولی ماروں گا۔ فیتا ہے تو ناپ کر دیکھ لو دونوں طرف سے۔ ایک ملی میٹر کا فرق بھی نکلے تو جو چور کی سزا وہ ہماری۔“

سیٹھ سراج اب اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ اس کا پالا آج رات کچھ غیر معمولی لوگوں سے پڑ گیا ہے۔ اس کے ساتھی کو بے دریغ شوٹ کر دیا گیا تھا اور اس کا خاص ملازم سرجیت جو

خود بھی ایک کڑک شخص تھا، بالکل بے دست و پا کھڑا تھا۔ ہم نے دفتر کے دروازے اندر سے لاک کر لیے تھے اور سی سی ٹی وی کیمروں کے تار کھینچ دیے تھے۔

میں نے چوڑے چکلے سیٹھ سراج کی تلاشی لی اور اس کے دونوں موبائل فونز اپنے قبضے میں لے کر آف کر دیے۔ سیٹھ سراج کی شاندار میز کی دراز میں ایک جدید پسٹل موجود تھا، وہ بھی سیٹھ کی دسترس سے دور کر دیا گیا۔

”شانتی سے بیٹھ جاؤ... اور بات کرو۔“ عمران نے اسے حکم دیا۔

وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا۔ ”کیا میں تمہارے منہ دیکھ سکدا ہوں؟“

”وقت آئے گا تو وہ بھی دکھا دیں گے۔ فی الحال حساب کتاب کی بات کرو۔“

”کیسا حساب کتاب؟“ وہ ساتھی کی لاش سے نگاہیں چراتے ہوئے بولا۔

”کیا لیتا ہے اپنی اس دکان کا؟“

”کس دکان کی گل کر رہے ہو؟“

”یہ تمہاری گولڈن بلڈنگ اور اس میں ہونے والا دھندا۔ اور اس کے علاوہ بھی جو دو تین چھوٹے موٹے ٹھکانے ہیں تمہارے۔“

”میں تمہاری گل نہیں سمجھا۔“

”تمہارا یہ کاروبار خریدنا چاہتے ہیں ہم۔ سارے اسٹاک اور ڈیڈ اسٹاک (زندہ و سامان) سمیت۔“

”تم ہوش وچ ہو؟“ سراج نے ہمیں حیرت سے دیکھا۔

”بارہ بج چکے ہیں لیکن تمہاری طرح ہم بھی سکھ نہیں ہیں۔ تم قیمت بولو۔ اور کسی بہت بڑی انٹرنیشنل کمپنی کے مالک نہیں ہو تم۔ بس ممبئی میں بیٹھ کر یہ ہٹی چلا رہے ہو۔ زیادہ لمبا چوڑا حساب کتاب نہیں کرنا پڑے گا تمہیں۔ دس پندرہ منٹ میں ٹوٹل جوڑ لو گے۔“

سراج کے چہرے پر اب پریشانی کے ساتھ ساتھ دلچسپی کے آثار بھی نمودار ہو رہے تھے۔ اس نے بھینسے کی طرح سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”تو تم گولڈن بلڈنگ خریدنا چاہندے ہو؟“

”ہاں... اور اس کے سارے سیٹ اپ... اور چھوکرے چھوکریوں سمیت۔ اس کے علاوہ یہ بھی بتا دوں۔ پہلے پوری پے منٹ کریں گے پھر تمہاری تشریف پر لات ماریں گے۔“

سیٹھ سراج الجھی الجھی نظروں سے عمران کو دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”اگر تم کسی طرح کا مذاق کر رہے ہو تو یہ تمہیں بہت مہنگا پڑنے والا ہے۔“

”اگر تم کہتے ہو تو تمہارے اس دوسرے کتے کو بھی گولی مار کر اپنی سنجیدگی کا ثبوت دے سکتا ہوں۔“ عمران نے پستول کا رخ سرجیت کمار کی طرف کیا۔ اس کا چہرہ ٹوٹی پلیٹ جیسا ہو گیا۔ ہونٹ بے ساختہ پھڑکنے لگے۔

”کیا دے سکتے ہو؟“ سیٹھ سراج نے کہا۔ انداز ٹائم پاس کرنے والا تھا۔

”جو بھی تم شرافت کے دائرے میں رہ کر مانگو۔ اس ہٹی کی اصل قیمت سے دگنا بھی... یا جو تم چاہو۔“

”لیکن تم ہو کون؟“

”دیکھو تم گندا کام کر رہے ہو۔ گندا کام کرنے والیاں یا کرنے والے گاہک کا نام پتا نہیں پوچھا کرتے۔ بس رقم وصول کرتے ہیں۔ تم بھی اپنی اس ہٹی کی قیمت بتاؤ۔ بیس کروڑ... پچیس کروڑ... بولو۔“

سیٹھ سراج کے چہرے پر اب حیرت گہری ہوتی جا رہی تھی۔ وہ گلابی اردو میں بولا۔ ”مار دھاڑ کے علاوہ تمہارے پاس ہور کیا ثبوت ہے کہ تم سنجیدہ ہو؟“

عمران نے کہا۔ ”انٹرنیٹ ہے تمہارے پاس؟“ سیٹھ نے گھڑا سا سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا۔ عمران بولا۔ ”اپنا کوئی پڑھا لکھا بندہ بلاؤ جو ایک اکاؤنٹ چیک کر سکے... اور خبردار! کوئی فالتو بات نہیں۔ ورنہ وہ جنازے والی بات سچ ہو جائے گی۔“

سیٹھ سراج نے انٹرکام اٹھایا اور کسی انوپم نامی ملازم کو اندر آنے کی ہدایت کی۔ دو تین منٹ بعد ہی تیس بتیس سال کا ایک اسمارٹ سا شخص اندر آ گیا۔ اس نے عینک لگا رکھی تھی۔ دفتر کا ماحول دیکھ کر وہ گھبرایا۔ ایک سیکنڈ کے لیے لگا کہ واپس پلٹ جائے گا لیکن پھر سراج کے کہنے پر رک گیا اور اندر آ گیا۔ میں نے دروازہ لاک کر دیا۔

عمران نے اس سے کہا۔ ”نیٹ آن کرو۔“

وہ ایک کونے میں رکھے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ گیا اور کانپتے ہاتھوں سے نیٹ آن کر دیا۔ عمران اس کے پاس جا بیٹھا... اور چار پانچ منٹ تک مصروف رہا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اسے کسی غیر ملکی بینک میں ایک بڑے اکاؤنٹ کی تفصیلات بتا رہا ہے۔ دھیرے دھیرے انوپم نامی اس شخص کے چہرے پر تعجب اور مرعوبیت کے آثار نظر آئے۔ اس نے سراج سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”جی سر! یہ ایک سوئس بینک

اکاؤنٹ ہے۔ کسی جی جی تھری نام کی کمپنی کا نام ہے۔ کافی بڑا اماؤنٹ موجود ہے اس میں۔"

"کتنا بڑا؟"

"کوئی ساڑھے نو ملین ڈالرز۔"

"روپے کتنے بنتے ہیں؟" سیٹھ سراج چیخ کر بولا۔

انوپم نے انڈین روپوں میں حساب کر کے بتایا۔ ظاہر ہے رقم کروڑوں میں تھی۔ اس سے پہلے کہ سیٹھ سراج کچھ مزید پوچھتا، عمران بولا۔ "تم نے رقم دیکھ لی۔ اب ذرا مال کے درشن بھی کراؤ۔"

"کی مطلب اے؟"

"مطلب کھوتی کا سر۔ گولڈن بلڈنگ کا سودا ہوگا۔ گولڈن بلڈنگ کی جھلکیاں تو دکھاؤ۔"

"گولڈن بلڈنگ تمہارے سامنے ہے لیکن مجھے اب بھی یقین نہیں کہ تم واقعی کوئی سودا کرنا چاہ رہے ہو۔۔۔ یہ جس کمپنی کے نام اکاؤنٹ ہے، یہ کرتی کیا ہے؟"

"آلو والے نان بیچتی ہے۔۔۔ تم کو اس سے کیا۔ تم "دھندے والیوں" والا کام کر رہے ہو۔ وہ بس نوٹ ڈالتی تھیں اپنے گریبان میں۔۔۔ سوال جواب نہیں کرتیں۔"

سیٹھ سراج کا چہرہ پہلی بار سرخ ہوا۔ لگا کہ وہ غصے سے پھٹ پڑے گا مگر وہ ابھی ایک لاش گرتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ اس نے تحمل سے کام لیا۔ عمران نے انوپم نامی شخص سے کہا کہ وہ سی سی ٹی وی کیمروں کے ذریعے ہمیں گولڈن بلڈنگ کے مناظر دکھائے۔

انوپم نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر باس سراج کی طرف دیکھا۔ سراج کچھ دیر برے برے منہ بناتا رہا پھر اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ انوپم نے کلوز سرکٹ ٹی وی کے کنٹرول پینل پر چند بٹن دبائے۔ تین قطاروں میں بارہ اسکرینیں روشن ہوگئیں۔ گولڈن بلڈنگ کے مختلف حصوں کے مناظر بڑی وضاحت سے نظر آنے لگے۔ یہ واقعی شاندار بلڈنگ تھی۔ وسیع رقبے میں پھیلی ہوئی تھی۔ ایک ہال نما کمرے میں کسی کلب کا سیٹ لگا ہوا تھا اور تیز روشنی میں دو نیم عریاں لڑکیاں ایک پولیس والے کو شراب پلانے اور رجھانے میں مصروف تھیں۔ ایک جگہ کوئی میٹنگ چل رہی تھی۔ گنجے اور نیم گنجے سروں والے کئی افراد سر جوڑے بیٹھے تھے۔ طویل میز پر کاغذ پھڑپھڑا رہے تھے۔ ایک نہایت آرام دہ لاؤنج میں دو نوجوان اپنی ساتھی لڑکیوں کے ساتھ گداز صوفوں پر بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ ان کے سامنے شراب کی بوتل کھلی پڑی تھی اور گلاس رکھے تھے۔ ان میں سے ایک نوجوان کو دیکھ کر میں چونکا اور مجھے اپنے جسم [illegible] سر کو چڑھتا ہوا محسوس ہوا۔۔۔ یہ کوئی اور نہیں۔۔۔ واجد واجی تھا۔ سراج کا وہی اوباش بیٹا جس نے چند برس پہلے ہوس ناک نظروں سے ثروت کو دیکھا تھا اور پھر [illegible] اس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ یہ وہی واجی تھا۔ اب یہ پہلے [illegible] فربہ ہو چکا تھا۔ اس نے فرنچ کٹ داڑھی رکھی ہوئی تھی [illegible] میں کسی قیمتی دھات کی زنجیر تھی۔ بال بھی عجیب انداز [illegible] بنے ہوئے تھے۔

میں دیر تک اس پر سے اپنی نگاہیں نہ ہٹا سکا۔ [illegible] میں جلتی ہوئی آگ کے شعلے کچھ اور بلند ہوگئے۔

ایک بہت بڑے ہال کمرے کے مناظر نے [illegible] طرف متوجہ کیا۔ یہاں کم و بیش پچیس لڑکیاں نہایت [illegible] لباس میں موجود تھیں۔ ایک کوریوگرافر انہیں کسی [illegible] ڈانس کی ریہرسل کروا رہا تھا۔ یہاں آرکسٹرا بھی موجود [illegible] لڑکیاں بار بار ہیجان خیز انداز میں اپنے جسم کو حرکت دیتی [illegible] اور پھر سوالیہ نظروں سے کوریوگرافر کو دیکھنے لگتی تھیں۔ [illegible] دوسری اسکرین پر چار خوبرو لڑکیاں کھانے کی میز پر [illegible] کھاتی نظر آئیں۔ ان میں سے ایک لڑکی کی شکل واضح طور [illegible] معروف انڈین ہیروئن کاجل سے ملتی تھی۔ دیگر تین بھی [illegible] اسی طرح کسی نہ کسی سلیبریٹی کی ہم شکل تھیں۔ [illegible] پاکستان سے لائی جانے والی سویٹی عرف ایشو [illegible] کہیں بیٹھی اپنی قسمت کو رو رہی ہو۔ مجھے وہ مناظر یاد آئے جب وہ کچھ دیر پہلے ٹھیکیدار انتل کی کوٹھی میں ڈائریکٹر [illegible] کی منت سماجت کر رہی تھی۔ صاف پتا چل رہا تھا [illegible] جالبازوں کے جال میں پھنسی ہوئی تھی اور پاکستانی لڑ[illegible] بھی یہاں موجود ہیں۔

انوپم، کنٹرول پینل پر مختلف بٹن دبا رہا تھا۔ ایک اسکرین روشن ہوئی تو اس پر گودام کا منظر نظر آیا۔ لوڈر [illegible] طرح کھڑا تھا۔ لوڈر کے دروازے کے پاس بے ہوش گار[illegible] کا بے حرکت جسم پڑا تھا۔

عمران نے اوپر والی اسکرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "اس میٹنگ میں کیا چل رہا ہے اور کون بندے ہیں یہ؟"

"اپنے بندے ہی ہیں۔" سراج نے اجڈ انداز میں کہا۔

میں نے سوالیہ نظروں سے انوپم کی طرف دیکھا۔ وہ بولا۔ "اپنی کمپنی کے لوگ ہی ہیں۔ نئی بھرتی کے بارے میں مشورہ کر رہے ہیں۔"

"نئی بھرتی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ ہم شکل لوگوں کی تلاش کرنا آسان کام نہیں۔ اس کے لیے بھاگ دوڑ کرنا پڑتی ہے۔ اب ہم پاکستان کے علاوہ بنگلہ دیش اور نیپال وغیرہ میں بھی کام کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے نئے ورکروں کی ضرورت ہے۔ اسی کے بارے میں بات ہو رہی ہے۔"

اسی دوران میں میٹنگ ہال میں سے موٹی توند والے ایک مہاشے نے انٹرکام پر کال کی۔ یہ کال سراج کے دفتر میں ہی آئی۔ میرے اشارے پر سراج نے ریسیور اٹھایا۔۔۔ "کی گل اے؟"

اندازہ ہوا کہ اسے میٹنگ ہال میں بلایا جا رہا ہے۔ سراج نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "میرا وہاں جانا ضروری ہے۔"

"پر تمہارا یہاں رہنا اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔" عمران نے کہا۔

سیٹھ سراج کچھ دیر پھاڑ کھانے والی نظروں سے عمران کو گھورتا رہا۔ پھر اس نے ماؤتھ پیس سے ہاتھ ہٹایا اور کال کرنے والے سے بولا۔ "میں ابھی نہیں آسکدا۔ ضروری کام ہے۔ واجد کو بھیج رہا ہوں۔"

انٹرکام بند کر کے اس نے دوسرا بٹن دبایا۔ اسکرین نمبر 4 پر واجد اپنی ساتھی لڑکی اور دوست کے ساتھ بیٹھا دستور فلم دیکھ رہا تھا۔ سیٹھ سراج نے بیٹے کو میٹنگ میں شریک ہونے کے لیے کہا اور انٹرکام بند کر دیا۔

میں نے اس دوران میں آفس کی ایک الماری کھولی تھی اور فائلوں کی ورق گردانی بھی کی تھی۔ ایک فائل مجھے اہم معلوم ہوئی۔ اس میں سارو پروڈکشن کے اہم لوگوں کے نام بھی موجود تھے۔ آٹھ دس نام تھے۔ یہ تقریباً سارے ہی ممبئی کے جرائم پیشہ لوگ تھے۔ ان میں سے فقط ایک اپنے نام کے اعتبار سے سکھ معلوم ہوتا تھا، باقی ہندو تھے۔ میٹنگ میں بھی پگڑی والا ایک سیٹھ نما سکھ موجود تھا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہی لوگ ہیں جو اس پروڈکشن کمپنی کے کرتا دھرتا ہیں۔

میں نے یہ فائل عمران کو دکھائی اور اپنا تجزیہ بھی بیان کیا۔ عمران نے مجھے پوری طرح چوکس رہنے کی ہدایت کی اور انوپم کو گن پوائنٹ پر ساتھ والے کمرے میں لے گیا۔ فائل بھی اس کے پاس تھی۔

عمران اور میں بات چیت کرتے ہوئے دانستہ ہندی کے لفظ بھی استعمال کر رہے تھے۔ مقصد یہی تھا کہ ہماری پہچان کے بارے میں ان لوگوں کو غلط فہمی رہے۔

سیٹھ سراج اب بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ذرا سا موقع ملنے پر بھی کوئی کارروائی ڈال دے گا۔ میں اسے یہ ذرا سا موقع دینے پر ہرگز تیار نہیں تھا۔۔۔ دوسرے کمرے سے انوپم کے بری طرح چلانے کی آوازیں آئیں۔ سیٹھ سراج مجھے خطرناک نتائج کی دھمکیاں دینے لگا۔ میں نے رائفل سے اس کے سر کا نشانہ لیا اور انگلی ٹریگر پر رکھ لی تو وہ ذرا ٹھنڈا ہوا۔ اس کی نگاہیں میرے ماسک کے پار دیکھنا چاہتی تھیں۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ ہم کون ہیں؟ میں بھی اسے بتانا چاہتا تھا کہ میں کون ہوں۔ لیکن ابھی شاید اس کا وقت نہیں آیا تھا۔ وہ بہت دبنگ بدمعاش بن چکا تھا تو میں بھی وہ کم ہمت تابش نہیں رہا تھا جسے سراج اور اس کے ساتھیوں نے لاہور کے ایک پارک میں روئی کی طرح دھنک دیا تھا۔ میری جون بدل چکی تھی۔ میں کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ مجھے انسان کو چیونٹی کی طرح مسلنا آگیا تھا اور آج میں سیٹھ سراج کو بتانا چاہتا تھا کہ جب اس جیسے سفاک، میرے جیسے عام لوگوں پر باعزت زندگی کے دروازے بند کرتے ہیں تو پھر ان کے لیے کیسے کیسے دروازے کھل جاتے ہیں۔ وہ کسی انجان سمت کا رخ کر لیتے ہیں، نشوں میں ڈوب جاتے ہیں، خودکشیاں کر لیتے ہیں اور کبھی کبھی میری طرح انہیں کوئی عمران مل جاتا ہے۔ وہ اپنی جھکی ہوئی گردن اٹھاتے ہیں، ہتھیار تولتے ہیں، آنکھوں میں چنگاریاں جگاتے ہیں اور ظالموں کے سر پر موت کی بجلی بن کر چمک جاتے ہیں۔۔۔ ہاں، میں آج سیٹھ سراج کو بتانا چاہتا تھا۔

اسی دوران میں ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھلا اور انوپم لڑکھڑاتا ہوا سا اندر آگیا۔ اس کے چہرے پر نیلگوں نشان تھے اور ایک آنکھ تیزی سے سوجتی جا رہی تھی۔ عینک کا کہیں پتا نہیں تھا۔

عمران نے اسے سرجیت کے ساتھ ہی قالین پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ وہ بے چون و چرا بیٹھ گیا۔ عمران نے سراج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بڑی اچھی بات ہے سیٹھ سراج کہ تمہارے قریبی ساتھی بھی اس سے یہیں تمہارے ساتھ موجود ہیں، میٹنگ ہال میں۔"

اپنے لیے سیٹھ سراج کا لقب سن کر سیٹھ بری طرح چونکا۔ "کون سیٹھ سراج؟" اس نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

"تم سیٹھ سراج! مالک سراج پلازا۔ سکنہ لاہور۔۔۔ لاہور کے ماتھے کا بدنما داغ ہو تم۔ تم جیسوں کی کوئی قومیت ہوتی ہی نہیں۔ تم بس مال زادے ہو۔ سونے کی چمک دیکھ کر ہر طرح کی غلاظت میں ڈبکی لگاتے ہو اور اس کا حصہ بن

عمران نے کمپیوٹر انجینئر انوپم کو ہدایات دیں اور اس نے کانفرنس ہال کے کیمروں کا رابطہ کنٹرول چینل سے مکمل منقطع کر دیا۔ اس دوران میں، میں الماریوں کی تلاشی لیتا رہا۔ ایک الماری سے جدید قسم کی چابیوں کے دو بڑے گچھے ملے۔ عمران نے سیٹھ سراج سے معلومات حاصل کیں کہ کانفرنس ہال سے باہر کتنے گارڈز ہیں اور ان کے پاس کیا اسلحہ ہے۔ اس کے بعد ہم جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

ہم نے سیٹھ سراج اور انوپم کو گن پوائنٹس پر رکھا اور دفتر سے نکل کر ایک کوریڈور میں داخل ہو گئے۔ تیس چالیس قدم چلنے کے بعد ہم اس ہال کے مین دروازے کے سامنے پہنچ گئے جہاں میٹنگ ہو رہی تھی۔ سیٹھ سراج کے بیان کے مطابق یہاں دو باوردی گارڈز موجود تھے۔ دونوں مسلح تھے لیکن بالکل ایزی موڈ میں کھڑے تھے۔ مجھے ان کو ہینڈز اپ کرانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

وہ ہکا بکا رہ گئے۔ ''چلو، تم دونوں بھی اندر چلو۔'' عمران نے کہا۔

ہم میٹنگ ہال میں یکے بعد دیگرے داخل ہوئے۔ سب سے آگے سیٹھ سراج اور انوپم تھے۔ ان کے پیچھے میں تھا، عقب میں عمران تھا۔ اس نے دونوں گارڈز کو کور کیا ہوا تھا۔ یہ گارڈز شکلوں سے ہی چھٹے ہوئے بدمعاش نظر آتے تھے۔ ہم میٹنگ ہال میں پہنچے تو طویل میز کے گرد بیٹھے افراد کے چہرے تصویرِ حیرت بن گئے۔ چند لمحے کے لیے وہ جیسے سکتے میں آ گئے تھے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ قطعی غیر متوقع تھا۔ مجھے بس یہی لگا کہ میرے پیچھے ایک جھماکے کے ساتھ تیز حرکت ہوئی ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا، مجھے اپنے پیچھے شیشے کی ایک دیوار سی نظر آئی۔ یہ دیوار فرش سے لے کر قریباً نو فٹ اونچی چھت تک چلی گئی تھی۔ عمران اور ایک گارڈ اس دیوار کے پیچھے تھے۔ گارڈ کا ایک پاؤں اس موٹی بلوری دیوار کے نیچے آ گیا تھا اور وہ زمین پر گرا مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ یہ سب کچھ اتنا آناً فاناً ہوا تھا کہ میں ایک سیکنڈ کے لیے چکرا گیا۔ اچانک ایک پرچھائیں سی میری طرف آئی۔ ایک پتھریلا جسم مجھ سے ٹکرایا، میں دور تک لڑھک گیا۔ میری رائفل سے ایک برسٹ چلا اور چھت میں کئی سوراخ ہو گئے۔ کوئی زورآور شخص مجھ سے لپٹ گیا تھا۔ میں نے اسے ٹانگوں پر اچھالنے کی کوشش کی لیکن اسی دوران میں دو تین مزید افراد مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ میں جانتا تھا کہ ان لمحوں میں میرے لیے سب سے ضروری بات یہ ہے کہ میں رائفل اپنے ہاتھوں سے نکلنے نہ دوں۔ میں اپنی انگلی ٹریگر پر نہیں رکھ سکا تھا مگر دستہ ابھی تک میرے ہاتھوں میں تھا۔ میں نے پوری جان سے اسے تھام لیا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ حملہ کرنے والے بھڑوں کی طرح مجھ سے چمٹ گئے ہیں۔ میرا پورا جسم شدید ضربوں کی زد میں آ گیا۔ پھر رائفل بھی میرے ہاتھ سے نکل گئی۔ مجھے لگا کہ میرے بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے اور میرے منہ میں خون کا نمکین ذائقہ گھلتا جا رہا ہے۔ میں مزاحمت کی کوشش کر رہا تھا لیکن یہ کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔ میری قمیص کے ساتھ ساتھ میرے چہرے کا ماسک بھی چیتھڑوں میں بدل چکا تھا۔ مجھے لگا کہ میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوب رہا ہے۔ ان لوگوں نے مجھے ادھ موا کر کے چھوڑ دیا تھا۔

مجھے اندازہ ہوا کہ ہمارے ساتھ آنے والا تنومند گارڈ رائفل تانے میرے سر پر کھڑا ہے۔ چکنے فرش پر اوندھے پڑے پڑے میں نے دھندلائی نظروں سے دیکھا۔ شیشے کی موٹی دیوار کے دوسری طرف سے عمران نے برسٹ چلایا لیکن یہ مکمل بلٹ پروف شیشہ تھا۔ عقبی دروازہ بھی آٹومیٹک طریقے سے لاک ہو چکا تھا۔ اب عمران اور گارڈ، ہال کے قریباً 16 فٹ ضرب 10 فٹ کے ایک مختصر حصے میں بند تھے۔ چھت بھی کافی نیچی تھی، یعنی صرف ساڑھے آٹھ نو فٹ کے قریب۔ گارڈ کا پاؤں بری طرح زخمی ہو چکا تھا اور پھنسا ہوا تھا۔ جب دیوار تیزی سے نیچے آئی تھی تو یہ پاؤں اس کی زد میں آیا تھا۔ اگر گارڈ خود آ جاتا تو معلوم نہیں اس کا کیا حشر ہوتا۔ میں نے دیکھا، سیٹھ سراج عرف سارو اس آٹومیٹک بلوری دیوار کو اوپر اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک سائڈ پر ایک چھوٹا سا پینل تھا۔ اس پر لاک کا سوراخ تھا۔ سیٹھ نے اس میں تین چار انچ لمبی ایک چابی داخل کی ہوئی تھی۔ پینل پر ایک بلب بار بار اپنا رنگ بدلتا تھا، کبھی سرخ اور کبھی زرد ہو جاتا تھا۔ سیٹھ سراج بار بار چابی گھما رہا تھا اور بائیں ہاتھ سے ایک سبز بٹن دبا رہا تھا لیکن دیوار اٹھ نہیں پا رہی تھی۔ گارڈ کا پاؤں پھنس جانے سے اس میں یقیناً کوئی خرابی واقع ہو گئی تھی۔

ان لوگوں نے مجھے ادھ موا سمجھ لیا تھا اور یہ ان کی غلطی تھی... یا شاید ان کی غلطی نہیں تھی۔ انہوں نے مجھے اتنی شدید چوٹیں لگائی تھیں کہ وہ مجھے مردہ یا نیم جان سمجھنے میں حق بجانب تھے۔ میرے سر کو رائفل کے کندوں کی ضربوں سے پلپلا کر دیا گیا تھا۔ میرا چہرہ خون میں لتھڑا ہوا تھا اور ایک بازو شدید چوٹ کی وجہ سے بالکل سن ہو چکا

جاتے ہو۔''

''پتا نہیں تم کیا بک رہے ہو؟''

''میں جو بک رہا ہوں تمہاری کھوپڑی میں اچھی طرح آ رہا ہے لیکن تم مان نہیں رہے ہو۔ نہ مانو۔ ہمیں اس سے غرض نہیں۔ ہمیں بس سودا کرنا ہے۔ اچھی بات ہے کہ تمہارے ساجھے دار بھی یہاں موجود ہیں۔ بس دو کی کمی ہے، ان کو بھی بلا لو۔''

''کیا کروں گا ان کو بلا کر؟''

''سودے کی بات چیت۔''

''اتنی جلدی کوئی سودا شودا نہیں ہو سکدا۔'' سراج نے منہ بنایا۔

''چلو شروع کی گل بات تو ہو ہی سکتی ہے نا۔ پرسوں ایک میٹنگ اور رکھ لیں گے۔ تمہارا سودا ہمیں پسند آیا ہے۔ آشا ہے کہ تمہاری ڈیمانڈ بھی پسند آ جائے گی۔''

سیٹھ نے کہا۔ ''اگر ہم نے یہ سودا نہ کرنا ہوئے تو پھر؟''

''پھر تم گھاٹے میں رہو گے۔ ہم پہلے سیدھی انگلیوں سے گھی نکالنے کی کوشش کرتے ہیں پھر دوسرے طریقے برتتے ہیں۔''

''دھمکیاں دے رہے ہو؟''

''کہو تو ابھی عمل کر کے بھی دکھا دیتا ہوں اور عمل کی شروعات تمہارے ان دونوں بندوں سے کر دیتا ہوں۔'' عمران نے پستول سرجیت کمار کی طرف سیدھا کیا۔ اس کا چہرہ پھر ٹوٹی پلیٹ جیسا ہو گیا اور اس دفعہ پلیٹ واقعی ٹوٹ بھی گئی۔ عمران نے بغیر کسی وارننگ کے گولی چلائی جو سیدھی سرجیت کمار کے منہ میں لگی اور اس کے دانت توڑتی ہوئی اس کے تالو میں گھس گئی۔ وہ بیٹھا بیٹھا ''دھپ'' سے قالین پر گرا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک خم دار چاقو دبا ہوا تھا۔ پتا نہیں یہ اس نے کہاں چھپا رکھا تھا جو تلاشی میں بھی برآمد نہیں ہوا تھا۔ چند سیکنڈ میں سرجیت کی بے جان مٹھی کھل گئی اور چاقو کا سرخ دستہ نظر آنے لگا۔ سراج اب سکتہ زدہ تھا۔ میں نے چاقو اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔

عمران کے لہجے میں درندگی تھی۔ ''یہ کافی ہے یا دوسرا ثبوت دوں؟''

انوپم کے زخمی چہرے پر موت کی زردی چھا گئی۔ سراج نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''کیا چاہندے ہو تم؟''

عمران نے فائل پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''امرناتھ کو بلاؤ جو ساؤتھ ممبئی میں نائٹ کلب چلاتا ہے اور سارو پروڈکشن میں آٹھ فیصد کا حصے دار ہے۔ اور ٹرانسپورٹر تیواری کو بلاؤ جس نے تمہیں پچھلے سال کولکتہ سے ہیروئن ڈیول [illegible] فیصد ہم شکل لا کر دیا تھا اور جس کے صلے میں تم نے اسے منیجر بنا رکھا ہے۔''

عمران کو یہ معلومات یقیناً انوپم سے ہی حاصل ہوئی تھیں۔ سراج ان دونوں افراد کو بلانے میں متذبذب تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ عمران کا ارادہ اٹل ہے اور وہ اس میں تاخیر نہیں چاہتا تو اس نے فون پر یکے بعد دیگرے دونوں افراد سے رابطہ کیا اور انہیں فوراً گولڈن بلڈنگ پہنچنے کے لیے کہہ دیا۔

سراج نے اس ہدایت پر اس لیے بھی عمل کیا کہ اسے کسی بہتری کی توقع تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید آنے والوں میں سے کوئی موجودہ صورتِ حال کا پانسہ پلٹ دے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، ان دونوں افراد میں سے تیواری بڑا خطرناک شخص تھا۔ اس نے کولکتہ کی دو بنگالی بہنوں کو زبردستی گھر میں ڈالا ہوا تھا اور انہیں گھر میں ڈالنے کے لیے اس نے اڑیسہ کے ایک قصبے میں، ایک ہی خاندان کے دس افراد کو آگ میں زندہ جلا ڈالا تھا۔ اپنے مزید پیاروں کو موت سے بچانے کے لیے ان دونوں بہنوں نے عدالت میں بیان دیا تھا کہ وہ تیواری کے ساتھ اپنی مرضی سے رہ رہی ہیں۔ ایک بیوی کی حیثیت سے، دوسری سالی کی حیثیت سے۔ دونوں نے مذہب تبدیل کرنے کے بارے میں بھی بیان دیا تھا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد تیواری بھی میٹنگ ہال میں آ گیا۔ وہ شکل سے ہی ایک بدبودار جانور لگتا تھا۔ دوسرے شخص امرناتھ کے بارے میں پتا چلا کہ وہ نشے میں اتنا دھت ہے کہ گھر سے باہر نکلنے میں ناکام رہا ہے۔

اب کورم تقریباً پورا تھا۔ مجھے عمران کے ارادے بڑے خطرناک لگ رہے تھے۔ خود میرے سینے میں بھی ایک ایسی آگ روشن تھی جس نے مجھے سرتاپا ڈھانپ لیا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں اپنے پرانے ''خیر خواہ'' سیٹھ سراج کو یہاں اس روپ میں دیکھوں گا۔ میں نے اسے دیکھ لیا تھا اور میرے سارے پرانے زخموں سے خون رسنے لگا تھا۔ ثروت کی بربادی آنکھوں کے سامنے آ رہی تھی۔ خالو عثمان اور خالہ صفیہ کے مردہ چہرے... اور پھر اپنی ماں کا مرنا۔ اذیت کی انتہا کو چھو کر ان کا کھڑکی سے نیچے چھلانگ لگانا۔ کچھ بھی تو بھولا نہیں تھا۔ سب کچھ راکھ کے ڈھیر میں سلگتے انگاروں کی طرح دبا ہوا تھا... ایک ہوا کا منتظر تھا اور وہ ہوا آج چلی تھی۔

تھا۔ مجھے ٹھیک سے علم نہیں تھا کہ اس کا کیا حال ہے۔ اگر میں یہ تمام تشدد سہہ گیا تھا اور ابھی تک پوری طرح بے ہوش نہیں ہوا تھا تو اس کی وجہ میری وہ غیر معمولی سخت جانی تھی جو میں نے پچھلے کچھ عرصے میں بتدریج حاصل کی تھی۔ پہلے اس بے مثال کردار بارود اجکی کے ذریعے اور پھر اپنی مسلسل نفس کشی کے ذریعے۔ ہاں، میں وہ سب کچھ سہہ گیا تھا اور مجھے مارنے والے مجھے اس قابل نہیں سمجھ رہے تھے کہ میں مزاحمت کر سکتا۔ وہ اپنی جگہ صحیح تھے، میں اپنی جگہ صحیح تھا۔ میرے سینے میں جو آگ بھڑک رہی تھی، اس کی حدت کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھی۔ آج برسوں بعد مجھے وہ چہرے دکھائی دیے تھے جن کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے میری آنکھوں کے اندر آنکھیں زخم بن گئے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے ایک پہاڑ جیسا قرض میرے سینے پر دھرا ہوا تھا۔ آج مجھے یہ قرض اتارنا تھا، یا مر جانا تھا۔ مجھے یہ "ابھی یا پھر کبھی نہیں" والا معاملہ نظر آرہا تھا۔

اسی دوران میں سیٹھ سراج شیشے کی دیوار کو حرکت دینے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے سبز بٹن دبا کر دیوار کو تین چار انچ بلند کیا۔ گارڈ نے اپنا پاؤں اندر کھینچ لیا۔ اس کے پاؤں کی ہڈیاں چور ہو گئی تھیں اور انگلیاں باقی پاؤں سے برائے نام ہی جڑی رہ گئی تھیں۔ اس کا خون تیزی سے چکنے فرش پر پھیلنے لگا۔ وہ بے ہوش ہونے کے قریب تھا۔

یہی وقت تھا جب میں نے حرکت میں آنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اپنی تمام تر بچی کھچی طاقت کو جمع کیا۔ گارڈ کی رائفل کی نال میری طرف جھکی ہوئی تھی... مجھ سے قریباً چار فٹ کے فاصلے پر تھی۔ گارڈ اتنا چوکس نہیں تھا جتنا اسے ہونا چاہیے تھا۔ اس کی چالیس پچاس فیصد توجہ شیشے کے پار اپنے تڑپتے ہوئے ساتھی پر تھی۔ میں نے لیٹے لیٹے اپنی جگہ سے جست کی اور رائفل کے بیرل پر ہاتھ ڈال دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ گارڈ کی انگلی ٹریگر پر بے ساختہ دب جائے گی۔ یہی ہوا۔ رائفل سے گولی نکلی۔ میں نے بیرل کا رخ سیٹھ سراج اور اس کے ساتھیوں کی طرف ہی رکھا تھا۔ گولی کا نشانہ سیٹھ سراج کا بیٹا واحد عرف واجی بنا۔ گولی اس کے کندھے پر لگی اور وہ کندھا پکڑ کر جھک گیا۔ میں نے زوردار لات گارڈ کے سینے پر ماری۔ رائفل اس کے ہاتھ سے نکل گئی اور وہ چکنے فرش پر دور تک لڑھک گیا۔

ایک شخص نے مجھ پر پستول کی گولی چلائی۔ میں زمین پر گرا۔ فائر خالی گیا۔ اس دوران میں، میں رائفل کو پوزیشن دے چکا تھا۔ میں نے پستول بردار پر یکے بعد دیگرے دو فائر کیے۔ ایک گولی سیدھی اس کے سر میں لگی۔

"خبردار... مار دوں گا۔" میں چنگھاڑا اور اس کے ساتھ ہی رائفل کو برسٹ پر کرلیا۔

ایک اور شخص نے میز پر سے رائفل اٹھانا چاہی۔ میں نے ٹریگر دبایا۔ کم و بیش پانچ گولیاں اس کے جسم میں پیوست ہوگئیں۔ "خبردار۔" میں نے پھر وارننگ دی۔ اس کے ساتھ ہی حاضرین کے پاؤں میں وارننگ برسٹ مارا۔ لکڑی کے چکنے ملائم فرش پر کئی سوراخ ہوگئے زبردست تڑتڑاہٹ نے دیواریں لرزا دیں۔ میں جانتا تھا کہ اس مکمل ساؤنڈ پروف اور "باپردہ" کانفرنس ہال سے کوئی آواز باہر نہیں جاسکتی اور کوئی نظر اندر نہیں آسکتی۔ یہاں قیامت کا منظر تھا۔ ممبئی کے نو دس چھٹے ہوئے دولت مند بدمعاش یہاں میرے سامنے موجود تھے۔ میرے قہرناک انداز نے ان کے چہرے دھواں کر دیے تھے۔

"ہاتھ کھڑے کرو۔" میں دہاڑا اور حرکت کر کے ہال میں سب سے مناسب جگہ پر کھڑا ہوگیا۔ یہ وہ لمبوتری طویل میز تھی جس پر کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔ یہاں سے میں ہر فرد پر بہ آسانی نگاہ رکھ سکتا تھا اور اسے نشانہ بنا سکتا تھا۔ ہال کمرے میں اب دو لاشیں تھیں اور سراج کا سوتیلا واجی اپنے لہولہان کندھے کو پکڑ کر بیٹھا ہوا تھا۔

مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ میرے بازو کی ہڈی ٹوٹنے سے بچ گئی ہے۔ تاہم چہرہ خون میں بری طرح لتھڑا ہوا تھا اور یہ خون بار بار میری آنکھوں میں بھر کر میری بصارت کو دھندلا رہا تھا۔ میرا بالائی جسم تقریباً عریاں تھا۔

میں نے سیٹھ سراج کو حکم دیا کہ وہ شیشے کی دیوار کو اوپر اٹھائے۔

سیٹھ نے تذبذب دکھایا تو میں نے بے دریغ اس کے بیٹے کو نشانہ بنایا۔ میں نے سنگل شاٹ چلایا اور گولی واجی کے دوسرے کندھے میں اتر گئی۔ اس بار وہ لکڑی کے فرش پر ڈھے گیا اور درد سے ڈکرانے لگا۔

میرے تیور دیکھ کر سیٹھ سراج آگے بڑھا۔ اس نے لاک کے سوراخ میں قریباً چار انچ لمبی چمک دار چابی ڈالی۔ سبز بٹن دبایا اور شیشے کی دیوار اوپر اٹھا دی۔ عمران اندر آگیا... میرا ماسک پہلے ہی اتر چکا تھا، عمران نے بھی

ماسک نوچ کر اتار دیا۔ اب ایک کی جگہ دو آٹومیٹک رائفلیں سراج اینڈ کمپنی کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ عمران نے میری طرف دیکھا اور میں نے اس کی طرف۔ ہم ایک دوسرے کا مافی الضمیر سمجھ گئے۔ عمران نے گرج کر کہا۔ "چلو اندر... سب اندر چلو۔"

وہ انہیں شیشے کی دیوار کی دوسری جانب بھیج رہا تھا۔

سیٹھ سراج کے چھوٹے سے ماتھے پر رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ وہ تڑخ کر بولا۔ "اوئے، کیا چاہندے ہو تم؟"

"پہلے تمہاری اس ہٹی کا سودا چاہتے تھے، اب کچھ نہیں۔ اب وہاں دیوار کے پیچھے جاؤ۔ ورنہ تیسری گولی ولی عہد واحد صاحب کے پیٹ شریف میں لگے گی۔" عمران کی آواز میں لرزا دینے والی سفاکی تھی۔

دو تین بندے اندر چلے گئے مگر باقی وہیں کھڑے رہے۔ ان میں مکروہ چہرہ تیواری بھی شامل تھا۔ یہی خطرناک شخص تھا جس نے بٹن دبا کر شیشے کی دیوار نیچے گرائی تھی۔ بعد میں مجھ پر جست کرنے والا بھی یہی تھا۔ عمران نے کہا۔ "دوستو! میں صرف پانچ تک گنوں گا۔ اگر تم لوگ دوسری طرف نہیں گئے تو گولی چلاؤں گا۔"

اس نے گنتی شروع کی۔ وہ چار تک پہنچا تھا جب سیٹھ سراج نے ہاتھ اٹھا کر اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ یقیناً "آرگو" کرنا چاہتا تھا لیکن عمران کسی گفت و شنید کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے تیواری پر برسٹ چلایا اور اسے بھون کر رکھ دیا۔ لیکن وہ نصف بھونا گیا تھا۔ چار پانچ گولیوں کا برسٹ بس اس کی ٹانگوں میں لگا تھا۔ وہ تڑپ کر گرا اور پھر رینگتا ہوا سب سے پہلے اس حصے کی طرف چلا گیا جہاں کچھ دیر پہلے عمران موجود تھا۔ باقی افراد بھی آناً فاناً اندر گھس گئے۔ انہوں نے جیسے موت کے فرشتوں کو اپنے روبرو دیکھ لیا تھا۔ اب صرف سیٹھ سراج اور اس کا زخمی بیٹا واجی باہر تھے۔ عمران نے رائفل ان دونوں کی طرف سیدھی کی اور دہاڑا۔ "تم دونوں بھی۔ آخری وارننگ دے رہا ہوں۔"

سیٹھ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ عمران نے انگلی ٹریگر پر رکھ لی۔ "ٹھہرو عمران!" میں نے کہا۔ "اگر یہ نہیں جانا چاہتا تو رہنے دو۔"

عمران نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے آنکھوں آنکھوں میں اسے آمادہ کرلیا۔ عمران نے اپنے پہلو میں کھڑے انوپم سے کہا۔ "شیشہ نیچے گراؤ۔"

انوپم طویل میز کے پیچھے گیا۔ اس نے میز کے نیچے ہاتھ ڈال کر کوئی کھٹکا دبایا۔ بلٹ پروف شیشہ بمشکل ایک سیکنڈ کے اندر چھت سے نو فٹ نیچے فرش تک آگیا۔ کوئی آواز پیدا نہیں ہوئی۔ زبردست تکنیک تھی۔ اب سراج اور اس کے بیٹے کے علاوہ سب لوگ شیشے کے دوسری جانب

تعلیم اور تفریح

ترقی یافتہ ممالک میں یہ رجحان عام ہے کہ تعلیم نہایت آسان اور تفریح روز بروز مشکل ہوتی جارہی ہے۔ مثلاً بی اے کرنا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، مگر برج سیکھنے کے لیے عقل درکار ہے۔ ریڈیو، ٹی وی، سینما، اور باتصویر کتابوں نے تعلیم کو بالکل آسان کر دیا ہے لیکن کھیل دن بدن گراں اور پیچیدہ ہوتے جارہے ہیں۔ لہٰذا بعض بھی لڑکے کھیل سے جی چرا کر تعلیم کی طرف زیادہ توجہ دینے لگے ہیں۔ اس سے جو سبق آموز نتائج رونما ہوئے۔ وہ سیاست دانوں کی صورت میں ہم سب کے سامنے ہیں۔ کسی اعتدال پسند دانا کا قول ہے۔ "کھیل کے وقت کھیل اور کام کے وقت کام اچھا۔" اگر ہم یہ کہیں کہ ہمیں اس زریں اصول سے سراسر اختلاف ہے تو اس کو یہ معنی نہ پہنائے جائیں کہ خدانخواستہ ہم شام و سحر، آٹھوں پہر کام کرنے کے حق میں ہیں، سچ پوچھیے تو ہم اپنا شمار ان نارمل افراد میں کرتے ہیں جن کو کھیل کے وقت کھیل اور کام کے وقت بھی کھیل ہی اچھا لگتا ہے اور جب کھیل کی باتیں ہو رہی ہیں تو یہ عرض کرنے کی اجازت دیجیے کہ فی الواقع کام ہی کے وقت کھیل کا صحیح لطف آتا ہے۔

(انتخاب: مشتاق احمد یوسفی)

غلط فہمی

ملا نصیرالدین کے گھر ہر روز صبح سویرے ایک فقیر آجاتا تھا۔ ملا اس سے تنگ آچکا تھا۔ ایک دن فقیر آیا تو ملا نے اندر سے پوچھا۔ "کون ہے؟"

فقیر نے جواب دیا۔ "اللہ کا مہمان۔"

ملا باہر آیا اور فقیر کا ہاتھ پکڑ کر مسجد لے گیا اور بولا۔ "تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ اللہ کا گھر یہ ہے۔"

(فہیم اللہ خان، بنوں)

تھے۔ یہ ایک طرح سے 16 فٹ ضرب 10 فٹ کا کیبن سا بن گیا تھا۔ کیبن نما جگہ کی چھت پر سوراخ بھی نظر آرہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ یہاں نہ صرف لوگوں کو آنا فانا بند کیا جا سکتا ہے بلکہ ان کی ایذا رسانی کا سامان بھی موجود ہے۔

میں ایذا پسند ہرگز نہیں تھا لیکن آج پتا نہیں کیوں مجھے ایذا رسانی بری نہیں لگ رہی تھی۔ میں سیٹھ سراج کو مار دینا چاہتا تھا جس طرح اس نے میری ماں کو مارا تھا۔ عمران نے انوپم سے پوچھا۔ ''یہ چھت پر چھوٹے سوراخ کیسے ہیں؟''

اس نے لرزاں آواز میں کہا۔ ''وہ دائیں طرف والے سوراخ تو مائک کے ہیں۔ آپ ان لوگوں سے کیول مائک کے ذریعے ہی بات کر سکتے ہیں۔''

''اور چھت والے سوراخ؟'' عمران نے پوچھا۔

وہ ذرا ہچکچانے کے بعد بولا۔ ''یہ ائرکنڈیشنگ کے سوراخ ہیں۔ کیبن کے ٹمپریچر کو باہر سے کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔''

''کیا رینج ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

وہ مردہ لہجے میں بولا۔ ''مائنس پچاس سے لے کر پلس 250 تک۔''

''250 سینٹی گریڈ پر تو آگ لگ جاتی ہے۔'' عمران نے کہا۔

''جی ہاں۔'' انوپم نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''ٹھیک ہے بھئی، لگا دو آگ۔'' عمران نے کہا۔ ''اور مائک کھول دو پورا۔''

اگلے سات آٹھ منٹ بڑے لرزہ خیز تھے۔ عمران کے حکم پر انوپم کو وہ ناب گھمانا پڑی جو کیبن کے ٹمپریچر کو تیزی سے بڑھاتی تھی۔ مائک کھلے ہوئے تھے۔ اندر موجود افراد دہائی مچانے لگے تھے۔ زخمی تیواری کی چلاتی ہوئی آواز آئی۔ ''سارو، روکو ان کو... بھگوان کے لیے روکو۔''

سارو یعنی سراج کیا کر سکتا تھا۔ میں نے رائفل اس کی طرف اور واجی کی طرف سیدھی کر رکھی تھی۔ وہ دونوں جانتے تھے کہ ایک لمحے میں ان کے جسم چھلنی ہو جائیں گے۔ اندر ٹمپریچر بڑھتا جا رہا تھا۔ تیواری پھر چلایا۔ ''سارو۔''

عمران نے مائک میں کہا۔ ''لگتا ہے تیواری صاحب، تمہیں بڑی گرمی لگ رہی ہے۔ گرمی تو یقیناً ان زردشت لوگوں کو بھی لگی ہوگی جنہیں تم نے زندہ جلایا تھا اور ان کے علاوہ بھی پتا نہیں کتنے لوگوں کو تم نے آگ میں جھونک رکھا ہوگا۔''

اب وہ سب چلا رہے تھے۔ دہائی دے رہے تھے پتا نہیں کیا کیا کہہ رہے تھے۔ ان کی آوازیں آپس میں [illegible] ہو گئی تھیں۔ ان کے چہرے پسینے سے تر ہوتے جا [illegible] تھے۔ پھر بات پسینے سے آگے نکل گئی۔ حدت سے [illegible] جلد جھلسنے لگی۔ وہ شیشے کی بلٹ پروف دیوار سے ٹکرا [illegible] لگے۔ پچھاڑیں کھانے لگے۔ یہ سب زندہ نسوانی گوشت کے بیوپاری تھے۔ انہوں نے بس آرٹ اور فلم میکنگ اپنی ڈھال بنا رکھا تھا۔ وہ بے رحم قصاب تھے اور آج [illegible] کند چھری کے نیچے آگئے تھے۔ وہ تڑپ رہے تھے [illegible] اذیت کی شدت سے ان کی آوازیں پھٹنا شروع [illegible] تھیں۔ عمران کے کہنے پر انوپم نے مائک آف کر دیا۔ پھر ایک دوسرا بٹن دبا کر شیشے کے سامنے ایک کرٹن [illegible]۔ سراج سکتہ زدہ بیٹھا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ رہا تھا [illegible] پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

... پانچ منٹ بعد انوپم نے عمران کی ہدایت [illegible] پردہ ہٹایا تو شیشے کی دوسری جانب وہ سب ختم ہو چکے تھے ٹمپریچر جب ایک حد سے بڑھا تھا تو ان کے کپڑوں نے آگ پکڑ لی تھی۔ یقیناً اس مرحلے کے بعد وہ۔۔۔ سکتہ کے اندر مر گئے تھے۔ وہ سب مادرزاد برہنہ پڑے تھے۔ بس کسی کسی کے جسم پر کوئی چیتھڑا رہ گیا تھا۔ یہ بڑا [illegible] ناک منظر تھا۔ عمران کے کہنے پر انوپم نے ایک بار پھر شیشے کے سامنے کرٹن کھینچ دیا۔

سیٹھ سراج کا پتا پانی ہو چکا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر عجیب لرزتی سی آواز میں بولا۔ ''کون ہو تم؟''

میں نے اپنی پھٹی ہوئی شرٹ سے اپنا خون آلود چہرہ اچھی طرح صاف کیا۔ ''تم مجھے کافی حد تک پہچان چکے ہو سراج۔''

''تم... عثمان کے بھانجے ہو نا... تابش!''

''اور خالو عثمان کے علاوہ میری والدہ کو بھی تم نے ہی مرنے پر مجبور کیا۔ میں نے تم سے کہا ہے نا کہ آج حساب کتاب کا دن ہے۔''

سیٹھ سراج کی آنکھوں میں موت ناچنے لگی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ زندگی کی فلم میں سن مانیوں کے طویل ''سیکوئنس'' کے بعد یہ وہی وقت ہے جو ہر ولن پر آتا ہے۔ اس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا اور سمجھ لیا تھا کہ اب بچنے کا امکان بہت کم ہے۔

میں نے عمران سے کہا۔ ''عمران! تم اس ولی عہد

واجد کا دھیان رکھو۔ میں بادشاہ سلامت سے دو دو ہاتھ کر لوں۔''

واجد کے دونوں کندھے زخمی تھے اور وہ دیوار سے ٹیک لگائے نڈھال بیٹھا تھا... وہ جانتا تھا کہ اس موقع پر وہ اپنی کوئی مدد کر سکتا ہے اور نہ اپنے باپ کی۔ وہ آنکھیں بند کیے بس کراہ رہا تھا۔ بلاشبہ سراج کی طرح اس نے بھی مجھے اور کسی حد تک عمران کو پہچان لیا تھا۔ ممکن تھا کہ پانچ سال پہلے کے مناظر اس کی نگاہوں میں گھومنا شروع ہو گئے ہوں۔

ایک جانب شیشے کے ایک خوب صورت شوکیس میں دو جدید بیگال رائفلیں آویزاں تھیں ان کے نیچے اسٹیل کی ایک چمک دار کلہاڑی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ کلہاڑی سیٹھ سراج کا خاص شوق ہے۔ اس نے جس کسی کو بری طرح دھمکانا ہوتا تھا، اسے کہتا تھا کہ... کلہاڑی سے تیرا گھاٹا اتاروں گا۔ وہ کلہاڑی کو پنجابی لہجے میں کواڑی کہتا تھا اور یہ بات ہے بھی حقیقت۔ کلہاڑی سے مرنا یقیناً مرنے والوں کے لیے بہت اذیت ناک ثابت ہوتا ہے۔ کلہاڑی کے زخم نہ تو ہتھوڑے کی طرح کند ہوتے ہیں اور نہ ہی خنجر وغیرہ کی طرح تیز دھار۔

میں نے رائفل کے کندے سے ضرب لگائی اور خوب صورت شوکیس کا شیشہ توڑ کر کلہاڑی نکال لی۔

''اس کا کیا کرو گے؟'' عمران نے پوچھا۔

''کچھ نہ کچھ کروں گا لیکن پہلے تم ایک کام کرو۔ یہاں جو باقی گارڈز ہیں، ان کو کسی ایک جگہ جمع کر لو۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'' عمران نے کہا۔ اس نے انوپم کمار سے اس بارے میں پہلے ہی معلومات حاصل کر رکھی تھیں۔

عمران کے حکم پر انوپم کمار نے کانفرنس ہال کے اندر سے ہی اسپیکر پر بلڈنگ کے گارڈز سے رابطہ کیا۔ اس کی آواز چھوٹے مائکس کے ذریعے بلڈنگ کے ہر حصے میں سنی گئی، وہ بولا۔ ''ہیلو گارڈز... ایمرجنسی ہے۔ آپ سب لوگ کمرا نمبر تین میں جمع ہو جائیں۔ یہ اعلان سارے گارڈز کے لیے ہے۔ کمرا نمبر تین میں جمع ہو جائیں... فوراً، یہ ایمرجنسی ہے۔''

اس نے یہ اعلان دو تین بار دہرایا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد اس نے سیل فون پر ایک سینئر سکھ گارڈ سے رابطہ کیا اور تصدیق چاہی کہ تمام گارڈز کمرے میں موجود ہیں... کانفرنس روم کے اندر ہی موجود ''کنٹرولز'' کے ذریعے اس نے کمرا نمبر تین کو لاک کر دیا۔ عمران نے اپنی پتلون کی جیب میں سے دو اور اسکائی ماسک نکال لیے۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں اس ہال سے باہر جانا چاہ رہا ہوں۔ اس نے ایک ماسک میرے چہرے پر چڑھا دیا اور دوسرا اپنے لیے رکھ لیا۔ کانفرنس ہال کے ایک گوشے سے ایک چھوٹی سی جدید کیپسول لفٹ اوپر جا رہی تھی۔ میں سیٹھ سراج کو گن پوائنٹ پر اس لفٹ میں لے آیا۔ وہ اڑیل ٹٹو کی طرح آسانی سے نہیں اٹھا لیکن جب میں نے اس کے پاؤں کے قریب رائفل سے فائر کیے تو اسے لفٹ میں آتے ہی بنی۔ لفٹ چند سیکنڈ میں ہمیں گولڈن بلڈنگ کی چھت پر لے آئی۔ یہ چوتھی منزل کی چھت تھی۔ ہم دونوں باہر نکلے۔ چھت بالکل خالی تھی۔ بس ایک طرف تھوڑی سی آگ جل رہی تھی اور چائے کے دو کپ اور سگریٹ کے ٹوٹے وغیرہ پڑے تھے۔ اندازہ ہوا کہ کچھ دیر پہلے تک یہاں ایک دو گارڈز موجود تھے۔ میرے جسم پر نیل ہی نیل تھے۔ ایک ہاتھ کا انگوٹھا شاید ٹوٹ گیا تھا۔ سر میں درد سے دھماکے ہو رہے تھے۔ لیکن یہ ساری اذیت مجھے مزہ دے رہی تھی۔

خنک ہوا نے ہم دونوں کا استقبال کیا۔ میں نے رائفل ایک طرف رکھی اور کلہاڑی کا پہلا بے رحم وار سیٹھ سراج کے کندھے پر کیا۔ یہ کاری ضرب تھی۔ سیٹھ سراج کا تنومند جسم دہل گیا۔ کھڑ کھڑاتی سفید قمیص کے نیچے چربی دار گوشت بھی کٹ گیا اور خون بہہ نکلا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو سراج... کواڑی کی مار واقعی بری ہوتی ہے۔''

موت کو سامنے دیکھ کر سراج نے آخری کوشش کی۔ وہ دیوانہ وار میری طرف آیا لیکن اس کے بھاری جسم میں وہ تیزی نہیں تھی جو اس قسم کی صورتِ حال میں اس کی مدد کر سکتی۔ میں ایک قدم پیچھے ہٹا۔ قریباً پانچ فٹ لمبے دستے والی کلہاڑی ایک بار پھر گھومی۔ اس بار سیٹھ سراج کی کلائی پر زخم لگا۔ ہڈی ٹوٹ گئی اور خون فوارے کی طرح بہہ نکلا۔ یہ اتنی تکلیف دہ چوٹ تھی کہ سیٹھ چلا اٹھا اور کلائی پکڑ کر دوہرا ہو گیا۔

میں نے کہا۔ ''سراج! یہ تو ''شروع اسٹارٹ'' ہے۔ ابھی ایسے بہت سے پھٹ تجھے لگنے ہیں۔ تو واقعی ''سائنس داں'' ہے۔ ٹھیک ہی کہتا تھا کہ کواڑی سے مرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ گولی سوراخ کر دیتی ہے، چاقو چیر دیتا ہے لیکن یہ مارتی بھی ہے اور رولتی بھی ہے۔''

سیٹھ کی آنکھوں میں اب اذیت اور خوف کے سوا اور

کچھ نہیں تھا۔ اسے اپنا انجام سو فیصد نظر آ گیا تھا۔ اس نے یقیناً میری آنکھوں میں ناچتی ہوئی وحشت بھی دیکھ لی تھی۔ میں نے کہا۔ ”سراج! بندہ جو بوتا ہے وہ کاٹتا ہے۔ اس میں کچھ دیر ضرور لگ سکتی ہے لیکن ہوتا یہی ہے۔“

میں نے پھر کلہاڑی اٹھائی۔ اس مرتبہ سراج نے وار ہاتھ پر روکنے کی کوشش کی۔ اس کی ہتھیلی پر گہرا گھاؤ آیا۔

میں نے کہا۔ ”سراج! اگر کلہاڑی کی موت سے بچنا چاہتے ہو تو پھر نیچے چھلانگ لگا دو۔“

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میری آنکھوں میں اٹل ارادے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ہم دونوں اب چھت کی منڈیر سے چار پانچ فٹ کے فاصلے پر تھے۔ نیچے کوہِ نور بلڈنگ کا عقبی صحن تھا۔ پتھر کا فرش دودھیا لائٹ میں چمک رہا تھا۔ یہ چوتھی منزل کی چھت تھی... سیٹھ نے میری کلہاڑی کی طرف دیکھا... پھر نیچے دیکھا... پھر کلہاڑی کی طرف دیکھا۔ میں بالکل ساکت کھڑا تھا۔ سیٹھ سراج کے دونوں طرف موت تھی لیکن ایک موت زیادہ اذیت ناک تھی اور سیٹھ جان چکا تھا، اب اسے بچانے کوئی نہیں آئے گا۔

”جلدی کرو سراج! مجھے اور بھی کئی کام کرنے ہیں۔“ میں نے کلہاڑی کو ہاتھ میں گھمایا اور ایک قدم آگے بڑھایا۔

سیٹھ سراج نے پھر مجھے دیکھا۔ نیم تاریکی کی وجہ سے مجھے صاف نظر نہیں آ رہا تھا لیکن یقینی بات تھی کہ سیٹھ کی تنگ پیشانی پسینے سے بھیگ چکی ہے۔ اس نے آخری بار میرے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر وہاں کوئی رعایت نہ پا کر دو فٹ اونچی منڈیر سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ زندگی آخر تک ”جینے“ کی خواہش رکھتی ہے۔ شاید سیٹھ سراج کے ذہن میں بھی ہو کہ ممکن ہے وہ گر کر بچ جائے۔ تقریباً تین من وزن کے ساتھ پچاس پچپن فٹ کی بلندی سے گرنا اور بچنا کرشمہ ہی کہلاتا۔ پھر بھی احتیاط کے طور پر میں نے رائفل اٹھائی اور نیچے جھانکا۔ دودھیا روشنی میں سیٹھ کا سر دولخت نظر آیا۔ خون فرش کو رنگین کرتا چلا جا رہا تھا۔ ایک بلی ”مردہ سیٹھ“ سے چند فٹ کے فاصلے پر حیرت زدہ سی کھڑی تھی۔

بلندی سے اس طرح گر کر مرنے کا ”ایک منظر“ میں پانچ سال پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ ”ماں جی!“ میں نے کہا اور میری آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔

چار پانچ منٹ بعد میں کیپسول لفٹ کے ذریعے پھر ساؤنڈ پروف کانفرنس ہال میں تھا۔ یہاں میرے آنے تک ایک اور معرکہ ہو چکا تھا۔ عمران کی چلائی ہوئی گولی سیدھی واجد عرف واجی کے رخسار پر لگی تھی اور کھوپڑی توڑ کر گدی کی طرف سے نکل گئی تھی۔ واجی کی لاش لکڑی کے فرش پر چت پڑی تھی۔ انوپم کار سہا ہوا، دیوار کے ساتھ کھڑا تھا۔

”سوری یار! مجھے اسے مارنا پڑا۔“ عمران بولا۔

”کیا ہوا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”تمہیں پتا ہے، یہ جب سے زخمی ہوا ہے ایک ہی جگہ بیٹھا رہا ہے۔“

”ہاں۔“

”اس کے نیچے یہ پسٹل دبا ہوا تھا۔ عمران نے مجھے ایک چھوٹا لیکن طاقتور پسٹل دکھایا۔ یہ سراج کے ساتھیوں میں سے ہی کسی کا تھا اور ہنگامے کے دوران میں گر گیا تھا۔“ عمران نے بتایا۔ ”اس نے ایک دم مجھ پر فائر کیا۔ یہ دیکھو، گولی کتنے قریب سے گزری ہے۔“ عمران کی قمیص کی ایک آستین میں گولی کا سوراخ تھا۔

”بہت اچھا کیا۔“ میں نے واجی کی لاش پر نفرت بھری نگاہ ڈالی۔ خون اس کی فرنچ کٹ داڑھی کو بھگو رہا تھا اور اس کے گلے میں حمائل، پلاٹینم کی زنجیر کو داغ دار کر رہا تھا۔ یہ وہ امیر زادہ تھا، عیش و قانون شکنی جس کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ لیکن میری دانست میں اس سے بڑا مجرم اس کا باپ تھا جو اس کا پشت پناہ اور مربی تھا۔ جس نے اسے بڑا قاتل اور ہوس کار بنانے کی باقاعدہ کوشش کی تھی۔

ہم کچھ دیر تک واجی کی اس اچانک موت پر بات کرتے رہے پھر عمران نے انوپم سے کہا۔ ”تم نے ہماری کافی مدد کی ہے لیکن افسوس کہ تم ہمیں ماسک کے بغیر دیکھ چکے ہو۔ دوسروں کی طرح اب تمہیں بھی مرنا پڑے گا انوپم۔“

انوپم کے چہرے کا سارا خون نچڑ گیا۔ اس نے رحم طلب نظروں سے عمران کو دیکھا۔ گھگیائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”آپ جو کہیں گے، میں کروں گا۔“

”بس ہم یہی کہتے ہیں کہ تم مر جاؤ۔“ عمران نے سپاٹ آواز میں کہا... اور... اس کی موت آسان بنا دی۔ عمران کی چلائی ہوئی گولی اس کی عین کنپٹی پر لگی اور وہ دھپ سے چوبی فرش پر گر کر ساکت ہو گیا۔ اس مقتول شخص کو زندہ رکھا جا سکتا تھا لیکن ہماری مجبوریاں آڑے آ رہی تھیں۔ ہمارے سامنے بدترین حالات تھے... اسی دوران میں کانفرنس روم کے اندر تیز الارم بجنا شروع ہو گیا۔

خطروں کے دائروں میں سفر کرتے جانبازوں کی داستان کے بقیہ واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

بے جرم گناہی

میمونہ عزیز

ایک مختلف زندگی بسر کرنے کے لیے بعض لوگ وہ کر گزرتے ہیں جس کا ازالہ کسی طور ممکن نہیں ہوتا۔ وقت... ماہ و سال کے کتنے ہی ہندسے عبور کر جائے... ماضی کے نقوش ان مٹ ہی رہتے ہیں... ایک ایسی ہی بے وفا کی زندگی کے ورق... جس کی ہر سطر اسے مجرم ٹھہراتی تھی...

جذباتی داستان... [illegible] جذبات کی [illegible] ایک دل گداز تحریر

کچھ عرصہ پہلے تک جارج پولیس کی ملازمت کرتا تھا... ریٹائر ہونے کے بعد وہ پرائیویٹ سراغ رساں کی حیثیت سے کام کر رہا تھا... اور کتنی کیسوں میں کامیابی حاصل کی تھی...

ایک دن وکیل اینڈریو سائکس اس کے پاس آیا... اور اس نے اپنی مشکل بیان کی... ”مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

”میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟“

"میری ایک موکلہ ہے اور اس کا نام روزی مارک ہے۔ شاید تم اس نام سے واقف ہو۔ اخبارات میں اس کے بارے میں بہت کچھ چھپتا رہا ہے۔"

جارج نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "مجھے یاد نہیں۔"

اینڈریو ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "تم میرے بارے میں اچھی طرح جانتے ہو اور دوسرے لوگوں کی طرح بھی سمجھتے ہوگے کہ میں بھاری فیس کے عوض مقدمات لڑتا ہوں لیکن بعض اوقات مجھے اپنے موکلوں سے رعایت کرنا پڑتی ہے اور کبھی کبھی تو میں بالکل فیس نہیں لیتا۔ خاص کر ایسی صورت میں جب مجھے یقین ہو جائے کہ ملزم بے گناہ ہے اور وہ میری فیس ادا کرنے کے قابل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ دوسری باتوں کو دیکھنا پڑتا ہے۔"

"مثلاً؟" جارج نے پوچھا۔

"مثلاً سماجی دباؤ، تعصب اور پولیس کی جانب داری وغیرہ وغیرہ۔"

"کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ مظلوم ہے اور اسے نشانہ بنایا جا رہا ہے؟"

"ہاں، وہ ماضی کی ستائی ہوئی عورت ہے۔ ساٹھ سالہ عورت جو ماضی میں روزی کوزینا کے نام سے پہچانی جاتی تھی۔ اس کی شادی ٹام کوزینا سے ہوئی جو ایک چھوٹے درجے کا بدمعاش تھا اور ایک خفیہ شراب خانہ چلاتا تھا۔ یہ 1927ء کی بات ہے۔ شاید تم نے اس کا نام سن رکھا ہو۔"

"اس وقت میں بہت چھوٹا تھا اور ویسے بھی پوری زندگی کسی غیر قانونی شراب خانے نہیں گیا اس لیے ایسے لوگوں کے بارے میں جاننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"روزی کے لیے وہ بہت سختی کے دن تھے۔ 1952ء میں کوزینا ایک دوسرے بدمعاش کے ہاتھوں مارا گیا تو وہ یہاں سے پندرہ میل دور واقع قصبے شرلے چلی گئی۔ وہاں اس نے ایک چھوٹا سا کیبن خریدا اور عام استعمال کی اشیا فروخت کرنے لگی۔ اس سے میرا پہلا تعارف کپڑوں کی ایک دکان پر ہوا جہاں میری بیوی اکثر جاتی رہتی تھی۔ جلد ہی ان دونوں میں دوستی ہو گئی اور جب اسے گرفتار کیا گیا تو بیوی کے کہنے پر میں اس سے ملنے گیا۔ اس سے تمام حالات سننے کے بعد اپنے تجربے کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ بے قصور ہے اور اس نے مجھ سے جھوٹ نہیں بولا۔"

"شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ تمہیں اس کی بے گناہی کا یقین آجائے اور تم مفت میں اس کا مقدمہ لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ کیا تم نے اس پہلو پر غور کیا؟"

اینڈریو نے لمحہ بھر خاموشی اختیار کی پھر بولا۔ "ہاں، مجھے یقین ہے کہ وہ اس قتل کی ذمے دار نہیں ہے۔"

جارج نے سر ہلایا لیکن کچھ بولا نہیں۔ چند سیکنڈ بعد اینڈریو آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ "یقیناً وہ کوئی فرشتہ نہیں ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ماضی میں وہ کیا کرتی رہی ہے اور پولیس اس کے ماضی سے اچھی طرح باخبر ہے۔ لیکن اب وہ اس دنیا میں تنہا ہے اور بڑی مشکل سے زندگی گزار رہی ہے۔ پولیس اس کے ماضی کو دیکھتے ہوئے اس پر شبہ کر رہی ہے لیکن میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ وہ مجرم نہیں ہے اور یہ بات کوئی پرائیویٹ سراغ رساں ہی ثابت کر سکتا ہے اور روزی اس کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتی۔ میں زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہوں کہ اپنی فیس چھوڑنے کے علاوہ تمہارے وقت کی قیمت بھی ادا کر دوں، بشرطیکہ تم معقول فیس لینے پر تیار ہو جاؤ۔ میں تمہاری صلاحیتوں سے واقف ہوں۔ حال ہی میں دو ملزمان تمہاری کوششوں کی بدولت بری ہوئے اور دو قاتلوں کو تم نے انصاف کے کٹہرے تک پہنچایا۔ کیا تم اس معاملے میں میرا ساتھ دو گے؟"

جارج اسی شام اینڈریو کے دفتر میں بیٹھا وہ فائل دیکھ رہا تھا جس میں فرانسس ڈرموٹ کے قتل کی تفصیلات درج تھیں۔ اس میں دیگر کاغذات کے علاوہ لاش، جائے وقوعہ اور کچھ ایسی اشیا کی تصاویر بھی تھیں جن کا تعلق قتل کی تحقیقات سے تھا۔ تفصیلات کے مطابق 17 اکتوبر 1959ء کو ماسنک کے علاقے میں واقع پختہ سڑک کے کنارے گھنے جنگل میں ایک شخص کی لاش پائی گئی جسے گولی مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔

ماسنک پولیس ڈپارٹمنٹ کے دو افسران پر مشتمل ٹیم کی ابتدائی تحقیق کے مطابق متوفی 64 سالہ فرانسس ڈرموٹ نیویارک سٹی پولیس کا ریٹائرڈ کیپٹن تھا اور حال ہی میں شرلے نامی قصبے میں شفٹ ہوا تھا۔ یہ جگہ اس مقام سے زیادہ دور نہیں تھی جہاں سے اس کی لاش ملی تھی۔ سراغ رسانوں نے شرلے پولیس چیف جین ورتھی کے ہمراہ مقتول کے گھر کا معائنہ کیا۔ تلاشی کے دوران میں ان کے ہاتھ ایک اسکریپ بک لگی جس میں انیس سو بیس سے لے کر اس کی ریٹائرمنٹ یعنی 1956ء تک کے مختلف اخباری تراشے چسپاں تھے۔ پولیس چیف نے وہیں کچن ٹیبل پر بیٹھ کر اس کی ورق گردانی شروع کر دی۔ اچانک اس کی نظریں ایک

صفحے پر جم کر رہ گئیں۔ اس خبر کے مطابق 1927ء میں بتیس سالہ فرانسس کا جھگڑا ایک غیر معروف خفیہ شراب خانے میں جونے ریڈی سے ہوا تھا۔ ان کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہوا جس کے نتیجے میں ریڈی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اس واقعے کی چشم دید گواہ شراب خانے کے مالک ٹام کوزینا کی بیوی روزی تھی۔

پولیس چیف ورتھی نے جلدی جلدی صفحات پلٹے اور اس سلسلے کے مزید اخباری تراشے دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ فرانسس اور روزی کے حلفیہ بیانات سننے کے بعد جیوری نے یہ تسلیم کر لیا کہ فرانسس نے اپنے اور روزی کے دفاع میں گولی چلائی تھی ورنہ جونے ریڈی ان دونوں کو قتل کر دیتا۔ ان اخباری تراشوں کو پڑھنے کے بعد پولیس چیف سے ضبط نہ ہو سکا اور اس نے چلاتے ہوئے کہا۔ "انسپکٹر! میرا خیال ہے کہ تمہیں اس کی ضرورت ہوگی۔"

قتل کی تحقیقات کے دوران یہ بات بھی سامنے آئی کہ فرانسس کی شرلے آمد کے بعد روزی کو کئی مرتبہ اس کے ساتھ دیکھا گیا۔ نیویارک سٹی پولیس ڈپارٹمنٹ سے ملنے والی معلومات کے مطابق روزی کا ماضی شفاف نہیں تھا اور اس کے کھاتے میں کئی جرائم درج تھے۔ اس کے مقابلے میں فرانسس کا پولیس کیریئر کسی حد تک شریفانہ تھا اور اس کے ریکارڈ میں کسی جرم کا ذکر نہیں تھا۔

لاش کے قریب کیچڑ میں پائے گئے ٹائروں کے نشانات سے ان کی قسم اور گاڑی کے بارے میں اندازہ لگانا مشکل تھا۔ البتہ اتنا ضرور معلوم ہو گیا کہ اگلے ٹائروں کا درمیانی فاصلہ اٹھاون انچ اور پچھلے ٹائروں کا اٹھاون اعشاریہ آٹھ انچ تھا جبکہ 1955ء میں روزی کے نام پر رجسٹر ہونے والی شیورلیٹ کار کے ٹائروں کی بھی یہی پیمائش تھی۔ لہٰذا سرچ وارنٹ حاصل کرنے کے بعد کار کا بغور معائنہ کیا گیا لیکن کوئی ایسا ثبوت نہیں ملا جو عدالت میں پیش کیا جا سکتا۔ روزی کے گھر کی تلاشی کے دوران دو غیر رجسٹرڈ ریوالور برآمد ہوئے جن میں سے ایک اعشاریہ دو دو کا آٹومیٹک اور دوسرا اعشاریہ تین آٹھ کا کولٹ ریوالور تھا۔ البتہ مقتول کو لگنے والی گولی ان ہتھیاروں سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ لاش کو اس جگہ پر پڑے ہوئے پانچ دن سے زیادہ اور دس دن سے کم کا عرصہ ہوا تھا۔ فرانسس کو کسی اور جگہ قتل کیا گیا تھا اور اس کی لاش کو جنگل میں لا کر پھینک دیا گیا۔ دونوں گھروں میں خون کے دھبے یا کوئی ایسا نشان نہیں ملا جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ قتل کی واردات ان میں سے کسی ایک جگہ پر کی گئی تھی۔ جارج نے پوری فائل غور سے پڑھی اور نیویارک سٹی پولیس کی طویل اور تفصیلی رپورٹ پر نظر ڈالنے کے بعد اپنا چشمہ اتار کر میز پر رکھ دیا۔ اب اس کے لیے روزی سے ملنا ضروری ہو گیا تھا۔

جمعے کی صبح وہ اس سے ملاقات کے لیے سفوک کاؤنٹی جیل گیا۔ ملاقاتی کمرے میں وہ دونوں ایک میز کے گرد آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ اس عمر میں بھی وہ خاصی دلکش نظر آ رہی تھی اور کوئی بھی مرد اس کی جانب متوجہ ہو سکتا تھا۔ جارج کو یہ یقین کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ ساٹھ سالہ اینڈریو بھی اس کے حسن و دلکشی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اسی وجہ سے اس کی مدد کرنے کے لیے بے چین نظر آ رہا تھا۔

روزی نے اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں اس کلب میں خوش آمدید کہتی ہوں۔"

"تم کس کلب کی بات کر رہی ہو؟" جارج نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "جو غریب لڑکیوں کو جیل سے نکلنے میں مدد دیتا ہے۔ اگر مسٹر اینڈریو کو اس کلب کا صدر بنایا جائے تو تم یقیناً ان کے نائب مقرر کیے جاؤ گے۔"

جارج نے اپنے کندھے اچکائے اور بولا۔ "میں نے ایسے کسی کلب میں شمولیت اختیار نہیں کی اور سچ تو یہ ہے کہ تمہارے مقدمے کی فائل پڑھنے کے بعد مجھے شک ہے کہ اس کلب کی رکنیت کے لیے درخواست دوں۔"

"میں تمہیں بھی وہی کچھ بتاؤں گی جو اس سے پہلے اینڈریو کو بتا چکی ہوں کہ بے شک وہ مجھے گیس چیمبر میں پھینک دیں۔ میں نے زندگی میں کئی جرم کیے ہیں لیکن اگر تمہیں سچ اور غلط کی پہچان ہے تو میرے الفاظ پر یقین کرو۔ میں نے اس شخص کو قتل نہیں کیا۔ شاید بیس سال پہلے اگر میں اس کی ضرورت محسوس کرتی تو اسے قتل کر سکتی تھی لیکن اب میں 59 سال کی ہو چکی ہوں اور ٹی وی دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی۔"

جارج نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور بولا۔ "تم نے اپنی تقریر ختم کر لی۔ اب کچھ میری بھی سن لو۔"

"یقیناً تمہاری بات ضرور سنوں گی کیونکہ اگر تم نے بھی اس مقدمے پر توجہ نہ دی تو میرے لیے کوئی راستہ نہیں

بچے گا۔"

"پولیس اس مقدمے کو جس انداز سے دیکھ رہی ہے، اس کے مطابق تمہارے پاس اس قتل کے لیے نیت، محرک اور مواقع بھی موجود تھے۔ تمہیں اس شخص کے ساتھ متعدد بار دیکھا گیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم اسے بہت اچھی طرح جانتی تھیں۔ آخری بار بھی جب وہ زندہ تھا تو اسے تمہارے ساتھ ہی دیکھا گیا۔ تمہارے پاس سے دو عدد غیر قانونی ہتھیار بھی برآمد ہوئے۔ شاید تم ان کا استعمال بھی جانتی ہوگی۔ ممکن ہے کوئی تیسرا ہتھیار بھی ہو جو کسی گڑھے یا کھاڑی میں سے مل جائے۔ یہ بات بھی سمجھ سے بالاتر ہے کہ اس نے شہر چھوڑ کر شرلے نامی قصبے میں رہنے کو کیوں ترجیح دی۔ پھر وہاں جو ٹائروں کے نشانات ملے ہیں، وہ تمہاری شیورلیٹ کے ٹائروں سے بہت مشابہ ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ تم ایک بار پھر اس فائل کا مطالعہ کرو۔ اس سے تمہیں پتا چل جائے گا کہ میں ہی وہ واحد ہستی ہوں جسے وہ پہلے سے جانتا تھا۔ میرے سوا اس کی یہاں کسی سے جان پہچان نہیں تھی اور یہ بات بھی ذہن میں رکھو کہ جائے وقوعہ پر ملنے والے ٹائروں کے نشانات میری کار کے ٹائروں سے ملتے جلتے ہیں، صرف ان کی چوڑائی ایک جیسی ہے۔ بائی دا وے تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ اس وقت کتنی شیورلیٹ کاریں سڑکوں پر دوڑ رہی ہیں؟"

"مجھے کچھ اندازہ نہیں لیکن ان کی تعداد کافی زیادہ ہے۔"

"پولیس والوں کو یہ تک معلوم نہیں کہ اسے کس تاریخ کو قتل کیا گیا تھا، لہٰذا میں بھی موقع واردات سے اپنی غیر موجودگی ظاہر نہیں کر سکتی اور جہاں تک محرک کا تعلق ہے تو جانتی ہوں کہ پولیس والے کیا کہہ رہے ہیں۔ ان کی تیار کردہ کہانی کے مطابق میں نیویارک سے چھپ کر اس قصبے میں چلی آئی اور اپنی شناخت چھپانے کے لیے کوزینا کا نام ہٹا دیا کیونکہ میرے پاس لوٹ مار سے حاصل ہونے والی بہت بڑی رقم تھی لہٰذا پولیس کا خیال ہے کہ وہ میری تلاش میں یہاں آیا تھا اگر جیوری کو یہ کہانی پسند نہ آئی تو وہ یہ مفروضہ بھی بیان کر سکتے ہیں کہ فرانسس مجھے بلیک میل کر رہا تھا اور اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ وہ دشمنوں کو میرے بارے میں بتا دے گا۔ لہٰذا میں نے اسے مار ڈالا۔ کیا تم مجھے اتنا ہی احمق سمجھتے ہو؟ اگر میں نے اسے قتل کیا ہوتا تو یہ بھی جانتی تھی کہ چوبیس گھنٹے سے بھی کم وقت میں پولیس میرے دروازے پر پہنچ جائے گی اور سب سے پہلے مجھ پر ہی شبہ کیا جائے گا۔ یقین کرو اگر کسی وجہ سے مجھے اس کو قتل کرنا ہی پڑتا تو اس کی موت حادثاتی ہوتی۔ وہ نہاتے کے ٹب میں مردہ پایا جاتا، سیڑھیوں سے پھسل کر نیچے گر جاتا یا زیادہ مقدار میں خواب آور گولیاں کھا لیتا۔ میں کبھی اسے گولی مار کر اپنے گھر سے دو میل کے فاصلے پر نہ پھینکتی۔"

جارج نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ "اطلاعات کے مطابق جب پولیس پہلی بار تمہارے پاس آئی تو تم نے کہا کہ تمہیں ان کے آنے کی توقع تھی۔"

روزی نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں میں نے ایسا کہا تھا۔ اس وقت تک مجھے معلوم نہ تھا کہ فرانسس اس دنیا سے جا چکا ہے۔ میں ہمیشہ یہی سوچتی رہتی تھی کہ جلد یا بدیر مقامی پولیس کی گرفت میں آ جاؤں گی۔ ممکن ہے کہ وہ مجھے قصبہ چھوڑنے کے لیے کہیں، اور یا اس رقم میں سے اپنا حصہ طلب کریں جو میں دبائے بیٹھی تھی۔"

"اس رقم کے بارے میں کیا کہو گی جو نیویارک پولیس کے مطابق تمہارے پاس ہے؟"

"اگر میرے پاس کوئی بھاری رقم ہوتی تو کیا میں اپنی گزر اوقات کے لیے چھوٹا سا کیبن چلا رہی ہوتی؟ مجھے پکی ملازمت چھوڑنے کے بعد دوسری جاب بھی نہیں ملی اور یہ چھڑی کے سہارے چلنے پر مجبور ہوں۔ میں نے ان ٹانگوں کے مقابلے میں زیادہ پیسا کمایا ہے جو کسی سہارے کے بغیر نہیں چل سکتیں۔"

"گویا یہی تمہارا جواب ہے؟" جارج نے پوچھا۔

"میرے شوہر کے قتل کے بعد اس کے گروپ کے ساتھیوں نے ہمارے گھر کی ہر چیز پر قبضہ کر لیا۔ ویسے بھی میرا شوہر حصص اور بانڈز وغیرہ خریدنے کا قائل نہیں تھا اور ساری کمائی نقدی کی صورت میں اپنے پاس رکھتا تھا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یہ دولت کہاں چلی گئی۔ بروک لین میں نامی بوائے الفریڈ و بتائے گا کہ یہ رقم کہاں ہے۔ اگر اسے یہ پتا ہوتا کہ میرے شوہر نے اپنی رقم کا کچھ حصہ میرے پاس بھی رکھوایا تھا تو وہ یہ پیسے چھین کر مجھے بھی دریا میں پھینک دیتا۔"

جارج نے ایک لمحے کے لیے سوچا پھر بولا۔ "تمہارے پاس سے جو ہتھیار برآمد ہوئے ان کے بارے میں کیا کہو گی؟"

"اعشاریہ دو دو کا ریوالور مجھے تحفے میں ملا تھا۔" وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ "میری بتیسویں سالگرہ پر شوہر نے دیا تھا جبکہ اعشاریہ تین آٹھ کا ریوالور اس کی ملکیت تھا۔ میں ان دونوں ہتھیاروں کا کیا کرتی... کوڑے کے ڈھیر میں پھینکتی یا پولیس والوں کے حوالے کر دیتی؟ جب میں نیویارک چھوڑنے لگی تو وہ دونوں ریوالور اپنے سوٹ کیس میں رکھ لیے۔"

"فرانسس یہاں کیوں آیا تھا؟ کیا تم نے اسے اپنی موجودگی کے بارے میں بتایا تھا؟"

"نہیں، البتہ میں کسی شخص کی ضرورت محسوس کر رہی تھی۔ ماضی میں ہمیشہ میرے دو تین مردوں سے تعلقات رہے۔ فرانسس بھی انہی میں سے ایک تھا۔ میرے شوہر کے مرنے کے بعد اس نے دوبارہ میرے پاس آنا شروع کر دیا۔ وہ مجھے تلاش کرتا ہوا یہاں بھی پہنچ گیا۔ وہ مجھ سے شادی کرنے کے بارے میں سنجیدہ تھا۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی جارج اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے روزی! میں تم سے رابطے میں رہوں گا اور ممکن ہے کہ اینڈریو بھی تم سے ملنے آئے۔"

شام کو وہ اینڈریو کے دفتر پہنچا تو اس نے پوچھا۔ "تم نے جن لوگوں کو فون کیے تھے، ان سے کچھ معلومات حاصل ہوئیں؟"

جارج سپاٹ لہجے میں بولا۔ "جنرل موٹرز کے لیگل ڈپارٹمنٹ نے بتایا ہے کہ تقریباً آٹھ لاکھ ایک ہزار نو سو پچانوے نئی کاریں اس ماڈل کی فروخت ہوئی ہیں اور ان سب کے ٹائروں کی یہی پیمائش ہے۔ اس کے علاوہ دس لاکھ دوسری کاروں مثلاً جنرل موٹرز، فورڈز کریسلرز، ریمبلرز اور اسٹڈ بیکرز کے ٹائروں کی پیمائش بھی کم و بیش اتنی ہی ہے۔"

"اس کے علاوہ کوئی اور بات معلوم ہوئی؟" اینڈریو نے پوچھا۔

"محکمہ موسمیات کا کہنا ہے کہ ستمبر کے آخر اور اکتوبر کے شروع میں اس علاقے میں بہت بارش ہوتی ہے۔ یہ لاش سات اکتوبر کو ملی اور ایک اندازے کے مطابق اسے وہاں پڑے ہوئے پانچ سے دس دن ہو چکے تھے۔ جائے وقوعہ کی تصاویر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ٹائروں کے نشانات بہت زیادہ گیلی زمین پر بنے ہوئے ہیں۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کوئی شخص پختہ سڑک سے اتر کر کیچڑ میں گاڑی چلانے کا خطرہ کیوں مول لے سکتا ہے جبکہ اس کی گاڑی کی ڈکی میں ایک لاش بھی موجود ہو؟ اس کے لیے آسان راستہ تو یہ تھا کہ وہ لاش کو سڑک کے کنارے پھینک کر فرار ہو جاتا۔ پولیس کا خیال ہے کہ روزی اس لاش کو جنگل میں چھپانا چاہ

رہی تھی اور اس کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ لاش کو گھسیٹ کر تیس گز دور اس جگہ لے جاتی جہاں سے یہ لاش ملی ہے چنانچہ وہ اپنی کار چلا کر وہاں تک گئی۔"

"ضروری نہیں کہ ٹائروں کے یہ نشانات روزی کی گاڑی کے ہوں۔ کوئی شکاری یا کوئی جوڑا بھی وہاں سے گزر سکتا ہے۔ تمہارے حاصل کردہ اعداد و شمار کے مطابق ایسی تیس لاکھ گاڑیاں سڑکوں پر موجود ہیں جن کے ٹائروں کی پیمائش کم و بیش یہی ہے۔"

"ہاں۔" جارج نے کہا۔ "اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اصل قاتل نے اپنی کار سڑک پر ہی چھوڑ دی ہو اور لاش کو گھسیٹتا ہوا وہاں تک لے گیا ہو۔ اس کے نتیجے میں جو نشانات بنے، وہ تیز بارش کی وجہ سے صاف ہو گئے۔"

"یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا۔" اینڈریو جلدی سے بولا۔

جارج چند لمحے سوچتا رہا پھر اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "کیا تم پولیس کو فون کر کے میرے لیے روزی اور فرانسس کے گھر تک رسائی کا بندوبست کر سکتے ہو؟ شاید وہاں سے کچھ سراغ مل جائے۔"

اینڈریو نے انٹرکام پر اپنی سیکریٹری سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "انسپکٹر چارلی سے بات کرواؤ۔"

دوسری صبح جارج اپنی کار میں شرلے کے لیے روانہ ہو گیا۔ راستے میں ایک جگہ رک کر اس نے اپنے کیمرے میں فلم ڈالی اور تھوڑی دیر بعد ہی وہ روزی کے مکان کے دروازے پر کھڑا تھا جہاں اس کی ملاقات شرلے کے پولیس چیف ورگی سے ہوئی۔ جارج کو دیکھتے ہی وہ بولا۔ "اس قتل کی تفتیش ماسٹک کا پولیس چیف کارسن کر رہا ہے کیونکہ یہ واردات اس کے علاقے میں ہوئی ہے۔ میں صرف تمہاری مدد کے لیے یہاں آیا ہوں۔"

جارج نے مسکراتے ہوئے گھر کی چابی اس سے لی اور بولا۔ "وہ تو ٹھیک ہے لیکن مقتول اور ملزم دونوں ہی تمہارے علاقے میں رہتے ہیں۔"

وہ دونوں مکان کے اندر چلے گئے لیکن انہیں وہاں کوئی قابل ذکر ثبوت نہیں ملا۔ باہر آنے کے بعد ورگی نے کہا۔ "فرانسس کا مکان قریب ہی ہے۔ وہاں تک پیدل بھی جایا جا سکتا ہے۔"

وہ درختوں سے گھری ویسٹن اسٹریٹ سے ہوتے ہوئے فرانسس کے مکان تک پہنچے جو روزی کے کیبن کے مقابلے میں خاصا بڑا تھا اور کم از کم تین چوتھائی ایکڑ پر پھیلا ہوا تھا۔ جارج اور ورگی پانچ سیڑھیاں چڑھ کر مرکزی

دروازے تک پہنچے۔ جونہی جارج نے دروازے کا تالا کھولا تو ورتھی کہنے لگا۔ ”تم اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔ کاؤنٹی کے لڑکے اور چور تمام سارا قیمتی سامان پہلے ہی لے جا چکے ہوں گے۔“

جارج نے دہلیز پر کھڑے ہو کر اندر جھانکتے ہوئے کہا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن میں کسی قیمتی چیز کی تلاش میں یہاں نہیں آیا۔ تم نہیں جانتے کہ میں کیا ڈھونڈ رہا ہوں۔“

ورتھی کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ”مجھے ذرا جلدی جانا ہے۔ تم اپنا کام ختم کرنے کے بعد دونوں چابیاں میرے دفتر میں چھوڑ دینا۔ میں ہفتے کی شام ایک مردہ شخص کے گھر میں ضائع نہیں کر سکتا جبکہ ملزم پہلے ہی لاک اپ میں بند ہے۔“

جارج نے متانت سے کہا۔ ”جیسا تم مناسب سمجھو۔“

ورتھی واپس جانے کے لیے مڑتے ہوئے بولا۔ ”چابیاں میرے ڈپٹی کو دے دینا اور اگر وہ موجود نہ ہو تو میری میز پر رکھ دینا۔“

اس کے جانے کے کافی دیر بعد جارج مکان کے عقبی حصے کی طرف گیا اور اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ وہ عمارت چاروں طرف سے درختوں سے گھری ہوئی تھی۔ جارج کی نگاہ بائیں جنگل کی طرف گئی اور اسے جھاڑیوں کے درمیان سے ایک غیر استعمال شدہ پگڈنڈی نظر آئی جو جنگل کی طرف جا رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی جارج کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ وہ خود دیہات میں پلا بڑھا تھا اور اپنے آبائی قصبے کے گرد واقع جنگلوں، آبشاروں اور جھیل سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے کم عمری میں ہی بہت سی باتیں جان لی تھیں اور اسے معلوم تھا کہ جنگلوں میں واقع پگڈنڈی کہیں نہ کہیں جا کر ضرور ختم ہوتی ہے۔ وہ کوئی تالاب، سوئمنگ پول، آبشار یا کسی شکاری کا کیبن بھی ہو سکتا ہے۔

جارج کا تجسس بڑھ گیا اور اس نے یہ جاننے کے لیے اس پگڈنڈی پر چلنا شروع کر دیا کہ وہ کہاں جا کر ختم ہوتی ہے۔ وہ پگڈنڈی پوری طرح گھاس سے ڈھکی ہوئی تھی جس کا واضح مطلب تھا کہ اسے کافی عرصے سے استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ جیسے ہی وہ پگڈنڈی کے سرے پر پہنچا تو اس کے شبہات کی تصدیق ہو گئی۔ بیس فٹ کے فاصلے پر اسے تختوں سے بنے ہوئے کیبن کا ڈھانچا نظر آ رہا تھا جسے مختلف سائز اور اقسام کے بیکار سامان سے بنایا گیا تھا۔ اب وہاں مثلث کی شکل میں درختوں کے تین تنے پڑے ہوئے تھے جبکہ بیشتر ڈھانچا گل سڑ گیا تھا۔

جارج بہت دیر تک یہ منظر دیکھتا رہا۔ بچپن کی یادیں اس کے ذہن میں تازہ ہونے لگیں جب وہ اور اس کا کزن اسی طرح سے درختوں کے گھر بنایا کرتے تھے اور ان کے مستقل آنے جانے سے ایسی ہی ایک پگڈنڈی بن گئی تھی جیسی کہ اس وقت اسے نظر آ رہی تھی۔ آخری بار اس نے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو اسے کچھ اور چیزیں بھی نظر آئیں۔ چند گز آگے جانے کے بعد جنگل کچھ اور چوڑا ہو گیا تھا۔ وہ تھوڑا سا مزید اس راستے پر آگے بڑھ گیا۔

ایک پرانی دس فٹ چوڑی گندی گلی فرانسس کے گھر کے عقبی حصے کے متوازی گزر رہی تھی۔ جارج کو اس گلی کی موجودگی پر کوئی حیرانی نہیں ہوئی۔ لانگ آئی لینڈ اس طرح کی گلیوں سے بھرا ہوا تھا جو کسی نقشے میں نہیں دکھائی جاتی تھیں۔ جارج نے اپنی زندگی میں اس طرح کی کئی گلیاں دیکھی تھیں اور جانتا تھا کہ یہ کسی نہ کسی مرکزی سڑک سے جا ملتی ہیں۔ اسے گلی کے ساتھ گھاس کا ایک قطعہ بھی نظر آیا جو پندرہ فٹ طویل تھا اور اس کی چوڑائی اتنی تھی کہ وہاں ایک گاڑی کھڑی ہو سکتی تھی۔ وہ اس پر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ گندی گلی کی نسبت یہ جگہ نسبتاً صاف تھی۔ پھر اچانک اسے وہ کچھ نظر آ گیا جس کے بارے میں اس نے سوچا بھی نہ تھا۔ وہ ٹائروں کے نشانات تھے اور واضح طور پر نظر آ رہے تھے۔ گو کہ مارچ کی دھوپ نے اس جگہ کو خشک کر دیا تھا لیکن لگتا یہی تھا کہ یہ نشانات اس وقت بنے ہوں گے جب زمین نرم اور گیلی تھی۔

اسے یہ نشانات کچھ عجیب سے معلوم ہوئے۔ وہ گھٹنوں کے بل جھک کر انہیں غور سے دیکھنے لگا۔ اس نے تیس سالہ پولیس کی نوکری میں موقع واردات پر ٹائروں کے کئی نشانات دیکھے تھے لیکن یہ ان سے بالکل مختلف تھے۔ ان نشانات سے وہ گاڑی کے ڈرائیو وہیل کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ہر گاڑی میں ایک ہی ڈرائیو وہیل ہوتا ہے، چاہے وہ دائیں جانب ہو یا بائیں جانب لیکن جس انداز سے ٹائر کیچڑ میں دھنسے تھے، اس سے یوں لگ رہا تھا کہ گاڑی میں ایک کے بجائے دو ڈرائیو وہیل ہیں اور وہ دونوں اگلے پہیوں کی طرح ایک ہی جانب گھومتے ہیں جس سے پتا چلتا تھا کہ اسٹیئرنگ وہیل پچھلے پہیوں کے بجائے اگلے پہیوں کو گھما رہا ہے۔ جارج نے پچھلے ٹائروں کے نشانات دیکھے۔ وہاں اسے کیچڑ ہٹنے کا نشان نظر نہیں آیا۔ وہ حیرانی کے عالم میں اپنا سر کھجانے لگا۔ اگر وہ چار پہیوں والی گاڑی تھی تو کیچڑ پر چاروں پہیوں کے نشانات ہونے چاہیے تھے لیکن ایسا نہیں تھا۔ یہ کون سی کار تھی جس کا اسٹیئرنگ صرف اگلے پہیوں کو ہی چلاتا تھا۔

اچانک ایک خیال بجلی کی طرح اس کے ذہن میں کوندا۔ ہو نہ ہو ان نشانات کا تعلق فرانسس کے قتل سے ہے۔ یقیناً کوئی شخص ایک ایسی گاڑی میں یہاں آیا جو دوسری گاڑیوں سے منفرد اور مختلف ہے۔ سب سے پہلے اس گاڑی کو تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔ یہ سوچ کر وہ واپس مڑا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اپنی کار کی طرف روانہ ہو گیا جو ابھی تک روزی کے مکان کے باہر کھڑی ہوئی تھی۔ اسے ان نشانات کی تصویریں بنانے کے لیے کیمرے کی ضرورت تھی جو اس نے اپنی کار میں ہی چھوڑ دیا تھا۔

واپس آتے ہوئے وہ راستے میں فرانسس کی ورکشاپ پر رکا۔ اس نے وہاں نصب پبلک فون بوتھ سے اپنے دوست پولیس چیف نیل کارٹر کا نمبر ملایا اور بولا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تم کاؤنٹی کے نقشے پر نظر ڈال کر یہ معلوم کرو کہ شرلے کے علاقے میں ہیسٹن روڈ سے چھ بلاک کے فاصلے پر ایک گندی گلی گزرتی ہے جو سڑکوں کے کسی نقشے پر نظر نہیں آئے گی البتہ فضائی سروے سے لی گئی تصویروں میں اس کی نشاندہی ہو سکتی ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ گلی کہاں جاتی ہے اور کس جگہ یہ مرکزی شاہراہ سے ملتی ہے؟“

”کیا یہ جاننا تمہارے لیے بہت اہم ہے؟“ کارٹر نے پوچھا۔

”ممکن ہے۔ تم فی الحال مجھے چیک کر کے بتاؤ۔ میں اس وقت فرانسس کی ورکشاپ پر ہوں اور مجھے ایک معاملے میں رائے چاہیے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں تمہیں تھوڑی دیر بعد فون کرتا ہوں۔“

☆☆☆

جارج نے اپنے کاؤنٹر پر بیٹھے بیٹھے بڑے غور سے ان چھ تصویروں کا معائنہ کیا جو اینڈریو نے اس کے سامنے رکھی تھیں اور سوالیہ انداز میں اس کی جانب دیکھنے لگا۔

اینڈریو بے تابی سے بولا۔ ”تم کیچڑ کے چھینٹے دیکھ رہے ہو۔ یہ صرف کار کے اگلے ٹائروں کے نشان ہیں۔“

جارج نے ایک بار پھر تصویروں کو غور سے دیکھا اور بولا۔ ”یہ جیپ یا ویگن کی طرح چار پہیوں والی گاڑی معلوم نہیں ہوتی۔ پچھلے پہیوں نے کیچڑ میں کوئی نشان نہیں بنایا۔“

”ہاں اور یہ دونوں بالکل سیدھے ہیں جیسے انہیں فکس کر دیا گیا ہو۔ اگر یہ ڈرائیو وہیل ہوتے تو کیچڑ کو پیچھے کی جانب اچھالتے لیکن پچھلے پہیوں کا کوئی نشان نظر نہیں آ رہا۔“

جارج نے تائید میں سر ہلایا اور بولا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اب مجھ سے کیا پوچھنا چاہ رہے ہو؟“

”میں دس سال کی عمر سے گاڑی چلا رہا ہوں لیکن میں نے اپنی زندگی میں ایسی گاڑی نہیں دیکھی جس کے ٹائروں کے نشانات اس طرح کے ہوں۔“

”یقیناً تم نے ایسی گاڑی نہیں دیکھی ہوگی۔“ جارج تصویروں والا لفافہ اسے واپس کرتے ہوئے بولا۔ ”کیونکہ یہ فرنٹ وہیل ڈرائیو ہے اور 1930ء میں کارڈ کمپنی نے اس طرح کی کچھ گاڑیاں بنائی تھیں۔ وہ صرف دو سال چلیں اور ان کی قیمت کیڈی لاک کے برابر تھی۔ اب یہ گاڑی کہیں نظر نہیں آتی۔“

اینڈریو نے اپنی جیب سے ایک پرچہ نکالا اور جارج کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”میں نے اگلے اور پچھلے

ٹائروں کے درمیانی فاصلے کی پیمائش کی تھی۔ اگلا ٹریک ساٹھ انچ چوڑا ہے جبکہ پچھلے ٹریک کی چوڑائی پچاس یا اکیاون انچ ہے۔ اس سے تم کچھ اندازہ لگا سکتے ہو؟''

جارج نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولا۔ ''میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن کارڈ کافی بڑی کار تھی لیکن اس کا پچھلا ٹریک نسبتاً کم چوڑا تھا۔''

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے پولیس چیف کارٹر بول رہا تھا۔ ''یہ گلی آگ بجھانے والی گاڑیوں کے لیے ہے اور یہ ہیسٹن روڈ کے متوازی چلتے ہوئے شمال میں سن رائز ہائی وے سے مل جاتی ہے۔ یہ صرف خوفناک آگ لگ جانے کی صورت میں فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کو راستہ مہیا کرتی ہے اور حقیقت میں کہیں جا کر ختم نہیں ہوتی۔''

''کاؤنٹی روڈ 80 تو کہیں نہ کہیں جاتی ہوگی۔'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ''یہ لین سیدھی اس مقام تک جاتی ہے جہاں سے لاش برآمد ہوئی تھی۔'' اس نے لمحہ بھر توقف کرنے کے بعد کارٹر سے پوچھا۔ ''کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ کس مقام پر کاؤنٹی روڈ سے ملتی ہے؟''

کارٹر نے نقشہ دیکھنے کے بعد کہا۔ ''کلفورڈ روڈ پر واقع اسٹینڈرڈ فارم کے مشرق میں چوتھائی میل کے فاصلے پر یہ بڑی سڑک سے مل جاتی ہے۔''

''ٹھیک ہے، تمہارا بہت بہت شکریہ۔'' یہ کہہ کر وہ اینڈریو کی طرف مڑا اور کہنے لگا۔ ''تم فرانس اور اٹلی بھی جا چکے ہو۔ وہاں تم نے کوئی ایسی کارڈ کار دیکھی؟''

''نہیں، اگر تمہیں کارڈ کی تلاش ہے تو بہتر ہوگا کہ کسی عجائب گھر سے شروع کرو اور جہاں تک اس جیسی دوسری کار سٹروِن کا تعلق ہے تو شاید ہی کوئی ایسا بے وقوف ہوگا جو باہر کی بنی ہوئی ایسی بدصورت کار خریدے۔''

''تم کسی اور فرنٹ وہیل ڈرائیو کے بارے میں جانتے ہو؟''

''نہیں، میں نے کسی اور کار کے بارے میں نہیں سنا اور نہ ہی یقین سے کچھ کہہ سکتا ہوں۔ البتہ اب مجھے یاد آ رہا ہے کہ سٹروِن کار، کارڈ سے پہلے مارکیٹ میں آئی تھی۔''

''بہت بہت شکریہ۔ تم نے میری بہت مدد کی۔''

''کوئی بات نہیں لیکن تم نے کافی عرصے سے اپنی گاڑی کی ٹیوننگ اور آئل تبدیل نہیں کروایا۔ اس کا خیال رکھو ورنہ بیچتے وقت اچھی قیمت نہیں ملے گی۔''

پیر کی صبح وہ لائبریری گیا اور اسے ہیسنگز موٹر نیوز کے پرانے شماروں سے مطلوبہ معلومات مل گئیں۔ اس کے مطابق آخری کارڈ کار 1937ء میں بنائی گئی تھی۔ لیکن اس کی تفصیلات جاننے کے بعد معلوم ہوا کہ اس کے پچھلے ٹائروں کا درمیانی فاصلہ اتنا کم نہیں ہوتا۔ البتہ سٹروِن کار کا اگلا ٹریک انسٹھ اعشاریہ ایک انچ اور پچھلا ٹریک اکیاون اعشاریہ سات انچ تھا اور یہ تقریباً وہی پیمائش تھی جو جارج نے ٹائروں کے نشان ناپ کر کی تھی۔ یہ بہت مہنگی کار تھی اور اس کی قیمت لنکن یا کیڈی لاک سے بھی زیادہ تھی۔ اسی وجہ سے یہ کاریں بہت کم تعداد میں فروخت ہوئیں۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ قاتل نے لاش کو ٹھکانے لگانے کے لیے ایک ہی کار استعمال کی تھی تو اس تک پہنچنے کے لیے اس کار کی شناخت ضروری ہو گئی تھی۔

اس نے مختلف لوگوں سے ملاقات اور ٹیلی فون کے ذریعے حاصل ہونے والی معلومات ایک فائل میں لگائیں اور اینڈریو کے دفتر پہنچ گیا اور اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''پورے ملک میں سٹروِن کار کے صرف دو ہی ڈیلرز ہیں۔ ان میں سے ایک لاس اینجلس میں اور دوسرا نیویارک میں ہے۔ نیویارک میں واقع اس کمپنی کے سیلز منیجر کا کہنا ہے کہ جب سے یہ کار مارکیٹ میں آئی ہے، وہ صرف اب تک دو سو کاریں فروخت کرنے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر گاڑیاں برف باری والے علاقوں میں بھیج دی گئیں کیونکہ فرنٹ وہیل ڈرائیو کی وجہ سے برفانی راستوں پر یہ گاڑی اچھی طرح چلتی ہے جبکہ لاس اینجلس میں اس کار کے خریداروں میں وہ فلم اسٹار شامل ہیں جنہیں انواع و اقسام کی گاڑیاں جمع کرنے کا شوق ہے۔ ان میں سے نیویارک سٹی میں فروخت ہونے والی صرف بائیس گاڑیاں ہیں جن کے ٹریک کی پیمائش ہمیں ملنے والے نشانات کے مطابق ہے۔''

اینڈریو نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم نے ان لوگوں کی فہرست حاصل کرنے کی کوشش کی جنہوں نے یہ گاڑیاں خریدی تھیں؟''

''سیلز منیجر نے فوری طور پر اس کی حامی نہیں بھری۔ اس کا کہنا ہے کہ پہلے وہ اپنے قانونی ماہرین سے مشورہ کرے گا البتہ اس نے ایک اہم بات یہ ضرور بتا دی کہ لانگ آئی لینڈ سے تعلق رکھنے والے کسی فرد نے اس سے یہ گاڑی نہیں خریدی۔''

''کیا تمہاری نظر میں اس فہرست کی کوئی اہمیت ہے؟''

''بالکل، میں شروع سے ہی روزی کو اس مقدمے میں بے قصور سمجھ رہا ہوں اور اگر وہ واقعی اس قتل میں ملوث نہیں ہے تو ہم ابھی تک اندھیرے میں ہی ہیں۔ ہمارے پاس کوئی ثبوت ہے نہ قتل کا کوئی محرک اور نہ کوئی ایسا شخص جس پر شبہ کیا جا سکے۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ فرانسس کو کسی تنازع کی بنیاد پر قتل کیا گیا۔ اس کا کوئی دشمن تلاش کرتا ہوا یہاں آیا اور اسے گولی ماردی۔''

''یہ محض تمہارا خیال بھی ہو سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے پھر تم روزی کے مقدمے کی پیروی کرو اور اپنی بہترین صلاحیتوں کو استعمال کرتے ہوئے اسے گیس چیمبر سے بچانے کی کوشش کرو۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔''

اینڈریو کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''تم ڈیلر سے اس گاڑی کے خریداروں کی فہرست حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ اگر وہ ٹال مٹول کرے تو اس کے لیے عدالتی حکم بھی لیا جا سکتا ہے۔ ہم روزی اور نیویارک پولیس کو وہ فہرست دکھائیں گے۔ شاید اس طرح کسی شخص کی نشاندہی ہو جائے۔''

اینڈریو مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تم نے پولیس کی نوکری میں عمر گنوا دی حالانکہ تم ایک اچھے وکیل ثابت ہو سکتے تھے۔'' پھر اس نے انٹرکام پر اپنی سیکریٹری کو ہدایت کی کہ وہ فوراً جج رابرٹ مولی سے اس کی بات کروائے۔

جارج ایک خاص نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔ اب اسے روزی سے ایک ملاقات کرنا تھی۔ وہ اس سے ملنے جیل پہنچا۔ اسے دیکھ کر روزی کے ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ پھیل گئی جیسے وہ اسی کا انتظار کر رہی ہو۔

''میرا خیال ہے کہ قاتل اس کی تلاش میں شہر سے آیا تھا۔ اس نے اندھیرا پھیلنے کے بعد اپنی گاڑی میں گھوم کر علاقے کا جائزہ لیا۔ اس رات بارش ہو رہی تھی اور لوگ اپنے گھروں میں دبکے ہوئے تھے۔ اس لیے کسی نے بھی اسے کار چلاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اسے وہ گلی بھی نظر آ گئی جو فرانسس کے گھر کے عقب سے گزرتی ہوئی روٹ 80 تک جاتی ہے۔ وہ واپس فرانسس کے گھر تک گیا۔ اپنی گاڑی گلی کے کنارے کھڑی کی۔ اسے معلوم تھا کہ بارش کی وجہ سے وہ کسی کی نظروں میں نہیں آئے گا۔ وہ بڑے اطمینان سے چلتا ہوا آیا۔ دروازے پر دستک دی اور جب فرانسس نے دروازہ کھولا تو وہ اسے ریوالور دکھا کر اپنی گاڑی تک لے گیا اور اسے گولی ماردی۔ پھر وہ گاڑی چلاتا ہوا اس مقام تک آیا جہاں سے لاش ملی تھی۔ اس نے اپنی گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی کی اور لاش گھسیٹتا ہوا جنگل تک لے گیا۔''

روزی مسکراتے ہوئے بولی۔ ''گویا تمہیں میری بے گناہی کا یقین آ گیا؟''

جارج ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''فی الحال تم اسے شک کا فائدہ سمجھ سکتی ہو۔ یقین تو بہت بڑا لفظ ہے۔''

''لاش کو ٹھکانے لگانے کے بعد وہ غائب ہو گیا اور پولیس نے مجھے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا جبکہ ان کے پاس میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔'' وہ روہانسی ہوتے ہوئے بولی۔

''اس نے سارا کام بہت ہوشیاری سے کیا۔ لاش کو وہاں پھینکنے کے بعد وہ اسی گلی میں گاڑی چلاتا ہوا سن رائز ہائی وے پر جا نکلا اور سیدھا شہر پہنچ گیا۔''

''تم مجھ سے یہی کہنے آئے تھے یا تمہاری آمد کا کوئی اور مقصد بھی ہے؟'' روزی نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

جارج نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور اسے میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ نیویارک میں رہنے والے خریداروں کی فہرست ہے۔ تم اس پر نظر ڈال کر بتاؤ کہ ان میں سے کوئی نام تمہیں جانا پہچانا لگتا ہے؟''

روزی چند سیکنڈ تک وہ فہرست دیکھتی رہی پھر اس کی

اعصابی انتشار

ایک نوجوان نے دوست کو بتایا۔ ''زیادہ ورزش کی وجہ سے میں اعصابی انتشار کا مریض بن کر رہ گیا ہوں۔''

دوست نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ''تو پھر تم زیادہ ورزش نہ کیا کرو۔''

''ورزش میں نہیں، سامنے فلیٹ میں رہنے والی گداز بدن کی لڑکی کرتی ہے۔'' نوجوان نے جواب دیا۔ ''میں تو بس اسے دیکھنے کے چکر میں رہتا ہوں۔''

(کراچی سے شاہد حسین کی بے بسی)

آنکھوں میں ایک چمک ابھری اور وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔

"اس میں ایک نام لائم بیرن کا ہے۔" وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔ "اسے میں جانتی ہوں۔ وہ آئرش نسل کا سابق پولیس آفیسر ہے اور اس کے پاس ایک فرانسیسی کار ہے۔"

☆☆☆

وہ تینوں ایک ریستوران میں ڈنر کر رہے تھے۔ جارج اور اینڈریو کے علاوہ تیسرا شخص پولیس چیف ورتھی تھا۔ جارج نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "لائم بیرن اور فرانسس پولیس کے زمانے کے ساتھی تھے۔ ان دونوں نے ناجائز ذرائع سے بہت پیسا بنایا۔ پولیس سے ریٹائر ہونے کے بعد فرانسس نے کسی کو بتائے بغیر شہر چھوڑ دیا اور شرلے نامی قصبے میں رہائش اختیار کرلی۔ کسی کو معلوم نہ ہوسکا کہ وہ اچانک کہاں چلا گیا۔ اس کے غائب ہوجانے سے سب سے زیادہ پریشانی بیرن کو ہوئی کیونکہ وہ ساری دولت سمیٹ کر لے گیا تھا جو انہوں نے ناجائز ذرائع سے حاصل کی تھی اور جس میں بیرن کا آدھا حصہ تھا۔ وہ انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ اس نے کسی نہ کسی طرح فرانسس کا پتا چلالیا اور اسے کیفرِ کردار تک پہنچا دیا۔ اس کی کار کی ڈکی میں خون کے دھبے پائے گئے ہیں جو فرانسس کے ہی ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ روزی کو رہا کردیا جائے گا۔" ورتھی نے بیئر کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"ہم نے اس کے خلاف مقدمہ خارج کرنے کی درخواست دے دی ہے اور جج اس کا جائزہ لے رہا ہے۔ امید ہے کہ اسے جلد ہی رہا کردیا جائے گا۔ البتہ بیرن کے بارے میں مزید معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ اس کے نام پر اعشاریہ تین آٹھ کے دو ریوالور رجسٹرڈ ہیں۔ ان میں سے ایک سروس ریوالور ہے جو اسے پولیس کی ملازمت کے دوران ملا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ اس نے یہ ریوالور ریٹائرمنٹ کے بعد کسی کے ہاتھ فروخت کردیا تھا لیکن وہ خریدار کا نام اور اس کے بارے میں دیگر معلومات بتانے سے قاصر ہے۔ اس نے یہی ریوالور 1950ء میں ہونے والے ایک پولیس مقابلے میں استعمال کیا تھا اور اس دوران اس کے ہاتھوں ایک مشہور جواری مارا گیا جبکہ بیرن کا کہنا تھا کہ اس نے اپنے دفاع میں گولی چلائی تھی لیکن اندرونی ذرائع کچھ اور ہی کہانی بتاتے ہیں جس کے مطابق بیرن نے یہ قتل اس جواری کے مخالف گروپ کے کہنے پر کیا تھا۔

چنانچہ پولیس نے تمام شہادتیں اور ثبوت محفوظ کرلیے تھے۔ فرانسس کو بھی اسی ریوالور سے ہلاک کیا گیا ہے۔"

ورتھی سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "اگر جج کو یہ اطمینان ہے کہ روزی اس قتل میں ملوث نہیں ہے اور اصل قاتل کی بھی نشاندہی ہوگئی ہے تو وہ اسے اس الزام سے بری کرسکتا ہے۔"

جارج بیئر کا گھونٹ لیتے ہوئے بولا۔ "دراصل ابھی سرکاری وکیل کے دلائل مکمل نہیں ہوئے۔ اس کی پوری بات سننے کے بعد ہی جج کوئی فیصلہ کرسکے گا لیکن میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ بے گناہ ہے اور اسے بری کردیا جائے گا۔"

اینڈریو معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ "تم اس کے حق میں اتنے یقین سے بول رہے ہو جیسے تم جج نہیں بلکہ تم اس کے وکیل ہو۔ مانتا ہوں کہ تم نے اصل مجرم تک پہنچنے میں بڑی محنت کی ہے اور ایک بے گناہ عورت کو سزا سے بچالیا ہے لیکن اب تم جس انداز میں اس کی وکالت کررہے ہو، اس سے مجھے کچھ شک ہونے لگا ہے۔ لگتا ہے کہ اس سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہوگئے ہو۔"

جارج کو یوں لگا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ وہ روزی سے صرف متاثر ہی نہیں ہوا بلکہ اپنا دل بھی ہار بیٹھا تھا۔ جب اینڈریو نے پہلی بار اس کے سامنے روزی کو بے گناہ ظاہر کرنے کی کوشش کی تو اس نے وکیل کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی تھی لیکن روزی سے پہلی بار ملنے کے بعد اسے محسوس ہوا کہ وہ صرف حسین اور دلکش ہی نہیں بلکہ اسے مردوں کو قابو کرنے کا ہنر بھی آتا ہے۔ گو کہ اس کا ماضی بے داغ نہیں تھا اور وہ کئی مردوں کو اپنے جال میں پھنسا چکی تھی لیکن جارج کو امید تھی کہ اس نے روزی کو بے گناہ ثابت کرکے جو احسان کیا ہے، اس کے صلے میں وہ اس سے بے وفائی نہیں کرے گی۔ ویسے بھی اس عمر میں روزی کو اس سے زیادہ مخلص اور چاہنے والا شوہر نہیں مل سکتا تھا۔ اس نے نئے نویلے دولہا کی طرح جھینپتے ہوئے اینڈریو کی طرف دیکھا اور کہا۔ "روزی سے ملنے کے بعد کوئی بھی شخص اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکتا اور یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا سر کرسی کی پشت سے لگا لیا۔ اسے یوں لگا کہ یہ اعتراف کرنے کے بعد اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہوگیا ہو۔ اب اسے شدت سے روزی کی رہائی کا انتظار تھا جو جرم بے گناہی کی سزا کاٹ رہی تھی۔

خودغرضی... کی سیڑھی پر پہلا قدم مشکل سے پڑتا ہے... پھر دوسروں کو دھکیل کر خود کھڑے ہوجانا... عادت بنتی چلی جاتی ہے... جھوٹ... فریب اور دغا بازی سے اپنے حق میں کھیل کا رخ موڑنے والوں کی ایک خونی جھلک...

خونی چال

محمد عفان آزاد
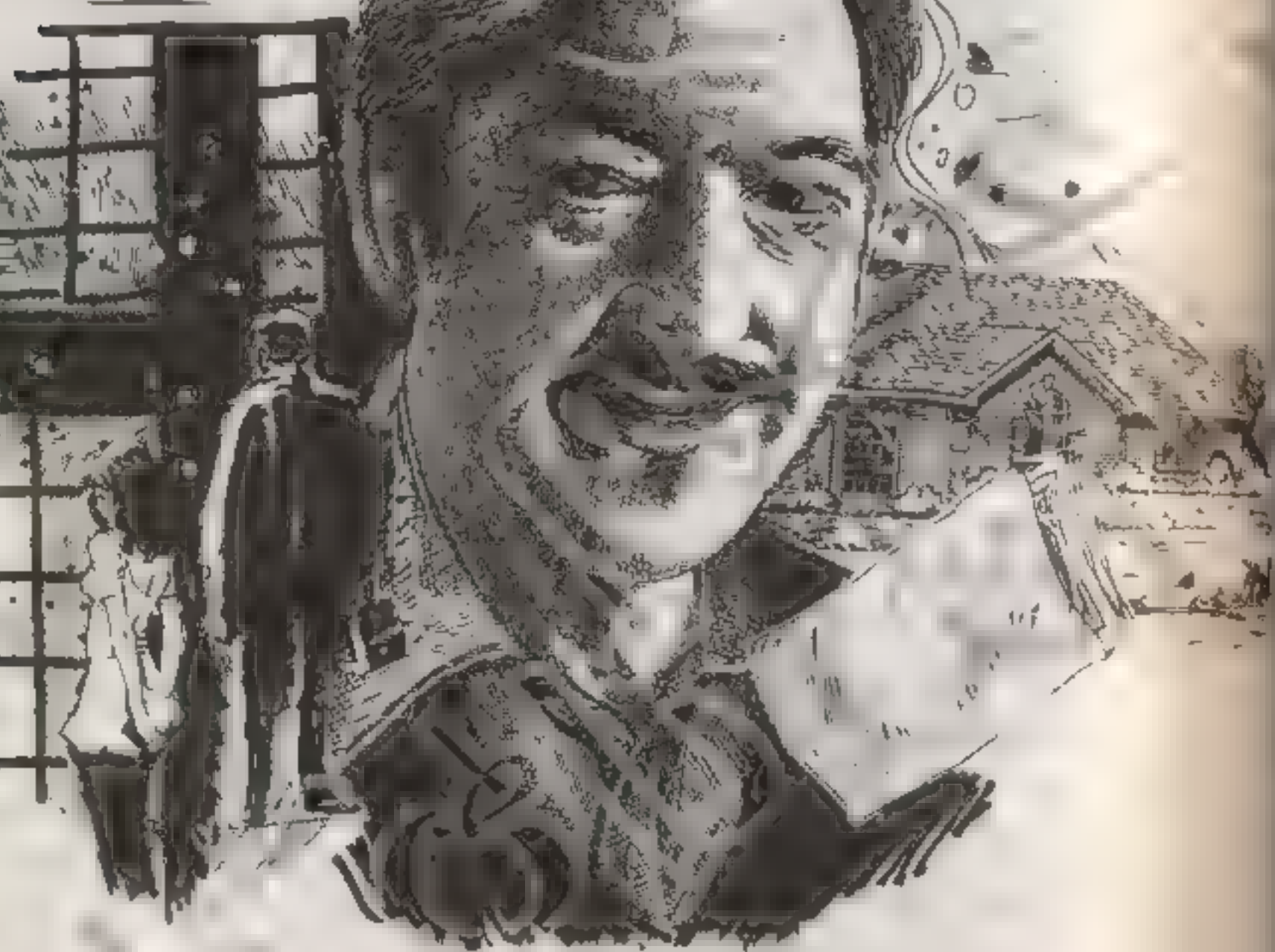
نامعلوم وجوہات کی بنا پر کلائز سے پہنچنے والی فیری کا رخ راستے میں ہی بدل چکا تھا اور اس پر سوار ہوکر لندن پہنچنے کے خواہشمند مسافروں میں چارلس میرلے بھی شامل تھا۔ فیری کی روانگی کے وقتِ مقررہ سے پانچ منٹ پہلے چارلس انگلش سمندر کے کنارے واقع چھوٹے سے ساحلی قصبے فاک اسٹون پہنچا تھا۔ کسی کو علم نہیں تھا کہ کن وجوہات کی بنا پر فیری کا رخ تبدیل کیا گیا ہے اور ان کا کیا بنے گا جنہیں اس کے ذریعے لندن پہنچنا تھا۔

چارلس پریشانی کے عالم میں ساحل کنارے، فیری کمپنی کے سامنے فٹ پاتھ پر پریشانی کے عالم میں ٹہل رہا تھا۔ سردی کے باعث ویسے ہی مسافر کم تھے اور وہ سب فیری کی منسوخی کی اطلاع کے بعد ٹکٹ کی رقم واپس لے کر کب کے واپس لوٹ چکے تھے لیکن چارلس کا مسئلہ سنگین تھا۔

پچھلے بیس منٹ کے دوران میں وہ متعدد بار یہ پتا چلانے کی کوشش کر چکا تھا کہ لندن کے لیے اگلی ٹرین کب جائے گی مگر اب تک اس کا مسئلہ برقرار تھا۔ اس وقت بھی وہ یہی سوچ رہا تھا۔ آخر اس نے فیصلہ کیا اور سوٹ کیس اٹھا کے آگے بڑھنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں اس نے ایک ہوٹل تلاش کرلیا مگر اس میں صرف کمرا دستیاب تھا۔ ڈائننگ کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ کھانے پینے کے لیے قریبی ریستوران جانا پڑتا مگر پریشان کن بات یہ تھی چھوٹے سے ساحلی قصبے کا واحد کھلا ریستوران صرف چائے پیش کرتا تھا۔

یہ ساحلی قصبہ موسم گرما کے حوالے سے سیاحتی مقام تھا لیکن دسمبر کے ان اوائلی دنوں میں شدید سردیاں تھی اور سیاحت کا آف سیزن ہونے کے باعث تقریباً تمام تر ہوٹل اور ریستوران بند تھے۔

”میں اب کیا کروں؟“ چارلس نے پاؤں پٹختے ہوئے استقبالیہ پر موجود خاتون سے کہا۔ ”مجھے بھوک لگ رہی ہے اور وہ بھی شدید۔“

”میرا خیال ہے کہ تم ساحل کی طرف واپس جاؤ، وہاں پارک ہے۔ ممکن ہے کہ تمہیں کھانے کو کچھ مل جائے۔“ خاتون نے مشورہ دیا۔

”بہت بہت شکریہ اس مشورے کا۔“ اس نے بیزاری سے کہا اور جواب کا انتظار کیے بنا تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا دوسری منزل پر واقع اپنے کمرے میں پہنچا۔ اندر داخل ہوتے ہی ایک کونے میں سوٹ کیس رکھا اور دروازہ لاک کر کے باہر نکل آیا۔ جیسے ہی وہ باہر آیا، اسے شدید سردی کا احساس ہوا۔ ”کم از کم ہوٹل تو اندر سے گرم ہے، کاش اس میں ریستوران بھی ہوتا۔“ چارلس نے مفلر کو کانوں کے گرد لپیٹتے ہوئے خود کلامی کی اور آگے بڑھ گیا۔

وہ چلتے ہوئے ہلکا سا لڑکھڑا رہا تھا۔ شاید اس کا بلڈ شوگر لیول کم ہو رہا ہوگا مگر یہ بات اس کی بیوی جانتی ہوگی لیکن اس وقت وہ پیرس میں تھی۔ ”اُف...“ بیوی کا خیال آتے ہی اس کے منہ سے نکلا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ ”اس وقت پیرس میں رات کے آٹھ بج رہے ہوں گے۔“ اس نے خود کلامی کی۔

چارلس یہ تو جانتا تھا کہ وہ اس وقت پیرس کے کسی ہوٹل میں ڈنر پر مدعو تھی جہاں اسے برطانوی سفارت خانے کے کسی افسر سے ملنا تھا۔ کون تھا وہ، یہ اسے بھی علم نہیں تھا۔ اس کے بعد... اس نے زور سے سر جھٹکا۔ اس سے آگے وہ کچھ نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ اس کی پریشانی لندن پہنچنا تھی۔ اگر فیری مل جاتی تو اس کے لیے کوئی پریشانی نہ تھی۔ اسے کل سہ پہر لندن میں اہم ملاقات کرنا تھی پھر فوراً پیرس روانہ ہونا تھا مگر اب پورا پروگرام تلپٹ ہو چکا تھا۔

وہ ساحل کے قریب پہنچ چکا تھا۔ بھوک شدت پکڑ رہی تھی۔ اس نے ناشتے کے بعد سے کچھ نہیں کھایا تھا اور اب اتنا راستہ پیدل طے کرنے کے بعد وہ خاصی کمزوری محسوس کرنے لگا تھا۔ اسے سیمنٹ کا زینہ دکھائی دیا۔ وہ سیڑھیاں اترنے لگا۔ ساحل پر جتنی زیادہ سردی تھی، اتنی ہی تیز ہوا چل رہی تھی۔ اس نے سختی سے اپنے گرد اوورکوٹ لپیٹ لیا۔

دھندلکے میں اسے سامنے پلے لینڈ نظر آ رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ استقبالیہ والی خاتون نے اسی جگہ کا اشارہ کیا ہوگا۔ وہ آگے بڑھا۔ واقعی وہ بچوں اور بڑوں کے لیے بنایا گیا کوئی تفریحی پارک ہوگا لیکن شام کے دھندلکے اور سخت سردی میں وہاں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ آگے بڑھا تو اسے لگا کہ پلے لینڈ کی حدود میں کوئی ریستوران ہے۔ وہ آگے بڑھا اور دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن پھر پیچھے ہٹا لیا۔ وہ دروازہ کھولتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ فیری اسٹیشن سے ہوٹل اور پھر وہاں سے یہاں تک ہُو کا عالم تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر وہ ریستوران نہ ہوا یا کم از کم بیکری بھی نہ ہوئی یا اسے وہاں کھانے پینے کی کوئی چیز نہ ملی تو وہ کیا کرے گا۔ یہ تو وہ دیکھ چکا تھا کہ ارد گرد اسے کوئی شخص نظر نہیں آیا تھا۔ اس لیے وہ اور بھی ڈر رہا تھا ایسے میں کیا کھانے کو کچھ مل سکے گا۔ بھوک سے اس پر نقاہت طاری ہو رہی تھی اور اسے فوری طور پر کچھ کھانے کو چاہیے تھا مگر... وہ وسوسوں میں پھنس گیا تھا۔

چارلس حقیقت پسند تھا۔ وہ تصوراتی دنیا میں کبھی نہیں رہا۔ گزشتہ اٹھارہ سال سے وہ خفیہ ایجنسی میں تفتیش کے شعبے سے وابستہ تھا اور بطور کیس افسر کام کر رہا تھا۔ اس وقت تک اسے ایسے کوئی آثار نظر نہیں آئے تھے کہ اسے یقین ہو جائے

کہ کچھ کھانے کو مل سکے گا۔ نہ جانے کیوں اب اس کا دل ڈر رہا تھا دروازہ کھولتے ہوئے۔

اس وقت اسے وہ روسی ادیب یاد آ گیا جو ایک کیس کے سلسلے میں اس سے برلن میں ملا تھا۔ وہ شاعرانہ مزاج کا لاابالی شخص تھا۔ اس نے باتوں باتوں میں کہا تھا جہاں پانی ہو وہاں زندگی ہوتی ہے اور جہاں پانی نہ ہو وہاں ایسا کچھ ضرور ہو سکتا ہے جو برے وقت میں تمہیں زندہ رکھ سکے۔

”افسوس...“ اس نے زیرِ لب کہا۔ اس وقت چارلس نے اس کی بات سے اتفاق نہیں کیا تھا مگر اب یہ بات یاد آتے ہی اس کے چہرے پر پہلی بار ہلکا سا اطمینان نظر آیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولا اور واقعی خوش گوار حیرت میں ڈوب گیا۔

ہال نما کمرا بہت صاف ستھرا اور روشن تھا۔ کافی بڑا ہال تھا مگر لگ بھگ خالی تھا۔ خوش گوار حیرت کی وجہ یہ تھی کہ سامنے ہی بڑے سے کاؤنٹر میں کیک، پیسٹریاں، بسکٹ اور سینڈوچز رکھے ہوئے تھے۔ اسے یقین ہو گیا کہ فیری کی منسوخی کے بعد، جتنا وہ کھانے کے لیے پریشان تھا، اب... کم از کم یہ مشکل تو ختم ہوئی۔

”استقبالیہ کلرک نے ٹھیک کہا تھا۔“ وہ قدم اندر رکھتے ہوئے زیرِ لب بڑبڑایا۔ ”کم از کم ڈنر اور ناشتے کی فکر تو ختم ہوئی۔“ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا سیدھا کاؤنٹر کی طرف بڑھا۔

اس نے کچھ سینڈوچز، پیسٹری، چپس اور پیٹز لیے۔ پلیٹ تھام کر اس نے دوسری طرف دیکھا۔ وہاں چند ان ڈور مشین گیم موجود تھے اور دو افراد ان سے کھیل رہے تھے۔ اب وہ خاصا مطمئن تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ لطف لے کر کھانا کھائے۔ ویسے بھی اب اسے سونے کے بجائے کوئی دوسرا کام نہیں تھا۔ وہ آگے بڑھا۔ گیمز مشین کے ساتھ چند ٹیبل اور کرسیاں تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ وہاں بیٹھ کر سکون سے کھانے کا لطف اٹھائے اور پھر اس کے بعد گرم گرم کافی پیے۔ ویسے وہ پتا کر چکا تھا کہ یہاں کافی بھی دستیاب تھی۔

”کیا تم بھی اُسی فیری کے مسافر ہو؟“ اس سے پہلے کہ چارلس کسی ٹیبل پر بیٹھتا، ٹوئڈ کوٹ پہنے شخص نے اس سے سوال کیا۔ گیمز مشین اس کے عقب میں تھی اور وہ شخص اسی طرف سے آگے بڑھا اور اچانک اس کے سامنے آ گیا۔ اس لیے چارلس ذہنی طور پر اس مداخلت کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔

اس کی بات سن کر چارلس کے قدم جہاں تھے وہیں رک گئے۔ وہ غور سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ کسی سیاح کے چہرے پر اتنی پھٹکار نہیں برس سکتی۔ ویسے بھی یہ اس علاقے میں سیاحت کا آف سیزن تھا اوپر سے شدید سردیاں، ایسے میں گرم کمرے کو چھوڑ کر سرد ترین سمندر کے ساحل پر تفریح کے لیے کوئی نہیں آتا۔ چارلس نے اس کے لہجے پر غور کیا۔ اس کا لب و لہجہ امریکی تھا۔ وہ ذہن پر زور دے رہا تھا کہ آیا اس نے اسے کہیں دیکھا ہے۔ کم از کم کچھ دیر پہلے فیری اسٹیشن پر مگر اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو لمحہ بھر میں اس کے سوال کا جواب دے کر آگے بڑھ جاتا مگر وہ تفتیشی افسر تھا اور اس کی یہ عادت اتنی پختہ ہو چکی تھی کہ اب چاہے بات کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو، وہ سوچے سمجھے بنا کچھ بھی کہنے سے گریز کرتا تھا۔ دوسری بات یہ کہ اجنبی بھی اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے سے ایسے تاثرات جھلک رہے تھے کہ جیسے وہ اس کے خاموش ہو جانے کی وجہ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو مگر پھر بھی سمجھ نہ آ رہی ہو۔

”میرا خیال ہے کہ آپ بھی اس فیری سے لندن جانے والے تھے؟“ اس سے رہا نہ گیا اور اپنا سوال انداز بدل کر دوبارہ کیا۔ اس وقت پورے ہال میں صرف تین افراد تھے۔

”مجھے آج رات تک ہر حال میں لندن پہنچنا تھا مگر...“ اس نے کہا۔

”تمہیں یاد نہیں ہم ایک ہی فیری پر یہاں پہنچے تھے آج شام۔“ اجنبی نے اسے یاد دلانے کے انداز میں کہا۔

”معاف کیجیے گا، مجھے آپ کا ساتھ یاد نہیں رہا۔“ اس نے مہذب لہجے میں، نپے تلے انداز میں جواب دیا۔

”تمہیں وہ عورت یاد آئی جو فیری پر کھلے آسمان تلے کھڑی تھی بنا گرم کپڑوں کے اور سب اس کو دیکھ کر کہہ رہے تھے، بس یہ تو گئی نمونیے کے پاس۔“ اجنبی نے بظاہر اسے یاد دلانے کی ایک اور کوشش کی۔

”اوہ... ہاں مجھے یاد آیا۔“ چارلس نے مسکرا کہا تو اس شخص نے دایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔

”میرا نام جان پیٹر ہے اور میں ڈوور میں ایک چھوٹے سے کام کی وجہ سے آیا تھا اور اب فیری سے لوٹنا تھا واپس لندن۔“

”ہاں... بڑی مشکل ہوئی اس کی منسوخی سے۔“ چارلس نے دکھی لہجے میں جواب دیا۔

”میں یہاں وقت گزاری کے لیے آ گیا تھا۔“ جان

نے کہا۔ ’’کچھ کھایا پیا اور سوچا کہ رات تو گزارنی ہے، کہیں بھی گزار لیں گے۔‘‘

یہ سن کر چارلس نے دل ہی دل میں کہا کہ کیسے لوگ ہیں جن کے آنے جانے، رات گزارنے وغیرہ کا کوئی شیڈول نہیں۔ ایسے لوگ کیا خاک کاروبار کرتے ہوں گے۔ ذاتی طور پر وہ نہایت منظم زندگی گزارنے کا قائل تھا۔ اسے ایسے لوگ پسند نہیں تھے مگر وہاں زیادہ لوگ نہیں تھے اور شاید اجنبی اسے بھی ٹائم پاس کا ذریعہ سمجھ رہا تھا۔ چارلس نے گہری سانس لی۔ ’’رات تو اب یہیں گزارنا ہوگی۔ ٹرین بھی صبح ملے گی اور فیری بھی۔‘‘

’’ویسے تم کہیں رکے ہو یا اب تک میری طرح گھوم رہے ہو؟‘‘

’’نہیں...‘‘ چارلس محتاط تھا۔ ’’میں نے ہوٹل میں کمرا لے لیا ہے۔‘‘

’’کس ہوٹل میں؟‘‘ جان نے پوچھا۔

’’اس وقت صرف ایک ہی ہوٹل یہاں پر کھلا ہے۔‘‘ چارلس نے سرد لہجے میں کہا۔ ’’لیزا ہوٹل۔‘‘

’’تو یہاں کیسے؟‘‘

’’وہاں کھانے کا بندوبست نہیں ہے اور قصبے میں بھی ایک جگہ ہے جہاں کچھ مل سکتا تھا۔‘‘ چارلس نے پلیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ ’’بس... میں یہ ختم کر کے ہوٹل کی طرف چلتا ہوں۔‘‘

’’ویسے بڑا عجیب اتفاق ہوگا۔‘‘ جان نے کہا۔

’’کیسا اتفاق؟‘‘

’’کچھ دیر پہلے میں نے بھی ہوٹل لیزا فون کر کے ایک کمرا بک کرایا ہے ڈبل بیڈ مگر اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہاں ڈائننگ کا بندوبست نہیں ہے۔‘‘

’’تو تم بھی وہیں...‘‘ چارلس نے حیرت سے کہا۔

’’جی ہاں...‘‘ جان مسکرا دیا۔ ’’جاؤ، بیٹھ کر اپنی پلیٹ صاف کر لو ورنہ بھوکے پیٹ مجھے کوستے رہو گے۔‘‘ وہ ایک طرف ہٹتے ہوئے بولا اور چارلس نے دو قدم آگے بڑھ کر پلیٹ میز پر رکھی اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ بھوک اب اس کے لیے ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔

جان آگے بڑھا اور پلے مشین پر کھیلنے میں مصروف ہو گیا۔

تقریباً آدھا گھنٹے تک چارلس وہیں رہا۔ اس نے ڈٹ کر کھایا۔ چند پیسٹریاں پیک کرا کر اوور کوٹ کی جیب میں رکھ لیں۔ حرے سے کافی پی مگر جان دوبارہ پلٹ کر اس کی طرف نہیں آیا۔

کھانے سے فارغ ہو کر وہ باہر نکلا تو اندھیرا پوری طرح چھا چکا تھا اور گہری دھند نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اگرچہ بڑے بڑے بلب روشن تھے مگر دھند اتنی شدید تھی کہ چند فٹ کے فاصلے پر بھی کچھ دیکھنا مشکل تھا۔ اسے زینے تک پہنچنا تھا تاکہ سڑک پر پہنچ کر ہوٹل تک جا سکے۔

چارلس بہت زیادہ شکی طبیعت کا مالک تھا۔ دوسرے، اس کا کام ہی ایسا تھا کہ وہ قدم قدم پر ہر شے کو شک کی نظر سے دیکھے۔ جب تک وہ ہال میں بیٹھا رہا وہ جان کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسے جان پر شک ہو رہا تھا۔ وہ یہ سمجھنے کی جستجو کر رہا تھا، وہ کیوں اسے یہ باور کرانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہم دونوں پہلے فیری پر ایک دوسرے سے مل چکے تھے۔ یہ اور بات کہ اس دوران میں ان کے درمیان ایک لفظ کا بھی تبادلہ نہیں ہوا تھا۔ دوسرا اسے تو یاد بھی نہیں آ رہا تھا کہ جان کو اس نے فیری پر دیکھا تھا۔ اسے یہ بات بھی کھٹک رہی تھی کہ اس نے ہوٹل کا ذکر کیوں کیا اور پھر یہ کیوں بتایا کہ وہ بھی وہیں ہے۔ اسے یہ بات بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ جب جان اور وہ باتیں کر رہے تھے تو اگر وہ تیسرا اس کا ساتھی تھا تو پھر قریب آنے کے بجائے کیوں لاتعلق بنا کھیل میں مگن رہا۔ اسے یہ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آگے بڑھ کر زبردستی جان پہچان کرانے والا جان شروع شروع میں کہاں اتنا گرم جوش تھا اور کہاں وہ اچانک اتنا سرد مہر ہو گیا کہ پھر پلٹ کر اسے دیکھا بھی نہیں۔ حتیٰ کہ جب وہ باہر آ رہا تھا تو رسماً بھی اس نے الوداع نہیں کیا۔

انہی سوالوں میں گھرا چارلس نہایت احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا زینے تک پہنچ گیا۔ اس کے کان کھڑے تھے۔ جان اس کے لیے مشکوک ہو چکا تھا۔ گہری دھند کے باعث آگے دیکھنا محال تھا اور وہ پلٹ کر دیکھنا نہیں چاہتا تھا مگر اس کے کان عقب میں کسی بھی آواز کو سننے کے لیے چوکنا تھے۔

زینے چڑھ کر وہ سڑک پر آ گیا۔ شدید سردی تھی۔ اس نے اوور کوٹ مزید کس لیا۔ اس کے دونوں ہاتھ جیب میں تھے۔ وہ جلد از جلد ہوٹل پہنچنا چاہتا تھا لیکن اس نے کچھ دیر وہیں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔

اس کے عقب میں پتھر کی اونچی دیوار تھی جو ساحل کے گرد بنی ہوئی تھی۔ برابر میں زینہ تھا۔ وہ دیوار کی طرف پشت کر کے کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظریں زینے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ یہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ کہیں جان اس کا پیچھا کرنے کی کوشش تو نہیں کر رہا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اسے زینے سے اوپر آتا دیکھ سکتا تھا۔ وہ دس منٹ تک وہیں کھڑا رہا مگر کوئی نہیں آیا۔ اس نے گہرا سانس لیا اور اب قدرے اطمینان سے ہوٹل کی طرف چل دیا مگر اب بھی اس کے دل سے شک دور نہیں ہوا تھا۔ جان نے بھی لیزا ہوٹل میں کمرا بک کرانے کی بات کی تھی۔ اگر وہ چارلس کے لیے کوئی خطرہ تھا تو مطلب یہ تھا کہ خطرہ ہوٹل اور کمرے کے اندر بھی ہو سکتا تھا۔ اسے پوری رات ہوٹل میں گزارنا تھی۔ اس کے علاوہ قصبے میں ایسی کوئی اور جگہ نہیں تھی جہاں وہ شب بسری کے لیے جا سکتا۔

ساحل سے ہوٹل تک کا راستہ اچھا خاصا تھا اور اس سردی میں تو قیامت سے کم نہیں تھا مگر چارلس نے ڈٹ کر کھایا تھا اس لیے اب اس کے جسم میں حرارت اور توانائی اچھی خاصی تھی مگر دن بھر بھوکا رہنے کے بعد، کھانے نے اس پر سستی طاری کر دی تھی۔ اس واک کا فائدہ یہ ہوا کہ اسے معدے پر گرانی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

وہ ہوٹل کے اندر داخل ہوا تو اس کی گرم فضا خاصی خوش گوار لگی۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ بیٹھک ایریا میں کارنس پر رکھا ٹی وی چل رہا تھا۔ وہاں چار اور لوگ بھی بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ سامنے آتش دان روشن تھا۔ وہ آگے بڑھا اور آتش دان کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس وقت ٹی وی پر کامیڈی شو چل رہا تھا۔

کچھ دیر بعد جب سردی کا احساس کچھ کم ہوا تو اس نے وہاں بیٹھے لوگوں پر طائرانہ نظر دوڑائی۔ تین کو وہ پہچان گیا۔ وہ تینوں عورتیں تھیں۔ اس نے انہیں فیری اسٹیشن پر بھی دیکھا تھا اور جب کلانر سے آنے والی فیری کی منسوخی کا اعلان ہوا تو وہ وہاں سے چل دی تھیں۔ ان کے ساتھ ایک اچھی خاصی عمر کا بوڑھا شخص بیٹھا تھا۔ چارلس نے اندازہ لگایا کہ وہ چاروں ایک ساتھ ہی سفر کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک عورت وہیل چیئر پر بیٹھی تھی۔ وہ باقی دونوں عورتوں سے عمر میں اچھی خاصی بڑی تھی۔ ان چاروں کی نظریں... ٹی وی اسکرین پر جمی تھیں۔

’’ہیلو۔‘‘ کچھ دیر بعد بوڑھے نے ٹی وی پر سے نظریں ہٹا کر مسکراتے ہوئے چارلس کو مخاطب کیا۔ ’’لگتا ہے تم بھی یہیں ٹھہرے ہو؟‘‘ اس نے استفساریہ لہجے میں کہا۔

چارلس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ’’اتفاقی طور پر۔‘‘

’’اچھا اتفاق ہے... ہم بھی یہاں اتفاق سے ہی پہنچے ہیں۔‘‘ بوڑھے نے خوش اخلاقی سے شگفتہ لہجے میں جواب دیا۔

’’اس موسم میں ہوٹل میں سیاح تو آنے سے رہے۔‘‘

’’ہاں... مصیبت میں ہی لوگ ہوٹل آئیں گے۔‘‘

’’آپ ٹھیک کہتے ہیں۔‘‘ چارلس نے رسمی مسکراہٹ سے جواب دیا۔

’’یہ ہیں مسز مائرا اور وہ ہیں مسز پیٹر...‘‘ بوڑھے نے برابر بیٹھی دونوں قدرے کم بوڑھی عورتوں کا تعارف کرایا۔ ’’یہ بھی ہمارے ساتھ سفر کر رہی ہیں۔‘‘ بوڑھا باتونی لگ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ وہیل چیئر پر بیٹھی عورت کا تعارف کراتا۔ اس نے ٹی وی پر سے نظریں ہٹائے بغیر، ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا مگر وہ نظر انداز کر گیا۔ ’’اور میرا نام ہے بش مین۔‘‘ وہ اٹھ کر اس سے مصافحے کے لیے آگے بڑھا۔

’’چارلس میرلے...‘‘ اس نے بھی اٹھ کر ہاتھ ملایا۔

’’بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔‘‘

’’مجھے بھی۔‘‘ بوڑھا یہ کہہ کر لمحہ بھر رسماً کھڑا رہا۔ ’’پلیز... تشریف رکھیں۔‘‘ یہ کہہ کر وہ واپس اپنے صوفے کی طرف بڑھا۔

چند لمحوں کے بعد اس نے پھر سوال کیا۔ ’’آپ بھی لندن جا رہے ہیں۔‘‘ لگ رہا تھا کہ اسے کامیڈی شو میں دلچسپی نہیں تھی۔

’’کوشش کر رہا ہوں۔‘‘

’’کرتے رہو، میں بھی یہی پلاننگ کر رہا ہوں۔‘‘ اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ’’کل، پرسوں... کم از کم مجھے جانے کی کوئی جلدی نہیں ہے۔‘‘

’’لیکن مجھے ہے۔‘‘ چارلس نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

’’اے بش... پلیز...‘‘ وہیل چیئر پر بیٹھی بوڑھی عورت نے اسے اس بار ذرا سختی سے چپ رہنے کو کہا۔

چارلس سمجھ گیا کہ وہ ضرور اس کی بیوی ہوگی مگر اسے کوئی سروکار نہیں تھا کہ وہ کون ہیں۔ اسے صرف اپنے معاملات سے دلچسپی تھی۔ بش مین خاموش ہو کر دوبارہ ٹی وی پر نظریں جما کر بیٹھ گیا۔ وقت گزاری کے لیے چارلس بیٹھک ہال کا جائزہ لینے لگا۔

کمرے میں واحد ٹیلی فون سیٹ تھا جو استقبالیہ ڈیسک پر موٹے سے رجسٹر کے برابر رکھا تھا۔ اس وقت اسے ایک فون کرنا تھا مگر وہ سمجھ چکا تھا کہ فارغ مرد و خواتین کا یہ ٹولہ

گھنٹوں یہاں سے ہلنے والا نہیں اور ڈیسک پر رکھے فون سے وہ بات کرنا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ وہ دو بلاک دور قصبے کے مرکز کی طرف جا رہا تھا۔ اسے علم تھا کہ وہاں پبلک فون بوتھ سروس ہے جہاں سے بڑے اطمینان سے بات کرسکتا ہے۔ شام کو بھی اس نے وہیں سے فون کیے تھے۔

باہر سردی کافی تھی لیکن ساحل کے مقابلے میں دھند کچھ کم تھی۔ زرد سڑک لائٹ میں اسے آگے بڑھنے میں کوئی دقت نہیں ہو رہی تھی۔ ویسے بھی اگر دھند، برف باری یا بارش ہوتی، تب بھی اسے فون تو ہر حال میں کرنا تھا۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ سڑک سنسان تھی اور ماحول قدرے ڈراؤنے والا تھا۔ چارلس کو لگا کہ وہ کسی ڈراؤنی فلم کے سیٹ پر رات کی گھٹا ٹوپ تاریکی میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ فون بوتھ تک پہنچ گیا۔ اس نے جیب میں سے چند سکے نکال کر اندر ڈالے اور نوٹ بک سے دیکھ کر لندن کا ایک نمبر ملانے لگا۔ ”ہیلو...“ دوسری طرف سے فون اٹینڈ ہوتے ہی اس نے کہا۔

”ہیلو... شام بخیر... کہیے میں آپ کی کیا مدد کرسکتی ہوں؟“ اسے توقع تھی کہ دوسری طرف سے روکھے لب و لہجے میں، مردانہ آواز سننے کو ملے گی مگر یہ توشستہ انگریزی میں کوئی عورت بول رہی تھی۔

چارلس لمحہ بھر کو سوچ میں پڑ گیا کہ کیا کہے۔ آٹھ سال بعد اس نے یہ آواز سنی تھی۔ اس وقت وہ بلغاریہ سیکشن میں کام کر رہا تھا اور لندن سے بہت دور عارضی آپریشنل ہیڈ کوارٹر میں ہوتا تھا۔ تب، آج کے مقابلے میں وہ کافی جوان تھا۔ اس وقت ییری پوپر کا تقرر بطور ڈائریکٹر لندن آپریشنل ہیڈ کوارٹر ہو چکا تھا۔ وہ ڈپٹی کے عہدے پر کام کر رہا تھا لیکن ریگن کے چلے جانے پر اس کی ترقی ہو گئی تھی۔ اس وقت فون پر لیری کی بیوی تھی۔ وہ آٹھ سال بعد اس کی آواز فوراً پہچان گیا تھا۔ ”چارلس بول رہا ہوں۔“ اس نے خود پر قابو پا کر لمحہ بھر کے توقف کے بعد جواب دیا۔

”ہیلو... ہاں چارلس کیا بات ہے؟“ اگلے لمحے فون پر لیری کی آواز سنائی دی۔ ”اگر تم نے سیموف کے لیے فون کیا ہے تو وہ یہاں نہیں، اب اسے ملنے یا بات کرنے کے لیے تمہیں کل تک انتظار کرنا ہوگا۔“

”او کے...“ چارلس نے جواب دیا۔ ”میں کل ہی سیموف سے مل لوں گا۔“ چارلس نے جواب دیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ آدمی کچھ حیران کن ہے۔ اس کی اطلاع درست ہو سکتی تھی مگر اس نے لیری سے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

”تم نے کیا کیا اب تک؟“

”میں اس فلیٹ پر گیا تھا مگر اب وہاں کوئی نیا کرایہ دار ہے۔“

”تم کچھ سودے بازی تو نہیں کر رہے؟“

چارلس نے بوتھ کے شیشے سے باہر سڑک کی طرف دیکھا، چہار سو سناٹا تھا۔ ”معاف کرنا، میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔“ اس نے سرد لہجے میں پوچھا۔

”تم اس وقت کہاں ہو، لندن کب پہنچ رہے ہو؟“ لیری نے اس کا سوال نظر انداز کر دیا تھا۔

”فاک اسٹون میں۔“ یہ کہہ کر اس نے فیری نہ ملنے اور رات یہیں ٹھہرنے کی وجہ بتائی۔

”اچھا... مجھے بتا دیتے، کار بھیج دیتا۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا۔ ”میں گاڑی بھیج دوں۔“ لیری نے استفساریہ انداز میں کہا۔

”میرے خیال میں اس کی ضرورت نہیں۔“ چارلس نے جواب دیا۔ جس انداز میں لیری نے ”اچھا“ کہا تھا، اس سے ہی وہ سمجھ گیا کہ کار تو نہیں آسکتی۔ وہ لیری کے ساتھ برسوں سے کام کر رہا تھا۔ اس کے جواب میں چھپے اصل جواب کو وہ فوراً تاڑ لیتا تھا۔ ساتھ ہی وہ یہ سوچ رہا تھا کہ جب اسے مجھ پر اعتبار نہیں تو کیس دینے کی زحمت کیوں کرتا ہے۔

”او کے... کل ملتے ہیں۔“ یہ کہہ کر لیری نے جواب کا انتظار کیے بغیر فون بند کر دیا۔

چارلس نے ریسیور کریڈل پر رکھا اور آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ وہ ڈھلوان سے اترتا ہوا ہوٹل کی طرف جا رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ سیموف کوئی چال تو نہیں۔ اس کے پیچھے پیرس سے لندن اور پھر نہ جانے کہاں کہاں تک یہ خاک اڑائی جا رہی ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس معاملے کو اتنا مسئلہ کیوں بنایا جا رہا ہے۔ اگر یہ آسانی سے حل کیا جا سکتا ہے تو لیری اسے کیوں پیچیدہ بنا رہا ہے۔ کافی دیر تک وہ سوچتا رہا۔ اس دوران میں وہ ہوٹل پہنچ چکا تھا۔ اس نے سر جھٹکا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ وہ اوورکوٹ کے بٹن کھولتا ہوا بار روم کی طرف بڑھا۔

سامنے جان ایک عورت کے ساتھ بار اسٹول پر بیٹھا تھا۔ اس نے چارلس کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ وہ قریب ہوا تو جان نے عورت کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ ہیں مسز مائر...“

چارلس رسماً مسکرا دیا۔

”ہم پہلے مل چکے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے مسز مائر نے دہانہ کھول دیا۔ اس کے دانت داغ دار اور زبان سیاہی مائل تھی۔ چارلس نے بوتلوں کی طرف رخ کر لیا۔ اسے ان لوگوں میں بظاہر کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

”جان بتا رہا تھا کہ تم دونوں امریکا سے ہو۔“ اس عورت نے کہنا شروع کیا تو چارلس نے رخ اس کی طرف موڑا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ میں تم دونوں سے پہلے ہی اپنے گھر پہنچ جاؤں گی۔“

اس سے پہلے کہ وہ اور کچھ کہتی، جان نے مداخلت کی اور چارلس کو خبردار کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر تمہارے کچھ راز ہیں تو پھر ان سے دور رہنا۔ یہ فلیٹ اسٹریٹ میگزین کی رپورٹر ہیں۔“

”میرا کوئی راز نہیں اور میرے پاس بھی کوئی راز نہیں۔“ اس نے جان کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے جواب دیا اور پھر مسز مائر کی طرف پلٹا۔ ”ویسے آپ کس طرح کی رپورٹنگ کرتی ہیں؟“

”بزنس رپورٹنگ...“ مسز مائر نے گھونٹ بھر کر آہستگی سے جواب دیا۔

جان نے مداخلت کی۔ ”مگر یہ تم سے لیڈی ڈیانا سے لے کر شاہی خاندان کے سیکرٹس تک پر بات کرسکتی ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر توقف کیا۔ ”ویسے تم کیا کام کرتے ہو؟“

”میں ایک پبلشنگ کمپنی کے ساتھ کام کرتا ہوں اور وہ صرف کتابیں شائع کرتی ہے۔“ چارلس نے نپے تلے انداز میں جواب دیا۔ اسی دوران اسے ایک کتاب یاد آگئی۔ وہ کسی غیر معروف ناشر نے چھاپی تھی اور خاصی غیر معیاری تھی۔ اس نے اگلے سوال سے بچنے کے لیے اس کمپنی کا نام لے دیا۔

”تمہارے کام کی نوعیت کیا ہے؟“ مائر نے تجسس سے پوچھا۔

”میں مصنفین سے مسودے لے کر اشاعت تک کی ذمے داریاں سنبھالتا ہوں۔“ اس کا جواب بظاہر مطمئن کر دینے والا تھا۔

”کرائم اسٹوری بک...“ مائر کا لہجہ استفساریہ تھا۔

”نہیں...“ چارلس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہم زیادہ تر ادب، شاعری یا پھر سیاسیات پر کتابیں شائع کرتے ہیں۔“

اس دوران اس نے اپنا ڈرنک ختم کیا۔ ”معاف کیجیے، میں دن بھر کا تھکا ہوا ہوں۔ اب اجازت چاہوں گا۔“ اس نے گلاس کاؤنٹر پر رکھ کر جان اور مسز مائر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ انہوں نے بھی مسکرا کر سر ہلایا۔ اگلے ہی لمحے چارلس سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل پر واقع اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔

اس کے کمرے کی کھڑکی باہر کی طرف تھی۔ اس نے آتش دان روشن کیا اور کھڑکی کا پردہ کھینچ کر، اس کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس وقت وہ پیرس میں اپنی بیوی کو فون کرنا چاہ رہا تھا مگر وہاں فون کی سہولت دستیاب نہیں تھی۔ دوسرے وہ جانتا تھا کہ اس وقت وہ ڈنر پر ہوگی۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ صبح سویرے جلدی اٹھ جائے گا اور فون بوتھ پر جا کر بیوی سے بات کرے گا اور ناشتا کرکے چیک آؤٹ کے لیے ہوٹل لوٹے گا۔ یہ فیصلہ کرتے ہی اس کے ذہن میں اور سوال سر اٹھانے لگے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہوا کہ لیری گاڑی بھیج کر اسے لندن بلا سکتا تھا مگر اس کے جواب سے لگا کہ وہ چاہتا ہے کہ میں یہیں شب بسری کروں۔ وہ کافی دیر تک اس پر سوچتا رہا مگر اسے کوئی ٹھوس وجہ سمجھ نہیں آئی۔

لیری کیا چاہتا تھا، اسے سمجھ نہیں آیا۔ سوچ سوچ کر اس کا سر دکھنے لگا۔ وہ اٹھا، کھڑکی کے پردے برابر کیے۔ سوٹ کیس کھول کر سلیپنگ سوٹ نکالا اور لباس تبدیل کرکے سو گیا۔ دن بھر کا تھکا ہارا تھا، کچھ ہی دیر میں نیند نے اسے اپنی آغوش میں دبوچ لیا۔

☆☆☆

پیرس کے ایک چھوٹے سے پبلشنگ ہاؤس کے دفتر میں، ایک بوڑھا سامنے رکھی فہرست کو بڑے غور سے پڑھ رہا تھا۔ یہ سیموف کی یادداشتوں کے مسودے میں شامل موضوعات کی فہرست تھی۔ اس کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ جیسے اسے مسودے میں بہت دلچسپی پیدا ہو رہی ہے۔

اسے چارلس کی یہ بات سن کر ذرا بھی گھبراہٹ نہیں ہوئی کہ ایک فاؤنڈیشن اس کام کے لیے معاونت کرنے پر تیار ہے۔ یہ اور بات کہ وہ فاؤنڈیشن صرف کاغذات پر ہی موجود تھی۔ وہ بوڑھا جانتا تھا کہ اکثر کاموں میں اس طرح کے ادارے ملوث ہوتے ہیں اور درحقیقت ان کی کڑیاں کہیں اور جا کر ملتی ہیں۔ وہ بظاہر بالکل مطمئن دکھائی دے رہا تھا۔

چارلس نے اسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس کے ادارے کے تحت چھپنے والی سیموف کی یادداشتوں پر مشتمل کتاب کا تمام خرچ بھی فاؤنڈیشن ادا کرے گی۔ یہ فاؤنڈیشن سوویت یونین کے خلاف ایسی کتابوں کی اشاعت میں مالی معاونت کرتی ہے۔ بعد میں یہ کتابیں یورپ اور امریکا میں پھیلائی جاتی ہیں۔

بوڑھے پبلشر کے چہرے پر اطمینان تھا اور چارلس محسوس کر رہا تھا کہ اسے بعض دوسرے لوگوں کی طرح امریکی پیسے پر پروپیگنڈا مواد چھاپنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ چارلس نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ لاکھوں کی تعداد میں شائع ہونے والی اس کتاب کی فروخت سے جو بھی آمدنی ہوگی، وہ اس کی ہوگی۔ یہ سن کر اس کے چہرے پر خوشی تھی۔ چارلس سمجھ گیا کہ مفت میں اتنا پیسہ ملنے پر وہ خوش ہی ہوگا۔ اگر وہ اصولوں کا پابند ہوتا تو چارلس یہاں سے کب کا جا چکا ہوتا۔

”تو اس کا مطلب ہے کہ جتنی کاپیاں شائع ہوں گی، سب کی سب نکل جائیں گی؟“ پبلشر نے پوچھا۔

”اشاعت کے اخراجات فاؤنڈیشن دے گی خفیہ طور پر اور اسے خریدے گی بھی وہی۔“ چارلس نے اسے یقین دلایا۔

بوڑھا پبلشر ناول چھاپنے میں دلچسپی رکھتا تھا مگر چارلس کی بات سننے کے بعد اسے یادداشتوں کی اشاعت پر بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ پوری طرح آمادہ نظر آ رہا تھا اور چارلس کو ایک کام مکمل ہو جانے کی خوشی تھی۔

”میں کتاب چھاپنے پر تیار ہوں مگر....“

”کتنے پیسے چاہئیں؟“ چارلس نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔ ”پیسے کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ جتنے چاہئیں، مل جائیں گے۔“

”پھر تو سمجھو کتاب تمہارے ہاتھ میں ہے۔“ پبلشر نے خوشی سے کہا۔ موضوع اسے اچھا لگا تھا اور بنا خرچ کیے مال مل رہا تھا۔

”کتاب سب سے پہلے پیرس میں چھپے گی۔“ چارلس نے اسے پروگرام سمجھانا شروع کیا۔ ”اس کے بعد لندن سے اس کا یورپی ایڈیشن شائع ہوگا اور پھر امریکا سے بھی۔“

”جیسا کہو گے ویسا ہی ہوگا۔“ پبلشر نے کہا۔

”یورپ والے ماسکو کی زیادتیوں سے بہت واقف ہیں۔ تاریخی طور پر انہیں بہت مارا ہے اسٹالن گراڈ نے۔“

”یہ سرد جنگ ہے۔ جنگوں میں یہی سب کچھ ہوتا ہے....“

”اب تم بھی سرد جنگ میں اپنا حصہ ڈالنے والے ہو۔“ چارلس نے مسکرا کر کہا۔ ”سوویت یونین کو نہ روکا گیا تو جو کام کر رہے ہو، کبھی نہیں کر سکو گے۔“ چارلس نے کافی کا گھونٹ بھرا۔ ”سیموف بتا رہا تھا کہ یورپ میں ادیبوں پر پیسترونیکا ڈاور رے بیکو بڑے معروف تھے۔“

”ہاں....“ پبلشر نے سر ہلایا۔ ”مگر اب سوویت حکومت کی طرف سے ان دونوں کی کتابوں پر پابندی ہے اور وہ خود سائبیریا میں قید۔“

”کاش.... وہ فاؤنڈیشن کے ہتھے چڑھ جاتے....“ چارلس نے خودکلامی کی۔

سوویت یونین اور مشرقی یورپ کے بارے میں بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ گزشتہ اٹھارہ برس کی ملازمت میں سے سولہ برس اسے سرد جنگ کی لڑائی لڑتے گزرے تھے۔ امریکا کو سوویت یونین اور اس کے نظام سے خوف تھا۔

اعصاب شکن سرد جنگ میں چارلس ہی نہیں، اس جیسے لاکھوں گمنام سپاہی لڑ رہے تھے اور اس لڑائی میں ان کا سب سے اہم ہتھیار پروپیگنڈا تھا۔ اب وہ پروپیگنڈا کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ پبلشر سے ملاقات کے بعد سیموف کیس ختم ہونے والا تھا۔ سیموف روسی ادیب تھا مگر وہ بھی جاسوسی میں ملوث رہا اور اب وہ سوویت یونین سے فرار ہو کر لندن پہنچ چکا تھا۔ برطانیہ کی خفیہ ایجنسی ایم فائیو نے اس کا کیس انہیں سونپ دیا تھا۔ چارلس اس خفیہ تنظیموں کے اتحاد میں شامل تھا جس میں امریکا، برطانیہ اور مغربی یورپ کے کئی ممالک کی خفیہ تنظیمیں شامل تھیں۔ ان کا ہدف روس کے خلاف پروپیگنڈا کرنا تھا۔

سیموف ماسکو کے ایک اپارٹمنٹ میں رہتا تھا۔ وہ دوسرے درجے کا ناول نگار تھا لیکن ادیبوں کے حلقوں میں اس کی اچھی خاصی جان پہچان تھی۔ سوویت خفیہ ایجنسی کے جی بی ہر شعبے پر کڑی نظر رکھتی تھی۔ اسے ادیبوں اور ان کے نظریات کے متعلق بھی جاننے کی ضرورت رہتی تھی۔ وہ خطرے کو پیدا ہونے سے قبل ختم کر دینے پر نظر رکھتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی ادیب سوویت نظام کے خلاف نظریات رکھے، اس کے تحت لکھے اور مسودہ مغربی یورپ اسمگل کر دے جہاں ایسے مصنف کی کتاب شائع ہو جس سے ملکی مفادات کو نقصان پہنچتا۔ سیموف کئی سالوں تک کے جی بی کے لیے جاسوسی کرنے کے بعد وہاں سے فرار ہو کر لندن پہنچ چکا تھا۔ اگرچہ وہ سرکاری طور پر پناہ میں تھا لیکن نہ جانے کیوں آرگنائزیشن اس پر بھروسا نہیں کر پا رہی تھی۔ نہیں اس پر شک تھا مگر کیوں، ایسا کوئی ثبوت تلاش کے باوجود ہاتھ نہیں چڑھ سکا۔ چارلس کو بھی اس کے پیچھے لگایا گیا مگر کام کی کوئی بات معلوم نہیں ہو سکی۔

چارلس بظاہر اس کی طرف سے مشکوک خیالات رکھتا تھا تاہم لیری اس آپریشن کا ذمے دار تھا اور اس کا خیال تھا کہ سیموف درست آدمی ہے۔ لیری کی وجہ سے ہی یہ چھان بین کی جا رہی تھی۔ کوئی ثبوت نہ ملنے پر وہ بڑا خوش تھا۔

چارلس نے ایک دو بار لیری سے اشارے کنائے میں اپنے شک کا اظہار کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس نے بری طرح جھاڑ پلا دی تھی۔ ویسے بھی سیموف، لیری کی زیرِ نگرانی تھا۔ اگرچہ اس کے بعد سے چارلس خاموش تھا لیکن یہ بات اس کے دل میں پھانس کی طرح چبھی ہوئی تھی کہ وہ اتنی آسانی سے ماسکو سے فرار کیسے ہوا۔ وہ کے جی بی کے نیے دل پر تھا لیکن اس کے باوجود وہاں اس کے خلاف کوئی زیادہ چھان بین نہیں تھی۔ اس نے اس بات کا اظہار دفتر کے دو تین ماتحت ایجنٹوں سے بھی کیا تھا۔

کافی دیر تک کتاب کی اشاعت، کاغذ کے معیار، ڈیزائن، تعداد اور لاگت کے معاملات طے کر کے چارلس وہاں سے اٹھا۔ پبلشر کے پاس بھاری رقم کا بیگ پہنچ چکا تھا اور چارلس کے سر سے بوجھ کا ایک بڑا حصہ ہٹ گیا تھا۔ پیرس میں فی الحال اس کا آپریشن کامیابی سے اختتام کو پہنچ گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہاں سے نکل کر لیری کو فون پر ڈیل کی اطلاع دے دے گا۔

☆☆☆

اتنا اوپر چڑھنا کم از کم لیری کو پسند نہیں تھا مگر پھر بھی وہ لفٹ چھوڑ کر، سیڑھیوں کے ذریعے اپارٹمنٹ کی چوتھی منزل پر پہنچا اور فلیٹ کی گھنٹی بجائی۔ جیسے ہی دروازہ کھلا، اس نے واشنگٹن میں رہنے والے کسی دل پھینک کے مخصوص انداز میں کہا۔ ”پیاری لڑکی.... ایک چھوٹی سی مشکل درپیش ہے۔“

عورت نے استفہامیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”میں جو کچھ آپ کو دکھانے جا رہا ہوں، اسے دیکھ کر آپ خوش ہو جائیں گی۔“ وہ کسی بینک کے پروموشن ایجنٹ کی طرح باتیں بنا رہا تھا۔

”بکواس بند کرو، اندر آؤ۔“ عورت نے اسے ٹائی سے پکڑ کر اندر کھینچا۔ یہ جینی تھی، لیری کی بیوی اور....

وزیرِ صحت پاگل خانے کے دورے پر گئے۔ وہاں پر دیکھا کہ تمام پاگل شور کر رہے تھے۔ کوئی گملا سر پر رکھ کر کھڑا تھا، کوئی ایسے ہی سائیکل چلا رہا تھا۔ کوئی کچھ کر رہا تھا لیکن ایک پاگل کرسی پر بیٹھ کر آرام سے اخبار پڑھ رہا تھا۔ وزیر صاحب اس کے پاس گئے اور بولے۔

وزیرِ صحت: ”السلام علیکم! آپ مجھے نہیں جانتے میں وزیرِ صحت ہوں۔“

پاگل: ”بھائی کوئی اور کام کرو، ادھر آنے سے پہلے میں بھی خود کو وزیراعظم کہتا تھا۔“

(فوجی صابر علی، حیدرآباد کینٹ)

لیری نے برسوں پہلے اسی طرح جینی کو دیکھ کر اپنے سحر میں پھانسنے کی کوشش کی تھی مگر شروع میں جینی نے اسے بالکل لفٹ نہیں کرائی تھی۔ جینی چارلس سے پیار کرتی تھی۔ ان دنوں چارلس اور لیری جونیئر لیول کے ایجنٹ تھے اور واشنگٹن میں تعینات تھے مگر پھر لیری کا اچانک تبادلہ برلن ہو گیا۔ یوں جینی اور چارلس کے درمیان وقت کی خلیج آ گئی۔ چارلس کے مطابق لیری سے غداری کا جرم سرزد ہوا تھا۔ اگرچہ بعد میں، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا مگر حقیقت یہی ہے کہ لیری کو اُس وقت حقیقت کا کچھ علم نہیں تھا۔ جب اسے پتا چلا تو اس نے چارلس سے معذرت بھی کی مگر اس کے بعد ان کے درمیان تعلقات پھر کبھی دوستانہ سطح پر نہ آ سکے۔

☆☆☆

دوسری منزل پر واقع ہوٹل کا کمرا خاصا ٹھنڈا تھا اور اسی وجہ سے اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ کمرے میں ٹہل رہا تھا جب اس نے ہوٹل کی حدود میں گاڑی رکنے اور ہارن بجنے کی آواز سنی۔ اس نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر جھانکا۔ وہ فوراً پہچان گیا۔ اسٹیشن ویگن سے ایک عورت باہر نکل رہی تھی۔ یہ وہی رپورٹر عورت تھی جس سے وہ فاک اسٹون کے پیزا ہوٹل میں ملا تھا۔ اس کے پیچھے ایک اور عورت باہر نکلی۔ اس نے سر پر اسکارف اوڑھ رکھا تھا۔ چارلس نے کھڑکی کا پردہ برابر کیا اور گھڑی دیکھی۔ پیرس کے وقت کے مطابق صبح کے تین بج کر بیس منٹ ہو رہے تھے۔ وہ جوتے اتار کر بستر پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد اسے ہوٹل کی راہداری میں قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ چارلس سمجھ گیا کہ وہی لوگ ہوں گے ورنہ تو اس وقت پیرس کی دھند بھری سردی میں کسی کے خوامخواہ باہر نکل کر جانے کا سوچنا ہی فضول تھا۔

کچھ وقت گزرنے کے بعد پھر اسے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ چارلس جاگ رہا تھا۔ اسے ایسا لگا کہ جیسے کوئی باہر جا رہا ہو۔ اس نے قدموں کی چاپ پر دھیان دیا۔ ہیل کی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ جس کا مطلب تھا کہ کوئی خاتون ہے۔ چارلس بستر سے اٹھا اور پھر کھڑکی سے باہر جھانکا مگر وہاں کچھ نہیں تھا۔ اس نے چند لمحے انتظار کیا۔ تھوڑی دیر بعد مسز مائرز واپس اسٹیشن ویگن کی طرف پلٹی۔ اس کے ساتھ وہ دوسری عورت بھی تھی۔ انہوں نے اسٹیشن ویگن کا پچھلا دروازہ کھولا اور تھوڑی دیر بعد جان کو تھامے وہ آگے بڑھ رہے تھے۔ اس وقت ان کے ساتھ ایک اجنبی مرد بھی نظر آ رہا تھا۔ چارلس چونک گیا۔ جان کا جسم جس حالت میں تھا، اس سے تو یہی لگتا تھا کہ وہ مر چکا ہے، تاہم وہ وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ نشے کی زیادتی کے باعث بے سدھ ہو۔

اسٹیشن ویگن جا چکی تھی اور وہ دونوں عورتیں جان کا وجود ڈانوا ڈول کرتے ہوئے ہوٹل کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھیں۔ چارلس کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ چکر کیا ہے لیکن اس نے سر جھٹکا اور بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ وہ اس چکر میں نہیں الجھنا چاہتا تھا اور نہ اس کا کوئی براہِ راست ان سے تعلق تھا۔ کچھ دیر بعد پھر راہداری میں قدموں کی آوازیں گونجنا شروع ہو گئیں۔ چارلس نے کمبل کھینچ کر منہ پر ڈال لیا۔

دوسری صبح چارلس نے ہال میں مسز مائرز کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر خوش گوار آثار تھے۔ چارلس سوچنے لگا کہ اس نے تو کہا تھا کہ اس کا سفر ختم ہونے والا ہے اور وہ یہاں... اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

”ہائے...“ مسز مائرز کی نظر چارلس پر پڑی۔ وہ آگے بڑھی۔ ”اس کا مطلب کہ تم اپنے لندن کا دورہ مکمل کر چکے۔“

وہ مسکرا دیا۔

”صرف مسکرانے پر اکتفا، آخر کو ہم نے ایک کیب شیئر کی اور ٹرین تک اکٹھے سفر کیا تھا۔“ وہ بولی۔ ”اتنے اجنبی تو نہیں رہے۔“

”سب یاد ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ اس سے ذرا فاصلے پر ایک مرد کھڑا تھا، جس کے قریب کپڑوں کا بیگ رکھا تھا۔ یہ وہی مرد تھا جو رات کو اسٹیشن ویگن کے ساتھ کھڑا تھا۔

چارلس سمجھ گیا کہ یہ شخص ضرور اسی خاتون کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ ویسے اس وقت وہ عمدہ لباس میں دکھائی دے رہی تھی۔ چارلس سوچ رہا تھا کہ اب وہ ٹرین کے سفر کے بارے میں بات کرے گی مگر ایسا ہوا نہیں اور نہ ہی جان نظر آیا۔ اسی دوران بیگ کے ساتھ کھڑے شخص نے اشارہ کیا اور وہ معذرت کرتے ہوئے اس طرف بڑھ گئی۔ چارلس نے بھی کافی ختم کی اور آگے بڑھ گیا۔ اسے دوپہر سے پہلے لندن پہنچنا تھا اور لیری کی ہدایت تھی کہ وہ لندن پہنچتے ہی رابطہ کرے۔ انہیں لنچ پر کسی ریستوران میں اکٹھے ہونا تھا۔

☆☆☆

وہ اس وقت شہر کے کینئے ڈرونز کے ایک چھوٹے سے کیبن میں بیٹھے لنچ کر رہے تھے۔ وہاں بھورے رنگ کی میز کے گرد آٹھ کرسیاں لگی تھیں جو نہایت آرام دہ تھیں۔ کھانے والے صرف یہی تھے۔ یہ لیری کا پسندیدہ ریستوران تھا اگرچہ اسے یہ نام بہت عجیب لگتا تھا۔ کیبن میں ایسی کوئی کھڑکی نہیں تھی کہ جس سے باہر کی طرف جھانکا جا سکے۔ وہ کیبن کسی قید کے مانند تھا۔

”میں سمجھتا ہوں کہ وہ سب کچھ ہو سکتا ہے مگر روسی نہیں۔“ جب سے وہ اس کیس پر کام کر رہا تھا تب سے یہ پہلا موقع تھا کہ وہ لیری کے سامنے سیموف کے بارے میں کھل کر ٹھوس لہجے میں اپنے خدشے کا اظہار کر رہا تھا۔

”تو پھر انہوں نے اسے میرے پاس کیوں بھیجا تھا؟“ یہ سنتے ہی لیری نے اسے لمحہ بھر غور سے دیکھا، پھر بعد الٹا سوال کر دیا۔

”انہیں ایک شخص کو گزشتہ اگست میں برلن سے نکال کر لندن پہنچانا تھا مگر...“

”مگر کیا؟“ لیری نے تیزی سے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

ان دنوں چارلس برلن میں تھا۔ اس نے لحظہ بھر کو اس کی طرف دیکھا۔ ”میں نے پورے معاملے کو کور کیا تھا، ایک بات...“ اس نے چمچ پلیٹ کی طرف بڑھایا۔ ”تم نے کسی کو قتل نہیں کیا۔“

”مجھے تو سمجھ نہیں آتا یہ خبیث آئیڈیا ان کے دماغ میں کس نے ڈالا تھا؟“ لیری نے زچ ہو کر پھر ایک سوال جڑ دیا۔ چارلس دل ہی دل میں ہنس دیا۔ ”سیموف کی کیا خبر ہے؟“

”بدقسمتی کی بات ہے۔“ لیری نے تاسف بھرے انداز میں کہا۔ پہلی بار وہ چارلس کی کسی بات کا جواب دے رہا تھا۔ ”اس نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔“ لمحہ بھر توقف کے بعد اس نے کہا۔

”کیا... کل رات پیرس میں اس نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ کچھ لوگوں نے اسے ایسا کرتے دیکھا بھی۔ ہمارے انڈر کور ایجنٹ نے تصدیق کر دی کہ وہ سیموف ہی تھا مگر اب تک اس کی لاش نہیں ملی۔ یقین یہی ہے کہ مر گیا ہوگا۔“ لیری نے بات ختم کی۔

”ٹھیک کہا تم نے، یہ افسوس کی بات ہے۔“ چارلس نے یہ سن کر سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”سنو... وہ مسودہ ہے تمہارے پاس؟“

”کیوں نہیں، اس کی ایک کاپی تو تم پیرس بھی لے گئے تھے اپنے ساتھ۔“

”ہاں... مگر وہ کاپی تھی۔“ اس نے آہستگی سے جواب دیا اور ڈش کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”اصل مسودہ ہے اور میں تمہیں دے سکتا ہوں مگر میرا خیال ہے کہ اب ہم اسے شائع نہیں کر سکتے۔“ لیری نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”واقعی کنفرم نہیں ہو سکا کہ سیموف اصل میں روسی تھا بھی یا نہیں...“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکا۔ ”چلو چھا ہوا وہ خود ہی چھلانگ لگا کر مر گیا، ہمارا کام ختم۔“

”کام ختم نہیں ہوا۔“ چارلس نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ”تم نے ایک آپریشن کیا اور اتنی بڑی غلطی کر بیٹھے کہ اس کی قومیت کا ثبوت حاصل نہیں کر پائے۔“

”کیا مطلب؟“

”وہ روسی نہیں تھا۔“ چارلس نے کہنا شروع کیا۔ ”وہ پولش تھا اور اصل سیموف برلن میں مارا گیا تھا کے جی بی ایجنٹ کے ہاتھوں۔“

”تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟“ وہ گھبرا گیا۔

”میں یہ کیس ہینڈل کر رہا ہوں اور میری رپورٹ تمہیں نہیں چیف کو جا چکی ہے۔ اب اس کے بعد...“

”اس کے بعد کیا ہوگا؟“ وہ گھبرا گیا۔

”تم میرے باس نہیں رہو گے اور نہ ہی ملازمت پر۔“

”تم مجھ سے بدلہ لے رہے ہو؟“

”ایک مرتبہ تم نے غداری کی تھی میری محبت کو ہتھیا کر... آج میں بدلہ لے رہا ہوں تمہارا کیریئر چھین کر۔“ چارلس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

دونوں ساکت بیٹھے تھے۔ چند لمحوں بعد چارلس اٹھا۔ ”تمہارے ساتھ الوداعی لنچ اچھا تھا... بائے۔“ چارلس باہر نکل چکا تھا اور لیری اپنی جگہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اسے چارلس کے ساتھ کی گئی ایک ایک زیادتی یاد آ رہی تھی۔

ہوٹل سے باہر نکلتے ہی وہ بینک آف انگلینڈ کی طرف گیا۔ وہاں مسز مائرز کھڑی تھی۔ ”سوری... مجھے دیر ہو گئی ذرا سی۔“

”کوئی بات نہیں۔“

”یہ لو۔“ چارلس نے جیب سے موٹا سا لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ اس میں بڑے بڑے نوٹ رکھے تھے۔

”تھینک یو...“ اس نے لفافہ کھول کر نوٹوں کی جھلک دیکھی اور واپس پرس میں رکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں... اپنے سیموف سے کہنا کہ اس کا کردار ختم، آئندہ پھر کبھی وہ میک اپ نہ کرے بلکہ برلن جا کر دوبارہ تھیٹر میں اداکاری کی کوشش شروع کر دے۔ سیموف ہمیشہ کے لیے مر چکا۔“

”کہہ دوں گی۔“

”ویسے جان کا کیا حال ہے۔“ چارلس نے پوچھا۔

”سیموف، اوہ سوری میرا مطلب ہے کہ ہیری سردی سے ٹھٹھر کر مر ہی جاتا اگر جان اسے بچانے کے لیے دریا میں چھلانگ نہ لگاتا۔“

”ویسے کیسا ہے اب وہ۔“

”بالکل ٹھیک۔ اب تو وہ نکل چکا ہوگا۔ میں نے صبح ہی اسے ہوٹل میں پے منٹ کر دی تھی۔“

”ٹھیک... ہم اب رخصت ہوتے ہیں اور امید ہے کہ پھر کبھی نہیں ملیں گے؟“ چارلس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ”اور نہ کبھی ہم زندگی میں پہلے مل چکے ہیں۔“

”آپ کا نام مسٹر...“ مسز مائرز نے چونک کر پوچھا اور وہ ہنس پڑا۔ چند لمحوں بعد دونوں اپنے اپنے راستوں پر جا رہے تھے دو مختلف سمتوں میں۔

راستے میں رک کر اس نے ایک فون بوتھ سے ہیڈ کوارٹر فون کیا اور اطلاع مل گئی۔ لیری کو فوری طور پر برطرف کر کے اسے لندن امریکا اسٹیشن کا ہیڈ آف آپریشن بنا دیا گیا تھا۔

”جینی... سوری مسز لیری... تم نے مجھ سے غداری کی اور اسے اپنا بنا لیا اور میں نے بدلے میں اس کی نوکری لے لی۔“ ریسیور کریڈل پر رکھ کر اس نے حسبِ عادت خود کلامی کی۔

”افسوس مسٹر سیموف... اگر اس شب میں آپ کو برلن کے ہوٹل میں گولی نہ مارتا تو آج میرا انتقام پورا نہیں ہوتا۔“

وہ بوتھ سے باہر نکلا۔ اس کا رخ ہیڈ کوارٹر کی طرف تھا۔ وہ اسی وقت لیری کی جگہ چارج سنبھالنا چاہتا تھا۔

اسما قادری

قسط 45

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور با اثر سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے میں ہو۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے۔ زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں... کبھی باری پلٹ بھی جاتی ہے۔ بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر سا نہ دے جاتا ہے... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے۔ حرم، افسر شاہی، جاگیر داری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بادشاہ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہر یار عادل ایک پُر جوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیر نگیں ضلع کے سب سے بڑے گاؤں پیر آباد کا چوہدری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہر یار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ چوہدری کی نفاست پسند بیٹی کشور، آفتاب سے خفیہ نکاح کر لیتی ہے۔ ماہ بانو کا تعلق بھی پیر آباد سے ہے۔ چوہدری افتخار جب ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آ جاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چوہدری کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ گورا، جس کا نام ڈیوڈ ہے، اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ چوہدری کو ماہ بانو کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ ادھر کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ چوہدری، آفتاب اور کشور کا سراغ لگانے کا حکم دیتا ہے۔ چوہدری افتخار لندن پہنچتا ہے اور ہیروئن کی تیاری کے لیے لیب کے قیام والے معاملات طے کر لیتا ہے۔ شہر یار کی ملاقات میجر ذیشان سے ہوتی ہے تو وہ اسے بتاتا ہے کہ ایک اینٹی فورس قائم کر دی گئی ہے اور وہ خود اس میں شامل ہو گیا ہے۔ یہ فورس ایک سیکیورٹی ایجنسی کے طور پر خفیہ کام کرتی ہے۔ واپسی میں شہر یار کو ماہ بانو کا فون موصول ہوتا ہے۔ وہ اس سے ایک ریسٹورنٹ میں ملتی ہے اور اسلم سے شادی کی خبر سنا کر اس سے اپنے شناختی کاغذات بنانے کے لیے اس کی مدد چاہتی ہے۔ شہر یار کو پتا چلتا ہے کہ ماریا اس کی جاسوسی کر رہی ہے۔ اسلم اور ماہ بانو شادی کے بندھن میں بندھ جاتے ہیں۔ ماریا، کرنل توحید کو رجھانے کی کوشش میں پکڑی جاتی ہے تاہم راستے میں رانا کے بندوں کی فائرنگ سے گاڑی میں آگ لگنے کے سبب ماریا بری طرح جھلس جاتی ہے اور اسپتال میں پوچھ گچھ کے
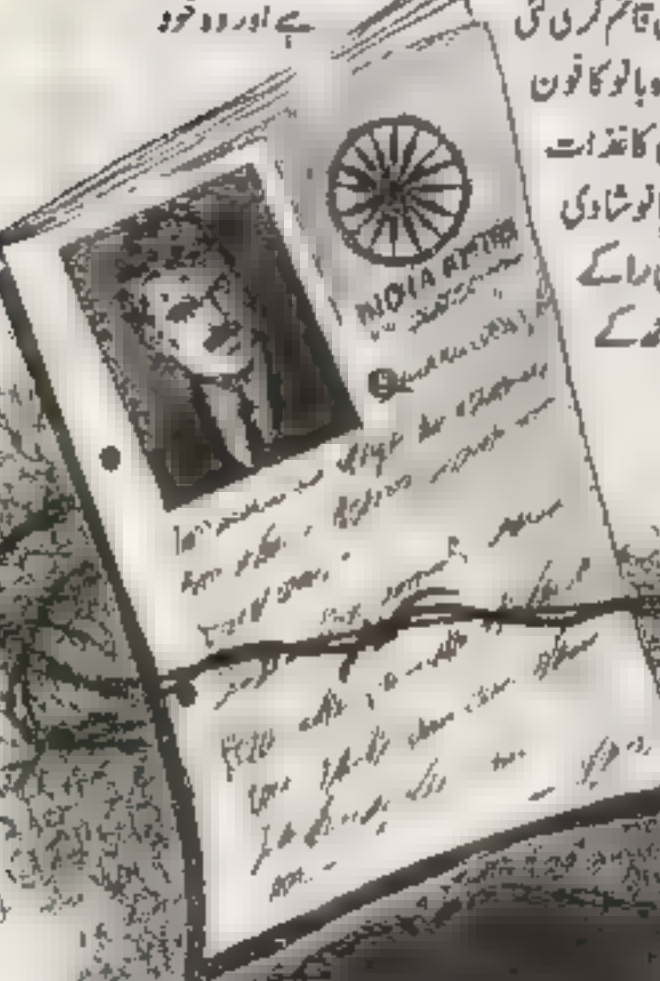
دوران دم توڑ دیتی ہے۔ شہریار اس کی لاش کو لاوارثوں میں شامل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ ادھر ماریا کی ماں سنتھیا جوزف ورما سے انتقامی کارروائی کا مطالبہ کرتی ہے۔ شہریار اللہ آباد اور نور پور دورے کے لیے نکلتا ہے۔ اس کی گاڑی کو بم سے اڑا دیا جاتا ہے لیکن وہ محفوظ رہتا ہے۔ شہریار کو کرنل توحید فورس میں شامل ہونے کا کہتے ہیں۔ شہریار فورس میں شامل ہونے کا فیصلہ کرلیتا ہے۔ شہریار کی شناخت چھپانے اور فورس میں آزادانہ کام کرنے کے لیے طے ہوتا ہے کہ شہریار کے فرضی ایکسیڈنٹ کی افواہ پھیلائی جائے گی۔ شہریار، ماہ بانو اور اسلم کو امریکا بھجوا دیتا ہے۔ پھر اس کے ایکسیڈنٹ کا ڈراما رچایا جاتا ہے۔ شہریار انڈر گراؤنڈ ہوجاتا ہے اور اس کی ٹریننگ اور حلیے میں تبدیلی کا عمل شروع ہوجاتا ہے۔ کشور اور آفتاب بھی نیویارک پہنچ جاتے ہیں جہاں ایک شاپنگ سینٹر میں ان کی ملاقات مراد شاہ سے ہوجاتی ہے۔ ادھر شہریار کے کہنے پر ذیشان سی ایف پی کے نوجوان کو خواجہ سراؤں کے گروہ میں شامل ہونے کے لیے بھیجتا ہے۔ جاوید علی نامی سی ایف پی کا نوجوان خواجہ سراؤں میں شامل ہوکر کراچی نوازش علی نامی شخص کی کوٹھی میں پہنچ جاتا ہے۔ وہاں ملازم خواجہ سرا تھے۔ وہاں جاوید علی کو پتا چلتا ہے کہ شانتی کسی چکر میں ملوث ہے۔ وہ ہیڈ کو رپورٹ کرتا ہے اور شانتی کے آدمی اسلحے سمیت پکڑے جاتے ہیں تاہم شانتی کو گرفتار کرنے کے بجائے اس کی نگرانی شروع کردی جاتی ہے۔ جاوید علی ہیڈ کو رپورٹ کررہا ہوتا ہے کہ نوازش علی کی بیٹی شاز مین اس کی گفتگو سن لیتی ہے۔ شانتی پکڑے جانے والے مال کے بارے میں ورما کو وضاحت دیتی ہے۔ وہ کراچی فون کرکے رجنی پر نظر رکھنے کی ہدایت کرتی ہے۔ ورما اس کی گفتگو سن لیتا ہے ورما اسے موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ ورما، پتا ٹھکانا چھوڑتا ہے مگر سی ایف پی کا اہلکار اس کا پیچھا کرتا ہے اور [illegible] ٹھکانے تک پہنچ جاتا ہے۔ ادھر جاوید علی شاز مین سے معلومات حاصل کرتا ہے۔ نوازش علی کی کوٹھی پر آپریشن کیا جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں [illegible] تہ خانہ [illegible] کو روسی [illegible] دے اڑا دیتے ہیں۔ جاوید علی شدید زخمی ہوکر اسپتال پہنچ جاتا ہے جبکہ نوازش علی [illegible] بازی ہار جاتے ہیں [illegible] اس کی دونوں [illegible] محفوظ رہتی ہیں۔ ادھر شہریار، ورما کے ٹھکانے پر پہنچ کر اسے قابو کرلیتا ہے۔ شاز مین [illegible] پہنچ جاتی ہے جہاں وہ جاوید علی سے ملنے اسپتال جاتی ہے۔ [illegible] والے شاز مین کی گاڑی کا پیچھا کرتے ہیں اور اسپتال سے واپسی میں اسے اغوا کرلیتے ہیں۔ سنتھیا، شاز مین سے پوچھ گچھ کرتی ہے اور کسی واضح صورت حال سے آگاہ کرنے پر اس پر جسمانی تشدد کا حربہ آزماتی ہے۔ پھر اس کو ایک مردہ سمجھ کر سنسان جگہ پھنکوا دیا جاتا ہے تاہم شاز مین بچ جاتی ہے اور اسپتال میں طبی امداد کے بعد اس کی حالت بہتر ہوجاتی ہے مگر شاز مین وہاں خودکشی کرلیتی ہے۔ مراد شاہ، کشور اور آفتاب کو کھانے پر گھر [illegible] ہے۔ وہاں اچانک واپسی پر اس کا کشور سے سامنا ہوجاتا ہے اور وہ غصے سے پاگل ہوجاتا ہے مگر مراد شاہ، کشور کو چودھری سے بچاتا ہے۔ ادھر شہریار کو [illegible] کر دیا جاتا ہے اور اسے سلو والے مشن پر کراچی بھیجا جاتا ہے۔ چودھری کشور اور آفتاب کو ٹھکانے لگانے کے لیے کرائے کے آدمیوں کا سہارا لیتا ہے۔ تاہم وہ بچ جاتے ہیں اور انہیں مارنے کی نیت سے آنے والے لوگ پکڑے جاتے ہیں۔ سلو، وزیر اعلیٰ کے بیٹے کی دعوت ولیمہ میں... ایک اہم شخصیت کو [illegible] کی کوشش کرتا ہے تاہم اسے گرفتار کرلیا جاتا ہے۔ ادھر مشابرم خان کی والدہ انتقال کر جاتی ہیں [illegible] کی شادی [illegible] ہوجاتی ہے۔ مشابرم خان کے دہشت گرد کو پکڑ کر آرمی کے حوالے کردیتا ہے۔ شہریار واپس لاہور آجاتا ہے۔ عمر فاروق اسے بتاتے ہیں کہ اسے ایک اہم مشن سونپا جارہا ہے۔ شہریار بھارت بھیجا جانا ہوتا ہے جہاں سے اسے ڈاکٹر قربان نامی شخص کو رہا کرانے کا مشن سونپا جاتا ہے۔ ادھر مشابرم خان [illegible] بشیر بھرلی [illegible] داخل ہوجاتا ہے اور اسے وہاں سے گن پوائنٹ پر لے کر آرمی والوں کے حوالے کردیتا ہے۔ سی ایف پی والے ریاض انور کو اٹھا لیتے ہیں۔ [illegible] جیل میں سازش کا انکشاف ہوتا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ سلو کو جیل میں ہلاک کیا جاتا ہے۔ جیل سے قیدیوں کے فرار کی سازش پر عمل درآمد ہوتا ہے۔ سلو کا ساتھی قیدی اسے لے کر جیل کی دیوار پار کرنے کے لیے نکلتا ہے۔ تاہم اس سازش کو ناکام بنادیا جاتا ہے۔ سلو کو سی ایف پی والے جیل سے نکال کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ادھر ریاض انور کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ سلو کو شہریار کے پاس پہنچا دیا جاتا ہے جو اب عادل خان تھا۔ شہریار اسے اپنے مقصد سے آگاہ کرتا ہے اور سلو، شہریار کے ساتھ مشن پر جانے کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔ وہ لوگ اسمگلروں کے ایک قافلے کے ساتھ غیر قانونی سرحد عبور کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ انڈین سرحد پر کچھ لوگ ان پر ہلا بول دیتے ہیں تاہم وہ وہاں سے بچ نکلتے ہیں۔ ادھر ڈیوڈ، سنتھیا کو درپیش ہونے والے نقصانات سے آگاہ کرتا ہے اور اس سے مشورہ کرتا ہے۔ سنتھیا اپنی ایک ایجنٹ کو بشیر کبر کے نائب کے پاس بھیج دیتی ہے تاکہ مزید معلومات حاصل کی جاسکیں۔ سلو اور شہریار ایک سرائے میں ٹھہرے ہوتے ہیں۔ وہ دونوں بے فکر ہوکر سو رہے ہوتے ہیں اور انہیں پتا ہی نہیں چلتا کہ کب تاریک کمرے میں دو افراد کسی سائے کی طرح داخل ہوتے ہیں۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

سلو اور شہریار دونوں ہی گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ کمرے میں داخل ہونے والے دونوں سائے محتاط قدموں سے چلتے ہوئے آگے بڑھے اور طے شدہ منصوبے کے مطابق ایک سلو کی چارپائی کی طرف اور دوسرا شہریار کی چارپائی کی طرف بڑھ گیا۔ ان دونوں نے اپنے بیگ چارپائیوں کے نیچے رکھے ہوئے تھے۔ داخل ہونے والے دونوں افراد نے بہ آہستگی بیگوں کو کھینچ کر باہر نکالا اور کمرے کے دروازے کا رخ کیا۔ اس ساری کارروائی کے دوران وہ بار بار سوئے ہوئے شہریار اور سلو کا بھی جائزہ لیتے جارہے تھے کہ کہیں ان میں سے کسی کی آنکھ نہ کھل جائے۔ آنکھ کھل جانے کی صورت میں وہ انہیں دو چار پٹخنیاں دے کر بے ہوش کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے لیکن خیر گزری اور اس کی نوبت ہی نہیں آئی اور وہ خاموشی سے اپنی کارروائی مکمل کر کے واپس جانے لگے۔

''تم دونوں جو بیگ لے جارہے ہو ان میں کچھ نہیں ہے۔ رقم تو میرے تکیے کے نیچے رکھی ہوئی ہے۔'' یکدم ہی انہیں اپنے عقب سے آواز سنائی دی تو وہ بھڑک کر واپس پلٹے۔ دونوں میں سے ایک چارپائی خالی تھی اور بولنے وال

ایک دیوار کے قریب کھڑا تھا۔ دراصل یہ شہریار تھا جس کی چھٹی حس کسی خودکار حفاظتی نظام کی طرح ان دونوں کے اندر داخل ہوتے ہی کھل گئی تھی لیکن اس نے فوری طور پر انہیں چھیڑنے کے بجائے انتظار کرنا مناسب سمجھا تھا اور عین اس وقت پر انہیں مخاطب کیا تھا جب وہ اپنے تئیں کامیاب واردات کر کے اطمینان سے واپس جارہے تھے۔ اس نے انہیں واپس جاتے دیکھ کر اتنی پھرتی اور خاموشی سے اپنی جگہ چھوڑی تھی کہ انہیں اندازہ بھی نہیں ہوسکا کہ ان کے پیچھے کتنی بڑی تبدیلی رونما ہوچکی ہے۔ شہریار نے انہیں مخاطب کیا تو وہ تیزی سے پلٹے اور ان میں سے ایک نے پھرتی سے خنجر نکال کر شہریار پر پھینکا۔ وہ ہوشیار تھا چنانچہ تڑپ کر اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور خنجر دیوار سے ٹکرا کر نیچے گر گیا۔ اس وار کو ناکام ہوتے دیکھ کر دونوں نے بیک وقت شہریار کی طرف چھلانگ لگائی۔ چھلانگ لگانے والوں میں سے ایک تو درمیان میں ہی دھڑام سے گر گیا جبکہ دوسرے کو شہریار کی پڑنے والی لات نے واپس اچھال دیا۔ درمیان میں گرنے والے کو سلو نے سنبھال لیا۔ درحقیقت وہ شخص گرا بھی اس کے ٹانگ اڑانے سے تھا۔ سلو کی آنکھ اس کارروائی کا آغاز ہوتے ہی کھل گئی تھی اور اس نے مناسب وقت پر اپنا حصہ بھی ڈالنا شروع کردیا۔

کمرے کی محدود فضا میں ان کے درمیان ہونے والی یہ ہاتھا پائی زیادہ طول نہ کھینچ سکی۔ دراندازی کرنے والے وہ دونوں نامعقول افراد بے شک ہاتھ پیر چلانا تو جانتے تھے لیکن دو تربیت یافتہ لڑاکوں کو سنبھالنا ان کے بس کا روگ نہیں تھا۔ تھوڑی دیر وہاں ہنگامہ ہوا اور پھر جلد ہی دونوں زمین بوس ہوگئے۔ سلو نے آگے بڑھ کر کمرے میں روشنی کردی۔ روشنی میں جو چہرے ان کے سامنے آئے، ان میں سے ایک کو شناخت کرنا ان کے لیے دشوار نہیں تھا۔ وہ جگدیش تھا جو اس قصبے میں وارد ہوتے ہی ان سے چمٹ گیا تھا اور انہیں توقع تھی کہ یہ لالچی شخص کسی نہ کسی طرح انہیں ضرور تنگ کرے گا۔ اب جبکہ اس نے دن دہاڑے انہیں سوتا جان کر ان کے کمرے سے ان کے بیگ چرانے کی کوشش کی تھی تو اس کی نیت کھل کر ان کے سامنے آگئی تھی۔

''رام بھلی کرے۔ سب چنگا تو ہے بھاپا جی۔'' اس سے قبل کہ وہ دونوں جگدیش سے بازپرس شروع کرتے، ان کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اور کسی نے ذرا سہمی ہوئی آواز میں دریافت کیا۔

''ہاں، سب چنگا ہے۔ اندر آجاؤ۔'' شہریار نے جواب دے کر پوچھنے والے کو اندر آنے کی دعوت دی۔ امید تھی کہ دستک دینے والا کوئی مقامی شخص ہوگا اور وہ اسے گواہ بنا کر جگدیش اور اس کے ساتھی کا کوئی فیصلہ کرڈالیں گے۔ دروازہ کھلا تو ایک تھکی سا درمیانی عمر کا آدمی اندر داخل ہوا۔

''میں آپ کے سامنے والے کمرے میں رکا ہوا ہوں۔ یہاں سے اٹھا پٹخ اور مار دھاڑ کی آوازیں سنائی دیں تو جانکاری کے لیے آگیا۔'' اس نے سہمی ہوئی نظروں سے کمرے کا منظر دیکھتے ہوئے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھتے ہوئے اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ وہ بزدل مزاج کا آدمی ہے اور اس نے اسی وقت کمرے کے دروازے پر دستک دینے کی جرأت کی ہے جب اسے یہ یقین ہوگیا کہ اندر صورت حال مکمل طور پر قابو میں ہے۔

''تسی کدھر سے آکر اتھے ٹھہرے ہو؟'' سلو نے اس سے پوچھا۔

''اسیں ہریانہ توں آیا سی۔ اسیں اتھے دکاناں تے مال سپلائی کرندا سی۔ سفر لمبا ہے اس واسطے تھوڑی دیر آرام لئی اتھے ٹھہر گیا ہوں۔'' اس نے اپنے بارے میں بتایا تو سلو کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''تسی اپنی ذاتی گڈی تے آئے ہو؟''

''آہو، میرے کول اک سوزوکی ہے۔ اسی پر آیا ہوں۔'' اس نے بتایا تو وہ دونوں ہی خوش ہوگئے۔

''آؤ بھاپا، آرام نال اتھے بیٹھو فیر میں تینوں سارا لفڑا دسدا ہوں۔'' سلو نے بڑی اپنائیت سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے چارپائی پر بٹھایا۔ وہ سہمی ہوئی نظروں سے جگدیش اور اس کے ساتھی کو زمین پر بے بس پڑا دیکھتے ہوئے چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''تسی وڈے بھاپا جی کو بتاؤ پاجی کہ سارا قصہ کی ہے۔'' سلو نے ذرا شرمانے کی اداکاری کرتے ہوئے شہریار سے درخواست کی تو وہ اس کا مقصد سمجھتے ہوئے بچی چارپائی پر بیٹھ کر ٹھیٹ دیہاتی انداز میں بولنا شروع ہوگیا۔

''قصہ اے ہے پاجی کہ یہ جو اپنا نندا اور اے ہے ور چندر اس کا ویاہ ہونے والا ہے، ہور اسیں اس کے ویاہ کی تیاری کے لیے دلی خریداری جی کرنی جارہے ہیں۔ اس قصبے میں آرام جی لئی ٹھہرے تھے۔ ادھر ہوٹل تے یہ بدمعاش جگدیش مل گیا ہور عقل اپنی سادگی توں انہاں کے دس دیئے کہ روپے لے کر خریداری واسطے نکلے ہیں۔ عقل کے کیا علوم تھا کہ یہ بدمعاش آدمی ہے ہور موقع ملتے ہی اسان کے لوٹنے واسطے ادھر گھس

جائے گا۔ وہ تو ماں کی کرپا نوں میری اکھ کھل گئی ہور میں نے انہاں کے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا سی۔ بدمعاش اسیں کے ڈرانے واسطے خنجر بھی لے کر آیا تھا پر انہاں نوں علوم نہیں تھا کہ اسیں بچپن نال اکھاڑے وچ ورزشاں کر کے تے ڈنڈ بیٹھکاں لگا کے جوان ہوئے ہیں۔ ایسی پھینٹی لگائی ہے اس ماں دے پتر نے، من جی ساری دی کہ سارا جیون یاد رکھیں گے۔'' شہریار نے نہایت فاخرانہ انداز میں اپنا کارنامہ بیان کیا۔

''ایہہ تو وڈی بُری گل ہے۔ اس سرائے کے مالک نوں بلا کر گل کرو کہ اتھے ایہہ کی ہو رہا ہے۔ دن جی ویلے ایہہ حال ہے تو راتاں نوں اتھے گزارنا شریف آدمی واسطے ممکن ای نہیں ہے۔'' نوواردوں نے مشورہ دیا تو سلو فوراً ہی باہر نکل گیا۔ باہر برآمدے میں بھی کوئی خاص روشنی نہیں تھی۔ اصل میں عمارت بنائی ہی کچھ اس انداز میں گئی تھی کہ دن کے وقت بھی اندھیرے اور گھٹن کا احساس ہوتا تھا۔ وہ سرائے کے مالک کے دفتر نما کمرے کے سامنے پہنچا تو انکشاف ہوا کہ دروازہ باہر سے بند ہے۔ اس نے کنڈی کھول کر اندر جھانکا۔ بوڑھا کرسی پر مزے سے سو رہا تھا۔ سلو نے اسے جھنجوڑ کر جگایا اور ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اس نے تفصیلات سن کر سیدھا ان کے کمرے کا رخ کرنے کے بجائے باہر کا رخ کیا اور ایک بچے کے ہاتھوں پیغام بھیج کر اپنے بیٹے اور قصبے کے دو تین معززین کو بلا یا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہاں ایک چھوٹا سا ہجوم جمع ہو گیا۔ جگدیش اور اس کا ساتھی اس دوران ہوش میں آ گئے تھے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ وہاں قصبے کے معززین جمع ہو گئے ہیں تو انہوں نے بے ہوش بن کر پڑے رہنے میں ہی عافیت جانی۔ سرائے کے مالک، اس کے بیٹے اور دیگر افراد نے پہلے شہریار اور سلو سے معافی مانگی کہ انہیں یہاں اس قسم کی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا پھر جگدیش اور اس کے ساتھی کے مستقبل کا فیصلہ کرنے لگے۔

''اسیں ان دوناں نوں وڈی چھوٹ دے چکے ہیں ہور ان کی بدمعاشیوں کو شما کرتے رہے ہیں کہ جوانی وچ بندے نوں ایسی غلطی لگ جاندی ہے۔ دونوں کسی ویلے سنبھل جائیں گے پر اج تو انہاں نو اساں دی نک ہی کٹوا دی ہے۔ اجنبی مسافراں نوں لوٹنے دی کوشش کرن والی حرکت ایسی نہیں ہے کہ شما کر دی جائے۔ اب پلیس کو ان کے بارے میں دسنا ہی ہوگا۔ دو چار مہینے حوالات میں رہ کر چھتی کھائیں گے تو دماغ ٹھیک ہو جائے گا۔'' آخر کار سرائے کے بوڑھے مالک نے سب کی متفقہ رائے سے یہ فیصلہ سنا ڈالا۔

فیصلہ سن کر اب تک بے ہوش بنا پڑا جگدیش اور اس کا ساتھی اپنی جگہ سے اٹھ گئے اور ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے لگے کہ ایک بار انہیں معاف کر دیا جائے، آئندہ وہ بھول کر بھی ایسی غلطی نہیں کریں گے لیکن ان لوگوں کا فیصلہ حتمی تھا۔ شاید دوسرے علاقے سے آئے ہوئے لوگوں کے سامنے اپنے قصبے کے جوانوں کی حرکت نے انہیں بے پناہ شرمندہ کر دیا تھا اس لیے وہ کسی طور نرم پڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ جگدیش اور اس کے ساتھی کا قصہ نمٹا تو ان دونوں سے ایک بار پھر معذرت کر کے انہیں نہ صرف آرام کے لیے تنہا چھوڑ دیا گیا بلکہ سرائے کے مالک نے اپنی طرف سے دوپہر کے کھانے کی دعوت بھی دے ڈالی۔ مناسب آرام اور پُرتکلف کھانے کے بعد وہ اس قصبے سے روانہ ہوئے تو کچھ اس طرح کہ سرائے میں رکے ہوئے تیسرے مسافر کی سوزوکی میں سوار تھے جو انہیں کسی ایسے مقام پر چھوڑ دیتا جہاں سے انہیں لاہور کے لیے براہِ راست سواری مل جاتی۔

☆☆☆

''سر! ایک مچھلی جال میں آئی ہے۔'' یہ اطلاع ملتے ہی میجر اسفند یار آپریشن روم کی طرف دوڑا۔ یہاں ٹیکنیکل ٹیم وقت کی پروا کیے بغیر پوری مستعدی سے اپنا کام کر رہی تھی۔ اس نے ایک خالی کرسی سنبھال کر ماتحت کا پیش کردہ ہیڈ فون کانوں پر چڑھا لیے۔ سماعتوں کے ذریعے اسے سمجھ آنے لگا کہ عبادت گاہ کے موجود کرتا دھرتا کی خواب گاہ میں گل جاناں نامی کشمیری بلبل کون سے گل کھلا رہی ہے۔ اس نے اپنا مطلب برآری کے لیے شراب اور شباب کے گویا دریا بہا رکھے ہوئے تھے اور وہ عقل کا کچا، ور نفس کا غلام اس کے آگے بچھا جا رہا تھا۔

''یہ تو بڑی دھکری ٹائپ مچھلی ہے یار۔ تو کہہ رہا تھا مچھلی جال میں پھنسی ہے پر مجھے تو لگتا ہے کہ یہ خود کیل کانٹوں سے لیس ہو کر شکار کے لیے نکلی ہے۔'' اس نے سنائی دینے والی آوازوں پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے خوش دلی سے اپنے ماتحت سے کہا۔

''کوئی مسئلہ نہیں ہے سر جی! کبھی کبھی شکاری خود بھی شکار ہو جاتا ہے۔ آپ بس ذرا سا اشارہ کریں پھر یہ شکاری مچھلی آپ کی ٹیبل پر ہوگی۔'' ماتحت نے ترت جواب دیا۔

''تو بس سمجھو ہو گیا اشارہ۔'' اس نے جواب دیا تو چہرے کے تاثرات یکسر بدل چکے تھے اور وہاں اب کھلنڈرے پن کی جگہ مکمل سنجیدگی نظر آ رہی تھی۔ معاملہ تھا بھی اہم۔ انہیں ابتدا سے ہی یہ یقین رہا تھا کہ بشیر اکبر کے غیاب

کے بعد نیا سیٹ اپ قائم ہو جانے کے باوجود اس کے پیچھے موجود لوگ حقائق کا کھوج لگانے کے لیے ضرور میدان میں اتریں گے اور اصولی طور پر اس مقصد کے حصول کے لیے اس شخص کے گرد گھیرا تنگ کرنا ہی سب سے اہم تھا جس نے بشیر اکبر کی جگہ لی تھی۔ چنانچہ وہ لوگ مسلسل اس آدمی کو اپنی نظروں میں رکھے ہوئے تھے۔ اس سلسلے میں اس کی رہائش گاہ کو بھی ''بگڈ'' کیا گیا تھا جس کی وجہ سے چند دنوں میں ہی ان پر یہ انکشاف ہو گیا تھا کہ وہ ایک عیاش طبع آدمی ہے۔ گل جاناں کی اس کے گھر میں آمد سے بھی وہ باخبر تھے اور یہ بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ ملازمہ کی حیثیت سے گھر میں داخل ہونے والی اس لڑکی کو وہ اپنی داشتہ بنانے میں دیر نہیں لگائے گا۔ البتہ فوری طور پر یہ شک نہیں کیا جا سکا تھا کہ پناہ کی غرض سے آنے والی یہ لڑکی اپنے ساتھ کچھ خاص مقاصد لے کر آئی ہے۔ یہ بات تو انہیں رات کے اس پہر پتا چل رہی تھی جب وہ اپنے ٹارگٹ کو شباب اور شراب کے نشے میں ڈبو کر اس سے یہ جاننے کی کوشش کر رہی تھی کہ بشیر اکبر کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا اور اس کے پیچھے کن لوگوں یا ادارے کا ہاتھ ہے۔ وہ کاٹھ کا الو بھی اپنی اوقات سے بڑھ کر مل جانے پر سب کچھ اگلتا جا رہا تھا۔

''ایک پارٹی عبادت گاہ جائے گی اور دوسری اس آدمی کے گھر جو اس فتنے کو لے کر آیا تھا۔ عبادت گاہ کے سامنے پہنچنے والی پارٹی کے لیے میں پہلے ہی اندر سے لائن کلیئر کروا دوں گا۔ تم لوگ پورے اطمینان سے جاؤ، مجھے رزلٹ میں بس کامیابی چاہیے۔'' اس نے بہت تیزی سے احکامات جاری کرنا شروع کر دیے تھے اور ان پر عمل اس سے بھی زیادہ تیزی سے ہو رہا تھا۔ گل جاناں کو لانے والے شخص کے گھر پر پہنچنے والی پارٹی پہلے اپنے ٹارگٹ پر پہنچی تو وہاں دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ انہوں نے وقت کی پروا کیے بغیر پڑوسی کے دروازے پر دستک دی اور اس سے اس سلسلے میں استفسار کیا۔

''یہ لوگ تو شاید لاہور گئے ہوئے ہیں۔ میری گھر والی نے ذکر کیا تھا کہ پڑوسن اپنے میکے والوں سے ملنے جا رہی ہے۔ سننے میں یہی آیا ہے کہ اس کا میکا لاہور میں ہے۔'' وردی پوشوں کو اپنے دروازے پر دیکھ کر وہ شخص تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا اور ایک ہی سانس میں خود کو حاصل معلومات منتقل کر دی تھیں۔ پارٹی کے لیڈر نے ذیشان کو اطلاع دی اور اس نے محلے کے دو معززین کی موجودگی میں تالا توڑ کر خانہ تلاشی کا حکم دے ڈالا تا کہ اگر کوئی مشکوک

شے ملے تو اسے اپنی تحویل میں لے لیا جائے۔ ہدایات ملنے پر پارٹی نمبر ایک اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ اس دوران میں دوسری پارٹی بھی اپنے ٹارگٹ پر پہنچ گئی تھی۔ اسفند یار نے پہلے ہی یہ بندوبست کر لیا تھا کہ عبادت گاہ کی سیکیورٹی پر متعین افراد میں اپنے آدمی بھی شامل ہوں اس لیے اس وقت انہیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی اور وہ سیدھے رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر معاملات کو اپنے ہاتھ میں لینا ان کے لیے کچھ مشکل نہیں تھا۔ گل جاناں اور موجودہ راہنما صاحب تیکنی طور پر قابلِ اعتراض حالت میں ملے۔ راہنما صاحب کے تو حواس اتنی بری طرح معطل تھے کہ مزاحمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا البتہ گل جاناں نے تھوڑے بہت ہاتھ پیر چلانے کی کوشش کی لیکن اسے بھی جوانوں نے قابو کر لیا۔ انہیں راہنما صاحب سے کچھ لینا دینا نہیں تھا اور انہیں ساتھ لے جانے میں نقصِ امن کا بھی اندیشہ تھا اس لیے اسے اس کے حال پر چھوڑ کر وہ لوگ صرف گل جاناں کو اپنے ساتھ لے کر روانہ ہو گئے۔ روانگی سے قبل اس فتنے کو بستر کی بڑی سی چادر میں لپیٹ لیا گیا تھا۔ وہ لوگ اسے لے کر تیزی سے ہیڈ کوارٹر واپس پہنچے۔ وہاں اسفند یار ان کا منتظر تھا۔ اس کے حکم پر چادر میں بالکل ساکت پڑی گل جاناں کا چہرہ کھولا گیا تو وہ سب چونک اٹھے۔ اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ اسفند یار نے قریب جا کر اس کا جائزہ لیا۔ اس کے گلے میں موجود سیاہ ڈوری میں پڑا ہوا تعویذ دانتوں تلے دبا ہوا تھا۔ وہ ایک گہرا سانس لے کر پیچھے ہٹ گیا۔

''تم لوگوں نے یہاں لانے سے پہلے اس کی تلاشی لے کر اس کی سب چیزوں کو اپنے قبضے میں کیوں نہیں لیا تھا؟'' اس نے سرد لہجے میں اپنے ماتحتوں سے پوچھا۔

''سوری سر! یہ جس حالت میں تھی، ہم نے بس یہی مناسب سمجھا کہ اسے چادر میں لپیٹ کر یہاں لے آئیں۔ ویسے بھی وہاں زیادہ رکنا مناسب نہیں تھا۔'' پارٹی کو لیڈ کرنے والے شخص نے شرمندہ سے لہجے میں وضاحت پیش کی تو اسفند یار نے برا سا منہ بنایا اور دوبارہ قریب جا کر گل جاناں کی لاش کا معائنہ کرنے لگا۔ اس کا خوب صورت چہرہ بالکل نیلا پڑ گیا تھا اور آنکھوں کی پتلیاں ساکت تھیں۔ یقینی طور پر اس کے گلے کے تعویذ میں جو زہر موجود تھا وہ بہت سریع الاثر تھا جس نے چند منٹوں کے اندر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور اب وہ ان کے لیے بالکل بیکار تھی۔ ایک لاش سے بھلا وہ کیا اور کیسے معلوم کر سکتے تھے۔

''اسے چیک کرو۔'' اسفند یار نے اس کے بالوں

میں لگا موتیوں سے بنا نفیس سا کلپ نکال کر ماتحت کو پکڑایا تو وہ فوراً کلپ لے کر باہر نکل گیا۔

”ضروری کارروائی مکمل کرو اور لاش کو ٹھکانے لگا دو۔“ اسفند یار حکم دے کر خود بھی کمرے سے باہر نکل گیا۔ اب وہ اپنے دفتر میں تھا۔ کچھ دیر بعد دوسری پارٹی کا لیڈر بھی وہاں پہنچ گیا اور رپورٹ پیش کرنے لگا۔

”گل جاناں کو منیر تک پہنچانے والے شخص کا نام قاسم تھا۔ وہ یہاں کا مقامی نہیں تھا بلکہ بشیر اکبر کی یہاں آمد کے لگ بھگ پانچ سال بعد یہاں آیا تھا اس کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جن سے بشیر اکبر کے قریبی مراسم تھے یا جنہیں وہ دوسروں کی نسبت زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ ہم نے اس کے گھر کی مکمل تلاشی لی ہے۔ فرنیچر، کپڑے اور گھریلو استعمال کا سارا سامان اپنی جگہ موجود ہے لیکن بہت اچھی طرح تلاشی لینے کے باوجود ہمیں وہاں کسی قسم کے کاغذات، ملکی یا زیورات وغیرہ جیسی چیزیں نہیں ملی ہیں۔ پورے گھر میں ایسا کوئی البم یا فوٹو فریم موجود نہیں ہے جس سے ہم قاسم اور اس کے بیوی بچوں کی تصویریں حاصل کرسکیں۔ کوئی مشکوک چیز بھی نہیں ملی ہے لیکن عام استعمال کی چیزوں کو چھوڑ کر گھر سے ہر اہم شے کا غائب ہونا اپنی جگہ خود مشکوک ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ قاسم پوری پلاننگ کے ساتھ یہاں سے فرار ہو چکا ہے۔“

”تمہارا اندازہ ٹھیک ہے۔ مجھے بھی یہی لگ رہا ہے کہ وہ بیوی کو میکے لے جانے کے بہانے یہاں سے نکل گیا ہے اور پیچھے ایسی کوئی نشانی نہیں چھوڑی ہے کہ گل جاناں کے پکڑے جانے کی صورت میں اسے تلاش کیا جاسکے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے گل جاناں کو قاسم کے ذریعے منیر تک پہنچایا تھا، انہیں اس بات کا اندازہ تھا کہ منیر کی نگرانی ہورہی ہوگی اور گل جاناں کے اپنی کارروائی کے دوران پکڑے جانے کا امکان ہے۔“ اپنے ماتحت کے اندازوں کی تصدیق کرتے ہوئے اس نے اپنا تجزیہ بھی پیش کیا۔ اسی لمحے دستک دے کر ایک جوان اندر چلا آیا۔ یہ وہی شخص تھا جسے کچھ دیر قبل اس نے گل جاناں کا کلپ چیک کرنے کے لیے دیا تھا۔

”کلپ چیک کرلیا گیا ہے سر! اس میں ایک بہت طاقتور مائکروفون نما آلہ چھپا ہوا تھا جس کی مدد سے بہت دور بیٹھ کر بھی اس آلے کی رینج میں آنے والی آوازوں کو واضح طور پر سننا ممکن ہے۔“ اس نے آتے کے ساتھ ہی رپورٹ پیش کی۔

”میرا یہی اندازہ تھا۔ ہمارا دشمن بہت چالاک ہے اور جدید آلات کے استعمال کے ساتھ ساتھ انسانی نفسیات سے کھیلنا بھی خوب جانتا ہے۔ گل جاناں کی حیثیت ایک معمولی مہرے سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ اس خوب صورت لڑکی کو قربانی کا بکرا بنا کر نہایت کامیابی سے یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں کہ ان کے ایجنٹ بشیر اکبر کے ساتھ یہاں کیا صورتِ حال پیش آئی اور وہ کیسے منظر سے غائب ہو گیا۔ ہم سے غلطی یہ ہوئی کہ اس قسم کا خدشہ موجود ہونے کے باوجود کہ منیر کے ذریعے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کی جاسکتی ہے، وقت سے پہلے یہ جاننے میں کامیاب نہیں ہوسکے کہ گل جاناں کو کسی خاص مقصد کے تحت منیر تک پہنچایا گیا ہے۔ جب ہمیں معلوم ہوا تو بہت دیر ہوچکی تھی اور منیر شروع میں ہی گل جاناں کے سامنے سب کچھ اگل چکا تھا جو کہ یقیناً ہو بہو کہیں اور سنا گیا ہے۔ گل جاناں جو ظاہر ہے اس لڑکی کا حقیقی نام نہیں ہے، اپنے بڑوں کے سامنے پہلے ہی یہ عہد کرکے آئی ہوگی کہ اگر گرفتاری کی نوبت آئی تو اپنے بارے میں کچھ بتانے کا خطرہ مول لیے بغیر پہلے مرحلے پر ہی خودکشی کرلے گی اور اس کے لیے اس کے پاس معقول انتظام بھی تھا۔“ کلپ سے متعلق رپورٹ سن کر اسفند یار نے ایک بار پھر حالات کا بھرپور تجزیہ کیا۔

”آپ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں سر! دشمن نے منیر کے ذریعے پہلے بندے کو پکڑنے سے لے کر اب تک ہمارے سامنے جو صورتِ حال آئی ہے، اس میں یہ بات بہت واضح ہے کہ یہ لوگ جن افراد کو اپنی ماتحتی میں لے کر کام کرتے ہیں، ان کے ذہنوں کو اس بُری طرح جکڑ لیتے ہیں کہ وہ وقت پڑنے پر اپنی جانیں لینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔“ اس کے ماتحت نے اس کی تائید کی۔

”مطلب برآری کے لیے ہر جگہ ایسے احمقوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسان کے لیے اپنی جان لینا اتنا آسان نہیں ہوتا لیکن جب اس کے دل و دماغ میں خوش کن خواب بھر دیے جائیں تو وہ یہ احمقانہ جرأت بھی کر بیٹھتا ہے، یہ سوچے بغیر کہ خدا کی مخلوق کو آزار دے کر بھلا وہ خدا کی جنت کا حق دار کیسے ٹھہر سکتا ہے۔“ اسفند یار نے تبصرہ کیا پھر گفتگو کو سمیٹتے ہوئے بولا۔ ”اینی وے، جو کچھ ہونا تھا ہوچکا۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اب ہم کیا کرسکتے ہیں۔ ہمارے پاس واحد کلیو قاسم ہی ہے۔ دیکھو کہ اسے تلاش کرنے کا کوئی راستہ نکلتا ہے یا نہیں۔ آس پاس والوں سے معلومات حاصل کرکے اس کا اسکیچ بنواؤ۔ جہاں وہ ملازمت کرتا تھا، وہاں سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ ممکن ہے وہاں سے اس کے کوئی ڈاکومینٹس وغیرہ مل جائیں۔ یہ بھی دیکھو کہ اس کے بچے کس عمر کے تھے اور اسکول وغیرہ جاتے تھے یا نہیں۔ اگر وہ اسکول جاتے تھے تو وہاں سے بھی ہمیں ان کے فوٹوگرافس وغیرہ کی شکل میں کوئی کلیو مل سکتا ہے۔ تم لوگ یہ کام کرو۔ میں دیکھتا ہوں کہ مشابرم خان کی سیفٹی کے لیے کیا کیا جاسکتا ہے۔ موجودہ حالات میں اس کے لیے خطرت سب سے زیادہ بڑھ گئے ہیں۔ اس سارے کیس میں وہ اپنے اصل نام کے ساتھ منظر پر آیا تھا اس لیے مجھے خدشہ ہے کہ اس کے لیے پہلے کی طرح اپنی روٹین لائف کی طرف پلٹنا مشکل ہوگا اور اس کے لیے کوئی دوسرا بندوبست کرنا پڑے گا۔“

”او کے سر۔“ اس کا اشارہ پا کر دونوں ماتحت کمرے سے باہر نکل گئے۔ اس مشن میں اس نے بہت ہی خاص اور معتمد بندوں کو ساتھ رکھا تھا کہ اگر اس کے اردگرد کوئی بشیر اکبر کا چاہنے والا موجود ہو تو گڑبڑ نہ کرسکے ورنہ حالات اور بھی مشکل ہوجاتے۔ حقیقت میں وہ خود بھی اس معاملے میں بہت زیادہ ملوث نہیں ہونا چاہتا تھا اور صرف اس حد تک کام کررہا تھا کہ کرنل توحید کو مطمئن کیا جاسکے۔ اب بھی وہ اس سارے معاملے پر باریک بینی سے غور کرتے ہوئے منتظر تھا کہ جوں ہی باقاعدہ آغاز ہوجائے تو کرنل توحید کو اب تک کے حالات کی رپورٹ پیش کردے۔

☆☆☆

نیلی جینز پر سیاہ رنگ کے کھلے گلے کی ٹی شرٹ میں ملبوس جاوید علی متوسط طبقے کا کھلنڈرا سا نوجوان لگ رہا تھا۔ ذیشان کی طرف سے اجازت ملتے ہی اس نے رائے چند پر کام کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا اور اس وقت بائیک پر سوار اسی کی دکان کی طرف جارہا تھا۔ وہاں جانے کے لیے اس نے شام کے وقت کا انتخاب کیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ پہلے خریداری کے بہانے رائے چند کی دکان کا ایک چکر لگائے گا پھر سامنے ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر دکان بند ہونے تک اس پر نظر رکھے گا۔ دکان سے وہ اس کے پیچھے اس کے گھر تک جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کے بعد اگر ممکن ہوتا تو شاید وہ اس کے گھر میں گھس کر اسے اور اس کے گھر والوں کو اپنے قابو میں کرتا اور اس سے اس کی حقیقت اگلوا لیتا۔ بہرحال، ابھی اس سلسلے میں اس کا ذہن واضح نہیں تھا اور فی الحال تو وہ رائے چند کو دیکھ کر اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا چاہتا تھا۔

اپنے اس پروگرام کے مطابق اس نے بڑی بے نیازی سے رائے چند کی دکان کے عین سامنے اپنی بائیک روکی اور انگلی میں کی چین گھماتا ہوا اندر داخل ہوگیا۔ رائے چند کی دکان جو کہ اچھی خاصی بڑی تھی، وہاں روزمرہ استعمال کے آئٹمز فروخت کیے جاتے تھے۔ دکان میں لمبائی کے رخ پر کافی بڑا انگریزی کے حرف "L" کی شکل کا کاؤنٹر بنا ہوا تھا جہاں شیشے کے شوکیس میں بے شمار اقسام کی ٹافیاں، چاکلیٹس، بسکٹس اور بچوں کی پسند کی الم غلم اشیا بھری پڑی تھیں۔ باہر رکھے ریکس میں چپس اور پاپڑ جیسے آئٹم نظر آرہے تھے جبکہ کاؤنٹر کے پیچھے دیواروں میں لکڑی کے شیلفس میں دودھ کے ڈبے، دیے کے پیکٹس، صابن اور سرف کی تھیلیوں سے لے کر گھریلو استعمال کی بے شمار اشیا کا ایک ڈھیر ترتیب سے سجا ہوا تھا۔

وہ ٹہلنے کے انداز میں دکان میں داخل ہوا اور بلاضرورت شیلفس میں سجی بہت سی اشیا خریدنا شروع کردیں۔ بعض اشیا کی صرف قیمت اور کوالٹی کے بارے میں استفسار کرنے پر اکتفا کیا اور بعض کے بارے میں تبصرہ کیا کہ قیمت کے مقابلے میں ان کی کوالٹی مناسب نہیں ہے۔ اس طرح اسے وہاں کافی وقت گزارنے کا موقع مل گیا اور وہ بڑی ہوشیاری سے وہاں کا جائزہ لیتا رہا۔ دکان پر دو تین سیلز مین تھے اور حقیقت میں وہی گاہکوں کو ڈیل کررہے تھے۔

رائے چند کاؤنٹر پر بیٹھا صرف بل کے مطابق رقوم وصول کررہا تھا۔ سفید کرتے پاجامے میں کلین شیو کا وہ درمیانی سی عمر کا مرد دیکھنے میں خاصا شریف اور خوش اخلاق محسوس ہورہا تھا۔ جاوید علی اپنی خریداری مکمل کرکے بل کی ادائیگی کے لیے اس کے سامنے کاؤنٹر پر جا کر کھڑا ہوا تو اس نے خوش اخلاقی سے مسکراتے ہوئے اس سے رقم وصول کی اور اپنی دراز میں رکھ کر بقایا نکالتے ہوئے نرم آواز میں بولا۔ ”آپ اس علاقے میں نئے لگتے ہیں۔ میں پہلی بار آپ کو اپنی دکان پر دیکھ رہا ہوں۔“

”میں یہاں کا رہنے والا نہیں ہوں۔ یہاں سے گزر رہا تھا تو آپ کی دکان دیکھ کر خیال آیا۔ والدہ نے گھریلو استعمال کی کچھ چیزیں لانے کا حکم دیا تھا۔ بس اس لیے یہاں چلا آیا۔ ویسے یہاں آکر مجھے اچھا لگا۔ آپ کی دکان پر ہر شے بہت قرینے سے رکھی ہوئی ہے اور خریدنے والا نہایت سہولت سے خریداری کرسکتا ہے۔ اب مجھے ہی دیکھیے۔ میرے پاس سامان کی لسٹ نہیں تھی لیکن چیزوں پر نظر پڑتی گئی اور یاد آتا گیا کہ کیا کیا خریدنا تھا۔“ جواباً اس نے بھی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہنس کر بتایا۔

”پھر تو آپ میری دکان کو یاد رکھیے گا اور آئندہ بھی

یہاں سے سودا خریدے گا۔ آپ کو یہاں سہولت کے ساتھ ساتھ خصوصی ڈسکاؤنٹ بھی ملے گا۔'' رائے چند نے ترغیب دیتے ہوئے اسے بقایا رقم واپس کی تو اس نے ایک نظر میں ہی دیکھ لیا کہ اس نے بننے والے بل کے مقابلے میں کم رقم کاٹی ہے۔

''آپ سے شاید حساب میں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ آپ نے مجھے زیادہ روپے واپس کر دیے ہیں۔'' اس نے فوراً ٹوکا۔

''نہیں، کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی بلکہ میں نے ابھی سے آپ کو ڈسکاؤنٹ دینا شروع کر دیا ہے۔'' اس نے ہنس کر جواب دیا تو جاوید علی اس کا شکریہ ادا کرتا ہوا کاؤنٹر سے ہٹ گیا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ ایک نوعمر لڑکا اس انتظار میں ہے کہ وہ کاؤنٹر سے ہٹے تو وہ رائے چند سے بات کرے۔ یہ بات کچھ عجیب سی تھی کیونکہ وہ دیکھ چکا تھا کہ لڑکے نے دکان سے کوئی خریداری نہیں کی تھی بلکہ سیدھا کاؤنٹر کی طرف آیا تھا جبکہ دکان میں اچھا خاصا وقت گزار کر وہ یہ دیکھ چکا تھا کہ رائے چند کا خرید و فروخت سے کوئی تعلق نہیں ہے اور وہ گاہکوں سے صرف رقم کی لین دین کا کام کرتا ہے۔ ایسے میں اس لڑکے کا براہِ راست وہاں آ کر کھڑا ہونا قابلِ غور تھا۔ وہ دکان سے باہر نکل گیا لیکن توجہ لڑکے کی طرف ہی رہی۔ باہر نکل کر سامان کا تھیلا بائک پر باندھنے اور بائک اسٹارٹ کرنے میں اس نے جان بوجھ کر خاصا وقت لگایا اور اس دوران بیک ویو مرر کی مدد سے دکان کے اندر کا جائزہ لیتا رہا۔ لڑکا سرگوشی میں رائے چند سے بات کر رہا تھا۔ جواب میں رائے چند کاؤنٹر سے اٹھ کر دکان کے کسی اندرونی حصے کی طرف گیا اور ایک پیکٹ لا کر لڑکے کو تھما دیا جسے لڑکے نے فوراً ہی اپنی قمیص کے نیچے چھپا لیا اور تیزی سے دکان سے باہر نکل گیا۔ جاوید اس دوران بائک اسٹارٹ کر چکا تھا۔ لڑکے نے دکان سے نکل کر ایک قریبی گلی کا رخ کیا تو وہ اس سے پہلے بائک اس گلی میں لے گیا اور کونے پر لے جا کر ایسے زاویے سے روک لی کہ لڑکا نظر آتا رہے۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ لڑکا اسی گلی کے کسی گھر میں جاتا ہے یا آگے نکل جاتا ہے۔ خوش قسمتی سے وہ کسی گھر میں داخل نہیں ہوا اور گلی سے نکل کر آگے بڑھ گیا۔ اس کا رخ ایک چھوٹے سے پارک کے دروازے کی طرف تھا۔ یہ بالکل اجاڑ پارک تھا جس میں اگائی گئی گھاس جانے کب کی سوکھ کر مٹی کے ساتھ رل مل گئی تھی اور زمین پر بس پارک میں کھڑے چند ٹنڈ منڈ سے درختوں کے جھڑ جانے والے زرد اور سوکھے پتے ہی پڑے دکھائی دے رہے تھے۔ پارک بالکل ویران پڑا تھا اور وہاں کسی ذی نفس کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ لڑکا دروازے سے گزر کر پارک میں داخل ہوا تو جاوید علی کو اندازہ ہوا کہ اس کی منزل پارک نہیں ہے بلکہ وہ پارک کے دروازے سے داخل ہو کر وہاں بنی پختہ روش سے گزرنے کے بعد دوسرے دروازے سے باہر نکلنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ جاوید علی کے ذہن میں فوری طور پر ایک خیال آیا اور وہ بائک وہیں کھڑی کر کے خود بھی تیزی سے لڑکے کے پیچھے لپکا۔

''اے لڑکے! بات سنو۔'' پارک میں داخل ہونے کے بعد اس نے لڑکے کو سخت اور بارعب لہجے میں پکارا۔ اس کی پکار سن کر لڑکا رک تو گیا لیکن اس کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں نظر آنے لگیں۔ جاوید علی لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چشم زدن میں اس کے سر پر جا پہنچا اور اسے تیز نظروں سے گھورنے لگا۔

''کیا بات ہے بھائی صاحب! آپ نے مجھے کیوں پکارا ہے؟'' لڑکے نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے اس سے دریافت کیا لیکن کوشش کے باوجود وہ اپنی آواز کی لرزش پر قابو نہیں پا سکا۔

''بھائی صاحب ہوں گے تمہارے مائی باپ بولو۔ ہم پولیس والے تم جیسے آوارہ چھوکروں کے مائی باپ ہوتے ہیں۔'' اس نے چہرے کے تاثرات میں مزید سختی سموتے ہوئے کرخت لہجے میں کہا۔

''پپ... پو... پولیس... مگر آپ...'' اس نے جاوید علی کے جینز اور ٹی شرٹ میں نمایاں ہوتے اسمارٹ ورزشی جسم پر ایک نظر ڈالی اور حیرت اور خوف سے ملے جلے لہجے میں چند آدھے ادھورے الفاظ ادا کیے۔

''کیوں... کیا تجھے یقین نہیں آ رہا؟ اپنا کارڈ دکھاؤں کیا تجھے؟'' جواباً جاوید علی غرایا۔

''نہیں سر جی! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ پر میری سمجھ نہیں آ رہا کہ آپ نے مجھے کیوں روکا ہے؟'' اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے استفسار کیا تو اس کا لہجہ کسی گڑبڑ کی چغلی کر رہا تھا۔

''وجہ بھی بتاتا ہوں بچو! تم ذرا میرے ساتھ ادھر تو چلو۔'' وہ لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر ایک سنگی بینچ کی طرف لے گیا۔ اس سے قبل اس نے اسے اپنی ٹی شرٹ کے نیچے بیلٹ میں اڑسی پسٹل کی جھلک دکھا دی تھی جس کی وجہ سے لڑکے کا خوف کچھ اور بھی بڑھ گیا اور وہ کسی بھی قسم کی پس و پیش کیے بغیر ڈھیلے قدموں کے ساتھ بینچ کی جانب گھسٹتا چلا گیا۔

''نام کیا ہے تمہارا؟'' بینچ پر بیٹھنے کے بعد اس نے لڑکے سے دریافت کیا۔

''حاذق۔'' اس نے مری مری آواز میں بتایا۔

''عمر؟''

''پندرہ سال۔''

''کس کلاس میں پڑھتے ہو؟'' وہ لڑکے کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کرنے کے لیے یونہی حتمی سے سوالات کرتا جا رہا تھا۔

''نویں کا امتحان دیا ہے۔'' اس نے تھوک نگلتے ہوئے بتایا۔

''رہتے کہاں ہو؟''

''وہاں، اس گلی کا چوتھا گھر میرا ہے۔'' اس نے ہاتھ سے اس گلی کی طرف اشارہ کیا جس سے گزر کر وہ یہاں تک آئے تھے۔

''گھر وہاں ہے تو پھر آگے کہاں جا رہے تھے؟'' جاوید نے ڈپٹ کر پوچھا۔

''وہ جی... دوست کے پاس جا رہا تھا۔''

''کیوں؟'' اس کا لہجہ کچھ اور سخت ہوا۔ اس بار لڑکے نے جواب نہیں دیا اور بس ہکلا کر رہ گیا۔ اس کا انداز دیکھ کر جاوید علی نے جواب پر اصرار کرنے کے بجائے ایک اور سوال داغ دیا۔

''رائے چند کی دکان پر کیا لینے گئے تھے؟'' اس سوال کا لڑکے پر زبردست ردعمل ہوا اور اس کا چہرہ بالکل زرد پڑ گیا۔ اس کے وجود سے ایسا لگا کہ وہ وہاں سے اٹھ کر بھاگ جانا چاہتا ہو لیکن ہاتھ جاوید علی کی گرفت میں ہونے کی وجہ سے مجبور ہو۔

''تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟'' جاوید علی غرایا۔

''کک... کچھ نہیں جی۔ میں تو بس ان سے گھی کے ڈبے کی قیمت پوچھنے گیا تھا۔'' اسے آخرکار کوئی بہانہ سوجھ ہی گیا۔

''بکواس کرتے ہو۔ ابھی تمہاری تلاشی لے کر وہ پیکٹ نکالتا ہوں جو تم رائے چند سے لے کر آئے ہو۔'' اس نے لڑکے کو تقریباً جھنجوڑ ڈالا جس پر وہ باقاعدہ رو پڑا۔

''معاف کر دیں سر جی! آئندہ ایسی حرکت نہیں کروں گا۔'' اس نے روتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنی شروع کر دی۔

''پیکٹ نکال کر دکھاؤ مجھے۔'' اس نے لڑکے کو حکم دیا جس کی اسے چار و ناچار تعمیل کرنی پڑی۔ جاوید علی نے پیکٹ اس کے ہاتھ سے لے کر اس کا جائزہ لیا۔ پیکٹ کا سائز زیادہ بڑا نہیں تھا اور نہ ہی وزن زیادہ تھا۔ اس نے اس پر چڑھا کور پھاڑ کر اسے کھولا۔ اندر سے ایک سگریٹ کا پیکٹ اور سی ڈی نکل کر سامنے آئی۔ اس نے سگریٹ کا پیکٹ کھول کر دیکھا۔ اس میں چار پانچ ہی سگریٹ تھے۔

''یہ کسے دینے جا رہے تھے؟'' اس نے دونوں چیزوں کو سخت تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے سرد مہری سے دریافت کیا۔ وہ چاہتا تو اتنی لمبی گفتگو کرنے کے بجائے پہلے ہی مرحلے میں لڑکے کی تلاشی لے کر یہ پیکٹ نکلوا لیتا لیکن صرف احتیاطاً ایسا نہیں کیا تھا کیونکہ بے شک وہ جس پارک میں موجود تھے وہ ویران اور اجاڑ پڑا ہوا تھا لیکن اس کے آگے پیچھے گلیاں تھیں اور ان گلیوں میں رہنے والے یقینی طور پر اس پارک کو گزرگاہ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اس لیے وہ یہ خطرہ نہیں مول لے سکتا تھا کہ کوئی اسے حاذق کے ساتھ زور زبردستی کرتا دیکھ کر اس طرف متوجہ ہو اور اس معاملے میں مداخلت کرے۔ وہ دونوں جب سے یہاں بیٹھے تھے، وہاں سے صرف ایک شخص گزرا تھا اور یقیناً اسے اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ حاذق نامی اس لڑکے سے کس نوعیت کی گفتگو کر رہا ہے۔

''تم نے جواب نہیں دیا۔ تم یہ پیکٹ کسے دینے جا رہے تھے؟''

''کسی کو نہیں، میں اپنے دوست شہباز کے گھر اس کے ساتھ یہ فلم دیکھنے جا رہا تھا۔'' لڑکے نے نظر چراتے ہوئے جواب دیا جو کہ خاصا حیرت انگیز تھا۔ رائے چند کی دکان پر جنرل آئٹم بکتے تھے، وہ کوئی ویڈیو سینٹر نہیں تھا جہاں سے فلمیں لا کر دیکھی جاتیں۔

''تم اور تمہارا دوست سگریٹ بھی پیتے ہو؟'' اس نے ایک سگریٹ نکال کر اسے ٹٹولتے ہوئے سوالات کا سلسلہ آگے بڑھایا۔

''کبھی کبھی چھپ کر۔'' اس نے جھکی نظروں سے اعتراف کیا۔ اس دوران میں جاوید علی سگریٹ کو کھول چکا تھا جس کے نتیجے میں اس پر یہ انکشاف ہوا کہ اس سگریٹ میں سفید زہر بھرا ہوا ہے۔

''اوئے، تم تو نشہ کرتے ہو۔'' اس نے یک دم لڑکے کی گدی پکڑ لی۔

''نہیں سر جی! قسم سے میں نشہ نہیں کرتا۔ یہ سگریٹ تو رائے انکل نے آج پہلی بار مجھے دیے ہیں۔ کہہ رہے تھے پی کر دیکھو، اس کے ساتھ فلم دیکھنے کا مزہ ڈبل ہو جائے گا۔''

لڑکے نے خوف زدہ منمناہٹ کے ساتھ حقیقت کا انکشاف کیا۔

''یہ کون سی فلم ہے؟ سی ڈی پر کوئی نام وغیرہ تو لکھا ہوا نہیں ہے؟'' ہیروئن بھرے سگریٹ دیکھ کر اسے اندازہ ہونے لگا تھا کہ یہ کوئی اور ہی چکر ہے اور شاید رائے چند را کے عمومی ایجنڈے کی پیروی کرتے ہوئے نوجوان نسل کی تباہی میں بھی کوئی کردار ادا کر رہا ہے۔

''یہ... یہ وہ فلم ہے جی... وہ... جنہیں نیلی...''

لڑکے نے اٹک اٹک کر بتانا شروع کیا تو اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ یہ نوعمر لڑکا قابل اعتراض فلمیں دیکھتا تھا اور اسے ہیروئن کے نشے کی طرف بھی راغب کیا جا رہا تھا۔ ان دو چیزوں کے زندگی میں شامل ہونے کے بعد اس کی تباہی میں کیا شک کیا جا سکتا تھا۔

''تم دوست کے گھر میں بیٹھ کر یہ فلم دیکھتے اور سگریٹیں پیتے تو اس کے ماں باپ تمہیں کچھ نہیں کہتے؟''

''اس کے امی ابو کسی شادی میں شرکت کے لیے شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں اور رات میں دیر سے واپس آئیں گے۔ اسی لیے ہم نے یہ پروگرام بنایا تھا۔'' لڑکے نے بتایا تو وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اسے خود بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ کچھ ایسی ہی صورت حال ہوگی۔ فی زمانہ حالات ایسے ہو گئے تھے کہ بچے موقع ملتے ہی والدین کو چونا لگا دیتے تھے۔ تیزی سے بدلتے ہوئے ان حالات میں ماں باپ کی ذمے داریوں میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ پہلے صرف لڑکیوں کو ان کی حفاظت کے پیشِ نظر گھر میں تنہا نہیں چھوڑا جاتا تھا لیکن اب صورت حال تقریباً یکساں تھی۔ ترغیبات اور خدشات دونوں میں ہی اتنا زیادہ اضافہ ہو چکا تھا کہ دونوں ہی کی حفاظت ضروری ہو گئی تھی۔ موجودہ زمانے کے والدین کے لیے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ اگر وہ اپنی اولاد اور اس کے مستقبل کو محفوظ دیکھنا چاہتے ہیں تو نہایت احتیاط سے انہیں اپنی مستقل نگرانی میں رکھیں۔ احتیاط اس لیے ضروری ہے کہ آج کل بچے شخصی آزادی کے نعرے کی وجہ سے اتنے حساس ہو چکے ہیں کہ اپنی زندگی میں والدین کی مداخلت بھی قبول نہیں کرتے۔ ایسے میں ظاہر ہے والدین کے پاس یہی حل رہ جاتا ہے کہ غیر محسوس طور پر ان کی سرگرمیوں پر نظر رکھیں اور ایسے مواقع میسر نہیں آنے دیں کہ وہ کسی شکاری کے جھانسے میں پھنسنے کے لیے آسان شکار نظر آئیں۔

''چلو تمہارے دوست کے گھر چلتے ہیں۔'' اس نے یکدم ہی ایک فیصلہ کیا اور حاذق کے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے اسے کھڑا ہونے کا اشارہ کیا۔

''کیا آپ اسے بھی گرفتار کر لیں گے؟'' اس نے خوف زدہ سے لہجے میں پوچھا۔

''یہ فیصلہ بعد میں ہوگا۔ پہلے میں اس سے ملاقات لوں۔'' جاوید علی نے سنجیدگی سے جواب دے کر اس کا بازو ایک بار پھر گرفت میں لے لیا۔ مجبوراً اسے اس کے حکم کی میل میں آگے بڑھنا پڑا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پارک سے باہر نکلے تو حاذق اسے ایک قریبی گلی میں لے گیا۔ اس گلی کے ایک مکان کے سامنے پہنچ کر حاذق نے کال بیل بجائی۔ فوراً ہی قدموں کی آواز سنائی دی اور گیٹ کا دروازہ کھلنے لگا۔

''تو بھی بڑا سست ہے یار حاذق۔ اتنی دیر لگا دی آنے میں۔ معلوم نہیں ہے کیا کہ امی ابو کے آنے سے پہلے واپس بھی...'' بلند آواز میں بڑبڑاتے ہوئے اس نے دروازہ کھولا تو حاذق کے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا اور باقی کے لفظ منہ میں ہی رہ گئے۔

''یہ کون ہے؟'' اس نے حاذق کے ستے ہوئے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''ابھی بتاتا ہوں بچو! پہلے تم اندر تو چلو۔ اس نے لڑکے کو دھکا دے کر پیچھے کیا اور خود حاذق کا ہاتھ پکڑ کر اسے اندر گھس گیا۔ اندر گھستے ہی اس نے بڑی پھرتی سے گیٹ دوبارہ بند کر دیا اور اپنا پسٹل نکال لیا۔ اس کی پھرتی کے سامنے وہ لڑکے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اتنا نڈر و بے باک تھا کہ بڑے بڑے مجرموں کے لیے بھی اس کے سامنے ٹکنا آسان نہیں تھا۔ یہ دو نوعمر لڑکے بھلا کیا اوقات رکھتے تھے۔ ان میں اگر کچھ دم خم تھا بھی تو پسٹل دیکھ کر نکل گیا۔

''ہمیں گولی مت مارنا۔ جو لے جانا چاہتے ہو لے جاؤ۔ سارے پیسے اور زیور امی کے بیڈ روم کی الماری میں ہیں۔ میرے پاس الماری کی چابی نہیں ہے۔ تم خود ہی توڑ کر نکال لینا۔'' ایک پسٹل لیے شخص کو اپنے سر پر سوار دیکھ کر وہ یہی سمجھا تھا کہ وہ کوئی ڈاکو ہے اس لیے اپنی جان بچانے کے خیال سے بولنے پر آیا تو بولتا چلا گیا۔

''اندر کمرے میں چلو۔'' اس کی باتوں پر کان دھرنے کے بجائے جاوید علی نے سرد لہجے میں حکم دیا اور ساتھ ہی پسٹل سے اشارہ بھی کیا تو دونوں لڑکے گرتے پڑتے اندر کی طرف بڑھ گئے۔ اندر پہنچ کر اس نے ان دونوں کو ایک طرف بیٹھنے کا حکم دیا اور مزید چند سوالات کیے جن سے ایک طرف تو حاذق کی فراہم کردہ معلومات کی تصدیق ہو گئی دوسری طرف کچھ مزید معلومات بھی حاصل ہو گئیں۔ لڑکوں

کے بیان کے مطابق وہ تقریباً چھ ماہ سے رائے چند کی دکان سے اس طرح کی فلمیں لے کر دیکھ رہے تھے۔ انہیں ان کے ایک ایسے دوست نے جو عمر میں ان سے چند سال بڑا تھا اور ساتھ کرکٹ کھیلنے کی وجہ سے ان کی اس سے دوستی تھی، اس راہ پر لگایا تھا۔ وہی انہیں رائے چند کی دکان پر لے کر گیا تھا اور اس کی سفارش پر رائے چند انہیں یہ فلمیں فراہم کرنے لگا تھا۔ حاذق کی طرح شہباز نے بھی اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ وہ کبھی کبھار سگریٹ نوشی کر لیتے ہیں لیکن نشے کے استعمال سے اس نے بھی انکار کیا تھا۔ جاوید نے ان سے ان کے اس دوست لڑکے کا نام پتا معلوم کر کے اپنے پاس نوٹ کر لیا۔ اب وہ آگے کی کارروائی کرنے کے لیے تیار تھا اور اس سلسلے میں اپنے ذہن میں ایک لائحہ عمل بھی بنا چکا تھا لیکن اس سے قبل ان لڑکوں کو کچھ دیر کے لیے غیر متحرک کرنا ضروری تھا چنانچہ دل نہ چاہتے ہوئے بھی مجبوراً انہیں ایک رسی سے باندھ کر ان کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ اسے یہ تو معلوم ہی ہو چکا تھا کہ شہباز کے والدین کی رات گئے گھر آمد متوقع ہے اس لیے وہیں بیٹھ کر اطمینان سے اپنی کارروائی کرنے لگا۔ سب سے پہلے اس نے ہیڈ کوارٹر سے رابطہ کر کے اپنے منصوبے اور اس کی ضروریات کے مطابق سہولیات کی دستیابی کے بارے میں بتایا۔ وہاں سے منظوری ملنے پر وہ مزید مصروف ہو گیا۔ اسے جو کچھ کرنا تھا، اس کے لیے فی الحال ہاتھ پیر چلانے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ ایک جگہ بیٹھے بیٹھے اپنے مہروں کو حرکت دینی تھی چنانچہ یہی کرتا رہا۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد جب اسے اس بات کا یقین ہو گیا کہ اب کارروائی شروع ہوا ہی چاہتی ہوگی تو یہاں سے نکلنے کا فیصلہ کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ روانگی سے قبل اس نے اس کمرے کا دروازہ کھول دیا جہاں ان دونوں لڑکوں کو قید کیا تھا۔ دونوں لڑکے بے بسی سے فرش پر پڑے تھے۔ اس کی شکل دیکھتے ہی ان کی آنکھوں میں خوف اتر آیا کہ جانے اب یہ شخص ہمارے ساتھ کیا کرتا ہے۔

''میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ تم لوگوں کی بھلائی اسی میں ہوگی کہ جو کچھ پیش آیا، اس کے بارے میں کسی کے سامنے زبان مت کھولنا۔ میں یہ ناخن تراش یہاں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ اس میں ایک ننھا سا چاقو بھی جڑا ہوا ہے۔ اب یہ تم دونوں کے اوپر ہے کہ کیسے اور کتنی دیر میں اس تک پہنچ کر ایک دوسرے کی رسیاں کاٹ کر اس قید سے نجات حاصل کرتے ہو۔ اگر ناکام رہے تو اپنے والدین کی آمد تک انتظار کرنا۔ وہ خود تمہیں کھول لیں گے۔ میں اب جاتا ہوں۔ ٹاٹا بابائے۔'' اس نے ناخن تراش لڑکوں سے کافی فاصلے پر موجود ایک میز پر رکھ دیا اور سیٹی بجاتا ہوا وہاں سے باہر نکل گیا۔ وہ چاہتا تو جانے سے پہلے انہیں کھول بھی سکتا تھا لیکن مسئلہ وہی تھا کہ مکمل کارروائی ہونے سے قبل ان کا آزاد ہونا مناسب نہیں تھا۔ دوسرے اچھا تھا کہ اس چھوٹی سی سزا کے ذریعے انہیں سبق مل جاتا اور وہ فضول حرکتیں چھوڑ کر سیدھی راہ پر آ جاتے۔ وہاں سے نکل کر وہ سیدھا اس پارک کی طرف گیا جس کی دوسری جانب اس نے اپنی بائک کھڑی کر رکھی تھی۔ پارک کے ایک دروازے سے دوسرے دروازے کے درمیان بنی پختہ روش پر سے گزرتے ہوئے اس نے دور ہی سے دیکھ لیا کہ دو افراد اس کی بائک کے قریب کھڑے ہیں اور بڑی عرق ریزی سے اس کا جائزہ لے رہے ہیں۔ اس نے قریب پہنچ کر جیب سے چابی نکالی تو وہ چونک گئے۔

''یہ بائک تمہاری ہے جوان؟'' دونوں میں سے زیادہ عمر رسیدہ حضرت نے اسے گھورتے ہوئے دریافت کیا۔

''جی میری ہے۔ آپ کو کوئی اعتراض ہے کیا؟'' اس نے جان بوجھ کر ایسا لہجہ اختیار کیا کہ وہ لوگ اس سے زیادہ بحث کرنے کی کوشش نہ کریں اور بائک پر سوار ہو گیا۔

''اعتراض تو چھوٹا لفظ ہے میاں۔ ہم تو پچھلے بیس پچیس منٹ سے اس تشویش میں مبتلا ہیں کہ جانے کون... کم بخت موٹر سائیکل پر بم باندھ کر یہاں کھڑی کر گیا ہے۔ ہم تو پولیس اسٹیشن فون کر کے اطلاع دینا چاہتے تھے اس مشکوک موٹر سائیکل کے بارے میں لیکن وہ بادشاہ لوگ بھی شاید آج سرِ شام ہی لمبی تان کر سو گئے ہیں۔ اس لیے کوئی فون ہی نہیں اٹھاتا۔'' بڑے میاں جانے کس بات پر زیادہ خفا تھے۔ تھانے والوں کے فون نہ اٹھانے پر یا اپنے تئیں ایک مشکوک موٹر سائیکل کے ہاتھ سے نکل جانے پر۔

''آپ نے ٹھیک ہی سمجھا جناب! اس تھیلے میں بم ہی رکھا ہے۔'' اس نے رائے چند کی دکان سے خریدی گئی اشیا کے تھیلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بائک کو کک لگائی تو وہ دونوں حضرات یوں پیچھے ہٹے جیسے وہ موٹر سائیکل ان پر چڑھاتے ہوئے بم بلاسٹ کر دے گا۔

''یہ بم آج رائے چند کے سر پر پھٹے گا۔'' گلی سے گزر کر واپس رائے چند کی دکان کی طرف جاتے ہوئے وہ زیرِ لب بڑبڑایا تو اس کے کان پولیس کی گاڑی کا سائرن سن رہے تھے۔ اس نے بائک اس ریستوران کے سامنے لے جا کر روک دی جو رائے چند کی دکان کے عین سامنے موجود

تھا۔ یہاں سے وہ پولیس والوں کی ساری کارروائی اطمینان سے دیکھ سکتا تھا۔ اس کارروائی کو دیکھتے ہوئے اس کی نظر میں اپنے آدمی بھی آگئے۔ اس ڈرامے میں جہاں پولیس کا کردار ختم ہوتا، وہیں سے اس کے آدمیوں کا کام شروع ہو جاتا۔ اسے سکون محسوس ہوا کہ وہ صحیح وقت پر اپنے کردار کی ادائیگی کے لیے منظر میں موجود ہیں۔ رائے چند کی دکان میں داخل ہونے کے آٹھ دس منٹ بعد ہی پولیس والے برآمد ہوئے تو ان کے چہرے فتح کی خوشی سے چمک رہے تھے۔ ان کے ساتھ بوکھلایا ہوا رائے چند موجود تھا اور اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ دوسری طرف ایک پولیس والے کے ہاتھ میں موجود تھیلے میں واضح طور پر کئی سی ڈیز نظر آرہی تھیں۔ ارد گرد کے دکان دار، ریستوران کا عملہ، گاہک اور راہ گیر اس کارروائی کو حیرت اور دلچسپی سے دیکھ رہے تھے اور اپنی اپنی جگہ انگشت بدنداں تھے کہ ایک جنرل اسٹور پر سی ڈیز کا کیا کام تھا؟ ان میں سے چند یقیناً واقف حقیقت بھی ہوں گے جن میں سے ایک گروہ ان افراد کا ہوگا جنہیں رائے چند کے کالے دھندے سے نفرت ہوگی اور وہ اس کے پکڑے جانے پر خوشی محسوس کر رہے ہوں گے جبکہ دوسرے گروہ کے افراد کو پریشانی لاحق ہوگی کہ رائے چند کی گرفتاری کے بعد وہ اپنے مطلب کی سی ڈیز کہاں سے حاصل کریں گے۔ جاوید علی کو فی الحال دونوں ہی طرح کے لوگوں سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ رائے چند کی گرفتاری کے بعد پولیس کی گاڑی کے وہاں سے روانہ ہوتے ہی وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ فی الحال تو رائے چند کو تھانے لے جایا جا رہا تھا لیکن اسے کہیں اور اس کے استقبال کے لیے پہنچنا تھا تاکہ اس سے دو دو ہاتھ کیے جا سکیں۔

☆☆☆

”لو بھاپا جی! اسیں ہریانہ وچ پہنچ گئے ہیں۔ ایہہ ہریانہ دا شہر پانی پت ہے۔ ایتھے اساں دا گھر ہے۔ تسی میرے کول چلو۔ نہا دھو کر روٹی شوٹی کھا و فیر اگے چلے جانا۔ میں خود تہانوں دلی جانے والی بس وچ بٹھا کر جاؤں گا۔“ وہ سرائے میں اپنے علاوہ ٹھہرے ہوئے دوسرے مسافر کی سوزوکی میں سوار ہو کر اس کے ساتھ اس کے شہر تک پہنچے تھے اور اب وہ اپنی روایتی مہمان نوازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑے خلوص سے انہیں اپنے ساتھ اپنے گھر چلنے کی دعوت دے رہا تھا۔

”بہت بہت دھنیواد بھاجی، پر اس دی لوڑ نہیں ہے۔ اسیں تو پہلاں کے پہلے ہی دس چکے ہیں کہ اسیں جلد سے جلد دلی وچ پہنچنا چاہندے ہیں تاکہ اپنے راج کمار دے ویاہ دی تیاری کر کے واپس لوٹ جائیں۔ ہاں، اس دے ویاہ توں فارغ ہونے کے بعد فیر کبھی ادھر آنا ہوا تو تیرے کول ضرور آئیں گے۔“ شہریار نے عاجزی اور ممنونیت کا اظہار کرتے ہوئے اس کی پیشکش کا شکریہ ادا کیا لیکن قبول کرنے سے بڑی خوب صورتی سے انکار کر دیا۔

”تہاڈی مرضی جی! اگر بولو تو دلی کے لیے بس کے ٹکٹ کٹوا دیتا ہوں۔“ اس نے ان کے بہانے کو حقیقت سمجھتے ہوئے زیادہ اصرار نہیں کیا اور ایک اور پیشکش کی۔

”نہ نہ... ایہہ چھوٹا سا کام اسیں خود بھی کر سکتے ہیں۔ تسی اپنے گھر وچ جاؤ اور آرام کرو۔ ہم تھوڑا بازار میں گھوم پھر کر دیکھتے ہیں۔“ وہ اب اس شخص سے جان چھڑانے کے چکر میں تھے اس لیے اس دوسری پیشکش کو بھی ٹھکرا کر مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اس نے چار و ناچار دونوں سے گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد انہیں اپنی گاڑی سے اتار دیا۔ اتارنے سے قبل البتہ وہ انہیں یہ بتانا نہیں بھولا تھا کہ دلی کے لیے بسیں کہاں سے چلتی ہیں اور ٹکٹ کے حصول کے لیے انہیں کیا کرنا ہوگا۔ اس کی فراہم کردہ ان معلومات کو ذہن نشین کرتے ہوئے وہ آگے بڑھے اور بازار کی رونقوں میں خود کو گم کر لیا۔ تاریخی اہمیت کے حامل اس شہر کے بازار میں گھومتے ہوئے شہریار کو مغل تاجدار ظہیر الدین بابر یاد آیا۔ تاریخ اس مغل بادشاہ کے متعلق معلومات فراہم کرتی تھی ان کی روشنی میں جرأت مند اور بہادر سپہ سالار تسلیم کرنے میں کسی کو کوئی عار نہیں ہو سکتا تھا۔ اس پانی پت کے میدان میں ہی اس نے ابراہیم لودھی سے تین جنگیں لڑی تھیں۔ اس میدان جنگ کا تو کچھ پتا نہیں تھا لیکن آج وہ اس کے بازار میں گھوم رہے تھے۔ بازار میں گھوم پھر کر انہوں نے ایک دکان سے اپنے ناپ کے کپڑے خریدے پھر ناپ کے جوتے بھی لے لیے۔

خریداری کرتے ہوئے ان کا انداز ان عجیب دیہاتیوں جیسا تھا جو پہلی بار اپنے لیے شہری وضع قطع کے کپڑے اور جوتے خرید رہے ہوں۔ ان کی اس سادہ لوحی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دکان داروں نے اپنے تئیں انہیں خوب لوٹا۔ اپنے کردار کو تقویت دینے کے لیے وہ آرام سے لٹ گئے۔ رقم کے معاملے میں ویسے بھی انہیں کوئی پریشانی نہیں تھی۔ پاکستان سے روانہ ہوتے وقت ہی انہیں راستے کی ضروریات پوری کرنے کے لیے معقول انڈین کرنسی فراہم کر دی گئی تھی۔ امرت کور کے گھوڑے کو فروخت کرنے کے

باعث اس رقم میں مزید اضافہ ہو گیا تھا اس لیے انہوں نے آرام سے خریداری مکمل کی اور پھر ایک عوامی حمام میں جا کر لباس تبدیل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی شیو بھی بنا ڈالی۔ پینٹ شرٹ اور جوتوں کی تبدیلی کے ساتھ ان کے سنورے ہوئے حلیوں نے ان کی وضع قطع کو بالکل تبدیل کر کے رکھ دیا۔ کچھ دیر قبل جس شخص نے انہیں بازار کے قریب ڈراپ کیا تھا، اگر اس وقت وہ انہیں دیکھ لیتا تو آسانی سے شناخت نہیں کر سکتا تھا۔ ان کے لیے شناخت کی یہ تبدیلی ضروری بھی تھی تاکہ اپنے پیچھے اپنا کوئی اتا پتا چھوڑ کر نہ جائیں۔ فی الحال تو وہ خود کو انڈین معاشرے کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ یہاں سے لباس کی خریداری کا بھی یہی مقصد تھا ورنہ جو کپڑے وہ پاکستان سے پہن کر نکلے تھے، اس کے علاوہ بھی ایک ایک اضافی جوڑا ان کے بیگ میں موجود تھا۔ پہنے ہوئے لباس تو راستے میں ہی خاصے خراب ہو گئے تھے چنانچہ سرائے سے روانہ ہونے سے پہلے انہوں نے انہیں تلف کر دیا تھا اور امرت کور کے فراہم کردہ دھوتی کرتے میں ہی یہاں تک آئے تھے۔ اب وہ ان دیہاتی کپڑوں سے بھی جان چھڑا چکے تھے اور نئے نئے شہر کے فیشن میں رنگے ہوئے جوان دکھائی دے رہے تھے۔ پاکستان سے ساتھ لائے ہوئے زائد لباس کا استعمال بھی انہوں نے اس لیے مناسب نہ سمجھا تھا کہ چہرے مہرے اور بول چال کے علاوہ لباس بھی چغلی کھا جاتا ہے کہ بندے کا تعلق کس جگہ سے ہے۔ چہرے اور بول چال میں تو وہ اپنی تربیت اور محنت کے بل بوتے پر خاصی تبدیلی لا چکے تھے، لباس بھی بھارتی تیار کردہ پہن لیا تو مقامی ہی لگنے لگے۔

اس کام سے فارغ ہو کر انہوں نے بس اسٹاپ کا رخ کیا اور دلی تک براہ راست جانے والی بس کے ٹکٹ خرید لیے۔ ان کی خوش قسمتی تھی کہ وہ ایسے وقت میں وہاں پہنچے تھے جب بس کی روانگی میں بس پندرہ بیس منٹ ہی باقی رہ گئے تھے اور اس کے باوجود انہیں اس میں سیٹیں مل گئی تھیں۔

”تم یہاں سے کھانے پینے کے لیے کچھ خریدو، میں ابھی آتا ہوں۔“ دلی تک جانے کا انتظام ہوا تو اسے دوسرے اہم کام کا خیال آیا اور وہ سلو کو ہدایت کر کے اس طرف بڑھ گیا جہاں اس نے ایک پبلک کال آفس دیکھا تھا۔ وہ جن راستوں سے گزر کر بھارت پہنچے تھے، وہاں موبائل کے سگنلز نہیں آتے تھے اس لیے اپنے پاس موبائل رکھنا بیکار تھا۔ اس قسم کے سارے انتظامات انہیں یہیں رہ کر کرنے تھے اور وہ اسی سلسلے میں پی سی او تک جا رہا تھا۔ پاکستان سے روانگی سے قبل اسے چند اہم فون نمبرز اور کوڈز ذہن نشین کروائے گئے تھے جہاں سے انہیں اپنے مشن کی تکمیل کے سلسلے میں کچھ مدد مل سکتی تھی۔ اس وقت وہ ایسے ہی ایک نمبر پر رابطہ کر رہا تھا۔ سلو پر چونکہ سو فیصد اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا اس لیے اسے اس قسم کے رازوں میں شریک نہیں کیا گیا تھا۔ پی سی او سے اپنا مطلوبہ نمبر ملا کر وہ کال ریسیو کیے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ دو گھنٹیوں کے بعد کال ریسیو کر لی گئی۔

”شیر نے اپنی سلطنت میں قدم رکھ دیے ہیں۔“ اس نے طے شدہ کوڈ ورڈ ادا کیا۔

”جنگل کے جانور اس کی اطاعت قبول کرتے ہیں۔“ دوسری طرف سے جوابی کوڈ ورڈز ادا کیے گئے۔

”ہم پانی پت میں ہیں اور تھوڑی دیر بعد دلی جانے والی بس میں سوار ہونے والے ہیں۔“ کوڈ ورڈز سن کر اسے اطمینان ہو گیا کہ صحیح آدمی سے رابطہ ہوا ہے چنانچہ اپنے

بارے میں اسے اطلاع دی۔

"ٹھیک ہے۔ میں جامع مسجد کی سیڑھیوں کے پاس آپ سے ملوں گا۔" اس نے جواب دیا اور پھر انہوں نے ملاقات کے لیے وقت، ایک دوسرے کے حلیے اور بیٹے کوڈ ورڈز طے کرلیے۔ اس ساری گفتگو میں انہوں نے مشکل سے پانچ منٹ ہی صرف کیے تھے۔ پی سی او والے کو کال کا بل ادا کر کے وہ باہر نکل آیا۔ اس پی سی او میں یہ بات اچھی تھی کہ وہ تین الگ الگ بوتھ بنے ہوئے تھے چنانچہ اسے تنہائی میں اطمینان سے گفتگو کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ اس پی سی او کی یہ خصوصیت اس نے پہلے ہی نوٹ کرلی تھی اسی لیے اس کا انتخاب بھی کیا تھا۔ کال سے فارغ ہو کر وہ اسٹاپ پر واپس پہنچا تو سلو ہاتھ میں ایک شاپر لیے اس کا منتظر تھا۔

"ابھی میں نے یہ کھجوریاں خریدلی ہیں۔ صبح کھانا دہلی پہنچ کر ہی کھائیں گے۔" شہریار کو دیکھ کر اس نے ملتے ہی بتایا۔

"او کے، ایز یو وش۔" اس نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ وہ جس زندگی میں قدم رکھ چکا تھا، وہاں ماضی کی طرح لگی بندھی روٹین پر چلنا ممکن نہیں تھا اور نہ ہی پہلے کی طرح وہ نخرے دکھائے جا سکتے تھے۔ اپنے لیے اس نے جس زندگی کا انتخاب کیا تھا، اس میں کسی آوارہ گرد اور خانہ بدوش کا سا انداز اختیار کرنا لازم تھا۔ ایسی زندگی میں معمولات نہیں ہوتے، پسند ناپسند نہیں ہوتی اور معیارات قائم نہیں کیے جاتے۔ بس خود کو وقت کے دھارے پر چھوڑ کر مطلوبہ نتائج کے حصول کے لیے ہاتھ پیر چلائے جاتے ہیں، وہ بھی یہی کر رہا تھا۔

"تم کہاں چلے گئے تھے؟" سلو نے لفافے سے ایک کھجوری نکال کر کھاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"ایک کام سے گیا تھا۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"مجھے بتانا نہیں چاہتے؟"

"یہی سمجھ لو۔"

"ٹھیک ہے سمجھ گیا۔" اس نے بے پروائی سے شانے اچکائے اور پوری طرح کھجوریوں میں مصروف ہو گیا۔ چند منٹ بعد بس چلنے کا اعلان ہوا تو وہ دونوں بھی اس میں سوار ہو گئے۔ بس آرام دہ تھی، سبک رفتاری سے فاصلے طے کرتی ہوئی سونی پت اور کرنال سے گزر کر دہلی کی حدود میں داخل ہو گئی۔ دہلی کی حدود میں داخل ہوتے ہوئے انہوں نے راستے میں کئی فارم ہاؤسز دیکھے۔ ساتھی مسافروں کی زبانی معلوم ہوا کہ ان فارم ہاؤسز کو شادی بیاہ اور دیگر تقریبات کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ بس نے انہیں مقررہ بس اسٹاپ پر اتارا تو وہ دونوں سائیکل رکشے میں بیٹھ کر جامع مسجد کی طرف روانہ ہو گئے۔

ان دونوں کے پاس ایک ایک سفری بیگ کے سوا کوئی سامان نہیں تھا اس لیے یہ ضروری نہیں تھا کہ اسٹاپ سے پہلے کسی ہوٹل میں جا کر وہاں کمرا بک کرواتے اور پھر اپنا سامان رکھ کر جامع مسجد کی طرف روانہ ہوتے۔ ویسے بھی ہوٹل میں قیام کے لیے شناختی دستاویز کی ضرورت ہوتی ہے جو ظاہر ہے ان کے پاس نہیں تھیں۔ اس لیے بہتر تھا کہ وہ اس شخص سے مل لیتے جس سے انہیں دہلی میں اپنے لیے مدد ملنے کی امید تھی۔ سلو کو اس بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا لیکن جب [illegible] نے سائیکل رکشے والے کو جامع مسجد چلنے کو کہا تو اس نے کسی قسم کا استفسار نہیں کیا۔ وہ یوں مطمئن تھا جیسے [illegible] خطرناک مشن پر نہ آیا ہو بلکہ سیر کے لیے آیا ہوا ور اس [illegible] لیے سارے معاملات طے کرنا شہریار کی ذمے داری ہو۔ شہریار کے لیے اس کا یہ بے نیاز اور بے پروا انداز باعث فکر نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس لاابالی سلو کے اندر وہ شخص چھپا ہوا ہے جو وقت پڑنے پر ایکشن میں آنے کی زبردست صلاحیت رکھتا ہے بلکہ اس کی یہ بے نیازی تو اس کے نڈر و دلیر ہونے کی دلیل تھی۔

جامع مسجد کی سیڑھیوں کے پاس ہی اسے اپنا مطلوبہ شخص نظر آ گیا۔ درمیانی قامت کے گول مٹول سے اس آدمی نے سفید دھاریوں والی نیلی قمیص کے ساتھ سر پر سفید ٹوپی پہن رکھا تھا جو اس کی گوری رنگت پر جچ رہا تھا۔ فون پر اس شخص نے اپنا بھی حلیہ بتایا تھا چنانچہ شہریار اطمینان سے اس کی طرف بڑھ گیا اور اس کے عین سامنے کھڑا ہو کر بولا۔

"دلی بائیس خواجہ کی چوکھٹ ہے، کہاں حاضری دوں کہاں نہیں؟"

"کہیں جاؤ نہ جاؤ، درگاہ نظام الدین پر جانا مت بھولنا۔" اس نے بھی جوابی کوڈ دہرایا اور مسکراتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"فی الحال تو ہمیں سب سے پہلے کسی رہائش گاہ کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ اپنے لیے شناختی دستاویزات، موبائل فونز اور ان کی سم وغیرہ درکار ہوں گی۔" اس نے فوراً اسے اپنی ضروریات سے بلا تکلف آگاہ کیا۔ تکلف کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اسے اس شخص سے رابطہ کرنے کے لیے کہا ہی اس لیے گیا تھا کہ وہ ان کی ضروریات پوری کر سکے۔

"ٹھیک ہے۔ یہ سب ہو جائے گا۔ مجھے چند منٹ کے لیے مسجد کے اندر جانا ہے۔ آپ لوگ چاہیں تو میرے ساتھ چلیں پھر ہم ایک جگہ چلیں گے۔" اس نے خوش خلقی سے کہا۔

"آپ چلے جائیں۔ ہم یہیں آپ کا انتظار کرتے ہیں۔" اس نے انکار کر دیا کیونکہ وہ یہیں سے دیکھ سکتا تھا کہ مسجد کے دروازے پر سیکیورٹی کا زبردست انتظام ہے اور ان کے پاس کچھ اسلحہ موجود تھا۔ دروازے سے گزر کر وہ مسجد میں جانے کی صورت میں فوری طور پر پکڑے جاتے، چنانچہ یہیں انکار کرنا مناسب تھا۔ انکار سن کر وہ شخص تنہا ہی چل پڑا۔ وہ دونوں اپنی جگہ کھڑے اسے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دیکھنے لگے۔ مغل بادشاہ کی سرخ پتھروں سے تعمیر کروائی گئی یہ جامع مسجد پرشکوہ گنبدوں اور میناروں پر مشتمل تھی اور اس سے وہ خصوصی طرز تعمیر جھلکتا تھا جو مغلوں سے منسوب ہے۔ لیکن افسوس کی بات یہ تھی کہ مسجد کی سیڑھیوں کے نیچے اور آس پاس صفائی کا شدید فقدان تھا۔ حالانکہ وہاں سیاحوں کی بڑی تعداد کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ حکومت ہند کو سیاحوں کی وجہ سے جو کثیر آمدنی ہوتی ہے، اس میں اس مسجد کا بھی اہم کردار ہے۔ بہرحال، وہ اس وقت اس قسم کے معاملات پر کسی قسم کی رائے زنی نہیں کر سکتا تھا۔

اگرچہ یہ مسجد اور ہندوستان بھر میں موجود مسلمانوں کی تعمیر کردہ تاریخی اہمیت کی حامل عمارتوں سے ہر پاکستانی مسلمان کی طرح اس کی بھی جذباتی وابستگی تھی اور وہ بجا طور پر فخر کرتا تھا کہ مسلمانوں نے طویل عرصے ہندوستان پر حکمرانی کرنے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کو ان عمارتوں کی صورت، انمول خزانے سے نوازا تھا۔ دنیا کے عجائبات میں سے ایک بے نظیر عجوبہ تاج محل مسلمان مغل بادشاہ شاہجہاں کا کارنامہ ہونے کے باوجود ہندوتواز ہندوستان کے لیے کثیر زرمبادلہ کما کر دیتا تھا۔ یہ بھی مسلمانوں کا ان پر ایک احسان تھا لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ تھی کہ مسلمانوں کے سارے کارہائے نمایاں ماضی کا حصہ بن چکے تھے اور پاکستان بننے کے بعد کوئی پاکستانی مسلمان اپنے آباء کی ان یادگاروں پر حق ملکیت نہیں جتا سکتا تھا اور حال کا قصہ یہ تھا کہ اسے اپنے وطن کے ایک مایہ ناز سائنس داں ڈاکٹر فرحان جمیل کو بھارتی بھیڑیوں کی قید سے نجات دلا کر واپس پاکستان لے جانا تھا۔

ماضی میں جو کچھ ہاتھ سے نکل گیا تھا اور جو کچھ بھارتی غنڈوں نے لوٹ لیا تھا، اس سب کے لیے بے شک کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن اپنا حال اور مستقبل بچانے کے لیے ضروری تھا کہ وہ ڈٹ کر ان غنڈوں سے مقابلہ کریں۔ ایسے ہی ایک مقابلے کا عزم دل میں لے کر وہ جان ہتھیلی پر لیے ہندوستان کی سرزمین پر پہنچا تھا اور یہ طے تھا کہ ڈاکٹر فرحان جمیل کو یہاں سے واپس لے کر ہی جائے گا۔

"چلیے، اب چلتے ہیں۔" اسے اندازہ بھی نہیں ہوا کہ مسجد کا نظارہ کرتے ہوئے وہ کتنے گہرے خیال میں ڈوب گیا تھا۔ نیلی قمیص والے نے آ کر دوبارہ مخاطب کیا تو حال کے منظر میں واپس آیا۔ نیلی قمیص والے سے اس نے اس کا نام دریافت نہیں کیا تھا۔ اس نے بھی ان سے اس بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا۔ انہیں ناموں کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ بس انہیں معلوم تھا کہ وہ پاکستان کے لیے کام کر رہے ہیں اور اس سے آگے کسی قسم کے سوال و جواب کی گنجائش نہیں تھی۔

بھرے پُرے بازار سے گزرتے ہوئے وہ پیدل ہی جانے کن کن گلیوں سے گھماتا ہوا انہیں ایک مکان تک لے گیا۔ مکان زیادہ بڑا نہیں تھا اور باہر سے دیکھنے میں ہی لگتا تھا کہ مکینوں کی مالی حالت زیادہ اچھی نہیں ہے۔ اس آدمی نے دروازے پر دستک دی تو ایک جوان لڑکے نے دروازہ کھولا۔ انہیں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک سی آ گئی لیکن بظاہر وہ بے نیازی کا مظاہرہ کرتا ہوا دروازے سے ہٹ گیا۔ وہ دونوں نیلی قمیص والے کے پیچھے مکان کے اندر داخل ہو گئے۔ مکان کی حالت اندر سے بھی تقریباً ویسی ہی تھی جیسا باہر سے دیکھ کر اندازہ قائم کیا جا سکتا تھا۔

"پہلے تمہاری شناختی دستاویزات کی تیاری کے لیے کام شروع کرتے ہیں۔" اس نے بغیر کسی لاگ لپیٹ کے اندر داخل ہوتے ہی کام کی بات شروع کر دی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ دونوں اس کے اور اس کے ساتھی کے رحم و کرم پر تھے۔ کمرے میں روشنی کا معقول انتظام کر کے ایک دیوار پر نیلی چادر تان دی گئی اور وہ دونوں ان کے چہروں پر اپنا ہنر آزماتے ہوئے دو تین مختلف حلیوں میں ان کی تصویریں لیتے چلے گئے۔ ان کے سامنے آئینہ نہیں تھا لیکن ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ کر وہ اندازہ کر سکتے تھے کہ یہ دونوں ہی افراد میک اپ کے فن میں ماہر ہیں۔

"میں نے تصویریں لے لی ہیں۔ کمپیوٹر پر ان پر مزید کام کر کے آپ دونوں کے لیے کئی شناختی دستاویزات تیار کروا دوں گا۔ اس کام کے لیے مجھے بس کل تک کی مہلت درکار ہوگی۔ اس کے بعد آپ آزاد ہوں گے کہ حلیے بدل بدل کر ہندوستان بھر میں جہاں چاہے گھومتے پھریں۔ آپ کی شناخت کے سلسلے میں کوئی آپ پر شک نہیں کر سکے گا۔" اپنا کام مکمل کرنے کے بعد اس نے انہیں آگاہ کیا جبکہ اس کا ساتھی خاموشی سے سارا ساز و سامان سمیٹنے لگا۔

"ٹھیک ہے۔ یہ کام تو ہو گیا، باقی دوسرے معاملات...؟" شہریار نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے استفسار کیا۔

"تین چار سیلولر فون کے سیٹ اور سمیں میں آپ کو ابھی دے دیتا ہوں۔ رہائش کا مسئلہ ابھی میرا ساتھی آپ کے ساتھ جا کر حل کروا دے گا۔ صرف آج ہی آپ کو یہ پرابلم رہے گی، کل سے تو آپ کسی بھی ہوٹل میں آسانی سے قانونی طور پر قیام کر سکیں گے۔" اس نے جواب دیا۔ اس دوران میں اس کا ساتھی سامان سیٹ کر رکھنے کے بعد واپس آ گیا۔

"یہ ایک اے ٹی ایم کارڈ ہے۔ اس کی مدد سے آپ پورے ہندوستان میں کہیں سے بھی رقم حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کارڈ کا تعلق ایک ایسے شخص کے اکاؤنٹ سے ہے جسے مرے ہوئے بھی پانچ سال گزر چکے ہیں لیکن بینک کے پاس ریکارڈ نہیں ہے۔ اکاؤنٹ میں ہم مختلف ذرائع سے رقم جمع کرواتے رہتے ہیں اور ظاہر ہے بینک کے پاس یہ ریکارڈ بھی موجود نہیں ہے کہ یہ رقم کہاں سے آتی ہے۔ چنانچہ آپ لوگوں کے پکڑے جانے کا کوئی امکان نہیں ہوگا۔ بشرطیکہ آپ ذہانت، ہوشیاری اور احتیاط سے کام لیں۔" اس نے ایک کارڈ شہریار کے ہاتھ میں تھما دیا پھر اپنے ساتھی کو اشارہ کیا تو وہ بالکل الرٹ کھڑا ہو گیا۔

"آئیے، میں آپ کو ہوٹل تک چھوڑ دیتا ہوں۔" اس نے انہیں ساتھ لیا اور گھر سے نکل گیا۔ اپنے ساتھی ہی کی طرح وہ بھی انہیں پیچ در پیچ گلیوں سے گھماتا ہوا مینا بازار واپس لے آیا اور ایک چھوٹے سے ہوٹل میں لے کر داخل ہو گیا۔

"اور لالو بھائی کیا حال ہے؟... بھابی اور بچے سب ٹھیک ہیں نا؟" کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص سے گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"ارے راہول تم... بڑے دنوں بعد چکر لگایا۔ گھر پر بھی بہت دنوں سے نہیں آئے۔ تمہاری بھابی اور بچے تمہیں یاد کر رہے تھے۔" لالو کے نام سے پکارے جانے والے شخص نے بھی جواباً گرم جوشی سے مصافحہ کیا جس سے انہیں اندازہ ہوا کہ ان کے ساتھ آنے والے جوان کے اس سے خاصے خوش گوار اور بے تکلفانہ تعلقات ہیں۔ کاؤنٹر والے شخص نے اسے راہول کہہ کر پکارا تھا۔ اب یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ اس کا اصلی نام تھا یا وہ راہول کا روپ دھار کر یہاں رہ رہا تھا۔

"تمہیں تو اپنی مصروفیت کا معلوم ہی ہے لالو بھائی۔ کبھی یہاں تو کبھی وہاں۔ ایک جگہ ٹک کر بیٹھیں تو میل جول میں بھی باقاعدگی آئے۔"

"ہاں، مجھے سب معلوم ہے۔ تم صحافی لوگ کیسے بدمعاش ہوتے ہو۔ یہ بتاؤ آج کل کس ہیروئن بے چاری کے پیچھے لگ کر اسے بلیک میل کرنے کی تیاری کر رہے ہو؟" لالو نے قہقہہ لگاتے ہوئے پوچھا۔

"ارے کہاں لالو بھائی! تم یار لوگ بھی خوامخواہ بدنام کرتے ہو۔ میں ایسا بلیک میلر ہوتا تو شہر میں اپنا بھی کوئی بنگلہ اور کوٹھی ہوتی۔" اس نے سنجیدہ شکل بنا کر تردید کی کوشش کی۔

"مجھے بے وقوف نہیں بناؤ۔ مجھے سب معلوم ہے تمہاری چار سو بیسی کا۔" لالو نے اس کی بات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

"اچھا مت مانو لیکن اب مہمانوں کے سامنے انسلٹ تو نہ کرواؤ۔ یہ میرے چاچا کے بیٹے ہیں۔ یاترا کے لیے گھومنے پھرنے کے لیے نکلے ہیں۔ کچھ دن دہلی میں ٹھہر کے پھر آگے نکل جائیں گے۔ تم اپنے ہوٹل میں ان کے لیے دو بیڈز کا ایک کمرا تو بک کر دو۔" وہ بڑی خوب صورتی سے مطلب کی بات پر آ گیا۔

"کیوں نہیں بھئی، تمہارے مہمان ہیں تو ہمارے بھی مہمان ہوئے۔" اس نے اٹھ کر شہریار اور سلو سے ہاتھ ملایا پھر دوبارہ راہول کی طرف متوجہ ہوا۔ "دونوں کے نام بتاؤ۔" اس نے نام بتا دیے جو کہ جگدیش اور رویندر تھے اور پتے کے خانے میں کوئی پتا بھی لکھوا دیا۔ اس کی وجہ سے لالو نے شناختی کاغذات دکھانے پر بھی اصرار نہیں کیا اور کمرے کی چابی نکال کر ان کے سامنے کاؤنٹر پر رکھ دی۔ چابی کے ساتھ منسلک ٹیگ پر کمرا نمبر تیرہ لکھا ہوا تھا۔

"اچھا بھئی، تمہارے لیے کمرے کا انتظام تو ہو گیا۔ تم آرام سے یہاں رہو اور جہاں چاہے گھومو پھرو۔ میں اب چلتا ہوں، ایک ضروری کام سے جانا ہے۔" کام ہوتے ہی اس نے ان دونوں سے کہا اور مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔

"ارے یار! ابھی بھی کیا جلدی ہے؟ کم سے کم چائے تو پیتے جاؤ۔" لالو نے اسے روکا۔

"نہیں، ابھی مجھے بچ نکلنا ہے۔ کبھی فرصت ملی تو گھر آ کر بھابی کے ہاتھ کے بنے گوبھی کے پراٹھے کھاؤں گا۔ ابھی تم میرے حصے کی چائے میرے مہمانوں کو پلا دو۔" وہ ہاتھ ہلاتا ہوا عجلت میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس کے روانہ ہوتے ہی لالو نے ایک پورٹر کو بلا کر ان دونوں کو ان کا کمرا دکھانے کا حکم دیا۔ کمرے میں پہنچ کر سلو نے بیگ ایک طرف پھینکا اور بستر پر گر گیا۔

"تمہارے دوست کتنے کنجوس ہیں۔ کھانا تو دور کی بات ایک پیالی چائے تک کو نہیں پوچھا۔" ٹانگیں پھیلا کر بستر پر لیٹے لیٹے اس نے تبصرہ کیا۔

"ہم یہاں تفریحی دورے پر نہیں آئے ہوئے ہیں کہ لوگ ہماری خاطر مدارات کرتے پھریں۔ انہیں ہمارے لیے جو کچھ کرنا چاہیے تھا، وہ انہوں نے کیا۔ تم کھانا کھانا چاہتے ہو تو ڈائننگ ہال میں چلتے ہیں یا یہیں منگوا لیتے ہیں۔" نیلی قمیص والے سے ملنے والے موبائلز میں سے ایک موبائل میں سم لگاتے ہوئے اس نے سلو کی بات کا جواب دیا۔

"نہیں، کہیں باہر چلتے ہیں۔ ذرا سیر بھی ہو جائے گی اور کھانا بھی کھا لیں گے۔" وہ جو بستر پر ایسے لیٹا تھا کہ جیسے بھوک اور تھکن کے مارے بُرا حال ہو، یکدم ہی باہر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ شہریار نے بھی مسکراتے ہوئے اس کے پروگرام کی تائید کر دی۔ اسے معلوم تھا کہ سلیم عرف سلو نامی یہ بلا بڑی آفت شے ہے اور ذرا سا سفر یا بھوک اسے اتنی آسانی سے نڈھال نہیں کر سکتے۔

☆☆☆

جاوید علی نے اپنے سامنے بیٹھے رائے چند کو غور سے دیکھا۔ وہی اجلا سفید لباس اور نرم سے تاثر دینے والے نقوش تھے اس شخص کے جس سے اچھا بھلا بندہ دھوکا کھا جائے اور ذرا شک نہ ہو کہ یہ بھی شیطانی صفات رکھنے والا آدمی ہے۔ سی ایف پی والوں کی نظر میں تو وہ اس لیے آیا تھا کہ انہیں اس پر را کا مبینہ ایجنٹ ہونے کا شک تھا لیکن اس کے علاوہ بھی وہ ایسے جرائم میں ملوث تھا کہ اس پر قانون کی گرفت ہونا لازمی تھی۔ وہ بدبخت اخلاق باختہ فلموں اور منشیات کی مدد سے بڑی چالاکی اور خاموشی کے ساتھ نوجوان نسل کو تباہ کرنے کے مشن پر جتا ہوا تھا اور افسوس ناک بات یہ تھی کہ اس کا ساتھ دینے میں لالچ اور طمع میں جتلا قانون کے رکھوالے برابر کے شریک تھے۔ وہ کتنا ہی شریف صورت سہی لیکن بہرطور یہ تو ممکن نہیں تھا کہ اس کے ان گھناؤنے اور غیر قانونی دھندوں کی سن گن پولیس کو نہ ملی ہو۔ وہ سب جانتے تھے لیکن پابندی سے پہنچنے والے نذرانے نے ان کی زبانیں بند کر رکھی تھیں۔ اب جو اوپر سے سخت احکامات ملے تو انہیں چار و ناچار اس کی دکان پر چھاپا مار کر مال برآمد کرنا پڑا۔ چھاپا مارنے والی ٹیم کا انچارج انسپکٹر یقیناً اس وقت بہت حیران ہوا ہوگا جب اسے

اوپر سے ہی یہ احکامات ملے کہ معقول رشوت قبول کر کے رائے چند کو آزاد کر دیا جائے۔ انسپکٹر ہوشیار تھا۔ اس نے موقع کا خوب فائدہ اٹھایا اور رائے چند سے مول تول کر کے خاصی بڑی رقم اینٹھنے میں کامیاب رہا۔

رائے چند کے لیے اصل اہمیت آزادی کی تھی سو اس نے منہ مانگی قیمت ادا کر کے اپنے لیے آزادی خرید لی۔ چالاک بنیے نے شاید یہ سوچ رکھا ہو کہ یہ نقصان اپنے غیر قانونی دھندوں سے بعد میں پورا کر لوں گا لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ تھانے سے نکلنے کے بعد وہ اس سے بھی بڑی مصیبت میں پھنسنے والا ہے۔ اس نے گھر فون کر کے اپنے بیٹے سے رقم منگوائی اور پھر اسے واپس بھیج دیا کہ تم واپس جاؤ، میں ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔ تھانے میں اس نے خود کو گرفتار کرنے والے انسپکٹر کے ساتھ چائے پیتے ہوئے یہ جاننے کی کوشش کی کہ باقاعدگی سے پہنچنے والے نذرانے کے باوجود آخر اس نے اس پر ہاتھ کیوں ڈالا۔ اگر معمول کے نذرانے سے زائد رقم ہی درکار تھی تو وہ ویسے بھی بتا سکتا تھا۔ انسپکٹر بھی گھاگ آدمی تھا، سچ اور جھوٹ کو آپس میں ملاتے ہوئے اسے یہ کہانی سنائی کہ علاقہ مکینوں میں سے کسی نے اوپر شکایت کر دی تھی کہ رائے چند نامی ایک دکان دار علاقے میں منشیات اور گندی فلموں کا کاروبار کر رہا ہے، اس کے خلاف ایکشن لیا جائے۔ ایس پی صاحب نے تھانے فون کر کے ایکشن لینے کا حکم دیا تو مجبوراً مجھے حرکت میں آنا پڑا۔ مہلت اتنی کم تھی کہ وہ پہلے سے اسے اطلاع بھی نہیں دے سکا کہ اپنی دکان سے ساری مشکوک چیزیں ہٹا لے لیکن اب حقِ دوستی ادا کرنے کے لیے اسے آزاد کرنے کو تیار ہے۔ اوپر والوں کو وہ یہ کہانی سنا سکتا تھا کہ چھاپے میں رائے چند کی دکان سے کچھ برآمد نہیں ہوا اور تفتیش کے نتیجے میں بھی پولیس کو اس سے ایسی کوئی معلومات حاصل نہیں ہوئیں جن کی بنیاد پر اسے مشکوک قرار دیا جا سکتا چنانچہ معمولی تنبیہ کے بعد چھوڑ دیا گیا۔ البتہ مستقبل میں اس پر یعنی رائے چند پر سخت نظر رکھی جائے گی۔

یہ ساری کہانی سن کر رائے چند شاداں و فرحاں تھانے سے روانہ ہو گیا کہ اس کے دوست انسپکٹر نے بے شک ایک بڑی رقم لینے کے بعد اسے بہت بڑی مصیبت سے بچا لیا اور مستقبل میں بھی اسی طرح اس کی مدد کرتا رہے گا۔ یہ نہ تو انسپکٹر کو معلوم تھا، نہ رائے چند کو کہ مستقبل اس کے لیے کتنا بھیانک ثابت ہونے والا ہے۔ تھانے سے نکل کر وہ کچھ دور ہی پہنچا تھا کہ سی ایف پی کے آدمیوں نے اسے گھیر لیا اور ہیڈ

کوارٹر پہنچ کر جاوید علی کے حکم کے مطابق بغیر کسی قسم کے سوال جواب کے بڑے کلاسیکل انداز میں اس کی پھینٹی لگا دی۔ یہ وہ انداز تھا جو پولیس والے بھی اختیار کرتے ہیں۔ رائے چند کو بھی خوب جی بھر کر مار پڑی۔ لیکن ایسے طریقے سے کہ اس کے جسم پر کوئی زخم آیا، نہ کوئی ہڈی ٹوٹی پھوٹی۔ چہرہ تو بالکل بھی متاثر نہیں ہوا البتہ چیخیں مارتے مارتے اور یہ پوچھتے پوچھتے رائے چند کا حلق خشک ہو گیا کہ اسے کس جرم کی پاداش میں اس سلوک کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔ لیکن اس پر تشدد کرنے والے تعمیلِ حکم میں گونگے بہرے بنے ہوئے تھے چنانچہ اسے اپنی کسی بات کا کوئی جواب نہیں ملا۔ تشدد کرنے والوں نے اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق خود ہی اپنے ہاتھ روک دیے اور اسے اس کا وہی سفید اجلا لباس دوبارہ پہنا دیا گیا جسے بغرضِ تشدد اتار دیا گیا تھا۔ لباس پہنانے کے بعد ان لوگوں نے اسے جوس وغیرہ پلایا اور پھر اس کرسی پر لا بٹھایا۔ یہاں بیٹھنے کے بعد اس نے جاوید علی کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تو بری طرح چونک گیا۔ چند گھنٹے قبل دیکھا گیا جاوید علی کا چہرہ بھلا اس کی یادداشت سے کیسے نکل سکتا تھا۔ البتہ وہ یہ سوچنے پر ضرور مجبور ہو گیا کہ اس کی دکان پر عام گاہک بن کر آنے والا یہ شخص حقیقت میں کوئی عام آدمی نہیں تھا اور اس پر جو بھی مصیبت ٹوٹی ہے اس میں اس شخص کا پورا پورا ہاتھ ہے۔

''تم حیران ہو رہے ہوگے رائے چند کہ تمہیں یہاں لا کر کسی قسم کے سوال جواب کے بغیر اتنی بری طرح کیوں مارا پیٹا گیا تو میں تمہاری یہ حیرت دور کر دیتا ہوں۔ تم پڑنے والی اس مار کو اپنے گھناؤنے دھندوں کی سزا کی پہلی قسط سمجھ لو اور عقل مند ہو تو یہ بھی سمجھ لو کہ جب پہلی قسط ہی ایسی ہے تو تعاون نہ کرنے کی صورت میں ہم تمہارا کیا حشر کریں گے۔'' نظروں ہی نظروں میں کچھ دیر ایک دوسرے کو تولنے کے بعد جاوید علی نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم کون ہو اور تمہارا تعلق کس محکمے سے ہے؟ میں مانتا ہوں کہ مجھ پر لگائے گئے الزامات درست ہیں لیکن میں کوئی واحد شخص تو نہیں ہوں جو اس شہر میں یہ دھندا کر رہا ہے۔ تم نے ان سب میں سے کسی کو کچھ نہیں کہا اور مجھے پکڑ کے لے آئے جبکہ میں ہمیشہ بہت پابندی سے پولیس کو اس کا بھتا دیتا رہا ہوں۔ اب بھی میں تھانے میں ایک خاصی بڑی رقم جمع کروانے کے بعد وہاں سے نکلا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اتنی خدمت کے بعد کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مجھ پر ہاتھ ڈالے۔''

رائے چند نے ذرا ناراضی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا جسے سن کر جاوید علی نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ یہ شخص اس کے وطن کے مستقبل کو تباہ و برباد کر رہا تھا اور سمجھتا تھا کہ اس جرم کے مداوے کے لیے چند بے ضمیروں کو کرارے نوٹوں سے نواز دینا کافی تھا۔ ادھر خود اس کا یہ حال تھا کہ جتنی دیر میں ساری کارروائی مکمل ہوئی اور سی ایف پی والوں نے رائے چند کو یہاں لا کر اس کی خاطر مدارات کی، وہ مسلسل مصروف رہا۔

حاذق اور شہباز نامی لڑکوں سے اس نے ان کے اور ان کے دوستوں کے جو ٹیلی فون نمبر لیے تھے، ان پر فون کر کے ان لڑکوں کے والدین کو آگاہ کیا کہ ان کے بچے کیا گل کرتے پھر رہے ہیں۔ ان والدین سے اس نے یہ بھی درخواست کی کہ اپنے بچوں سے پوچھ گچھ کر کے ان سے مزید ایسے لڑکوں کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کریں جو ان کے بچوں ہی کی طرح ان قبیح عادات میں مبتلا ہو چکے ہیں تاکہ بروقت توجہ دے کر انہیں ان برائیوں سے نجات دلائی جاسکے۔ ساتھ ہی اس نے انہیں یہ بھی پیشکش کی کہ اگر اس سلسلے میں انہیں کسی قسم کی مدد درکار ہو تو وہ بلا جھجک اس سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے اس نے ان تمام والدین کو ایک پی او بکس نمبر دے دیا تھا جہاں وہ اپنی گزارشات اسے بھیج سکتے تھے۔ اس نے ان لوگوں سے یہ بھی درخواست کی تھی کہ اگر رائے چند کے علاوہ بھی کوئی شخص ان کے علاقے میں اس قسم کا دھندا کر رہا ہے تو وہ اسے آگاہ کر سکتے ہیں۔ اطلاع دینے والے کے لیے بھی اپنی شناخت ظاہر کرنا ضروری نہیں ہوگا، البتہ اس کی دی گئی اطلاع پر قرار واقعی کارروائی کی جائے گی۔ لوگوں نے اس کا شکریہ ادا کیا تھا اور اپنے تعاون کی پوری پوری یقین دہانی بھی کروائی تھی۔ اپنے طور پر اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ واقعی ان منشیات فروشوں کا پیچھا نہیں چھوڑے گا اور سی ایف پی کا دائرۂ کار محدود ہونے کے باوجود اپنے بڑوں کو اس بات کے لیے راضی کرے گا کہ اپنے محدود وسائل اور نفری کے باوجود وہ اس مسئلے کے حل کے لیے پوری پوری کوشش کریں کیونکہ ان کا کام ہی وطن کی حفاظت تھا اور وطن کی حفاظت کے لیے سب سے ضروری یہی تھا کہ اس کے مستقبل یعنی نوجوان نسل کو بچایا جائے۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو رائے چند کہ اس شہر میں تمہارے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ یہ دھندا کر رہے ہیں لیکن صرف تم ہماری گرفت میں آئے ہو۔ اس کی دو بڑی

وجوہات ہیں۔ اوّل یہ کہ تم بدقسمت ہو اور دوئم یہ کہ ان میں سے کسی اور پر را کا مبینہ ایجنٹ ہونے کا الزام نہیں ہے۔" جاوید علی کا جملہ مکمل ہوا تو رائے چند خاصی ردی حالت میں ہونے کے باوجود اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔

"یہ... یہ... تم مجھ پر جھوٹا الزام لگا رہے ہو۔" اس نے جاوید علی کو جھٹلانے کی کوشش کی۔

"یہ الزام نہیں حقیقت ہے اور کتنی ٹھوس ہے اس کا اندازہ تم اس بات سے لگا لو کہ پچھلے کئی مہینوں سے ہم تمہاری نگرانی کروا رہے ہیں۔ میں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ یہ نگرانی کس تاریخ سے اور کیوں کروائی جا رہی ہے۔" اس نے رائے چند کو بتانا شروع کیا کہ کس تاریخ کو اسے شہریار کے خون وغیرہ کے نمونے حاصل کرتے ہوئے دیکھا گیا تھا اور اب تک کس طریقے سے اس کی نگرانی کی جاتی رہی ہے۔

"تم لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ جس تاریخ کا تم ذکر کر رہے ہو، اس دن میں اسپتال گیا ضرور تھا لیکن اپنی بیوی کی رپورٹس لینے۔ اس کے پتے میں پتھری ہے اور اس کا علاج اسی اسپتال سے ہو رہا ہے۔" رائے چند نے ایک بار پھر اسے جھٹلانے کی کوشش کی اور نہایت معصومیت سے بولا۔ "میں تو جانتا بھی نہیں ہوں کہ تم شہریار نامی جس شخص کا نام لے رہے ہو، وہ کون ہے اور کہاں رہتا ہے؟"

"اس مسئلے کو تم جانے دو۔ میرے آدمی بندے کی کھوئی ہوئی یادداشت واپس لانے میں ایکسپرٹ ہیں۔ تمہیں سب یاد آجائے گا کہ شہریار کون ہے اور تم نے اس کے نمونے کیوں حاصل کیے تھے۔ یہ کوئی کمرائے عدالت نہیں ہے جو مجرم جھوٹے دلائل دے کر خود کو بچا لے۔ ہم دلائل نہیں صرف حقائق سننے والے لوگ ہیں۔ اب یہ تمہاری مرضی اور قوت برداشت پر منحصر ہے کہ تم کتنی دیر میں سچ اگلنا شروع کرتے ہو۔ البتہ ایک بات کا میں تمہیں یقین دلا دوں کہ سچ اگلے بغیر تمہیں موت کی آغوش میں بھی پناہ نہیں ملے گی۔" جاوید علی کا لہجہ سفاک ہو گیا۔ رائے چند کے لیے اس کے دل میں رحم کی کوئی رمق تھی بھی نہیں۔ ایک طرف وہ سب سے بڑے دشمن را کا ایجنٹ تھا تو دوسری طرف موت کا بیوپاری۔ ایسے شخص کو تو اگر اسے اختیار دیا جاتا تو وہ سات بار اذیت ناک موت کی سزا دیتا۔ اس وقت بھی اس نے اشارہ کیا تو رائے چند پر قیامت ٹوٹ پڑی اور وہ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے بُری طرح تھرتھرانے لگا۔ یہ تھرتھراہٹ اس برقی رو کا نتیجہ تھی جو اچانک ہی اس کی کرسی میں دوڑا دی گئی تھی۔ دھاتی کرسی میں چند سیکنڈز کے لیے دوڑنے والی برقی رو نے رائے چند کے حلق سے چیخیں نکلوا دیں۔

"میرے آدمیوں کو بتاؤ کہ تم منشیات اور مخرب اخلاق فلموں کا دھندا کرنے والے کن کن لوگوں سے واقف ہو اور را کے کن کن سورماؤں سے تمہارے روابط ہیں؟ میرے ان دو سوالوں کا جواب حاصل کرنے کے لیے یہ لوگ تم پر اتنا ستم ڈھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ تمہاری روح بلبلا اٹھے گی لیکن یہ اسے تمہارے جسم کا ساتھ چھوڑنے کی اجازت نہیں دیں گے۔" رائے چند کے بجلی کے جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد اس نے ایک بار پھر اسے دھمکایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ رائے چند کی چیخیں اس کے تعاقب میں کمرے سے باہر تک آ رہی تھیں۔

☆☆☆

"واہ بھئی کیا فنٹاسٹک کھانا ہے اِدھر کا۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ کم سے کم ایک ہفتہ دہلی میں رکوں اور تینوں وقت اسی ہوٹل میں آکر کھانا کھاؤں۔" لقمہ منہ میں رکھتے ہوئے سلو نے جھوم کر کھانے کی تعریف کی اور ساتھ ہی خواہش بھی بیان کی۔

"تم ایسا کرنا کہ جب شادی کرو تو ہنی مون منانے کے لیے اپنی بیگم کو یہیں لے آنا اور خوب دل بھر کر دہلی کے کھانے کھانا۔ فی الحال میں تو تمہاری یہ خواہش پوری نہیں کر سکتا۔" شہریار نے مسکرا کر اسے جواب دیا۔

کل رات کھانے کے لیے وہ اسی ہوٹل آئے تھے اور سلو کو یہاں کا کھانا اتنا پسند آیا تھا کہ وہ وہاں سے روانہ ہوتے وقت ناشتے کا مینیو معلوم کرتا ہوا نکلا تھا۔ شہریار کو سادہ ناشتا کرنے کی عادت تھی اور اس کا خیال تھا کہ یہ سادہ ناشتا انہیں اس ہوٹل کی انتظامیہ بھی فراہم کر سکتی تھی جہاں وہ ٹھہرے ہوئے تھے لیکن سلو کی ضد پر اسے ناشتے کے لیے نواور نامی اس ہوٹل آنا ہی پڑا تھا اور بلاشبہ وہاں فراہم کیا جانے والا ناشتا بے حد لذیذ تھا۔

ناشتے کے بعد وہ دونوں پیدل ہی اِدھر اُدھر گھومتے رہے تھے۔ بازاروں کی خاک چھاننے کے علاوہ انہوں نے مختلف بس سروسز کے دفتروں اور ریلوے اسٹیشن کا دورہ بھی کیا تھا۔ اس طرح انہیں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ دہلی سے باہر جانے کے لیے انہیں کن ذرائع سے اور کن اوقات میں سہولیات مل سکتی ہیں۔ اس آوارہ گردی میں ان کا اچھا خاصا وقت گزر گیا تھا اور بھوک بھی خوب چمک گئی تھی۔ بھوک لگنے پر کھانا کھانے کا فیصلہ کیا گیا تو سلو کا انتخاب ایک بار پھر نواور ہوٹل ہی تھا۔ شہریار کے نزدیک آپس میں بہتر تعلقات کے لیے ایسے چھوٹے موٹے لاڈ اٹھانے میں کوئی حرج نہیں تھا اس لیے اس نے اس کا مطالبہ تسلیم کر لیا اور اب کھانا کھاتے ہوئے سلو کھانے کی شان میں رطب اللسان تھا۔

"آئیڈیا برا نہیں ہے استاد! ویسے تو لگتا ہے کہ میرے ہاتھوں میں شادی کی لکیر نہیں ہے لیکن اگر کبھی اتفاق سے شادی ہو گئی تو صرف یہاں کے کھانوں کی خاطر میں یہاں ہنی مون منانا پسند کروں گا... بلکہ ایسا کروں گا کہ اپنی بیوی کو شیف کی ٹریننگ دلوانے کے لیے کچھ عرصہ یہاں ملازمت دلوا دوں گا۔ بس پھر تو سمجھو ساری زندگی کے عیش ہیں۔" سلو بھی موڈ میں تھا اس لیے خوش گوار لہجے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کی گفتگو کا یہ حصہ مشروبات پہنچانے کے لیے ان کی میز پر آنے والی ویٹریس نے بھی سنا اور مسکرا کر خوش دلی سے بولی۔

"ہمارے لیے بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ نے ہمارے کھانوں کو پسند کیا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ جب بھی دوبارہ یہاں آئے، ہمارے کھانوں کا یہی معیار پائیں گے۔"

"جی ہاں لیکن بس شرط اتنی ہے کہ کھانا آپ کے ان خوب صورت ہاتھوں سے ہی سرو کیا جائے کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ کھانے کے اس سواد میں آپ کے ان خوب صورت ہاتھوں کا بھی بڑا دخل ہے۔" ویٹریس کی دخل اندازی کا بُرا مانے بغیر سلو نے شوخی سے اسے جواب دیا۔

"ایسی بددعا نہ دیں سر! میں نے مجبوری میں صرف کچھ عرصے کے لیے یہ ملازمت کی ہے، ورنہ میرے پاس ماسٹرز کی ڈگری ہے اور جیسے ہی میری پرابلم سولو ہوئی، میں کسی اچھی نوکری پر لگ جاؤں گی۔" اس نے انہیں بتایا پھر یکدم موضوع گفتگو بدلتے ہوئے بولی۔ "اگر آپ کو کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو آرڈر کر سکتے ہیں۔"

"تھینکس۔ جو کچھ ہے، وہی بہت ہے۔ آپ اپنے دوسرے کسٹمرز کو دیکھ سکتی ہیں۔" اس بار سلو کے بجائے شہریار نے اسے جواب دیا۔ وہ خود نپا تلا کھانا کھا کر اپنا ہاتھ روک چکا تھا اور ایک ویٹریس کے ساتھ سلو کی اس غیر ضروری بے تکلفی کو پسند نہیں کیا تھا۔ کتنا ہی نرم دل اور غریب پرور سہی لیکن وہ تھا تو ایک بیوروکریٹ خاندان کا حصہ، چنانچہ اس کے اندر بیوروکریسی کے کچھ نہ کچھ جراثیم بہرحال موجود تھے اور اس کے نزدیک یہ نہایت غیر مہذبانہ حرکت تھی کہ ایک ویٹریس اس طرح گفتگو میں دخل دے اور جواباً اس کی حرکت کا بُرا ماننے کے بجائے اس سے بے تکلفی برتی جائے۔ ویٹریس نے بھی اس کا یہ موڈ بھانپ لیا اور خاموشی سے وہاں سے ہٹ گئی۔

"تم بھی بڑے بدذوق بندے ہو یار... اتنی خوب صورت لڑکی باتیں کر رہی تھی لے کر اسے بھگا دیا۔" سلو نے ایک اور لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے اس کی حرکت پر تبصرہ کیا۔

"خوب صورت لڑکیاں خطرناک بھی ہوتی ہیں۔ اگر تم خوب صورتی کو دیکھ کر اس طرح پھسلتے رہے تو ہم کسی بڑی مشکل میں بھی پھنس سکتے ہیں۔" شہریار نے اسے تنبیہ کی۔

"مشکلوں سے ڈرنے والے اے آسماں ہم نہیں۔" سلو نے بے نیازی سے اسے جواب دیا اور مشروب کا گلاس اٹھا کر ایک بڑا سا گھونٹ بھرا۔ اس کے اس انداز پر شہریار اسے فقط گھور کر رہ گیا اور خود بھی مشروب پینے لگا۔ ابھی مشکل سے اس نے دو گھونٹ ہی لیے تھے کہ ڈائننگ ہال کے ایک حصے سے شور سا سنائی دیا۔ وہ دونوں ہی اس طرف متوجہ ہوئے۔ کونے والی ایک میز تھی جس پر دو تین آدمی موجود تھے اور کچھ دیر قبل انہیں کھانا پیش کرنے والی ویٹریس اس میز کے قریب نظر آ رہی تھی۔ میز کے گرد بیٹھے تین آدمیوں میں سے ایک نے ویٹریس کا ہاتھ تھام رکھا تھا اور وہ بلند آواز میں اسے اپنا ہاتھ چھوڑنے کے لیے کہہ رہی تھی۔

"یہ ہاتھ تو اب نہیں چھوٹنے کا۔ تُو ہمارے من کو بھا گئی ہے اور اس من کو شانتی اسی سمے ملے گی جب تُو ہمارے بیڈروم میں ایک رات گزارے گی۔" ویٹریس کے کہنے پر اس کا ہاتھ چھوڑنے کے بجائے اس شخص نے اپنے عزائم کا اظہار کیا۔ جواباً اس لڑکی نے اپنے دوسرے آزاد ہاتھ کا طمانچہ اس کے منہ پر دے مارا۔ ڈائننگ ہال میں اس وقت کئی لوگ موجود تھے لیکن یہ قصہ شروع ہوتے ہی سب کھانا پینا بھول کر اس طرف متوجہ ہو گئے تھے اور اتنی خاموشی سے یہ سب دیکھ رہے تھے جیسے ان پر سکتہ طاری ہو گیا ہو۔ لڑکی نے اس شخص کے منہ پر تھپڑ مارا تو خاموشی کی وجہ سے اس تھپڑ کی گونج پورے ڈائننگ ہال میں سنائی دی۔

"بڑی تیکھی شے ہے۔" سلو نے زیرلب تبصرہ کرتے ہوئے سیٹی بجانے والے انداز میں ہونٹ سکیڑے۔ اِدھر لڑکی کے تھپڑ مارتے ہی جیسے ایک بھونچال آ گیا تھا۔ تھپڑ کھانے والے آدمی کے ساتھ بیٹھے دونوں بندے غصے سے چنگھاڑتے ہوئے کھڑے ہوئے اور انہوں نے شکاری جانوروں کی طرح لڑکی کو دبوچ لیا۔

"سالی! تیری اتنی ہمت کہ دادا پر ہاتھ اٹھائے۔ تیری تو ہم بوٹی بوٹی کر کے چیل کوؤں کو کھلا دیں گے۔" وہ بُری طرح اس لڑکی پر پل پڑے تھے اور بلادریغ جوتے مکے مار رہے تھے۔ شہریار اور سلو اس منظر کو دیکھ کر انگشت بدنداں

تھے۔ انھیں حیرت اس بات پر تھی کہ ہال میں بیٹھے ہوئے اتنے لوگوں میں سے کسی نے اس معاملے میں دخل نہیں دیا تھا اور خاموش تماشائی بنے بیٹھے تھے بلکہ کئی نے تو خاموشی سے وہاں سے کھسکنا شروع کر دیا تھا۔

”شما کر دیں سرکار! نادان ہے۔ نئی نئی نوکری پر لگی ہے۔ آپ کو جانتی نہیں ہے۔“ ہوٹل کے منیجر تک اس ہنگامے کی خبر پہنچی تو وہ دوڑا آیا اور چھیڑ کرنے والے آدمی کے سامنے کھڑا ہو کر اس سے عاجزانہ درخواست کرنے لگا۔

”کپڑے پھاڑ دو سالی کے اور گلے میں رسّی ڈال کر اڈے تک لے جاؤ تاکہ ساری دلی کو پتا چل جائے کہ نادر دادا سے پنگا لینے والے کا کیا حشر ہوتا ہے۔“ منیجر کی درخواست کو یکسر نظرانداز کرتا ہوا وہ بری طرح غرایا اور اس کی طرف سے یہ حکم جاری ہوتے ہی لڑکی کو زدوکوب کرتے ہوئے دونوں افراد نے اس کے لباس پر ہاتھ ڈال دیا۔ ایک نے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈالا اور اتنی زور سے جھٹکا دیا کہ وہ پھٹ گیا اور اندر سے اس کا گورا بدن جھانکنے لگا۔ وہ جو مار کھا کر چیخ چلا یا رحم کی درخواست نہیں کر رہی تھی، اس حرکت پر بری طرح رونے چلانے لگی۔ سلو اور شہریار کے لیے اب ممکن نہیں تھا کہ اتنا بڑا ظلم اپنی نظروں کے سامنے ہوتا دیکھیں اور خاموش بیٹھے رہیں۔ وہ گویا کسی اندرونی ربط کے تحت اپنی جگہ سے بیک وقت کھڑے ہوئے اور پل بھر میں اس مقام پر پہنچ گئے جہاں اس لڑکی کو ظلم کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔

”شرم نہیں آتی ایک کمزور عورت سے ایسا سلوک کرتے ہوئے؟“ سلو نے ان میں سے ایک کا گریبان پکڑ کر کھینچتے ہوئے اس کے منہ پر زوردار گھونسا مارا جبکہ دوسرا شہریار کی لات کی زد میں آ گیا۔

”یہ کون مائی کے لال ہیں جو نادر دادا کے آدمیوں پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت کر رہے ہیں؟“ ہال میں موجود افراد میں سے کسی نے خوف زدہ لہجے میں کہا اور پھر وہاں افراتفری سی مچ گئی۔ لوگ بھاگ بھاگ کر ہوٹل سے باہر نکلنے لگے۔ ادھر ان چاروں کے درمیان زبردست معرکہ جاری تھا۔ نادر دادا کے آدمی مضبوط ہاتھ پیر کے اور اچھی قد و قامت کے مالک تھے۔ لڑنے بھڑنے میں بھی ماہر لگتے تھے لیکن ان میں وہ تیزی اور پھرتی نہیں تھی جو شہریار اور سلو میں تھی۔ وہ پینترے بدل بدل کر ان دونوں پر حملے کرتے تھے اور یہ دونوں نہ صرف کامیابی سے ان کا حملہ روک دیتے تھے بلکہ پلٹ کر ایسا وار کرتے تھے کہ وہ بلبلا اٹھتے تھے۔

اس لڑائی کو دیکھنے والے اب بہت کم افراد وہاں رہ گئے تھے۔ ایک نادر دادا تھا جو اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں تھا اور اطمینان سے کرسی پر براجمان اس طرح وہ فائٹنگ دیکھ رہا تھا جیسے وہ کسی فلم کا منظر ہو۔ دوسری ہستی اس سارے جھگڑے کا سبب بننے والی ویٹریس تھی جو ان دونوں سے جان چھوٹ جانے پر کھسکتی ہوئی ذرا فاصلے پر موجود ستون تک چلی گئی تھی اور اس سے ٹیک لگا کر اس انداز میں بیٹھی ہوئی تھی کہ اس نے اپنے دونوں بازو سینے پر باندھ رکھے تھے اور گھٹنے سمیٹ کر پیٹ سے لگا رکھے تھے۔ اس طرح شاید اس نے ستر پوشی کی کوشش کی تھی۔ وہ خوف اور حیرت کی ملی جلی کیفیت میں اپنے لیے لڑتے ہوئے ان دو اجنبیوں کو دیکھ رہی تھی جن کے جسم میں خون کی جگہ شاید پارا بھرا ہوا تھا۔ وہ یوں اچھل اچھل کر لڑ رہے تھے کہ ابھی پیر زمین پر پوری طرح ٹکتے نہیں تھے کہ وہ دوبارہ فضا میں بلند ہو جاتے تھے۔ دیکھا جائے تو انہوں نے صحیح معنوں میں نادر دادا کے پھوؤں کو ناچ نچا رکھا تھا۔

اس منظر کا تیسرا ناظر ہوٹل کا منیجر تھا جس کے چہرے پر حیرانی سے زیادہ پریشانی تھی۔ وہ گردن کو دائیں، بائیں، آگے پیچھے اور اوپر نیچے مسلسل حرکت دیتے ہوئے اس نقصان کا تخمینہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا جو قیمتی کراکری اور فرنیچر وغیرہ کے ٹوٹنے پھوٹنے کے نتیجے میں ہوٹل کو اٹھانا پڑتا۔ ان تین ناظرین کے علاوہ چوتھا ناظر ہوٹل کی ریسپشنسٹ تھی جو ڈر کر کاؤنٹر کے پیچھے چھپ گئی تھی اور وہاں سے کبھی کبھی جھانک کر دیکھ لیتی تھی۔ ان چار افراد کے علاوہ وہاں موجود گاہک اور ہوٹل کا سارا عملہ اپنے بچاؤ کے لیے وہاں سے نکل چکا تھا۔ چند منٹ کے دورانیے پر مشتمل اس لڑائی میں واضح طور پر سلو اور شہریار کا پلہ بھاری نظر آ رہا تھا۔

نادر دادا کے آدمیوں نے جب دیکھا کہ ہاتھ پاؤں کی لڑائی میں ان دونوں لڑکوں کو قابو کرنا آسان نہیں ہے تو ان میں سے ایک نے اپنے نیفے میں اڑسا ہوا پسٹل کھینچ کر نکال لیا اور ہیجان زدہ لہجے میں چیخا۔

”بس بہت ہو گئی۔ اب تم دونوں سیدھے ہو کر ایک طرف کھڑے ہو جاؤ ورنہ میں تمہارے جسموں کو چھید ڈالوں گا۔“ اس کی اس دھمکی نے لمحہ بھر کے لیے سارے منظر کو ساکت کر دیا۔

شہریار اور سلو خواہ مخواہ کسی چکر میں پڑ جانے سے بچنے کے لیے اپنے ہوٹل سے نکلتے وقت اسلحہ ساتھ لے کر نہیں نکلے تھے۔ اپنے طور پر تو وہ بس صرف گھومنے اور دلی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے نکلے تھے اور انہیں ڈر تھا کہ کسی قسم کی دستاویزات کی عدم موجودگی میں وہ اگر کسی ایسی جگہ چلے گئے جہاں اسلحے کو پکڑنے والے آلات نصب ہوئے تو وہ خواہ مخواہ مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ لیکن یہاں معاملہ ایک کمزور اور مظلوم لڑکی کی عزت کا تھا اور وہ اپنے تحفظات کے بارے میں کچھ سوچے بغیر اس جھگڑے میں کود پڑے تھے۔

”طمنچہ اندر رکھ بخشو۔ مرد بچہ بن کر اگر مقابلہ کرنے کا دم نہیں ہے تجھ میں تو ہیجڑوں کی طرح بیٹھ کر تالیاں بجا لیکن اسلحے کے زور پر بے ایمانی سے مقابلہ جیتنے کی کوشش نہ کر۔“ ساکت منظر کو نادر دادا کی گرج دار آواز نے ایک بار پھر متحرک کر دیا۔ حکم سنتے ہی بخشو نے تو چوروں کی طرح نظر چراتے ہوئے اپنا اٹھا ہوا بازو نیچے کر لیا البتہ دوسرے نے کچھ کارکردگی دکھانے کی کوشش کی اور ایک بار پھر حملہ آور ہوا۔ اس کا رخ سلو کی طرف تھا جس نے اپنی جگہ سے بس معمولی سی حرکت کی اور بڑے آرام سے حملہ آور ہونے والے کو اٹھا کر پیچھے کی طرف پھینک دیا۔

”بس کرو تم لوگ یہ ڈرامے بازی۔ میں نے دیکھ لیا ہے کہ تم لوگوں کے بازوؤں میں کتنا دم ہے۔ میں جو موٹی موٹی رقمیں دیتا ہوں نا تم حرام خوروں کو اسے کھا کھا کر تمہارے جسموں پر چربی چڑھ گئی ہے۔ دیکھنے میں ہاتھی جیسے ہو لیکن ایک بچے تک سے مقابلہ کرنے کا دم نہیں ہے تم میں۔ بس ہٹ جاؤ ایک طرف اور اپنے انجام کا انتظار کرو۔“ لگتا تو یوں تھا کہ مقابلے کا نیا راؤنڈ شروع ہونے جا رہا ہے لیکن نادر دادا کی پھنکار سن کر اس کے دونوں گرگے فوراً ہی ایک طرف ہٹ گئے اور مجرموں کی طرح سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔

”نام کیا ہے تم دونوں کا؟“ اپنے آدمیوں کو کنارے لگانے کے بعد نادر دادا ان دونوں کے مقابل آ کر کھڑا ہوا اور انہیں بغور دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”میں جگدیش ہوں اور یہ میرا کزن وریندر۔ ہم یہاں دلی میں گھومنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔“ شہریار نے عام سے لہجے میں اس کے سوال کا جواب دیا۔ ویسے وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ نادر دادا نامی یہ بندہ یقینی طور پر کسی بڑے گینگ سے تعلق رکھتا ہے یا پھر اسے کسی بڑے آدمی کی پشت پناہی حاصل ہے اس لیے لوگ اس سے اتنے خوف زدہ ہیں کہ سرعام ایک لڑکی سے ایسی چھیڑ چھاڑ کرنے پر کسی نے اسے یا اس کے آدمیوں کو روکنے کی کوشش نہیں کی اور یہ صورت حال ایک طرح سے ان کے لیے مناسب نہیں تھی۔

وہ یہاں ایک خاص مشن پر آئے تھے اور آتے ہی کسی بڑے جھگڑے سے بھڑ جانے کی وجہ سے بڑی مشکلات میں مبتلا ہو سکتے تھے۔ لیکن ظاہر ہے اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا اور اسے تدبر سے اس صورت حال سے نمٹنا تھا اس لیے نادر دادا سے گفتگو کی ذمے داری خود سنبھال لی تھی۔

”یہ تو میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔ اگر دلی کے رہنے والے ہوتے تو میرے آدمیوں کے مقابلے پر آنے کی ہمت کبھی نہیں کرتے۔“ نادر دادا نے مسکرا کر اسے جواب دیا پھر ایک بار دوبارہ ان دونوں کو سر سے پیر تک دیکھنے کے بعد بولا۔ ”تمہاری جی داری من کو بہت بھائی ہے۔ اس جی داری کے صدقے ہی میں تمہاری جان بخشی کر رہا ہوں ورنہ یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی بندہ نادر دادا کے بندوں سے پنگا لے اور اسے اپنے ہاتھ پیروں پر واپس جانا نصیب ہو۔ تم دونوں خوش قسمت ہو۔ پتا نہیں تم میں کیا بات ہے کہ تمہیں معاف کر دینے کا جی چاہتا ہے۔“

”تھینک یو سو مچ دادا! آپ کے برتاؤ سے پتا لگ گیا ہے کہ آپ سچ مچ بہادر آدمی ہو کیونکہ ایک بہادر ہی دوسرے بہادر کو ایسے سراہتا ہے۔“ کسی مشکل میں پڑے بغیر آسانی سے مسئلہ نمٹتا دیکھ کر شہریار نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ اس شخص کو اپنی کسی بات سے طیش دلانے کے بجائے مزید ٹھنڈا کر دیا جائے ورنہ کچھ دیر قبل اس نے جس طرح ایک کمزور لڑکی پر ہاتھ ڈالا تھا، وہ کسی طور ایک بہادر کا شیوہ نہیں ہوتا۔

”ہمارے ہاں بہادروں کی بڑی قدر کی جاتی ہے۔ اگر تمہارا ہمارے ساتھ شامل ہونے کا من کرے تو کسی سے بھی پوچھ لینا کہ نادر دادا کا اڈا کہاں ہے؟ وہ سیدھا تمہیں ہمارے پاس پہنچا دے گا۔“ اس نے بڑی فراخ دلی سے پیشکش کی جس کے جواب میں ظاہر ہے شہریار کو خاموشی ہی اختیار کرنی تھی۔ اسے خاموش دیکھ کر نادر دادا نے جواب کا انتظار نہیں کیا اور اپنے آدمیوں کو اشارہ کرتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ منیجر بھی بھاگتا ہوا اس کے پیچھے گیا اور دروازے کے قریب اسے روک کر اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کچھ کہنے لگا۔ جواب میں نادر نے بھی کچھ کہا جس کے بعد منیجر کی اتری ہوئی صورت پر ذرا رونق دوڑی اور اس نے خود آگے بڑھ کر نادر دادا اور اس کے آدمیوں کے لیے بڑے احترام سے دروازہ کھولا۔ ان تینوں کے باہر نکل جانے کے بعد وہ پلٹ کر واپس آیا تو اس کے چہرے پر حیرت نظر آ رہی تھی۔

”یہ تو چمتکار ہو گیا۔ دادا نے نہ صرف آپ دونوں کو شما

کر دیا بلکہ یہ بھی کہا کہ وہ میرے ہوٹل کا ہونے والا سارا نقصان خود بھرے گا۔" ان دونوں کے قریب کھڑے ہوئے ہوئے اس نے بے نیفنی سے بتایا۔

"چلو، یہ تو تمہارے لیے اچھا ہو گیا۔ اب ایسا ہے کہ ہم دونوں چلتے ہیں۔ تم اس بے چاری ویٹریس کی ڈریسنگ وغیرہ کروا کر اسے اس کے گھر پہنچانے کا بندوبست کرو۔" منیجر کو جواب دینے کی ذمے داری بھی شہریار نے ہی سنبھالی۔ اصل میں وہ سلو کے لاابالی پن اور بے باکی سے ذرا خائف رہتا تھا اس لیے عموماً نازک مواقع پر گفت و شنید کی ذمے داری از خود سنبھال لیتا تھا۔

"سوری سر! میرے لوگوں میں سے کوئی یہ ہمت نہیں کر سکے گا کہ دادا کو ناخوش کرنے والی عورت کی مدد کر سکے۔ ہاں آپ کی بات الگ ہے۔ آپ میں ہمت تھی تو ہی آپ نے دادا کے آدمیوں پر ہاتھ ڈالا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دادا نے خود آپ کے لیے معافی کا اعلان کیا ہے۔ اس لیے میرے نزدیک اسے اس کے گھر تک پہنچانے کے لیے آپ سے بہتر کوئی نہیں ہوگا۔" منیجر کا جواب سن کر ان دونوں نے ایک دوسرے کو بے بسی سے دیکھا۔ یہاں ان کے ساتھ الٹی آنتیں گلے پڑیں والا معاملہ ہو گیا تھا لیکن وہ انکار بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اس سارے جھگڑے کا سبب بننے والی ویٹریس ان کے سامنے تھی۔ اپنی نیم عریانی کو چھپانے کی کوشش کرتی وہ خوب صورت لڑکی زخمی ہونے کے ساتھ ساتھ اس وقت سخت ہراساں بھی تھی اور ضروری تھا کہ اس مشکل گھڑی میں کوئی اسے سہارا دے۔ ان دونوں سے ہی انکار نہیں ہو سکا۔ ویسے بھی جب وہ اس کی خاطر غنڈوں سے بھڑ جانے کی خطرناک حرکت کر چکے تھے تو پھر اسے اس کے گھر تک پہنچا دینا تو نسبتاً کم خطرناک کام تھا۔

"اوکے، ہم یہ کام کر دیتے ہیں۔" شہریار نے منیجر پر اپنی رضامندی ظاہر کر دی اور سلو کو اشارہ کیا تو وہ ایک میز پوش کھینچ کر اتارتے ہوئے ستون کے ساتھ نڈھال بیٹھی ویٹریس کی طرف بڑھ گیا۔

"یہ کچھ روپے ہیں۔ اس کی مرہم پٹی کروانے کے کام آئیں گے۔" منیجر نے اپنا پرس نکال کر اس میں سے کچھ نوٹ نکالتے ہوئے شہریار کی طرف بڑھائے۔

"نو تھینکس، اس کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے انکار کر دیا اور سلو کی طرف بڑھ گیا جو میز پوش سے لڑکی کی ستر پوشی کرنے کے بعد اسے سہارا دے کر کھڑا کر چکا تھا۔ شہریار نے اسے دوسری طرف سے سہارا دیا اور پھر وہ دونوں اسے لے کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ ہوٹل سے باہر نکل کر انہوں نے ایک آٹو رکشا روکا اور لڑکی سے اپنے گھر کا پتا بتانے کو کہا۔ لڑکی کے پتا بتانے کے بعد آٹو والے سے کرائے کا معاملہ طے ہوا اور وہ اس طرح لڑکی کے گھر کی طرف روانہ ہوئے کہ لڑکی درمیان میں بیٹھی تھی اور وہ دونوں اس کے دائیں بائیں تھے۔

راستے بھر ان میں سے کسی نے کچھ نہیں کہا البتہ شہریار نے ایک بار راستے میں کسی کلینک یا اسپتال پر رک جانے کے بارے میں ضرور استفسار کیا لیکن لڑکی نے [illegible] انکار کر دیا۔ اس نے بھی اصرار نہیں کیا۔ نادر دادا کے غنڈوں کے ہاتھوں بننے والی درگت کے نتیجے میں لڑکی کا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔ ماتھے پر کافی بڑا سا گومڑا ابھر آیا تھا اور اس کے علاوہ بھی کئی نیل اور خراشیں نظر آ رہی تھیں۔ [illegible] ستر ادھ اس کا لباس بھی پھٹا ہوا تھا۔ وہ لوگ اسے لے کر کسی اسپتال جاتے تو انہیں جواب دینا پڑتا کہ لڑکی کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ پولیس کیس ہونے کی وجہ سے اسپتال کی انتظامیہ پولیس کی آمد سے قبل اسے ٹریٹمنٹ دینے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتی اور پولیس سے سامنا کرنا ان کے اپنے حق میں مناسب نہ ہوتا، وہ بھی اس صورت میں کہ کسی دادا ٹائپ کے بندے سے ٹکر لے چکے تھے اور ان کے پاس شناختی دستاویزات تک نہیں تھیں۔

مطلوبہ پتے پر پہنچ کر لڑکی نے رکشا رکوایا اور وہ لوگ نیچے اتر آئے۔ رکشے والے کو کرایہ دے کر فارغ کرنے تک لڑکی دروازے پر دستک دے چکی تھی۔ وہ نچلے طبقے کا ایک محلہ تھا جہاں چھوٹے چھوٹے بے رونق و بدنما گھر بنے ہوئے تھے۔ لڑکی نے دروازے پر کئی دستکیں دیں تب کہیں جا کر دروازہ کھلا۔ دروازہ کھولنے والا شخص عجیب و غریب تھا۔ اس نے چوخانے والی لنگی پر میلی سی بنیان پہن رکھی تھی جو کئی جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ سر کے بال اور داڑھی بے حد الجھی ہوئی تھی اور اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ اسے نہائے ہوئے کئی ہفتے یا پھر شاید مہینے گزر گئے تھے۔ وہ دروازے پر نمودار ہوا تو بدبو کا ایک بھبکا سا محسوس ہوا۔

"تو کیوں بے وقت آ گئی میری نیند خراب کرنے؟"

اس نے نہ تو لڑکی کے ابتر حلیے کی طرف توجہ دی اور نہ ہی اس کے پیچھے کھڑے دو اجنبیوں کی طرف۔ بس اسے دیکھ کر بڑبڑایا اور جھومتا ہوا واپس پلٹ گیا۔

"آپ دونوں اندر آ جائیں۔" لڑکی نے اس کی طرف دھیان دیے بغیر ان سے کہا۔

"میرے خیال میں پہلے میں آپ کے لیے کسی میڈیکل اسٹور سے کچھ میڈیسن اور بینڈیج وغیرہ کا سامان لے آؤں۔" شہریار اندر جاتے ہوئے ذرا سا ہچکچایا۔

"میرے پاس فرسٹ ایڈ باکس موجود ہے اس لیے اس تکلیف کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن تکلیف کے باعث ہونٹوں سے سسکی سی نکل گئی۔

"پھر تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آپ کے گھر والے زخموں کی صفائی اور ڈریسنگ میں آپ کی مدد کر دیں گے۔ ساتھ میں آپ کوئی پین کلر لے لیجیے گا، درد سے آرام آ جائے گا۔ میرے اندازے کے مطابق تو آپ کو کوئی بھی بہت زیادہ گہری چوٹ نہیں لگی ہے۔ گھر پر ہی چند دن پابندی سے دوائیں لینے کے ساتھ آرام کرتی رہیں گی تو طبیعت سیٹ ہو جائے گی۔ البتہ اگر آپ محسوس کریں کہ کوئی اندرونی گھاؤ ہے تو اسپتال چلی جائیے گا۔" شہریار اب وہیں سے واپس پلٹنے کے موڈ میں تھا۔

"میرے کوئی گھر والے نہیں ہیں۔ صرف ایک گھر والا ہے جو اتنے ہوش میں نہیں ہوگا کہ میری مرہم پٹی کروانے میں مدد کرے یا مجھ سے ہمدردی کرے۔" وہ بہت آہستہ سے ہی بولی تھی لیکن اس کے لہجے میں آنسوؤں کی نمی اور کچھ تلخی سی محسوس ہوئی۔ البتہ وہ دونوں اس انکشاف پر چونک سے گئے تھے کہ اتنی کم عمر اور کمسن سی نظر آنے والی وہ لڑکی شادی شدہ تھی اور بیوی بھی اس عجیب الخلقت شخص کی تھی جسے ایک نظر دیکھنے پر ہی انہیں گھن سی محسوس ہوئی تھی۔ سلو پر تو اس انکشاف کا زیادہ ہی اثر ہوا اور اس نے زیرلب "خود کی ماں اتنا بڑا دھوکا" کہتے ہوئے ہلکی سی سیٹی بھی بجا ڈالی تھی۔ البتہ شہریار اس انکشاف سے اتنا زیادہ متاثر نہیں ہوا تھا چنانچہ بردباری سے بولا۔

"اوکے، ہم اندر چل کر آپ کی ہیلپ کر دیتے ہیں۔"

"تھینک یو سو مچ۔" اس نے شکریہ ادا کیا اور خود اندر داخل ہو کر انہیں بھی اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ دو کمروں پر مشتمل چھوٹا سا گھر تھا جس کے در و دیوار سے غربت ٹپک رہی تھی۔ لڑکی انہیں لے کر ایک کمرے میں داخل ہو گئی۔

"آپ لوگ یہاں بیٹھیں، میں کپڑے چینج کر لوں پھر فرسٹ ایڈ باکس لے کر آتی ہوں۔" انہیں وہاں بٹھا کر وہ خود کمرے سے باہر نکل گئی۔ چلتے ہوئے اس کے پیر لڑکھڑا رہے تھے لیکن اس نے ہمت کر کے خود کو اس حد تک سنبھال لیا تھا کہ کسی کے سہارے کے بغیر چل سکے۔ اس کے باہر نکلنے کے بعد انہوں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرے میں سستا سا مختصر فرنیچر رکھا تھا اور فرش پر ایک بے حد استعمال شدہ دری بچھی ہوئی تھی۔ البتہ صفائی خوب تھی۔ دیوار پر ایک لکڑی کا ریک بھی لگا ہوا تھا جس میں بہت سی کتابیں سجی تھیں۔ ان کتابوں میں سے زیادہ تر انگریزی زبان میں تھیں اور مطالعے کا شوقین شہریار دور سے ان کے نام پڑھ کر ہی یہ بتا سکتا تھا کہ وہ خاصی مہنگی کتابیں ہیں۔ گھر کا عسرت زدہ ماحول اور لڑکی کے شوہر کو دیکھ کر یہ کتابیں یہاں اجنبی سی لگتی تھیں لیکن اجنبی تو وہ لڑکی بھی لگی تھی اس ماحول میں۔

"سوری، آپ لوگوں کو انتظار کرنا پڑا۔ میں اپنے زخموں کو دھونے کے لیے پانی گرم کر رہی تھی تو سوچا چائے بھی بنا لوں۔" کچھ دیر بعد وہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی تو نہ صرف لباس بدل چکی تھی بلکہ چہرہ دھو کر زخموں پر مرہم وغیرہ بھی لگا لیا تھا۔

"آپ نے چائے کا تکلف کیوں کیا؟ ہم تو آپ کی مدد کے خیال سے اندر آ گئے تھے اور آپ اس تکلیف میں پڑ گئیں۔" اسے چائے کی ٹرے میز پر رکھتے دیکھ کر شہریار نے بے ساختہ ہی ٹوکا۔

"تکلیف کی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ نے میرے لیے خود کو اتنے بڑے خطرے میں ڈالا تو کیا میں آپ کے لیے چائے بھی نہیں بنا سکتی تھی۔" اس نے دھیرے سے کہتے ہوئے چائے کی پیالیاں ان دونوں کی طرف بڑھائیں۔ پیالیاں نفیس اور صاف ستھری تھیں اور ان میں موجود چائے بھی خوش رنگ اور خوشبودار تھی۔ چکھنے پر ذائقہ بھی بہت اچھا لگا۔

"فنٹاسٹک... میں نے کہا تھا نا کہ اصل کمال آپ کے ہاتھوں کا ہے۔ اب دیکھیں، یہ چائے ہوٹل والوں کے کسی شیف نے تیار نہیں کی پھر بھی کتنے مزے کی لگ رہی ہے۔" پہلا گھونٹ بھرتے ہی سلو نے شوخی سے تبصرہ کیا جس پر وہ ہولے سے ہنسی پھر ہلکا سا کراہ کر چپ ہو گئی۔ لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد اس نے ایک بار پھر خود ہی گفتگو کا آغاز کیا۔

"کیا میں اپنے محسنوں کے نام جان سکتی ہوں؟"

"کیوں نہیں، میں ورِیندر ہوں اور یہ میرے دوست جگدیش ہیں۔ ہم دلی گھومنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔" سلو نے فوراً اس کے سوال کا جواب دیا۔ وہ خاصا سمجھ دار تھا اور یہ اندازہ لگا کر ہی منہ کھولتا تھا کہ کہاں اس کے بولنے پر شہریار کو اعتراض نہیں ہوگا۔

"میرا نام عائشہ ہے لیکن یہاں زیادہ تر لوگ مجھے آشا کہتے ہیں۔" اس نے بھی اپنا تعارف کروایا پھر مزید بولی۔ "مجھے افسوس ہے کہ آپ لوگ گھومنے کے لیے نکلے ہیں اور

میری ہمدردی میں خود اپنے لیے اتنی بڑی مصیبت مول لے بیٹھے ہیں۔"

"جانے دیں۔ وہ معاملہ تو اب ختم ہو گیا۔ آپ نے دیکھا نہیں تھا کہ نادر دادا نے ہم سے کیا کہا تھا۔" سلو نے کان پر سے مکھی اڑانے والے انداز میں اسے جواب دیا۔

"اس غلط فہمی میں مت رہیے گا۔ میں نے اپنی ڈریسنگ کے بہانے آپ دونوں کو اندر ہی اس لیے بلایا تھا کہ آپ کو خطرے سے آگاہ کر سکوں۔ وہ خطرناک اور عیار آدمی ہے۔ اس پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے آدمیوں کو آپ دونوں کے ہاتھوں ہزیمت اٹھانی پڑی ہے، یہ اس کے لیے کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اب تک یہ بات نہ جانے کہاں سے کہاں تک پھیل گئی ہو گی اور مجھے نہیں لگتا کہ اس نے آپ لوگوں کی بہادری سے متاثر ہو جانے کا جو ڈراما کیا ہے، اس میں کوئی حقیقت بھی ہے۔ وہ صرف وہاں سے اپنی بچی کچی عزت بچا کر نکلا ہے اور گرنے کے باوجود اپنی ٹانگ اونچی رکھنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اس ڈرامے کے بعد وہ پوری کوشش کرے گا کہ آپ لوگ یہاں سے بچ کر نہ نکلنے پائیں۔ وہ نہایت سفاکی سے آپ کو عبرت کا نشان بنا کر پورے دہلی کو یہ خاموش پیغام دینے کی کوشش کرے گا کہ نادر دادا کے آدمیوں سے بھڑنے والوں کا انجام کسی طور اچھا نہیں ہو سکتا۔" وہ جو کچھ انہیں بتا رہی تھی، وہ ان کے لیے تشویش ناک تھا۔ اگر وہ اس طرح کے مسائل میں پھنس جاتے تو اپنے اصل مشن پر کام کرنا مشکل ہو جاتا۔

"جب تمہیں معلوم تھا کہ وہ اتنے خطرناک لوگ ہیں تو کیا ضرورت تھی نادر دادا پر ہاتھ اٹھانے کی؟" سلو نے کچھ جھلا کر اس سے یہ سوال کیا کیونکہ بہرحال معاملے کے اس حد تک جانے میں عائشہ کے تھپڑ کا ہی بہت زیادہ ہاتھ تھا۔

"میں بکاؤ مال نہیں ہوں جو اس جیسا غنڈا موالی سرِ راہ میرا ہاتھ پکڑے اور کوئی بھی بے ہودہ فرمائش کرے تو میں نظرانداز کر دوں۔ اس گندے آدمی کی بات ماننے سے یہ بہت بہتر تھا کہ میں اس کے آدمیوں کے ہاتھوں اپنی جان سے چلی جاتی۔ کم از کم لوگ اس بات کے تو گواہ رہتے کہ میں نے اپنی عزت بچانے کی کوشش میں اپنی جان دے دی۔" اس نے غصے سے سلو کی بات کا جواب دیا۔

"اونہہ عزت... تمہارے خیال میں وہ شخص اب تمہیں بخش دے گا؟ تمہارے کہنے کے مطابق وہ ہم دونوں کی جان کا دشمن بن چکا ہو گا تو کیا فساد کی اصل جڑ کو چھوڑ دے گا؟" سلو نے اس کے غصے سے متاثر ہوئے بغیر دو... جواب دیا۔ شہریار البتہ خاموشی سے اس گفتگو کو سن رہا تھا اور سن کر اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس مصیبت سے بچنے کی کیا صورت نکل سکتی ہے۔

"میں اس کے لیے تر نوالہ ثابت نہیں ہوں گی۔ یہ دیکھو... یہ اب ہمیشہ میرے ساتھ رہے گا۔ اگر اب نادر دادا کے آدمی مجھ سے ٹکرائے تو صحیح سلامت بچ کر نہیں جا سکیں گے اور بالفرض میں ان سے مقابلہ نہیں کر سکی تو ایک گولی اپنے دل میں اتار کر اس جسم کو ٹھنڈا کر دوں گی۔" اس نے اپنے لباس میں سے ایک چھوٹا سا لیڈیز پسٹل نکالا تھا اور اسے لہراتے ہوئے اپنے عزائم کا اظہار کیا۔ یہ اظہار کرتے ہوئے اس کے لہجے میں چٹانوں کی سی سختی تھی اور صاف لگ رہا تھا کہ وہ جو کہہ رہی ہے اس پر عمل کرنے کی بھی جرأت رکھتی ہے۔ ویسے بھی اس کی جرأت مندی کا مظاہرہ وہ کچھ دیر قبل ہوٹل میں دیکھ ہی چکے تھے۔ یہ جانتے بوجھتے کہ اس کے مقابل دہلی کا نامی گرامی غنڈا ہے۔ اگر اس نے اس پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت کی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ وہ واقعی فطرتاً دلیر لڑکی ہے اور اتنے نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والی کی یہ بے باکی بڑی حیرت انگیز تھی۔ لیکن وہ تو تھی ہی پوری کی پوری حیرت انگیز چیز۔ اس کی بول چال اور نشست و برخاست کا انداز دیکھ کر یقین کرنے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس پسماندہ سے محلے میں رہتی ہو گی اور اس میلے کچیلے آدمی کی بیوی ہو گی جسے انہوں نے کچھ دیر پہلے دروازے پر دیکھا تھا۔

"آپ تو مجھے کوئی اونچی شے لگتی ہو میڈم! یہ اتنا مہنگا پسٹل آپ کے پاس کہاں سے آیا؟" سلو اسلحہ شناس تھا اس لیے اس کے ہاتھ میں موجود پسٹل کو دیکھ کر اندازہ لگایا کہ وہ کافی قیمتی ہے چنانچہ مشکوک لہجے میں اس سے پوچھنے لگا۔

"یہ مجھے میرے ایکس ہزبینڈ نے دلایا تھا۔ وہ ایک مل اونر تھے اور ان کا خیال تھا کہ چونکہ میں قیمتی زیورات پہن کر اکیلی گاڑی ڈرائیو کرتی ہوں تو میرے پاس اپنی سیفٹی کے لیے کچھ ہونا چاہیے۔" اس نے بے نیازی سے جواب دیا لیکن وہ لوگ تو حیرت میں مبتلا ہو گئے۔ وہ انہیں بتا رہی تھی کہ اس کا سابقہ شوہر ایک مل اونر تھا اور اب وہ ایک ابتر حلیے والے آدمی کے ساتھ اس تنگ و تاریک مکان میں بسی ہوئی تھی۔ یقینی طور پر اتنے بڑے انقلاب کے پیچھے کوئی بہت بڑی وجہ ہی رہی ہو گی اور ان کے دلوں میں خواہ مخواہ وہ وجہ جاننے کا تجسس جاگ اٹھا تھا۔

"تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ میرا باپ بھی مل اونر تھا اور اس نے اپنے لیے مل اونر داماد کا ہی انتخاب کیا تھا۔" اس نے اسی بے نیازی سے جواب دیا جو شاید اپنے جذبات پر پردہ ڈالنے کے لیے اختیار کر رکھی تھی۔ اس کے ان انکشافات سے البتہ اتنا ضرور ہوا تھا کہ وہ جو اس الجھن میں تھے کہ اس کی شخصیت اس ماحول سے لگا نہیں کھاتی، وہ دور ہو گئی تھی لیکن ایک نئی الجھن پیدا ہو گئی تھی کہ آخر وہ عرش سے فرش پر کیسے اور کیونکر پہنچی؟ یہ الجھن سوال بن کر ہونٹوں پر بھی آئی جسے سن کر وہ پہلے تلخی سے مسکرائی اور پھر نہایت روانی سے بتانے لگی۔

"میری زندگی کی کہانی وہی عام سی ہے جو ہمیشہ سے ہمارے معاشرے میں دہرائی جاتی رہی ہے۔ میں اپنے پاپا کی لاڈلی بیٹی تھی اور ساتھ ہی ذہین بھی۔ میں نے ماس کمیونیکیشن میں ماسٹر کی ڈگری لی اور اپنی چلبلی فطرت کی تسکین کے لیے ایک نیوز پیپر میں جاب کرنے لگی۔ وہیں ایک شخص وجے بھی تھا۔ میری ہی طرح ذہین اور خوب صورت۔ ہم دونوں کو پتا بھی نہیں چلا اور ساتھ کام کرتے کرتے ہم ساری زندگی ساتھ بتانے کے خواب دیکھنے لگے۔ محبت کے نشے نے ہمیں اتنا سرشار کیا کہ ہم بھول گئے کہ ہمارے درمیان مذہب اور کلاس کی دیواریں کھڑی ہوئی ہیں۔ خیال آیا تو وجے نے وعدہ کیا کہ وہ میری خاطر اپنا مذہب بدل لے گا۔ اس کے اس وعدے کے سہارے میں نے پاپا سے اس کے بارے میں بات کرنے کی جرأت کر لی۔ وہ ہمیشہ میری ہر فرمائش پوری کرتے رہے تھے اس لیے مجھے یقین تھا کہ اس خواہش کو بھی وہ نہیں ٹالیں گے۔ لیکن میرا خیال غلط ثابت ہوا اور پاپا نے فیصلہ سنایا کہ مذہب تبدیل کر لینے کے باوجود وجے جیسا ٹٹ پونجیا انہیں داماد کے طور پر قبول نہیں ہو گا۔

"میں نے بہت کوشش کی، خودکشی کی دھمکی تک دے کر دیکھ لی لیکن وہ راضی نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے زمانہ قدیم کے کسی بادشاہ کی طرح مجھے میرے کمرے میں نظربند کرنے کے بعد میرا رشتہ اپنے ایک دوست کے بیٹے سے طے کر دیا۔ میں نے انہیں دھمکی دی کہ میں عین نکاح کے وقت انکار کر دوں گی۔ جواب میں انہوں نے مجھے وہی فرسودہ دھمکی دی کہ اگر میں نے ایسا کیا تو وہ اسی وقت میری ماں کو طلاق دے دیں گے۔ میں جانتی تھی کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ انہیں میری ماں سے بہت محبت تھی اور وہ ایک دن بھی ان کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے لہٰذا میں اپنے ارادے میں اٹل تھی۔ میرے باپ ہونے کی وجہ سے وہ بھی میری رگ رگ کو پہچانتے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ ان کی دھمکی کا مجھ پر اثر نہیں ہو گا اس لیے انہوں نے مجھے پریشرائز کرنے کے لیے ایک ایسی حرکت کی جس کی مجھے ان سے بالکل بھی امید نہیں تھی۔ انہوں نے شادی سے صرف چار دن پہلے وجے کی بہن کو اغوا کروا لیا۔ مایوں والے دن جب میری چھوٹی بہن کارڈلیس لے کر میرے کمرے میں آئی کہ وجے مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتا ہے تو میں حیران رہ گئی کہ میرے گھر کا کوئی فرد وجے سے میری بات کیسے کروا سکتا ہے۔ اسی حیرت میں مبتلا جب میں نے بہن سے کارڈلیس لے کر ہیلو کہا تو وجے میری آواز سن کر رو پڑا اور بولا عائشہ میں ہاتھ جوڑ کر تم سے بنتی کرتا ہوں کہ اپنے پاپا کی بات مان لو اور خاموشی سے یہ شادی کر لو۔ ظاہر ہے میں حیران رہ گئی کہ وجے یہ سب کیوں کہہ رہا ہے؟ میں نے اس سے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ اس کی بہن کو اغوا کر لیا گیا ہے اور باعزت رہائی کی شرط تمہاری شادی کے لیے ہاں رکھی گئی ہے۔ اس جواب سے صاف ظاہر تھا کہ اس کام کے پیچھے پاپا کا ہاتھ تھا... پاپا اتنے بااختیار آدمی تھے کہ وجے جیسا نوآموز صحافی جو ابھی اپنا کیریئر بنانے کی جدوجہد کر رہا تھا، ان سے قطعی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ صحافی برادری میں سے بھی کوئی ان کے خلاف اس کا ساتھ نہیں دیتا چنانچہ صرف وجے کی محبت میں، میں نے پاپا کے سامنے ہار مان لی اور ساجد کی بیوی بن کر اس کے گھر چلی گئی۔ لیکن اس عہد کے ساتھ کہ جس گھر سے میری ڈولی اٹھی ہے، اب وہاں میرا جنازہ بھی نہیں جائے گا۔

"شادی کے بعد میں ایک بار بھی پاپا سے ملنے نہیں گئی۔ یہاں تک کہ رسم کے مطابق میری ماں، بہن اور بھابی مجھے میکے لے جانے کے لیے آئیں تو میں نے انکار کر دیا۔ ساجد میری اس حرکت پر بہت حیران ہوئے لیکن مجھے اپنے فیصلے میں اٹل دیکھ کر انہوں نے اصرار نہیں کیا۔ شادی کے بعد میں نے خود کو ایک اچھی بیوی اور بہو ثابت کیا اور اپنے ساتھ کی گئی پاپا کی زیادتی کا بدلہ ساجد کی فیملی سے لینے کی کوشش نہیں کی۔ شادی کو پورا سال بھی نہیں ہوا تھا کہ اللہ نے ہمیں ایک بیٹی بھی دے دی۔ دیکھنے میں، میں خوش باش تھی اور ایک آئیڈیل زندگی گزار رہی تھی لیکن میرا اندر میری اس زندگی سے خوش نہیں تھا۔ میں مہنگے کپڑوں، اچھے کھانوں اور ہیرے جواہرات وغیرہ سے خوش ہونے والی لڑکی ہی نہیں تھی۔ مجھے زندگی میں تھرل اور ایڈونچر اچھا لگتا تھا اور یقین تھا

کہ اگر پاپا وجے سے میری شادی کر دیتے تو اس کے ساتھ رہ کر میں وہی زندگی گزارتی جو مجھے پسند تھی۔ لیکن انہوں نے اپنی ضد پوری کرنے کے لیے مجھے اتنی بُری طرح بلیک میل کیا تھا کہ میرا دل ان سے خراب ہو گیا تھا۔

''پورے پانچ سال تک میں ساجد کے ساتھ ایک اَن چاہی زندگی گزارتی رہی اور خود کو خوش ظاہر کرنے کی اداکاری بھی کرتی رہی لیکن پھر میری زندگی میں ایک انقلاب آیا۔ کمال، ساجد کا چچازاد بھائی تھا اور نشے کی لت میں مبتلا تھا۔ والدین جب اس کا علاج کروا کروا کر ہار گئے تو انہوں نے میرے سسر سے مدد کی درخواست کی۔ میرے سسر اسے اپنے ساتھ لے کر گھر آ گئے اور یہاں اس کا علاج ہونے لگا۔ گھر کی بہو کی حیثیت سے مہمان کا خیال رکھنا یوں بھی میرا فرض تھا۔ پھر کمال کا کیس بھی ایسا تھا کہ مجھے لگا میری بے مقصد زندگی کو کوئی مقصد مل گیا ہو۔ کھانے پینے، گھومنے پھرنے کے سوا بھی تو زندگی کچھ ہوتی ہے نا؟ بس میں نے ٹھان لی کہ کمال کو نشے کی لت سے نکالنا ہے۔ میری توجہ اور نصیحتوں کا اس پر اچھا اثر ہوا اور وہ کسی حد تک اپنے علاج کے لیے تعاون کرنے لگا لیکن ایسا نہیں تھا کہ وہ بالکل ہی نشے کو بھول چکا ہو۔ ایک دن میں نے اس پر غصہ کیا کہ وہ دن کے وقت تو نشے کو ہاتھ نہیں لگاتا لیکن رات کو جب میں اس کی نگرانی نہیں کر سکتی تو نشہ کرنے لگتا ہے۔ اس نے مجھے جواب دیا کہ اس کا حل یہ ہے کہ میں دن رات اس کے ساتھ رہنے لگوں۔ اس وقت تو میں نے اس کی بات کو نظر انداز کر دیا لیکن بعد میں وہ چلتے پھرتے یہی فرمائش کرنے لگا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر اسے میرا ساتھ مل گیا تو وہ خود کو سدھار لے گا۔ میرا دماغ بھی ایک دن پھر گیا۔ میں نے سوچا کہ میں ساجد کے گھر رہ کر جو بے مقصد زندگی گزار رہی ہوں اس میں میرے لیے کون سا سکون ہے۔ اگر میں کمال کی بات مان لیتی ہوں تو میرے کریڈٹ پر ایک کارنامہ تو ہوگا کہ میں نے ایک شخص کی زندگی کو بچا لیا۔ بس پھر سب کچھ بدل گیا اور میں یہاں پہنچ گئی۔'' وہ اپنی داستانِ زندگی سنا رہی تھی اور وہ سانس روکے سنتے جا رہے تھے۔

''یہ سب آسانی سے تو نہیں ہوا ہوگا... تمہیں خاصی مشکل اٹھانی پڑی ہوگی؟''

''وہ تو اٹھانی پڑی تھی۔ جب میں نے ساجد سے طلاق مانگی تو ہر طرف بھونچال آ گیا۔ سب لوگ مجھے سمجھانے لگے کہ میں ایسی غلطی نہ کروں یہاں تک کہ پاپا جن سے میری برسوں سے بات چیت بند تھی، وہ بھی دوڑے آئے لیکن میں اپنے مطالبے سے پیچھے نہیں ہٹی۔ پاپا نے اپنے طور پر پتا لگانے کی کوشش کی کہ کہیں میرا وجے سے دوبارہ رابطہ تو نہیں ہو گیا ہے لیکن ظاہر ہے انہیں ایسی کوئی سن گن نہیں ملی۔ ان گزرے پانچ سالوں میں وجے نہ صرف شادی کر چکا تھا بلکہ پرنٹ میڈیا سے الیکٹرانک میڈیا کا سفر بھی طے کر لیا تھا اور ایک چینل سے معاہدے کے تحت دبئی میں رہ کر ان کے لیے کام کر رہا تھا۔

''میرے گھر والوں سمیت سب نے بہت کوشش کی کہ طلاق مانگنے کی وجہ جان سکیں لیکن اس بار میں نے کمال کا نام کسی کو بتانے کی غلطی نہیں کی ورنہ شاید پاپا مجھے بلیک میل کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیتے۔ میں نے اپنی چار سال کی بیٹی کو ساتھ لیا اور سسرال کا گھر چھوڑ کر ایک کرائے کے مکان میں رہنے لگی۔ جب سب نے دیکھا کہ میں اپنی ضد سے پیچھے ہٹنے والی نہیں ہوں تو میرے سسر نے ساجد کو سمجھایا کہ جو عورت تمہارے ساتھ رہنے پر راضی نہیں ہے، اس کے ساتھ زبردستی کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تم اسے طلاق دے دو۔ یوں مجھے طلاق ہو گئی۔ عدت کا عرصہ میں نے کرائے کے مکان میں محدود رہ کر گزارا۔ میرے پاس اتنی رقم موجود تھی کہ گزر بسر کے لیے کوئی پریشانی نہیں تھی پھر میں اپنے ساتھ پاپا کی طرف سے جہیز میں دیا گیا زیور بھی لے کر آئی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ زیور بیچ کر کمال کا علاج کروا دوں گی اور بعد میں زندگی کی گاڑی چلانے کے لیے کہیں ملازمت کر لوں گی۔ کمال ٹھیک ہو جاتا تو وہ بھی کچھ نہ کچھ کر سکتا تھا لیکن میری ساری پلاننگ دھری کی دھری رہ گئی۔ میں نے احتیاط کے پیشِ نظر عدت کی مدت میں کمال سے رابطہ نہیں رکھا تھا۔ بعد میں وہ مجھ سے ملا تو پہلے سے بھی بری حالت میں تھا۔ میرے پیچھے کسی نے اس کے علاج پر توجہ نہیں دی اور وہ آزادی پا کر پہلے سے زیادہ شدت سے نشہ کرنے لگا۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر میں نے سر پیٹ لیا لیکن کیا ہو سکتا تھا۔ بس ہمت کی اور اسے علاج کے لیے اسپتال میں ایڈمٹ کروا دیا۔ اچھی خاصی رقم خرچ کرنے کے بعد وہ کچھ سنبھلا تو اس نے شادی کے لیے رٹ لگا دی۔ میرا ارادہ تھا کہ وہ پوری طرح سیٹل ہو جائے پھر شادی کروں گی۔ میں خود بھی ان دنوں اپنی جاب میں ایڈجسٹ ہونے کی کوشش کر رہی تھی لیکن کمال نے رٹ لگا لی کہ میں اس سے فوری طور پر شادی کروں ورنہ وہ ڈاکٹرز سے تعاون کرنا چھوڑ دے گا۔ مجبوراً مجھے اس کی بات ماننی پڑی اور شادی ہوتے ہی نئے سرے سے پوری فیملی میں ایک ہنگامہ

اٹھ کھڑا ہوا۔ کسی نے فون پر تو کسی نے روبرو مجھے خوب باتیں سنائیں اور الزام لگایا کہ میں نے خود سے کم عمر شخص کی محبت میں مبتلا ہو کر اپنا بسا بسایا گھر توڑ ڈالا۔ میں اس الزام پر چپ رہی کیونکہ لاکھ کہتی کہ میں نے کمال کی محبت میں نہیں بلکہ ہمدردی میں اور اپنی زندگی کو با مقصد بنانے کے لیے یہ قدم اٹھایا ہے تو کوئی یقین نہیں کرتا کیونکہ ان میں سے کوئی میرا پوائنٹ آف ویو سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔ لگنے والے اس الزام کے ساتھ مجھے پاپا اور ساجد کے مزید دو بڑے الزام سہنے پڑے۔ پاپا کا خیال تھا کہ میں نے اس بات کو بھی بھلایا نہیں تھا کہ انہوں نے وجے سے میری شادی نہیں ہونے دی، اس لیے میں نے انتقاماً یہ حرکت کر کے ان کی عزت اچھالنے کا انتظام کیا۔ ادھر ساجد کو بھی کسی طرح وجے والے معاملے کی بھنک پڑ گئی تھی۔ ایک طرف میرے طلاق لے کر کمال سے شادی کرنے کا غم اور دوسری طرف یہ انکشاف کہ اس کی بیوی شادی سے پہلے کسی کی محبوبہ رہی تھی۔ وہ غصے سے دیوانہ ہو گیا اور اسی دیوانگی میں اس نے الزام لگایا کہ اس کے نکاح میں رہ کر میں نے جس بچی کو جنم دیا، وہ اس کی نہیں تھی بلکہ میں میکے سے اسے اپنی کوکھ میں ساتھ لے کر آئی تھی جب ہی تو شادی کے بعد اتنی جلدی بچی کی پیدائش ہو گئی تھی۔

''میں نے پاپا کا الزام خاموشی سے سہہ لیا تھا لیکن ساجد کے الزام پر سینہ تان کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی اور اسے چیلنج کیا کہ وہ ڈی این اے ٹیسٹ کروا کر اپنے اس الزام کو سچ ثابت کرے۔ سچ وہ بھی جانتا تھا اس لیے ٹیسٹ کے لیے راضی نہ تھا۔ میں نے کہا کہ اگر اس نے ٹیسٹ نہیں کروایا تو میڈیا پر اس سارے معاملے کو اٹھاؤں گی اور اسے مجبور کر دوں گی کہ وہ سب کے سامنے اپنا یہ الزام واپس لے۔ میری دھمکی نے اثر کیا اور اس نے اعتراف کیا کہ اس نے صرف غصے میں یہ بات کہی تھی ورنہ اسے ایسا کوئی شک نہیں تھا۔ میں پھر بھی پیچھے نہیں ہٹی اور کہا کہ ٹیسٹ تو تمہیں ہر صورت کروانا ہوگا تاکہ دوسروں کے دلوں میں شک کا جو بیج پڑ گیا ہے وہ جڑ سے اکھڑ سکے۔ اسے ٹیسٹ کروانا ہی پڑا کیونکہ میں بغیر ٹیسٹ کروائے اس کی جان چھوڑنے والی بھی نہیں تھی۔

''تم سمجھ سکتے ہو کہ ایک عورت کے لیے یہ کتنی اہم بات ہوتی ہے کہ اس کے کردار پر انگلی اٹھائی جائے اور یہاں تو معاملہ میری عزت سے بھی بڑھ کر تھا۔ آگے چل کر میری بچی کے لیے پرابلم کھڑی ہو سکتی تھیں۔ شک باقی رہتا تو لوگ

کہتے کیا معلوم واقعی وہ بچ حرام کی اولاد ہو۔ اسے کبھی اپنے خاندان اور معاشرے میں وہ مقام نہیں ملتا جو ایک نارمل بچے کا حق ہوتا ہے۔"

بڑی روانی سے اپنے کارنامے سناتی ہوئی وہ خاصی بلند حوصلہ عورت لگ رہی تھی جو دیکھنے میں تو بظاہر نازک سی تھی اور اپنی اصل عمر سے کئی سال چھوٹی بھی نظر آتی تھی لیکن مضبوطی میں مردوں کو بھی مات دیتی تھی۔ ایسی عورت اگر انجام کی پروا کیے بغیر نادر دادا پر ہاتھ اٹھا بیٹھی تھی تو کوئی عجیب بات نہیں تھی۔

"ساجد کے الزام سے چھٹکارا ملا تو کمال کے والد میدان میں اتر آئے۔ انہوں نے کمال کو اپنے بھائی کے گھر کی عصمت پر ہاتھ ڈالنے کے الزام میں جائداد سے عاق کر ڈالا۔ میرے لیے اس بات کی کوئی زیادہ اہمیت نہیں تھی بلکہ میں شروع سے ہی اس کی توقع کر رہی تھی لیکن کمال کو اپنے والد کے فیصلے سے دھچکا لگا۔ وہ ناز و نعم میں پلا تھا اور ہمیشہ ایسی ہی زندگی گزارنا چاہتا تھا اور ظاہر ہے میں اپنی جاب سے [illegible] وہ معیارِ زندگی قائم نہیں رکھ سکتی تھی جو کسی مل اونر یا بڑے تاجر کے گھر میں ہوتا ہے۔ اسے اپنے بستر سے لے کر کپڑوں، جوتوں، کھانوں اور برتنوں تک ہر چیز پر اعتراض تھا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ وہ یہ بات سمجھ سکے لیکن وہ سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوا اور اس غم کو بھلانے کے لیے ایک بار پھر شدت سے نشے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ شاید تمہیں اندازہ ہو کہ یہ علاج اتنا سستا نہیں ہوتا۔ میں پہلے ہی اس کی خاطر اپنے زیورات کا ایک بڑا حصہ بیچ چکی تھی جو بچا تھا، وہ میں نے بیٹی کے مستقبل کو محفوظ کرنے کے لیے بیچ ڈالا۔ اس کا بورڈنگ اسکول میں ایڈمیشن کروایا تاکہ وہ گھر کے ماحول سے دور رہے اور کمال کی نفرت کا نشانہ بننے سے بچ سکے۔ بچ جانے والی رقم سے میں نئے سرے سے کمال کا علاج شروع کروانا چاہتی تھی لیکن اس نے مجھ سے زیادہ تیزی دکھائی اور اپنی لت پوری کرنے کے لیے وہ رقم چوری کر ڈالی۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ میں جہاں جاب کر رہی تھی، وہاں کے کرتا دھرتا سے میری ان بن ہو گئی اور مجھے جاب سے نکال دیا گیا۔ جاب چھوٹنے پر میں نے حوصلہ نہیں ہارا اور سوچا کہ کہیں اور اپلائی کر دوں گی لیکن جب اس کام کے لیے گھر سے نکلنا چاہا تو انکشاف ہوا کہ میرے ڈاکومینٹس غائب ہیں۔ کمال سے پوچھا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن جب میں نے اپنی بہت ساری کتابیں بھی غائب دیکھیں تو سمجھ گئی کہ اس نے اپنا نشہ پورا کرنے کے لیے روپے حاصل کرنے کی خاطر وہ کتابیں بیچ ڈالی ہیں اور ان کے ساتھ ہی میرے ڈاکومینٹس بھی کسی طرح چلے گئے۔ میرے لیے ضروری ہو گیا کہ ان کی ڈپلیکیٹس نکلواؤں لیکن اس کی بھی کچھ REQUIRMENT ہوتی ہیں جو پوری کرنے میں میرے سامنے کچھ رکاوٹیں تھیں۔ میں سمجھ گئی کہ اس چکر میں لمبا عرصہ لگ سکتا ہے اور گھر چلانے کے ساتھ ساتھ بچی کے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے بھی مجھے رقم کی ضرورت ہوگی اس لیے سب سے پہلے کرائے کا وہ مکان چھوڑا جو یہاں کے مقابلے میں کافی بہتر علاقے میں تھا اور اسی حساب سے اس کا کرایہ بھی زیادہ تھا۔ مکان چھوڑنے کے ساتھ ہی میں نے وہاں سے تمام قیمتی چیزیں بھی بیچ ڈالیں۔ اس طرح [illegible] گئی اور بچنے والی رقم میں نے گھر میں رکھنے کے بجائے ایڈوانس فیس کے طور پر بچی کے اسکول میں جمع کروا دی۔ اب اس کی طرف سے مجھے یہ اطمینان ہے کہ اگر چند مہینے تک مجھے معقول ملازمت نہیں ملتی ہے تب بھی کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ یہ گھر میں نے بہت کم کرائے پر ضروری سامان سمیت حاصل کیا ہے اور ظاہر ہے کمال تو پہلے ہی ناخوش تھا، یہاں آنے پر اور بھی زیادہ ناراض ہے۔ میں اس کی ناراضی کو غلط نہیں سمجھتی لیکن فی الحال خود بھی مجبور ہوں۔ ایک سہیلی کے توسط سے نوادر میں [illegible] کی جاب حاصل کرنے کا مقصد یہ تھا کہ گھر کا دال دلیا چلتا رہے۔ ڈاکومینٹس کی ڈپلیکیٹ مل جانے پر جب مجھے کوئی اچھی جاب مل جاتی تو میں ایک بار پھر کمال کا علاج شروع کروا دیتی لیکن اب دیکھو کہ وقت مزید زندگی کا کون سا رنگ دکھاتا ہے۔ اپنی زندگی کے حالات اور واقعات سے تو میں نے یہی نتیجہ نکالا ہے کہ میں جو ارادہ باندھوں اور جو خواب دیکھوں، حقیقت اس کے برخلاف ہی نکلتی ہے۔"

اس کی آنکھوں میں یکدم ہی نمی اُمڈ آئی۔

"پلیز نہیں۔ آپ تو بہت حوصلہ مند اور مختلف عورت ہیں۔ اس طرح آنسو بہا کر خود کو عام عورتوں کی قطار میں مت کھڑا کیجیے۔" وہ بڑی عجیب شخصیت کی مالک تھی اور اس نے مروجہ اصولوں سے ہٹ کر اپنی زندگی کے لیے بڑے انوکھے فیصلے کیے تھے۔ پھر بھی وہ قابلِ ستائش محسوس ہوتی تھی۔ ایسی بہادر عورت کی آنکھوں میں آنسو دیکھنا ایک تکلیف دہ تجربہ تھا چنانچہ شہریار اسے ٹوکے بغیر نہیں رہ سکا۔

"آپ پہلے شخص ہیں جو مجھے اس طرح سراہ رہے ہیں ورنہ تو تقریباً ہر شخص مجھے ملامت ہی کرتا ہے کہ کیسی بے وقوف عورت ہو کہ عیش و آرام کو ٹھکرا کر اپنے لیے یہ ذلت

اور عسرت بھری زندگی منتخب کر ڈالی۔" اس نے نزاکت سے انگلی کی پور سے آنکھوں کے کناروں تک چلی آنے والی نمی کو صاف کیا اور بولی۔

"یہ بھی ہمارے معاشرے کا ایک المیہ ہے کہ عام لوگ کبھی بھی خاص لوگوں کو سمجھ نہیں پاتے اور آپ بھی ایک خاص ہستی ہیں۔" شہریار نے بے ساختگی سے اسے جواب دیا۔

"نوازش۔" اس نے ماتھے تک ہاتھ لے جا کر خوش دلی سے کہا۔

"آپ کمال نامی اس مخلوق سے چھٹکارا کیوں حاصل نہیں کر لیتیں؟ یہ شخص آپ کی زندگی سے نکل گیا تو آپ کے لیے تھوڑی آسانی پیدا ہو جائے گی۔" سلو نے اسے مفت مشورہ دیا جسے سن کر اس نے شدت سے نفی میں سر کو دائیں بائیں جنبش دی اور بولی۔

"اگر میں آسائشوں کی ہی خواہش مند ہوتی تو وجے جیسے مڈل کلاس بندے کے ساتھ محبت کر کے اس کے گھر میں بسنے کے خواب کیوں دیکھتی؟ اپنے باپ سے تعلقات کیوں توڑتی اور ساجد کا گھر کیوں چھوڑتی؟ میں زندگی میں جدوجہد کی قائل ہوں اور شاید میری زندگی میں یہ زیادہ ہی لکھی ہے۔ پھر کمال کا تو میرے سوا اب کوئی ہے ہی نہیں جو میرے چھوڑنے کے بعد اسے گلے لگا لے۔ مجھے ہی اسے سمیٹنا اور سنبھالنا پڑے گا اور مجھے یقین ہے کہ اگر زندگی نے وفا کی تو میں یہ کام کر گزروں گی۔ وہ ایک دن ضرور نشہ چھوڑ کر خود کو معاشرے کا کارآمد فرد ثابت کرے گا اور اس وقت اگر اس نے مجھے چھوڑنا چاہا تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"بس کر دیجیے نیک پروین صاحبہ! آپ کی اتنی انوکھی سوچ اب مجھ سے مزید ہضم نہیں ہو سکتی۔" سلو نے مزاحیہ انداز میں کہتے ہوئے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے لیکن اس کی آنکھوں میں عائشہ کے لیے جو ستائش تھی، اس سے ثابت ہو رہا تھا کہ وہ بھی اس انوکھی عورت سے متاثر ہوا ہے۔

"ٹھیک ہے مجھے چھوڑ دیتے ہیں اور اب آپ کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ دونوں فوری طور پر دہلی چھوڑ دیں تاکہ نادر دادا کے عتاب سے بچ سکیں۔"

"اور تم؟ تمہارا کیا ہوگا؟" شہریار نے پوچھا۔

"وہی ہوگا جو منظورِ خدا ہوگا۔" اس نے غیر سنجیدگی سے جواب دیا لیکن اسے بدستور اپنی طرف تشویش سے دیکھتے پا کر سنجیدگی اختیار کر لی اور بولی۔ "نوادر میں جو کچھ ہوا، اس کی خبر کسی نہ کسی ذریعے سے پاپا تک پہنچ جائے گی۔ اگر نہ بھی پہنچی تو میں خود پہنچانے کا بندوبست کر دوں گی۔ ہمارے درمیان لاکھ اختلافات سہی مگر وہ یہ کسی صورت برداشت نہیں کریں گے کہ ان کی بیٹی کی عزت کوئی غنڈا سرِعام اچھال سکے۔ ان کے پاس دولت کی طاقت ہے اور کئی صاحبِ اختیار لوگ ان کے دوست ہیں۔ سب مل ملا کر نادر دادا کو نکیل ڈال ہی دیں گے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو میں تمہیں اپنا ارادہ بتا ہی چکی ہوں۔ دو چار میرے ہاتھوں مارے جائیں گے یا میں اپنی جان سے چلی جاؤں گی اور یہ کوئی ایسی تشویش ناک بات نہیں ہے۔ آخرکار تو ہر شخص کی زندگی کا یہی انجام ہوتا ہے۔ ہاں! مجھے مرتے وقت یہ افسوس رہے گا کہ میں جس مقصد کے لیے ساجد کا گھر چھوڑ کر نکلی تھی، وہ پورا نہیں ہو سکا۔"

اب شہریار کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں رہا تھا۔ نہ ہی وہ اس کے لیے اس سے زیادہ فکرمندی کا اظہار کر سکتا تھا کیونکہ وہ تو خود پُرخطر راہوں کے مسافر تھے اور کسی طور اس لڑکی کو پناہ نہیں دے سکتے تھے۔ ویسے بھی وہ جس فطرت کی مالک تھی، اس سے صاف ظاہر تھا کہ اگر وہ اسے اپنے ساتھ چلنے کی پیشکش کرتا بھی تو وہ ہرگز قبول نہیں کرتی کیونکہ وہ کمال کو بے یار و مددگار چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی۔

"میں دعا کروں گا کہ اللہ تمہیں ان مسائل سے نکالے اور تم اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکو۔" اس نے پورے خلوص کے ساتھ عائشہ کو دعا دی۔ اسے دیکھ کر نہ جانے کیوں اسے ماہ بانو کی یاد آ گئی تھی۔ حالانکہ وہ عائشہ کی طرح بے باک اور آزاد مزاج نہیں تھی، ہاں البتہ عزت کے معاملے میں بے حد حساس تھی اور اسے بچانے کے لیے در بدر کی ٹھوکریں کھاتی ہوئی بالآخر امریکا پہنچ گئی تھی۔ ماہ بانو کا خیال ذہن میں آیا تو دل میں ایک کسک سی جاگی۔ وہ کتنا مجبور تھا کہ اپنے ہاتھوں اسے کسی اور کا بنا ڈالا تھا لیکن خوشی بھی تھی کہ وہ زندگی کے خارزاروں میں بھٹکنے سے بچ کر اسلم کے ساتھ ایک محفوظ زندگی گزار رہی تھی۔ وہ اسلم کے بارے میں پُریقین تھا کہ وہ اس سے بے حد محبت کرتا ہے اور اپنی محبت کے مرہم سے اس کے دل پر لگا ہر زخم مندمل کر سکتا ہے۔

"ایک بات کہوں، تم برا تو نہیں مانو گے؟" عائشہ کی آواز اسے لمحۂ موجود میں واپس لائی۔

"کہو۔"

"تم دونوں نے مجھے اپنے نام غلط بتائے ہیں۔ تم نے خود کو ہندو ظاہر کیا ہے لیکن جن الفاظ اور انداز میں تم مجھ سے گفتگو کرتے رہے ہو، اسے دیکھتے ہوئے میں سو فیصد یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ تم دونوں مسلمان ہو اور کسی خاص وجہ سے

اپنی اصلیت چھپا رہے ہو۔" وہ بولی تو وہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ سن رہ گئے۔ عائشہ کی صاف ستھری اردو سن کر اس کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے انہیں یاد ہی نہیں رہا تھا کہ وہ ہندوؤں کا کردار ادا کر رہے ہیں اور انہیں اس کے ساتھ اسی لب و لہجے میں بات کرنی چاہیے۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا؟ اب تو تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ ہم دونوں نے اپنے شوق سے اردو سیکھی ہے اور جب بھی آپ جیسی اردو دان سے بات چیت کرنے کا موقع ملے تو اس کا فائدہ اٹھا کر خود بھی بولنے کا شوق پورا کر لیتے ہیں۔" پہلے شہریار نے خود کو سنبھالا اور معاملے کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔

"میں اپنی بات پر اصرار نہیں کروں گی۔ اگر آپ خود کو جلدیش اور وریندر کہلوانے پر مصر ہیں تو مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ آپ کے بارے میں کھوج لگانے کی کوشش کروں۔" عائشہ نے جو جواب دیا، اس سے واضح تھا کہ وہ اس کی دی ہوئی وضاحت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ شہریار نے بھی زیادہ بحث مناسب نہیں سمجھی۔ ان کے حق میں اتنا ہی کافی تھا کہ وہ ان کے بارے میں مزید کھوج لگانے کا ارادہ نہیں رکھتی ہے۔

"یہاں بیٹھے سوچ بچار ہی کرتے رہو گے یا کچھ کرو گے بھی؟ میں نے تم دونوں سے کہا ہے کہ فوری طور پر دہلی سے روانہ ہو جاؤ اور تم ابھی تک میرے گھر جیسی خطرناک جگہ پر بیٹھے ہوئے ہو۔"

"اوہ ہاں... واقعی ہمیں یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔" شہریار نے اس کی تائید کی لیکن اپنی جگہ وہ خود الجھن میں تھا کہ دہلی سے فوری طور پر کس طرح نکلے؟ ان کے مددگار نے انہیں شام کے بعد شناختی دستاویزات مہیا کرنے کا وعدہ کیا تھا جن کے بغیر زیادہ سفر کرنا ان کے لیے یوں بھی خطرناک ہو سکتا تھا لیکن اب صورتِ حال ایسی ہو گئی تھی کہ یہاں ٹھہرنا بھی مشکل نظر آ رہا تھا۔

"میرے خیال میں تم دونوں کسی ہوٹل وغیرہ میں ٹھہرے ہوئے ہو گے اور وہاں یقینی طور پر تمہارا سامان بھی موجود ہوگا۔ اگر نادر دادا تم سے انتقام لینا چاہتا ہے تو ممکن ہے کہ اس کے آدمیوں نے اب تک مختلف ہوٹلوں میں تم دونوں کی تلاش شروع کروا دی ہو۔ اس لیے بہتر ہے کہ اگر تمہارے سامان میں کوئی قیمتی شے نہیں ہے تو اسے وہیں پڑا رہنے دو اور ہوٹل جانے کا خطرہ نہ مول لو۔" عائشہ نے انہیں ایک اور مشورے سے نوازا لیکن اس کا یہ مشورہ اس لیے قابلِ قبول نہیں تھا کہ ان کے بیگز میں اسلحے اور کرنسی کے علاوہ دوسری ضروری چیزیں بھی موجود تھیں۔

"ہم اپنا سامان ہوٹل میں چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ اس میں ہماری بہت اہم چیزیں موجود ہیں۔"

عائشہ کے مشورے کا اس نے حتمی لہجے میں جواب دیا اور بولا۔ "نادر یا اس کے آدمیوں کو ہمارے نام معلوم نہیں ہیں۔ نہ ہی ان کے پاس ہماری کوئی تصویر ہے، اس لیے صرف زبانی حلیہ بتا کر ایک ایک ہوٹل میں جا کر ہمیں تلاش کرنا ان کے لیے اتنا آسان نہیں ثابت ہوگا۔ اس سارے پروسس میں کافی وقت لگ سکتا ہے اس لیے ہمارے پاس چانس ہے کہ ہم وہاں جا کر اپنا سامان لے آئیں۔"

"بالکل ٹھیک، چلو ہم ابھی چلتے ہیں۔" سلو نے بھی اس کی تائید کی اور کھڑا ہو گیا۔

"ایک منٹ رکو۔ میرے خیال میں، میں اس سلسلے میں تمہاری کچھ مدد کر سکتی ہوں۔" عائشہ نے انہیں روکا۔

"وہ کیسے؟"

"میری ایک عزیز سہیلی ہے شکنتلا۔ میری خاطر وہ بہت کچھ کر سکتی ہے۔ اگر تم کہو تو میں اس کے ذریعے تمہارا سامان منگوا دوں؟ اس دوران تم اس کے گھر پر بھی رک سکتے ہو۔ روکنے کو میں بھی روک لوں لیکن اس کا امکان ہے کہ وہ لوگ تمہیں تلاش کرتے ہوئے یہاں کسی بھی وقت پہنچ جائیں گے اور تم مارے جاؤ گے۔" اس نے اپنی تجویز پیش کی۔

"شکریہ لیڈی۔ آپ نے ہمیں جو پیشکش کی اس کے لیے ہم آپ کے شکر گزار ہیں لیکن اس بات کو کسی طور مناسب نہیں سمجھتے کہ آپ ہماری خاطر اپنی سہیلی کو خطرے میں ڈالیں۔ ہم مرد ہیں، کسی نہ کسی طرح خود کو بچا ہی لیں گے۔ اس لیے نہ تو آپ کوئی زحمت کریں اور نہ ہی کسی دوسرے کو زحمت میں ڈالیں۔ اب ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔ آپ اپنا بہت بہت خیال رکھیے گا۔" شہریار نے غور سے اس کی تجویز سنی ضرور لیکن فوراً ہی رد کر دی اور روانگی کے لیے تیار ہو گیا۔

"جیسی آپ کی مرضی۔ میں اللہ سے آپ دونوں کی سلامتی کے لیے دعا کروں گی۔" وہ ان کے پیچھے دروازے تک آئی اور بالکل ایسے لہجے میں کہا جیسے کسی محاذ پر جانے والے سپاہی کی بہن کہتی ہوگی۔

"ایک بار پھر شکریہ۔ ہمیں سب سے زیادہ ضرورت ہے بھی دعاؤں کی ہی۔" اس نے لمحہ بھر کے لیے عائشہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور پھر وہ دونوں آگے پیچھے باہر نکل گئے۔ گلی سے نکلنے کے بعد اس نے کسی سواری کو تلاش کرنے کے بجائے پیدل ہی چلنے کو ترجیح دی تھی۔

"بیٹھے بٹھائے ہم نے یہ سالی اچھی مصیبت گلے لگا لی۔ اب پتا نہیں وہ خبیث دادا ہمیں کتنا خوار کروائے گا۔" زباں برداری سے اس کے ساتھ ساتھ چلتے سلو نے اپنے انداز سے صورتِ حال پر تبصرہ کیا جس کے جواب میں اس نے کچھ کہنا ضروری نہیں سمجھا۔ اصل میں وہ کسی مناسب جگہ کی تلاش میں تھا جہاں کچھ دیر سکون سے بیٹھا جا سکے۔

چند منٹ چلنے کے بعد بالآخر ایک پبلک پارک کی صورت میں ایسی جگہ مل گئی۔ وہاں ایک بینچ پر بیٹھ کر اس نے اپنا موبائل نکالا۔ شکر تھا کہ اچھی خاصی مار دھاڑ اور اچھل کود کے باوجود نہ تو موبائل اس کی جیب سے نکل کر کہیں گرا تھا اور نہ ہی اسے کوئی نقصان پہنچا تھا چنانچہ اس وقت وہ اسے استعمال کرنے کی پوزیشن میں تھا۔

"شیر نے اپنی سلطنت میں قدم رکھ دیے ہیں۔" ذہن نشین کیا ہوا مخصوص نمبر ملانے کے بعد رابطہ ہونے پر اس نے طے شدہ کوڈ ادا کیا۔

"جنگل کے جانور اس کی اطاعت قبول کرتے ہیں۔" دوسری طرف سے جوابی کوڈ دہرایا گیا۔

"ہم مشکل میں ہیں۔ کچھ دیر پہلے تو اور ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں ہماری نادر دادا نامی غنڈے کے آدمیوں سے ہاتھا پائی ہو گئی تھی اور اب امید ہے کہ اس کے بندے ہمیں ہر جگہ ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے۔ کیا تم ہمارے ہوٹل سے ہمارا سامان نکالنے کے لیے کچھ کر سکتے ہو؟" صحیح آدمی سے رابطہ ہو جانے کا یقین ہونے پر اس نے فوری طور پر اپنا مسئلہ بیان کیا۔

"اوہ گاڈ! تو وہ تم دونوں تھے۔ اس واقعے کی بازگشت تو دور تک پھیل گئی ہے۔ بہر حال، تم کہاں ہو، مجھے بھی لوکیشن بتاؤ پھر میں تمہاری مدد کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔" وہ تحیر زدہ لہجے میں بولا اور پھر فوراً ہی اس سے پوچھنے لگا۔ جواب میں اس نے عائشہ کی زبان سے سنا علاقے کا نام بتانے کے ساتھ ساتھ اس پارک کے اطراف کی نشانیاں بھی بتاویں جہاں وہ اس وقت بیٹھے ہوئے تھے۔

"ٹھیک ہے، تم وہیں ٹھہرو۔ میں خود تمہیں لینے آتا ہوں۔" وہ فوراً ہی بولا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ اب ان دونوں کے پاس انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا چنانچہ یہی کرتے رہے۔ تقریباً پچیس منٹ بعد انہیں اپنے مددگار کی

جانی پہچانی شکل نظر آئی۔

"میں اپنے ساتھ گاڑی لایا ہوں۔ اس میں ایک ڈرائیور بھی موجود ہے۔ تم دونوں راستے بھر کوئی بات نہ کرنا اور بالکل خاموش بیٹھے رہنا۔" کسی قسم کے تکلف میں پڑے بغیر اس نے سنجیدگی سے انہیں ہدایت کی اور پلٹ کر چل پڑا۔ وہ دونوں بھی اس کے پیچھے تھے۔ وہ ان کے لیے جو گاڑی لایا تھا، وہ ایک ٹیکسی تھی۔ ٹیکسی میں ان کے بیٹھتے ہی سفر شروع ہو گیا۔ بیس منٹ بعد وہ ایک تنگ گلی کے کونے پر ٹیکسی سے اتر رہے تھے۔ ٹیکسی روانہ ہو گئی تو ان کا پیدل سفر شروع ہوا اور وہ شخص انہیں مختلف گلیوں سے گزارتا ہوا اس گھر کے دروازے پر پہنچ گیا جہاں وہ پہلے بھی آ چکے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ آج اس نے دروازے پر دستک دینے کے بجائے جیب سے چابی نکال کر دروازے پر لگا تالا کھولا اور پھر انہیں لیے اندر داخل ہو گیا۔

"یہ آپ نے بڑا غضب کیا کہ نادر دادا جیسے بندے سے الجھ بیٹھے۔ اس غلطی کا کوئی بھی نتیجہ نکل سکتا ہے۔" اندر پہنچتے ہی وہ تشویش سے بولنا شروع ہو گیا۔

"ہمیں کیا معلوم تھا کہ وہ کیا بلا ہے۔ ہم نے تو بس ایک لڑکی کے ساتھ زیادتی ہوتی دیکھ کر اس کی مدد کرنے کی کوشش کی تھی۔" منہ بنا کر جواب دینے کا فریضہ سلو نے انجام دیا۔

"وہ بڑا خطرناک آدمی ہے۔ اس کے بارے میں آپ لوگ اس بات سے ہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہاں اتنا کچھ ہونے کے باوجود پولیس کا کوئی آدمی پھٹکا تک نہیں ہوگا کیونکہ یہ نادر کا حکم ہے کہ جہاں وہ اور اس کے بندے کسی لفڑے میں الجھے ہوں، وہاں پولیس کا نام و نشان بھی نظر نہ آئے۔" اس نے ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"اوہ، آئی سی۔ یعنی وہ اتنا بڑا غنڈا ہے کہ پولیس بھی اس سے ڈرتی ہے؟"

"بالکل۔" وہ زور سے گردن ہلا کر بولا۔

"تو پھر اب تم ہماری کیا مدد کر سکتے ہو؟" شہریار نے استفسار کیا۔

"میں نے راہول کو فون کر دیا تھا۔ وہ کچھ بندوبست کر کے آتا ہوگا۔ اس کے آنے تک تم دونوں اپنے حلیوں میں تھوڑی سی تبدیلی کر لو تاکہ کوئی فوری طور پر تمہیں شناخت نہ کر سکے۔" اس نے نہ صرف مشورہ دیا بلکہ حلیوں کی تبدیلی میں ان کی مدد بھی کرنے لگا۔ اس کام سے فارغ ہونے تک راہول بھی واپس آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ان دونوں کے بیگز

لٹکے ہوئے تھے۔

”اوہ مائی گاڈ! بڑی مشکل سے لالو بھائی کو سمجھا بجھا کر یہ بیگز لے کر آیا ہوں۔ وہ بھی اس بات کا انتظام کرنے کے بعد کہ اس کی جان کسی مشکل میں نہیں پھنس سکے۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بیگز نیچے زمین پر رکھے تو سلو نے آگے بڑھ کر ایک بیگ کھولا اور اندر سے اس کا جائزہ لینے لگا۔

”اچھی طرح چیک کرلو، ہر چیز موجود ہے یا نہیں؟ میں نے تو بڑی جلدی میں سارا کام نمٹایا ہے۔ تمہارے کمرے سے یہ بیگ نکالنے کے ساتھ ہی اسی رنگ کے دو بیگ کپڑوں اور دیگر سفری سامان سمیت وہیں چھوڑ کر آیا ہوں۔ اب اگر نادر دادا کا کوئی آدمی تمہارا پوچھتا ہوا لالو بھائی تک پہنچا تو وہ اس سے یہی کہیں گے کہ لڑکے ٹھہرے ہوئے تو اس کے ہوٹل میں ہی ہیں لیکن صبح سے نکلنے کے بعد واپس نہیں آئے۔ ثبوت میں وہ تمہارے زیر استعمال کمرا اور سامان دکھا دے گا۔ بس پھر اللہ اللہ خیر صلا۔ آگے تو دادا کی مرضی ہوگی کہ کیا ہوتا ہے۔ لالو البتہ اس شرط پر زبان نہیں کھولے گا کہ ہونے والے کسی نقصان کو بھرنے کی ذمے داری ہم اٹھائیں گے۔“ اس نے انہیں تفصیلات سے آگاہ کیا اور بوتل منہ سے لگا کر پانی کے بڑے بڑے گھونٹ پینے لگا۔

”میرا مشورہ ہے کہ تم یہاں سے بس کے ذریعے بستی نظام الدین چلے جاؤ۔ وہاں مسلمانوں کے علاوہ بہت سے ہندو بھی آتے ہیں۔ تم اپنے موجودہ گیٹ اپ کے ساتھ وہاں کے ماحول میں آسانی سے گھل مل جاؤ گے۔“ راہول خاموش ہوا تو پہلے والے شخص نے بولنا شروع کردیا۔

”ہم دہلی سے باہر نکلنا چاہتے ہیں۔“ شہریار نے مطالبہ کیا۔

”سوری، ابھی تم لوگوں کی شناختی دستاویزات تیار نہیں ہو سکی ہیں اور مجھے خدشہ ہے کہ کل تک کا وقت لگ جائے گا۔ اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ جہاں میں کہہ رہا ہوں، وہاں چلے جاؤ۔ وہاں تم محفوظ رہو گے اور میں خود وہاں آکر تمہیں کاغذات پہنچا دوں گا۔“ اس نے درپیش مسئلہ بتایا تو ان کو اس کی بات ماننی ہی پڑی۔ ذرا دیر بعد وہ اپنے بیگ شانوں سے لٹکائے بستی نظام الدین کے لیے جانے والی بس پر سوار ہو رہے تھے۔ انہیں وہاں جانے کا مشورہ دینے والے ان کے خیر خواہ نے انہیں بتا دیا تھا کہ بس سے اترنے کے بعد رکشا کر کے درگاہ تک چلے جانا اور وہاں موجود سراؤں میں سے کسی میں قیام کر لینا۔ انہوں نے اس مشورے پر عمل کیا اور ایک سرائے میں کمرا بک کروانے کے بعد دیگر زائرین کی طرح خود بھی درگاہ کی طرف گئے۔ وہاں بے شمار لوگ تھے جو ہندو، مسلم اور سکھ کی تخصیص کے بغیر اپنی حاجتیں لے کر وہاں آئے ہوئے تھے۔ ... کی بحث اپنی جگہ لیکن یہ امر حیرت ناک تھا کہ سیکولر ہندوستان میں جہاں اصل میں ہندوؤں ہی کا راج تھا، ایک بزرگ دین کی ایسی عزت تھی کہ وہ دنیا سے گزر جانے کے طویل عرصے بعد بھی ہر ایک کے دل پر راج کرتا تھا۔ حکمرانی ایسی تھی جسے کوئی چھین نہیں سکتا تھا۔

وہ دونوں بھی کچھ دیر تک زائرین کے ساتھ ... مختلف حصوں میں گھومتے رہے پھر وہاں ہر روز پکنے والی ... کے لیے نذرانہ دے کر باہر نکل گئے۔ عقیدت ... اس دیگ کے لیے نذرانہ وہ لوگ دیتے تھے جو ... لے کر وہاں آتے تھے۔ انہیں حاجت کوئی نہیں تھی ... خیال سے نذرانہ دے دیا تھا کہ ہر روز سیکڑوں لوگوں کو کھانا فراہم کرنے والی دیگ میں تھوڑا سا حصہ ان کا ... جائے گا۔ سرائے واپس آکر انہوں نے کھانا کھایا اور سونے کے لیے لیٹ گئے۔ آج صبح سے ہی وہ مستقل گردش میں تھے اور اب جا کر بستر کی شکل دیکھنی نصیب ہوئی تھی اس لیے ... ہی سو گئے۔ صبح دستک کی آواز پر ان کی آنکھ کھلی۔

”شاید سرائے کا مالک ہوگا اور ناشتے کے بارے میں پوچھ رہا ہوگا۔“ شہریار نے اپنی جگہ لیٹے لیٹے اندازہ لگایا۔

”جو بھی ہو، اس کو ٹال دو۔ میں ابھی کچھ دیر اور ... چاہتا ہوں۔“ سلو نے کروٹ بدل کر دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ مجبوراً شہریار کو ہی بستر چھوڑنا پڑا۔ ویسے بھی آج وہ معمول کے خلاف بہت دیر تک سو گیا تھا۔ اس کے بستر سے اتر کر دروازے پر جانے تک دستک ایک بار پھر دی گئی جو پہلے سے زیادہ بلند تھی۔

”کون ہے بھائی، ذرا صبر کرو آرہا ہوں۔“ اس نے وہیں سے کہا اور دروازے کی طرف لپکا۔

”کون ہے؟“ دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے احتیاطاً دریافت کیا۔

”پولیس، دروازہ کھولو۔“ باہر سے جو جواب دیا گیا اسے سن کر شہریار تو شہریار بستر پر کروٹ بدل کر سو جانے والا سلو بھی اچھل پڑا۔

> یہ پُرپیچ وسنسنی خیز داستان جاری ہے
> مزید واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

فون کال

بابر نعیم

کچھ سپنے اتنے رنگین اور خوش نما ہوتے ہیں کہ انہیں حقیقت میں پانے کی آرزو شدت سے جاگ اٹھتی ہے... وہ بھی اپنے خواب کو شرمندۂ تعبیر دیکھنے کے لیے ایک کامیاب منصوبہ تشکیل دے چکا تھا...

اس بت تراش کا ماجرا جسے اپنی کامیابی کا کامل یقین تھا

کمرے کے ایک کونے میں رکھا ہوا ٹیلی فون خاموش تھا لیکن اس کے باوجود وہ پورے کمرے میں حاوی دکھائی دے رہا تھا۔

ہیلن نے یقین کرنے کی خاطر ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا... کہ آیا ٹیلی فون کام کر رہا ہے یا نہیں۔ فون صحیح کام کر رہا تھا۔ البتہ بدستور کسی ہٹ دھرم کے مانند خاموش تھا۔

ہیلن ٹیلی فون سیٹ کے رنگ کے بارے میں سوچنے

لگی۔ سرخ رنگ کا سیٹ اسے کسی طور اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ یہ اسے بہت زیادہ ناگوار محسوس ہو رہا تھا۔ اس لیے کہ یہ ایک جاذبِ نظر رنگ کا تھا۔ کریم یا بیج کلر کا انتخاب زیادہ بہتر ہوتا کیونکہ وہ پس منظر میں جذب ہو جاتا۔ وہ جب بھی کمرے میں داخل ہوتی تھی، اس کی نگاہ سب سے پہلے ٹیلی فون سیٹ کی جانب اٹھ جاتی تھی جیسے یہ سیٹ اسے چڑا رہا ہو۔ اس نے یہ بات اب ذہن میں بٹھالی تھی کہ یہ معاملہ ختم ہوتے ہی وہ اسے تبدیل کر دے گی اور کسی ہلکے رنگ کا سیٹ لے آئے گی۔

وہ بے تابی سے ٹیلی فون کی گھنٹی کے بجنے کا انتظار کرنے لگی۔

بالآخر فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

ہیلن گھنٹی کی آواز پر چونک سی گئی اور اس کے ہاتھ سے پیالی چھوٹ گئی۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ آگے بڑھایا اور ریسیور اٹھالیا۔

"کیا تم تیار ہو؟" دوسری جانب سے درشت سرگوشی کے لہجے میں پوچھا گیا۔

"ہاں۔" ہیلن نے جواب دیا۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ ہیلن نے کھنکھارتے ہوئے گلا صاف کیا اور بولی۔ "اب بتاؤ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"رقم لے کر جیکسن اسٹریٹ کے کارنر پر بنے ہوئے ٹیلی فون بوتھ پر پہنچ جاؤ۔ ابھی اور اسی وقت چل پڑو۔ جب تم وہاں پہنچو گی تو ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی ہوگی۔ اس لیے فوراً روانہ ہو جاؤ۔" اسی درشت آواز نے کہا۔

"ایک منٹ ٹھہرو۔" ہیلن چیخ پڑی۔ "میرا شوہر؟"

لیکن دوسری جانب سے فون بند ہو چکا تھا۔

ہیلن نے ہینڈ سیٹ پٹخ دیا، فرش پر رکھا ہوا بریف کیس اٹھایا اور دروازے کی جانب لپکی۔ اس نے چلتے چلتے اپنے شاندار سوٹ کے اوپر اوور کوٹ پہنا اور پتھر کی چوڑی سیڑھیوں پر سے تیزی سے اترتی ہوئی اپنی بی ایم ڈبلیو کار میں جا بیٹھی جو مکان کے باہر پارک تھی۔ اس نے پلک جھپکتے میں چابی گھما کر کار کا انجن اسٹارٹ کر دیا۔

ہیلن کی تمام تر توجہ جیکسن اسٹریٹ کے مختصر ترین روٹ پر مرکوز رہی۔ وہ جلد از جلد وہاں پہنچ جانا چاہتی تھی۔

پھر جب وہ جیکسن اسٹریٹ کے کارنر پر لگے ہوئے ٹیلی فون باکس کے سامنے پہنچی تو فون کی گھنٹی پہلے سے بج رہی تھی۔ اس نے کار جلت میں اس طرح روک لی کہ اس کے دو پہیے فٹ پاتھ پر تھے اور دو سڑک پر۔ وہ کار سے کر ٹیلی فون باکس کی جانب لپکی۔ اس نے جھپٹ کر ریسیور اٹھالیا۔

"ہاں۔" وہ ہانپتے ہوئے بولی۔ "اب کیا کرنا ہے؟"

"اپنی کار لے کر ردج کے علاقے میں اوپر کی جانب پہنچ جاؤ۔" اسی درشت آواز نے کہا۔ "وہاں پہنچ کر اپنی کار پارکنگ میں چھوڑ دینا اور پیدل اس جگہ آجانا جہاں مجسمہ نصب ہے۔ نہ آس پاس دیکھنا اور نہ ہی کسی سے بات کرنا۔ اگر تم اپنے شوہر کو زندہ دیکھنا چاہتی ہو تو ویسا ہی کرنا جیسا میں کہہ رہا ہوں... اور رقم لانا مت بھولنا رقم!"

ہیلن پلٹ کر اپنی کار کی جانب دوڑ پڑی۔ یہ دیکھ کر اسے اطمینان ہوا کہ بریف کیس بدستور فرنٹ سیٹ پر رکھا ہوا تھا، اس حقیقت کے باوجود کہ وہ ٹیلی فون بوتھ میں بجنے والی گھنٹی کی آواز پر اپنی کار کا دروازہ چوپٹ کھلا چھوڑ آئی تھی۔

ردج شہر سے چند میل کے فاصلے پر ایک دیہی علاقہ تھا۔ ہیلن اپنی کار میں سوار ہو کر ردج کی جانب چل پڑی۔ اس کا ذہن گزشتہ چند روز کے واقعات کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ ایک حیرت انگیز بات تھی کہ وہ اغوا اور بلیک میل کا نشانہ بن گئی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھے، انہوں نے تاوان کے طور پر پانچ لاکھ پونڈز طلب کیے تھے۔ انہوں نے تاکید کی تھی کہ تمام رقم پرانے اور استعمال شدہ نوٹوں پر مشتمل ہونی چاہیے۔ ساتھ ہی انہوں نے ہیلن سے یہ وعدہ بھی لے لیا تھا کہ وہ پولیس کو اس بارے میں خبر نہیں کرے گی۔

ہیلن خود بھی پولیس کو اس معاملے سے باخبر کرنے سے کترانا چاہتی تھی کیونکہ اس کے نتیجے میں بعد میں ہونے والی پبلسٹی اس کی شہرت کو نقصان پہنچا سکتی تھی۔ اسی لیے اس نے اغوا کرنے والوں سے اس بات کی حامی بھر لی تھی کہ وہ پولیس کو کوئی اطلاع نہیں دے گی۔

جب ہیلن مقررہ جگہ پر پہنچی تو اس پر قدرے ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ اس کے حلق سے بے ساختہ ہلکا سا قہقہہ بلند ہو گیا۔ اسے اب ایک عجیب سا لطف محسوس ہو رہا تھا۔ یہ لطف اسے اس وقت بھی محسوس ہوا تھا جب کئی برس پہلے اس نے کاروبار سے لاکھوں پونڈز کمائے تھے۔

وہ ایک کامیاب بزنس وومن تھی اور ایک ایسی کمپنی سے وابستہ تھی جس کے اپنے بیشتر چین اسٹور تھے۔ چونکہ وہ کمپنی کے سب سے زیادہ شیئرز کی حامل تھی اس لیے بورڈ آف ڈائریکٹرز بھی اسے اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتا تھا۔ لوگ اس کا بہت احترام کرتے تھے اور ایک حد تک اس سے ڈرتے بھی تھے یا کم از کم وہ یہی سمجھتی تھی۔

بالکل اس کے شوہر کی طرح!

اس کا شوہر ایک سابقہ مووی اسٹار تھا اور اپنے دور میں اس کا طوطی بولتا تھا۔ لیکن ہیلن نے جس شخص سے آشنائی کی تھی وہ اب یوں لگتا تھا جیسے غائب ہو گیا ہو۔ جوں جوں اس کا کیریئر زوال پذیر ہوتا چلا گیا، ہیلن کا کاروبار اتنا ہی پھلنے پھولنے لگا۔ پھر اس کا شوہر خود بھی نکما بن گیا۔ ہیلن سے جو الفت اسے کسی زمانے میں رہی تھی، اس میں بھی اب بے حد کمی واقع ہو چکی تھی۔

ہیلن کو بھی اس کی محبت اور سرد مہری کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ ایک غیر یقینی کیفیت کا شکار تھی۔ اس کے باوجود بھی وہ اس سے وابستہ رہنا چاہتی تھی۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ ایک شوہر کو کھونا نہیں چاہتی تھی بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ طلاق کی صورت میں خود اس کی شہرت اور سوشل اسٹینڈنگ پر ایک داغ لگنے کا خطرہ تھا۔ اگر وہ کسی محفل میں اپنے شوہر کی بانہوں میں بانہیں ڈالے نظر نہ آتی تو لوگوں کی چہ میگوئیاں اس کے لیے سوہان روح بن سکتی تھیں۔

لوگ یہی کہتے کہ جو عورت اپنے شوہر سے بندھن قائم نہ رکھ سکی، وہ کمپنی سے ناتا کس طرح جوڑے رکھ سکتی ہے۔ اور یہ بات اس کی ذات کے ساتھ ساتھ اس کے کاروبار کو بھی متاثر کر سکتی تھی۔

نہیں، وہ ایسا ہرگز نہیں کرے گی... ہیلن نے سوچا۔ اس میں بہت زیادہ رسک تھا اس لیے بہتر ہے کہ تاوان کی رقم ادا کر دے اور خاموش رہے!

جب ہیلن نے ایک کارنر سے کار گھمائی تو سامنے آتی ہوئی کار کی تیز روشنیوں سے اس کی آنکھیں خیرہ ہونے لگیں۔ اس نے اپنی کار کا اسٹیئرنگ وہیل تیزی سے کاٹا اور واپس اپنی لین میں آگئی۔ اگر لمحہ بھر کی دیر ہو جاتی تو اس کی کار سامنے سے آتی ہوئی کار سے ٹکرا جاتی۔ دوسری کار کا ڈرائیور غصے سے ہارن بجاتا ہوا آگے نکل گیا۔

ہیلن نے اپنے اعصاب پر قابو پانے کے لیے اپنی

لاہور کا تانگہ

بعض لوگ زیادہ عبرت پکڑنے کے لیے ان تختوں کے نیچے کہیں کہیں دو ایک پہیے لگا لیتے ہیں اور سامنے دو بک لگا کر ان میں ایک گھوڑا ہانک دیتے ہیں۔ اصطلاح میں اس کو تانگہ کہتے ہیں۔ شوقین لوگ اس تختے پر موم جامہ منڈھ لیتے ہیں تاکہ پھسلنے میں سہولت ہو، اور بہت زیادہ عبرت پکڑی جائے۔

اصلی اور خالص گھوڑے لاہور میں خوراک کے کام آتے ہیں۔ قصابوں کی دکانوں پر انہی کا گوشت بکتا ہے اور زین کس کر کھایا جاتا ہے۔ تانگوں میں ان کے بجائے بناسپتی گھوڑے استعمال کیے جاتے ہیں۔ بناسپتی گھوڑا شکل وصورت میں دُم دار تارے سے ملتا ہے۔ کیونکہ اس گھوڑے کی ساخت میں دم زیادہ اور گھوڑا کم پایا جاتا ہے۔ حرکت کرتے وقت اپنی دُم کو دبا لیتا ہے اور اس ضبطِ نفس سے اپنی رفتار میں ایک سنجیدہ اعتدال پیدا کرتا ہے تاکہ سڑک کا ہر تاریخی گڑھا اور تانگے کا ہر ہچکولا اپنا نقش آپ پر ثبت کرتا جائے اور آپ کا ہر ایک مسام لطف اندوز ہو سکے۔

بچے جو سب سے اچھے

☆ ایک باپ نے اپنے بچے کے دوست سے اپنے بیٹے کے بارے میں پوچھا: "بیٹا یہ تو بتاؤ کہ میرا بیٹا تاریخ میں کیسا جا رہا ہے۔ کیونکہ جب میں طالب علم تھا تو تاریخ سے مجھے شدید نفرت تھی۔"

بچہ: "جناب تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔"

☆ ایک بچہ دھوبی کے پاس گیا جو کپڑے استری کیا کرتا تھا۔ اور اس سے پوچھا: "استری کے کتنے روپے لوگے؟"

دھوبی بولا: "جناب پندرہ روپے۔"

بچے نے جلدی سے پندرہ روپے جیب سے نکال کر میز پر رکھے اور استری اٹھا کر بھاگ گیا۔

☆ ماں اپنے بچے سے: "تم کیا کاغذ پر الٹی سیدھی لائنیں کھینچ رہے ہو؟"

بچہ: "ماں، خط لکھ رہا ہوں۔"

ماں حیرت سے: "مگر تمہیں تو لکھنا نہیں آتا؟"

بچہ: "فکر نہ کریں، جس دوست کو لکھ رہا ہوں، اسے کون سا پڑھنا آتا ہے۔"

(پشاور سے عثمان غنی کا انتخاب)

کار سڑک کے کنارے روک دی۔ کار کے تیز ہارن کی آواز بدستور اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

کچھ دیر بعد اسے سکون محسوس ہوا تو اس نے کار دوبارہ آگے بڑھا دی۔ پھر چند منٹ بعد وہ مزید کسی حادثے سے دوچار ہوئے بغیر بالآخر کار پارک میں داخل ہو گئی۔

جیسا کہ اسے توقع تھی، کار پارک ویران پڑا تھا۔ ہیلن نے کار کھڑی کر دی اور کار سے اترنے کے بعد اپنا اوورکوٹ مضبوطی سے اپنے گرد لپیٹ لیا۔ پھر بریف کیس لے کر اس چھوٹی سی پہاڑی کی طرف چل پڑی جس پر مجسمہ نصب تھا۔ راستے میں جابجا سوکھے پتے پھیلے ہوئے تھے جو اس کے قدموں تلے چرچرا رہے تھے۔

پتوں کی یہ چرچراہٹ ہیلن کے پہاڑی کے اوپر پہنچنے تک معدوم ہو گئی۔ مجسمے کے نزدیک پہنچ کر ہیلن رک گئی اور اس نے اپنا بریف کیس زمین پر رکھ دیا۔

ابھی چند لمحے ہی گزرے تھے کہ اس کے کانوں میں وہی درشت آواز سنائی دی۔ ”پلٹ کر دیکھنے کی کوشش مت کرنا۔“ لہجہ تحکمانہ تھا۔

پھر پیچھے سے ایک ہاتھ آگے آیا اور اس نے زمین پر رکھا ہوا بریف کیس ایک جھٹکے سے اٹھا لیا۔

”میرا شوہر... تم نے وعدہ کیا تھا۔“ ہیلن نے پلٹ کر بلیک میلر کو دیکھنے کی خواہش کو شدت سے دباتے ہوئے کہا۔ ”میں نے معاہدے کے مطابق اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔“

”سب کچھ ٹھیک ہے ڈارلنگ... میں یہاں ہوں۔“ ہیلن کے کانوں میں جانی پہچانی آواز سنائی دی تو وہ تیزی سے آواز کی سمت گھوم گئی۔

اس کا شوہر اپنے معمول کے صاف ستھرے حلیے میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔

ہیلن نے دوڑ کر اسے سینے سے لگانے کے ارادے سے قدم اٹھایا ہی تھا کہ ایک حقیقت کے احساس نے اس کے قدم وہیں جما دیے۔

اس کا لایا ہوا بریف کیس اس کے شوہر نے اپنے ایک ہاتھ میں تھاما ہوا تھا جبکہ اس کے دوسرے ہاتھ میں ایک گن تھی جس کی نال کا رخ ہیلن کے سینے کی سمت تھا۔

ہیلن کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھٹ پڑیں۔ اس نے استفہامیہ نظروں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا تو اس نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا اور تیکھے لہجے میں بولا۔ ”ہاں، اب میں آزاد ہوں... بالآخر آزاد!“

ساتھ ہی اس نے ٹریگر دبا دیا۔

☆☆☆

فائر کی آواز اس ویرانے میں دیر تک گونجنے کے بعد بالآخر معدوم ہو گئی تو اس نے ایک جھٹکے سے بریف کیس کھول لیا۔ وہ فرار ہونے سے پہلے اپنی تسکین چاہتا تھا۔ اب اسے ہیلن کی جانب سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ ہیلن بہت دور پہنچ چکا تھا اور اب اس کی دسترس میں نہیں تھا۔

یہ وہی ہیلن تھی جو شادی کے روز ہی سے اس سے اس طرح کا برتاؤ کر رہی تھی جیسے وہ اس کے پاؤں کی جوتی ہو۔ وہ اسے انتہائی حقیر گردانتی تھی۔ وہ صرف اپنی دولت سے دلچسپی رکھتی تھی۔ اس نے اپنی دولت کے گرد اتنا مضبوط حصار باندھ دیا تھا کہ اس کے مرنے کے بعد بھی اسے پھوٹی کوڑی نہیں مل سکتی تھی۔

”پانچ لاکھ پونڈز!“ وہ بڑبڑایا۔ اس کی نظر بریف کیس میں سلیقے سے رکھی ہوئی رقم پر جمی ہوئی تھی۔ اس نے صفائی سے لپٹے ہوئے نوٹوں کے بنڈلوں میں سے ایک بنڈل اپنے ہاتھ میں اٹھا لیا اور یہ دیکھنے کی خاطر کہ اتنی بڑی رقم ہاتھ میں آنے کے بعد کیسا محسوس ہوتا ہے، اس نے نوٹوں کی گڈی کو ایک سرسراہٹ کے ساتھ پلٹنا شروع کیا۔

اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ پرانے اخبارات ہوں۔

وہ چونک پڑا اور تب اسے احساس ہوا کہ وہ حقیقت میں ہاتھوں میں کیا تھامے ہوئے تھا۔ وہ نوٹ کے برابر سائز میں کٹے ہوئے اخبارات کے ٹکڑے تھے جن کے دونوں جانب اصلی نوٹ رکھے گئے تھے۔

اس نے پاگلوں کی طرح بریف کیس کو کھنگال ڈالا۔ تمام بنڈل بالکل ایک جیسے تھے... اخباروں کی کٹنگ پر مشتمل گڈیاں اور ہر گڈی کے دونوں جانب اصلی نوٹ!

بریف کیس کی تہ میں ایک کاغذ چسپاں تھا۔ اس نے کاغذ نکال کر اس کی تہ کھولی تو اس کی نگاہیں اس پر لکھے ہوئے الفاظ پر جم کر رہ گئیں۔ لکھا تھا:

”کیا تم نے سنجیدگی سے یہ نہیں سوچا، آیا وہ اس قدر قیمت کا حامل بھی ہے؟“

✸

گناہِ بے لذت

تنویر ریاض

جرم کرنے والے کبھی پیچھے مڑ کے نہیں دیکھتے... وہ آگے کا سفر جاری رکھتے ہیں لیکن نوآموز مجرموں کے لیے بعض اوقات پہلا جرم ہی آخری جرم بن جاتا ہے... ایک ایسے ہی جرم کی روداد... جس نے کتنی لوگوں کے لیے راہیں ہموار کر دیں... اور وقت گزرنے کے ساتھ... اس ایک جرم کی کڑی سے کتنی کڑیاں بنتی چلی گئیں...

[illegible]

کوری الیوانز ڈیوٹی ختم کرکے اپنے گھر جانے کے لیے کار پارکنگ کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اس کی نظر ایک عورت پر گئی جو بس اسٹاپ کی بینچ پر بیٹھی غالباً بس کا انتظار کر رہی تھی۔ موسم قدرے ابرآلود تھا اور ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ کوری نے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے سرسری انداز میں اسے دیکھا لیکن یہ ایک جھلک ہی اس جیسے تربیت یافتہ پولیس آفیسر کے لیے کافی تھی جس کی مدد سے وہ اپنے ذہن میں اس عورت کا خاکہ تیار کر سکتا تھا۔

اس کے چہرے کے نقوش تیکھے اور سنہری بال تراشیدہ تھے۔ وہ قدرے دبلی اور کمزور نظر آرہی تھی۔ اس کے کندھے آگے کی طرف جھکے ہوئے تھے۔ اس نے پرانی سی جینز اور اونچی ایڑی کے جوتے پہن رکھے تھے۔ دیکھنے میں وہ کوئی اسٹور گرل یا کسی پس ماندہ علاقے کی رہنے والی لگ رہی تھی۔ کوری اس سے دس قدم آگے جا کر رک گیا۔ بارش قدرے تیز ہوچکی تھی۔

''کیا بس چھوٹ گئی؟'' اس نے عورت سے پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلادیا لیکن اس کی جانب دیکھا اور نہ کچھ بولی۔

''دوسری بس ایک گھنٹے سے پہلے نہیں آئے گی۔'' کوری نے کہا۔ عورت نے جواب میں کندھے اچکا دیے۔

''میں تمہیں ساکرامینٹو تک چھوڑ سکتا ہوں۔'' کوری نے پیشکش کی۔

''کیا تم گارڈ ہو؟'' عورت نے پہلی بار اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں، میں اصلاحی افسر ہوں۔''

''میں یہاں ایک مجرم سے ملنے آئی تھی۔'' عورت نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''شاید ہم دونوں کا ایک ساتھ گاڑی میں سفر کرنا ٹھیک نہ ہو۔''

''میں تمہیں اپنے ساتھ موٹیل چلنے کے لیے نہیں کہہ رہا۔'' کوری نے جل کر کہا۔ ''صرف ساکرامینٹو تک لفٹ دینے کی پیشکش کی ہے۔ اب یہ تمہاری مرضی ہے کہ چلتی ہو یا نہیں۔'' یہ کہہ کر وہ اپنی گاڑی کی طرف چل دیا۔ بارش اب تیز ہوچکی تھی۔ وہ عورت بھی اس کے پیچھے پیچھے آئی اور جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔

راستے میں اس نے کہا۔ ''کیا تم یہ جاننا نہیں چاہو گے کہ میں کس سے ملنے آئی تھی؟''

''مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔'' کوری نے.... بے پروائی سے کہا۔

''پھر بھی تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کون ہے میرا شوہر، بوائے فرینڈ یا بھائی۔''

''دیکھو اگر تم مجھے بتادو، تب بھی میں نہیں جان سکوں گا کہ تم کس کے بارے میں بات کررہی ہو۔ ہماری جیل میں پندرہ سو سے زیادہ قیدی ہیں اور میں صرف انہیں جانتا ہوں جو میری بیرک میں ہیں۔''

''کیا تم ہمیشہ سے ہی ایسے بدمزاج ہو یا جیل میں رہ کر ایسے ہوگئے ہو؟'' عورت نے طنزیہ انداز میں کہا۔

بارش کافی تیز ہوچکی تھی اور ونڈ شیلڈ پر لگے ہوئے وائپرز پانی ہٹانے میں ناکافی ثابت ہورہے تھے۔ کوری نے کار کی ہیڈ لائٹس روشن کردیں تاکہ سڑک پر جمع ہونے والے پانی میں اسے راستہ نظر آسکے۔ وہ دونوں خاموش تھے۔ جب وہ شہر کی حدود میں داخل ہوئے تو کوری نے پوچھا۔ ''تمہیں کہاں اتار دوں؟''

''گرے ہاؤنڈ ڈپو مناسب رہے گا۔'' کوری کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد گرے ہاؤنڈ کمپاؤنڈ کے داخلی دروازے پر پہنچ گیا۔ اس نے گاڑی روک دی لیکن انجن بند نہیں کیا۔

''لفٹ دینے کا شکریہ۔'' وہ گاڑی سے باہر نکلتے ہوئے بولی۔

''اس کی ضرورت نہیں۔'' کوری نے نرم لہجے میں کہا۔ ''امید ہے کہ تم آرام سے گھر پہنچ جاؤ گی۔''

عورت نے اپنی طرف کا دروازہ بند کیا اور تیز قدموں سے ڈپو کے داخلی دروازے کی جانب بڑھنے لگی۔ کوری نے گاڑی آگے بڑھائی اور یوٹرن لینے کے بعد آدھے بلاک کے فاصلے پر سڑک کے کنارے کھڑی کردی۔ اس نے انجن بند نہیں کیا تاکہ وائپرز کے ذریعے ونڈ شیلڈ کی صفائی ہوتی رہے۔ اچانک ہی بارش مکمل طور پر تھم گئی۔ اب اسے سامنے بس اسٹاپ واضح طور پر نظر آرہا تھا۔ اسے صرف پانچ منٹ انتظار کرنا پڑا۔ وہی عورت اسی دروازے سے واپس آتی دکھائی دی جس سے وہ اندر گئی تھی۔ اس نے ایک لمحے کے لیے رک کر اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر تیزی سے سڑک کے کنارے چلنے لگی۔

کوری بھی گاڑی سے باہر آگیا اور کچھ فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب کرنے لگا۔ وہ کئی بلاک کا فاصلہ طے کرنے کے بعد شہر کے وسط میں واقع موٹیل نمبر سات تک پہنچی اور استقبالیہ پر رکے بغیر نچلی منزل پر واقع ایک کمرے تک چلی گئی۔ اس نے جینز سے چابی نکال کر دروازہ کھولا اور اندر چلی گئی۔ یہ کمرا نمبر 121 تھا۔

کوری نے ایک گہری سانس لی اور واپس کار کی طرف بڑھنے لگا۔ اپنے اپارٹمنٹ پہنچ کر اس نے فریج سے دودھ کی بوتل نکالی اور کرسی پر بیٹھ کر ٹی وی کی خالی اسکرین کو دیکھنے لگا۔ وہ اسی عورت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ کون تھی؟ کس سے ملنے آئی تھی؟ اس کا نام کیا تھا وغیرہ وغیرہ۔ جب وہ سونے کے لیے بستر پر لیٹا تب بھی اس کا خیال ذہن پر قبضہ جمائے ہوئے تھا۔

دوسری صبح جب وہ اپنی ڈیوٹی پر پہنچا تو ڈیسک کلرک نے اسے بتایا کہ اسے ڈپٹی وارڈن نے اپنے دفتر میں طلب کیا ہے۔ وہ الٹے قدموں پلٹا اور ڈپٹی وارڈن کے دفتر کی طرف چل دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسے ایک مجرم سے ملاقات کے لیے آنے والی عورت کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھ لیا گیا ہے۔

جب وہ ڈپٹی وارڈن ڈفی کے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں وارڈن کے علاوہ ایک اور شخص بھی موجود تھا جسے اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس شخص نے پرانے زمانے کا بیلجی رنگ کا سوٹ، سفید قمیص اور پرانی سی ٹائی لگا رکھی تھی۔

''ایوانز۔'' ڈپٹی وارڈن نے کہا۔ ''یہ اسپیشل ایجنٹ راجر ہیری ہیں اور ان کا تعلق ایف بی آئی سے ہے۔'' کوری نے اس کی جانب دیکھ کر احتراماً سر ہلایا تو ڈپٹی وارڈن بولا۔ ''بیٹھ جاؤ۔ ہمیں تم سے کچھ سوالات کرنے ہیں۔ کیا تم نے کل اپنی شفٹ ختم ہونے کے بعد کسی عورت کو کار میں لفٹ دی تھی؟''

''جی ہاں۔''

''کیا تم اس عورت کو جانتے تھے؟''

''نہیں جناب۔''

''پھر تم اسے اپنے ساتھ کار میں لے کر کیوں چلے گئے؟''

''بارش شروع ہوچکی تھی اور دوسری بس ایک گھنٹے سے پہلے نہیں آتی۔ اس بس اسٹاپ پر بارش سے بچنے کے لیے کوئی سائبان بھی نہیں تھا۔ اس لیے میں نے اسے اپنی گاڑی میں بٹھا لیا۔''

''کیا تمہیں ملاقاتیوں کے ساتھ میل جول کے بارے میں قوانین کا علم نہیں؟''

''اس سے میرا کوئی میل جول نہیں وارڈن۔'' کوری نے ہلکا سا احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اسے صرف لفٹ کی پیشکش کی تھی کیونکہ بارش...''

''کیا تم نے اسے اپنا نام بتایا تھا یا اس کا نام پوچھا؟''

''نہیں جناب۔''

''ٹیلی فون نمبر، گھر کا پتا یا اور کسی قسم کی ذاتی معلومات؟''

''نہیں جناب! ایسا کچھ نہیں ہوا۔''

''تم نے اس عورت کو کہاں چھوڑا؟''

''ساکرامینٹو میں ایل اسٹریٹ پر واقع گرے ہاؤنڈ ڈپو پر۔''

''اس کے بعد تم کہاں گئے؟''

''سیدھے اپنے اپارٹمنٹ۔'' کوری نے بے چینی سے کرسی میں پہلو بدلتے ہوئے جھوٹ بولا۔ ''کیا میں یہ سب کچھ لکھ کر دوں؟ اس کے لیے میں چاہوں گا کہ یونین کا نمائندہ بھی یہاں موجود ہو۔''

''اس کی ضرورت نہیں ایوانز۔ میں اس ملاقات کا باقاعدہ ریکارڈ بنانا نہیں چاہتا۔ اس واقعے کی کوئی رپورٹ نہیں بنائی جائے گی بشرطیکہ تم ایجنٹ ہیری سے پوری طرح تعاون کرو۔''

کوری نے ایف بی آئی ایجنٹ کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''کیسا تعاون؟''

''تم نے جس عورت کو لفٹ دی تھی، اس کے بارے میں تمہیں کچھ معلومات دینا چاہتا ہوں۔'' ایجنٹ نے کہنا شروع کیا۔ ''اس کا نام..... نیلی ہے اور وہ ہیسٹر ڈریگ سے ملنے کے لیے آئی تھی جو کار چوری کے جرم میں چھ سال کی سزا بھگت رہا ہے اور گزشتہ اٹھارہ ماہ میں دو مرتبہ پیرول پر رہا ہوچکا ہے۔ ہم اس شخص میں اس لیے دلچسپی لے رہے ہیں کہ وہ موڈیسٹو میں ہونے والی بینک ڈکیتی میں کار چلا کر لے گیا تھا۔ دو مسلح افراد جو بینک میں گئے، وہ بارہ لاکھ ڈالرز لوٹنے میں کامیاب ہوگئے جسے بیس منٹ بعد ایک ٹرک کے ذریعے منتقل کیا جانا تھا۔ دونوں ڈاکو بینک سے باہر آئے اور انہوں نے پیسے ہی لوٹی ہوئی رقم کے دو تھیلے کار میں رکھے، کیش لے جانے والا ٹرک مقررہ وقت سے پہلے وہاں پہنچ گیا اور اس سے پہلے کہ دونوں ڈاکو کار میں سوار ہوتے، ٹرک پر موجود مسلح محافظوں نے ان پر فائر کھول دیا جس کے نتیجے میں دونوں ڈاکو موقع پر ہی ہلاک ہوگئے۔ اس افراتفری میں ڈرائیور رقم سمیت کار کو بھگا کر لے گیا۔ مسلح محافظ گاڑی کا نمبر تو نوٹ نہ کرسکے لیکن انہوں نے اس کے بارے میں تفصیل سے سب کچھ بتادیا۔ بعد میں وہ کار چوری کی ثابت ہوئی۔ تین دن بعد کیلی فورنیا ہائی وے پیٹرول پولیس نے اس کار کو بارڈر پر پکڑا۔ اسے ہیسٹر ڈریگ چلا رہا تھا جبکہ نیلی اس کے برابر والی نشست پر براجمان تھی لیکن کار سے کوئی رقم برآمد نہیں ہوئی اور نہ ہی ہمارے پاس ایسی کوئی شہادت ہے کہ بینک ڈکیتی کے موقع پر ڈریگ گاڑی چلا رہا تھا۔ ہم زیادہ سے زیادہ اس پر کار چوری کا الزام عائد کرسکتے تھے جبکہ نیلی پر کوئی الزام نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ لفٹ لے کر کار میں سوار ہوئی تھی جس کی تصدیق ڈریگ نے بھی کی۔''

''گویا ایف بی آئی والوں کو لوٹی ہوئی رقم کی فکر

ہے؟'' کوری نے کہا۔
''اگر یہ معلوم ہو جائے کہ ڈریک نے وہ رقم کہاں چھپا رکھی ہے تو ہم اسے بڑی آسانی سے بینک ڈکیتی میں ملوث کر سکتے ہیں اور نیلی کو بھی سازش میں شریک ہونے کے الزام میں پکڑا جا سکتا ہے۔''
''تمہارے خیال میں نیلی کو معلوم ہے کہ وہ رقم کہاں رکھی ہے؟'' کوری نے پوچھا۔ جواب میں ایجنٹ ہیری نے کندھے اچکا دیے۔
''یہ کہنا بہت مشکل ہے کیونکہ وہ اس رقم کو خرچ نہیں کر رہی اور بہت کفایت شعاری سے گزارہ کر رہی ہے۔ اس کی گزر اوقات بے روزگاری الاؤنس پر ہے جو اسے مہینے میں دو بار ملتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ اسی لیے باقاعدگی سے ڈریک سے ملنے آ رہی ہو اور اسے اس کی رہائی کا انتظار ہو تاکہ اس رقم میں سے اپنا حصہ وصول کر سکے۔''
''وہ کسی اور وجہ سے بھی اس سے ملنے آ سکتی ہے۔'' کوری نے کہا۔
''ممکن ہے۔'' ڈپٹی وارڈن نے سر ہلایا۔ ''ملاقاتیوں کی فہرست میں اس کا نام ڈریک کی بیوی کی حیثیت سے درج ہے۔''
کوری کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں؟''
''یہ دیکھنا ابھی باقی ہے۔'' ہیری بولا۔ ''تم نے اتفاقیہ طور پر اس سے رابطہ کر لیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ موٹیل نمبر سات میں رہتی ہے۔'' کوری کو یقین آ گیا کہ گزشتہ روز اس نے جو کچھ دیکھا، وہی حقیقت تھی۔
''میں کچھ عرصے سے اس کی نگرانی کر رہا ہوں اور جانتا ہوں کہ وہ کہاں سے شاپنگ کرتی ہے۔ کن ہوٹلوں میں کھانا کھاتی ہے اور کس سینما میں فلمیں دیکھتی ہے۔ لیکن اس سے ہمارا مقصد پورا نہیں ہوتا لہٰذا میں نے اور ڈپٹی وارڈن ڈی نے سوچا ہے کہ تم ایک بار پھر اس عورت سے رابطہ کرو۔''
''ایک منٹ۔'' کوری نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم اسے اپنے جال میں پھانسنے کے لیے مجھے چارے کے طور پر استعمال کرنا چاہ رہے ہو تو تم نے غلط آدمی کا انتخاب کیا ہے۔ میں اصلاحی افسر ہوں، پولیس کا مخبر نہیں اور میں ایسے کسی کام کے لیے تیار نہیں۔''
ایف بی آئی ایجنٹ اور ڈپٹی وارڈن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر ڈپٹی وارڈن بولا۔ ''ایوانز! اس ملاقات کو غیر رسمی رکھنے کا فیصلہ ایجنٹ ہیری کے ساتھ تمہارے تعاون سے مشروط ہے۔ تم نے اپنی ملازمت کی شرائط اور قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اس عورت کو اپنی کار میں لفٹ دی بلکہ اس طرح ہیری کی کوشش بھی ناکام ہوئی جو وہ اس عورت کی نگرانی کے سلسلے میں کر رہا تھا۔''
''وہ کیسے؟'' کوری نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔
''میں اس بس میں سوار تھا جو نیلی سے چھوٹ گئی۔ جب میں واپس بس اسٹاپ پر آیا تو نیلی وہاں سے جا چکی تھی جبکہ دوسری بس بھی اس وقت تک نہیں آئی تھی۔ چنانچہ ڈپٹی وارڈن کو جیل کے تمام سیکیورٹی کیمروں کو چیک کرنا پڑا کہ وہ کس طرح یہاں سے گئی۔''
ڈپٹی وارڈن آگے کی طرف جھکا اور اپنی ہتھیلیاں میز پر جماتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو ایوانز! ہم تم سے کچھ کرنے کے لیے نہیں کہہ رہے۔ بس تمہیں اس عورت سے دوستی بڑھانی ہے اور وہ تم سے جو کچھ بھی کہتی ہے، اس کی رپورٹ ایجنٹ ہیری کو دیتے رہو۔ یہ ایک دوستانہ پیشکش ہے اور اس کے بدلے تمہیں یہ رعایت دی جا سکتی ہے کہ گزرے روز تم نے جو قانون کی خلاف ورزی کی ہے، اس کی باقاعدہ رپورٹ نہ کی جائے۔''
''یہ ایک طرح کی بلیک میلنگ نہیں ہے؟'' وہ جھنجلاتے ہوئے بولا۔
''تم جو بھی سمجھو لیکن ہیری سے تعاون کی صورت میں تمہیں مزید فائدہ بھی ہو سکتا ہے۔'' ڈپٹی وارڈن معنی خیز انداز میں بولا۔ ''اگلی بار سارجنٹ کے عہدے کے لیے تم بھی متوقع امیدوار ہو۔ میں ذاتی طور پر کوشش کروں گا کہ تمہارا نام اس فہرست میں پہلے نمبر پر ہو... کیسا رہے گا؟''
کوری نے ایک گہری سانس لی اور شکست خوردہ انداز میں بولا۔ ''میں اس نئی دوستی کے لیے تیار ہوں۔''
اس کے جانے کے بعد ڈپٹی وارڈن سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور ایجنٹ ہیری سے بولا۔ ''مجھے امید ہے کہ تم جو کچھ کر رہے ہو، اس کے بارے میں اچھی طرح جانتے ہو گے۔''
''میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ کیا کر رہا ہوں بلکہ ہم کر رہے ہیں۔'' ہیری پُراعتماد لہجے میں بولا۔ ''بس تم میرے ساتھ اس کھیل میں شامل رہو پھر یہ بارہ لاکھ ڈالرز ہمارے ہوں گے بشرطیکہ ایوانز نے ہماری ہدایات پر عمل کیا اور اس کے ذہن میں کوئی اور خیال نہ آ گیا۔''
ڈی زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں اس کے بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ محض جیل کا محافظ ہے، اس کے دماغ میں بھوسا بھرا ہوا ہے۔ وہ کسی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔'' ہیری سوچنے لگا کہ بارہ لاکھ ڈالرز کے لیے کوئی بھی شخص کچھ بھی سوچ سکتا ہے، چاہے وہ وارڈن ہی کیوں نہ ہو۔
''اب تمہارا کیا پلان ہے؟'' ڈی نے پوچھا۔
''آج منگل ہے۔'' ہیری نے کہا۔ ''گزشتہ دو ماہ سے نیلی ہر بدھ کے روز فلم دیکھنے جاتی ہے۔ ہم کل صبح ایوانز کو بلا کر سمجھا دیں گے کہ شام کو جب نیلی فلم دیکھنے جائے تو اسے کیا کرنا ہے۔''

☆☆☆

اگلی شام جب فلم کا پہلا شو ختم ہوا تو کوری سینما ہال سے متصل کافی شاپ میں نیلی کا انتظار کر رہا تھا۔ جیسے ہی وہ دیگر لوگوں کے ہمراہ باہر آئی، وہ تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا اس کی جانب لپکا اور قریب جا کر سرگوشی کے انداز میں بولا۔
''سواری چاہیے؟''
وہ چلتے چلتے رک گئی اور حیرت زدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''تم کیا چاہتے ہو؟''
''ہم دونوں کو کہیں بیٹھ کر بات کرنے کی ضرورت ہے۔'' کوری نے کہا۔ ''ایک ایف بی آئی ایجنٹ تمہاری نگرانی کر رہا ہے اور اب میں بھی اس کے نشانے پر ہوں کیونکہ میں نے پرسوں تمہیں اپنی کار میں لفٹ دی تھی۔ اس لیے ہم دونوں کو اس بارے میں سنجیدگی سے گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔''
نیلی نے اسے غور سے دیکھا اور بولی۔ ''ٹھیک ہے، کہاں چلنا ہے؟''
''یہیں کونے پر ایک کافی شاپ ہے۔ وہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔''
اس کافی شاپ کا نام کلف کیفے تھا۔ کاؤنٹر کے ساتھ دس اسٹول رکھے ہوئے تھے جبکہ چار افراد کے بیٹھنے کے لیے چھ بوتھ بھی بنے ہوئے تھے۔ وہ دونوں ایک بوتھ میں جا کر بیٹھ گئے تو کوری نے پوچھا۔
''تمہیں بھوک لگی ہے؟''
''نہیں۔'' اس نے سختی سے جواب دیا۔
''لیکن مجھے تو بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔ اگر تم کھانے میں میرا ساتھ نہیں دینا چاہتیں تو تمہارے لیے بلیک کافی منگوا لیتا ہوں۔''
جب ویٹریس آرڈر لے کر چلی گئی تو نیلی نے مضطرب انداز میں کہا۔ ''تم کیا بتانا چاہ رہے تھے؟''
''یہ ایک دلچسپ کہانی ہے۔'' کوری نے کہا اور اس کے بعد اسے سب کچھ بتا دیا۔ وہ سب باتیں بھی جو ڈپٹی وارڈن کے دفتر میں ہوئی تھیں اور جن کے بارے میں اس نے پہلے ہی سوچ رکھا تھا کہ نیلی کو سب کچھ بتا دے گا لہٰذا اس نے کچھ نہیں چھپایا۔ البتہ ایک بات گول کر گیا کہ اس نے نیلی کا تعاقب موٹیل نمبر سات تک کیا تھا۔ یہ ایک ذاتی معاملہ تھا جس کا ڈپٹی وارڈن یا ہیری سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس مرحلے پر وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اس انداز میں کیوں سوچ رہا ہے۔
کوری کھانے میں مصروف تھا اور نیلی کافی کے گھونٹ لیتے ہوئے اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک معمولی شکل وصورت کا آدمی تھا۔ اس کی آنکھیں چھوٹی اور ناک تھوڑی سی اٹھی ہوئی تھی۔ یقیناً وہ ڈریک کی طرح ہینڈسم نہیں تھا جو دو ٹوٹے ہوئے دانتوں کے باوجود جونی ڈیپ جیسا نظر آتا تھا۔ اس کے علاقے کی بیشتر لڑکیاں اس پر فدا تھیں لیکن نیلی اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ گو کہ بعد میں نیلی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا لیکن دیر ہو چکی تھی۔
''تم یہ سب بتانے کے لیے میرے پاس کیوں چلے آئے؟'' نیلی نے پوچھا۔
کوری اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔ ''میں ڈپٹی وارڈن اور ایف بی آئی کے ایجنٹ کے ہاتھوں بلیک میل ہونا نہیں چاہتا۔''
''کیا تمہیں اس رقم سے کوئی دلچسپی نہیں؟'' نیلی معنی خیز انداز میں بولی۔
''ان کے خیال میں تم اس جگہ سے واقف ہو جہاں وہ رقم چھپائی گئی ہے۔'' کوری اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔ اس نے اپنے سامنے رکھی ہوئی ڈش پر نمک چھڑکا اور کہنے لگا۔ ''میرا خیال ہے کہ تمہیں بھوک لگ رہی ہو گی۔''
''مجھے نہیں معلوم کہ وہ رقم کہاں ہے؟'' نیلی اس کے آخری جملے کو نظرانداز کرتے ہوئے بولی۔
''میرے خیال میں وہ ایف بی آئی ایجنٹ سمجھتا ہے کہ تم اس جگہ تک پہنچ سکتی ہو جہاں وہ رقم رکھی ہوئی ہے۔''
''کہیں اس ایجنٹ کا نام ہیری تو نہیں؟'' نیلی نے پوچھا۔
''ہاں... تم اسے جانتی ہو؟''
''وہ اس وقت سے میرے پیچھے پڑا ہوا ہے جب میں اور ڈریک میکسیکو کی سرحد پار کرنے کی کوشش میں پکڑے گئے تھے۔ اس نے ہم سے رقم کے بارے میں جاننے کی

کوشش کی لیکن ناکام ہونے کے بعد ڈریگ کو کار چوری کے الزام میں جیل بھجوا دیا۔ اس کے بعد سے وہ مسلسل میری جان کھا رہا ہے۔ حالانکہ میں اسے سو مرتبہ بتا چکی ہوں کہ مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں لیکن اس نے کبھی میری بات پر یقین نہیں کیا۔''

نیلی نے ایک طویل سانس لی اور سامنے رکھی ہوئی پلیٹ میں سے چپس منہ میں ڈالتے ہوئے بولی۔ ''کیا ہیری کو توقع ہے کہ تم مجھ سے کچھ اگلوانے میں کامیاب ہو جاؤ گے؟''

''میں نہیں جانتا۔'' کوری نے اپنا برگر ختم کیا اور چپس کی پلیٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''ممکن ہے اس کا خیال ہو کہ تم بستر سے بے وفائی کر کے میری جانب راغب ہو جاؤ اور میری مدد سے رقم حاصل کر کے مجھے حصے دار بنا لو۔''

نیلی نے بظاہر نرم لہجہ اختیار کیا لیکن اس میں سختی جھلک رہی تھی۔ ''یہ نہیں چلے گا۔ میں ذاتیات میں جانا نہیں چاہتی لیکن تم میرے مطلب کے آدمی نہیں ہو۔''

کوری پر ان ریمارکس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ نیلی کی آنکھیں مزید سکڑ گئیں۔ ان میں شک کی جگہ تجسس جھلک رہا تھا۔ وہ چیلنج کرنے کے انداز میں بولی۔ ''تم سمجھ رہے ہو نا؟''

''کیا؟''

''کیا تم جواب میں یہ نہیں کہو گے کہ میں بھی تمہارے مطلب کی نہیں ہوں۔ میں ایک مجرم کی بیوی ہوں اور تم جیل کے محافظ۔ ہم دونوں کا کوئی جوڑ نہیں۔''

کوری نے مشروب کا آخری گھونٹ لیا اور بوتل ایک طرف کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے خود بھی ٹھیک طرح نہیں معلوم کہ میرے مطلب کی عورت کون سی ہو سکتی ہے۔ میں اس معاملے میں کچھ زیادہ خوش نصیب نہیں ہوں۔'' کیفے سے باہر نکل کر کوری اس کے ساتھ موٹیل نمبر سات تک گیا۔

''تمہارا کیا خیال ہے؟'' نیلی اپنے کمرے کے دروازے پر رک کر بولی۔ ''اس کھیل کا نتیجہ کیا نکلے گا؟''

''میں نہیں جانتا۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں کھیل شروع کر دینا چاہیے، نتیجہ جو بھی ہو۔''

''میرا بھی یہی اندازہ ہے۔'' نیلی متفق ہوتے ہوئے بولی۔ یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

کمرے میں پہنچ کر نیلی نے کھڑکی کا پردہ ہٹایا اور اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔ گہری سوچوں میں گم وہ اسے اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔ کافی عرصے سے وہ بھی تنہا وقت گزار رہی تھی۔

☆☆☆

دوسرے روز ملاقات کے وقفے کے دوران جینز ڈریگ خاصا مضطرب نظر آ رہا تھا۔ اس نے نیلی سے پہلا سوال یہی کیا۔ ''اس نے تمہیں ہیری کے بارے میں کیا بتایا؟''

''کچھ نہیں۔'' نیلی نے سکون سے جواب دیا۔ ''اس سے زیادہ کچھ نہیں جو میں تمہیں پہلے بتا چکی ہوں۔'' وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''لیکن تم ہیری کو اتنی اہمیت کیوں دے رہے ہو؟''

''کیونکہ وہ اس رقم کے معاملے میں مجھ سے ہیرا پھیری کرنا چاہتا ہے۔''

''تم نے پہلے کبھی اس بارے میں نہیں بتایا۔'' وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

''میں نہیں سمجھتا تھا کہ تمہیں یہ سب جاننے کی ضرورت ہے۔'' وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ''تمہیں جتنا کم معلوم ہو، اتنا ہی میرے حق میں بہتر ہے۔'' نیلی نے لمحہ بھر کے لیے اپنی نظریں دوسری جانب پھیر لیں۔ وہ اسی طرح اسے تکلیف پہنچایا کرتا تھا اور یہ عام طور پر اس وقت ہوتا جب وہ پریشان یا غصے میں ہوا کرتا تھا۔ اور نیلی کا خیال تھا کہ پریشانی یا غصے کے عالم وہ بالکل بھی جونی ڈیپ نہیں لگتا تھا۔

اپنے دلی جذبات کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ بولی۔ ''تم کیا چاہتے ہو... میں اس پولیس آفیسر کے ساتھ کیسا رویہ اختیار کروں؟''

''میں نہیں جانتا۔ فی الحال اس سے کھیلتی رہو اور جاننے کی کوشش کرو کہ ہیری اور ڈپٹی وارڈن کیا منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔ لیکن اس سے بات چیت میں بہت محتاط رہنا ہوگا۔'' اس نے دھمکی آمیز انداز میں اس کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''اسے یہ نہیں بتانا کہ تم نے مجھے اپنی اور اس کی ملاقات کے بارے میں بتا دیا ہے۔ تمہیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے۔''

''میں سمجھ رہی ہوں ڈریگ۔''

ڈریگ نے اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھائے اور میز کی دوسری جانب بیٹھی ہوئی نیلی کے ہاتھ تھامتے ہوئے نرم لہجے میں بولا۔ ''ہنی! تم اس کے ساتھ مراسم بڑھا سکتی ہو۔ اس حد تک کہ وہ تمہارا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جائے۔''

''تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟'' وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

''میرا مطلب ہے کہ تم اس کے ساتھ اتنا مضبوط تعلق قائم کر لو کہ جب میری سفارش کرنے کا وقت آئے تو وہ انکار نہ کر سکے۔ میں چاہتا ہوں کہ گودام یا لانڈری سے مجھے کہیں اور منتقل کر دیا جائے۔ صابن اور بلیچ سے میرے ہاتھ کھردرے ہو گئے ہیں۔''

نیلی کا خون کھول کر رہ گیا اور وہ اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ''کیا تم یہ کہہ رہے ہو کہ میں اس شخص کے ساتھ تنہا وقت گزاروں تاکہ وہ تمہیں کسی بہتر کام پر لگا دے؟''

''ہاں۔'' ڈریگ معصومیت سے کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''میرا مطلب ہے کہ یہ محض ایک ناٹک ہوگا جو تم میرے لیے کرو گی تاکہ میری زندگی میں کچھ آسانی پیدا ہو جائے۔ تم میرا مطلب سمجھ رہی ہو نا؟''

''ہاں، اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔'' وہ جل کر بولی۔

بس اسٹاپ کی طرف جاتے ہوئے نیلی کو محسوس ہوا جیسے اس کا پورا جسم شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا ہو۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ڈریگ اس حد تک گر سکتا ہے۔

☆☆☆

اس شام کوری اپنی کار میں اس سے ملنے آیا اور اسے اپنے ساتھ شہر کے وسط میں واقع ایک اطالوی ریستوران میں لے گیا جو کلف کیفے سے کافی بہتر تھا۔ کوری نے وائن کا آرڈر دیا اور ڈنر آنے تک وہ دونوں اس سے دل بہلاتے رہے۔ نیلی نے اسے ڈریگ سے اپنی ملاقات کے بارے میں بتایا۔

''میں یقین نہیں کر سکتی کہ وہ مجھ سے ایسا کرنے کے لیے کہے گا۔'' وہ شکایتی انداز میں بولی۔ ''میں اس کی بیوی ہوں اور وہ مجھے تمہارے ساتھ تنہائی میں وقت گزارنے کے لیے کہہ رہا ہے تاکہ خوش ہو کر تم اسے کسی بہتر کام پر لگا دو۔''

''اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔'' کوری نے کہا۔ ''میں محض ایک اصلاحی افسر ہوں۔ صرف سارجنٹ یا اس سے اوپر کا کوئی افسر کسی قیدی کا تبادلہ دوسری جگہ کر سکتا ہے۔'' اس نے ایک لمحے کے لیے نیلی کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''تم آج بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔ جینز اور بوٹوں کے بغیر۔'' نیلی نے اس شام تیار ہونے میں خاصا اہتمام کیا تھا۔ اس نے سیاہ اسکرٹ اور اونچی ہیل کے سینڈل پہن رکھے تھے جبکہ سردی سے بچنے کے لیے پوری آستینوں والا سوئٹر زیب تن کر رکھا تھا۔

نیلی نے کندھے اچکائے اور بولی۔ ''میں نہیں چاہتی کہ تم مجھے مضافات میں رہنے والی ایسی لڑکی سمجھو جس کے پاس پہننے کے لیے ڈھنگ کے کپڑے نہیں ہیں۔ مجھے لباس پہننے کا سلیقہ آتا ہے لیکن ڈریگ نہیں چاہتا کہ میں اچھے کپڑے پہن کر اس سے ملنے جیل آؤں۔ اس کا خیال ہے کہ اس طرح جیل کے محافظوں کی نظروں کا نشانہ بن سکتی ہوں۔ اس لیے مجبوراً مجھے جینز اور ٹی شرٹ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔''

کوری مسکراتے ہوئے بولا۔ ''زیادہ تر افسران، قیدیوں سے ملنے کے لیے آنے والی عورتوں پر توجہ نہیں دیتے حالانکہ ان میں سے بہت سی عورتوں کا کریکٹر ٹھیک نہیں ہوتا اور وہ اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے لیے عمدہ لباس اور بھاری میک اپ کا سہارا لیتی ہیں۔''

''کیا تم مجھے بھی ان عورتوں جیسا سمجھتے ہو؟''

''نہیں۔'' کوری اس کے چہرے پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے بولا۔ ''میں یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوں کہ اس رات تمہیں بس اسٹاپ پر اتارنے کے بعد میں نے موٹیل تک تمہارا تعاقب کیا تھا۔ جب تم گرے ہاؤنڈ کمپاؤنڈ میں گئیں تو نہ جانے مجھے کیوں محسوس ہوا کہ تم واپس آؤ گی لہٰذا میں نے تمہارا انتظار کیا اور اس کے بعد پیچھا کرتا ہوا موٹیل تک پہنچ گیا۔''

''اب تم مجھے یہ سب کیوں بتا رہے ہو؟''

''میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ... ڈپٹی وارڈن اور ایجنٹ ہیری کا آلۂ کار بننے سے پہلے ہی میں تم میں دلچسپی لینے لگا تھا۔''

''کیسی دلچسپی... کیا تمہاری نیت پہلے ہی خراب تھی؟''

''نہیں اس حد تک نہیں۔ گو کہ مجھے یقین ہے کہ یہ مرحلہ بھی بالآخر آ ہی جائے گا۔ اس وقت تو میں صرف یہ چاہتا تھا کہ تمہارے بارے میں زیادہ سے زیادہ جان سکوں۔ تمہارا نام کیا ہے، تم کہاں سے آئی ہو اور موجودہ حالات میں کس طرح زندگی گزار رہی ہو وغیرہ وغیرہ۔'' یہ کہہ کر وہ رک گیا جیسے سوچ رہا ہو کہ آگے کیا کہنا ہے۔

''تم میرا نام پہلے سے جانتے ہو؟'' وہ تیز لہجے میں بولی۔ یہ وہی لہجہ تھا جو اس نے پہلی ملاقات کے دوران اختیار کیا تھا۔

کوری نے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔ ''نہیں، صرف تمہیں جاننے کی کوشش کر رہا ہوں نیلی۔'' پہلی بار اس نے نیلی کا نام لیا تھا جسے سن کر نیلی کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔

کھانے کے دوران میں پہلی بار نیلی نے اس شخص کے

بارے میں سوچنا شروع کیا جو اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ غور سے دیکھا تو اسے کوری میں کافی کشش محسوس ہوئی۔ وہ بیسٹر کو بھول کر اس کے بارے میں سوچنے لگی۔ وہ محبت کی بھوکی تھی اور اس کے سامنے بیٹھا ہوا شخص اسے محبت کی بھیک دے سکتا تھا۔

☆☆☆

رات دیر تک وہ دونوں خوش گپیوں میں مشغول اور بیئر سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ نیلی کا کمرا بہت معمولی اور گندہ تھا۔

"او خدایا! کتنا گندہ کمرا ہے۔" کوری نے اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "تم اس سے بہتر جگہ پر نہیں رہ سکتیں؟"

"یہ بھی بیسٹر کا آئیڈیا تھا۔" نیلی سپاٹ لہجے میں بولی۔ "اس کا خیال ہے کہ اگر میں نے کسی مہنگی جگہ پر رہائش اختیار کی تو لوگوں کی نظروں میں آجاؤں گی۔" یہ کہہ کر اس نے کمرے کی لائٹ بجھادی اور بستر پر دراز ہوگئی۔

علی الصباح کوری کام پر جانے کے لیے تیار ہونے لگا تو نیلی نے پشت سے آکر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور بولی۔ "مسٹر آفیسر! ہم یہاں سے کہاں جائیں گے؟"

"فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتا۔" کوری آئینے میں اپنے بال سنوارتے ہوئے بولا۔ "تم جانتی ہو کہ وہ رقم کہاں رکھی ہوئی ہے تو ہم بیسٹر ڈریگ، ڈپٹی وارڈن اور ایف بی آئی ایجنٹ کو خدا حافظ کہہ کر اس رقم سمیت اپنی جنت کی طرف پرواز کر جائیں گے۔" پھر وہ تیزی سے مڑا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "لیکن تم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔"

"نہیں، کاش مجھے معلوم ہوتا۔" اس نے سوچا کہ ہر ایک تان پیسوں پر ہی آکے ٹوٹتی ہے۔

"کاش اس رقم کے بارے میں معلوم ہو جائے تو ہماری زندگی میں انقلاب آسکتا ہے۔" وہ گھوم پھر کر اسی موضوع پر آگیا۔

نیلی پیر پٹختے ہوئے اپنے بستر پر جا کر بیٹھ گئی اور تیز لہجے میں بولی۔ "تم بار بار رقم کا ذکر چھیڑ دیتے ہو، آخر تمہارے ذہن میں کیا ہے؟"

کوری کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ "جب تم جانتی ہی نہیں کہ وہ رقم کہاں چھپائی گئی ہے تو بتانے سے فائدہ۔"

"ہاں، واقعی مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

کوری موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ "اگر میں بیسٹر کو جیل سے باہر لے آؤں تو مجھے کیا فائدہ ہوگا؟"

"یہ کام تم کیسے کرسکو گے؟" وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

کوری کی نظریں اس کے خوب صورت جسم پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ "بہت جلد۔"

☆☆☆

دفتر پہنچ کر اس نے ڈپٹی وارڈن اور ایف بی آئی ایجنٹ کو بتادیا کہ نیلی رقم کے بارے میں کچھ نہیں جانتی

"لیکن میرا خیال ہے کہ بیسٹر اس سلسلے میں... راہنمائی کرسکتا ہے اگر ہم اسے تھوڑی سی رعایت دے سکیں۔ نیلی کا کہنا ہے کہ وہ لانڈری کے کام سے تنگ آچکا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے ڈیری فارم پر لگا دیا جائے۔"

ہیری اور ڈفی نے حیران ہوتے ہوئے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر ڈفی غضب ناک لہجے میں بولا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ ہم اسے فرار ہونے کا موقع فراہم کریں؟"

"کیوں نہیں، وہ ایجنٹ ہیری کی نگرانی میں رہے گا اور کام پورا ہونے کے بعد واپس آجائے گا۔ ریکارڈ میں بھی یہ نہیں آئے گا کہ وہ جیل سے باہر گیا تھا۔"

ہیری نے اپنی ٹھوڑی سہلائی اور بولا۔ "خیال بُرا نہیں ہے۔"

"جیل سے نکلنے کے بعد اگر ہم اس کی نگرانی نہ کرسکے تو کیا ہوگا؟" ڈفی پریشان ہوتے ہوئے بولا۔ "ہم اسے کھو سکتے ہیں۔"

"یہ کوئی مسئلہ نہیں۔" ہیری اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ "اگر ہم اسے ایک ایسی کار فراہم کرسکیں جس میں ٹریکر لگا ہوا ہو تو ہم بڑی آسانی سے اپنی کار میں اس کا تعاقب کرسکتے ہیں۔"

"اگر وہ باہر نکلنے کے بعد میری کار استعمال کرے تو کیسا رہے گا؟" کوری نے تجویز پیش کی۔ "نیلی اس کار کو پہچانتی ہے۔ وہ یقیناً اس میں آرام محسوس کرے گی۔"

ہیری کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ "ہاں... ہاں، کیوں نہیں۔"

ڈفی اس تجویز سے متفق نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے احتجاجاً کچھ کہنا چاہا لیکن اس سے پہلے کوری نے بولنا شروع کردیا۔ "میں نیلی کو بتاؤں گا کہ بیسٹر کو ڈیری فارم منتقل کروا سکتا ہوں۔ وہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں سے وہ آسانی سے باہر نکل سکتا ہے۔ میں اسے بتاؤں گا کہ وہ اور میں فارم

سے ایک میل کے فاصلے پر گاڑی پارک کرکے بیسٹر کا انتظار کریں گے اور اس کے عوض میں لوٹی ہوئی رقم میں سے ایک لاکھ ڈالرز لوں گا۔ جب بیسٹر میری کار میں بیٹھ جائے گا تو ہم اسے لے کر اس جگہ جائیں گے جہاں وہ رقم چھپائی گئی ہے۔ ایک بار ہم وہاں پہنچ جائیں تو تم بھی پیچھا کرتے ہوئے آجانا۔ اس کے بعد سب کچھ آسان ہو جائے گا۔"

ہیری کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی لیکن ڈفی انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "یہ میرے منصب کے خلاف ہے کہ ایک قیدی کو اس طرح باہر جانے کا موقع فراہم کروں۔"

"دیکھو!" ہیری اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ "تم حقیقت میں اسے باہر جانے کا موقع فراہم نہیں کررہے۔ یہ محض ایک جوا ہے اور تکنیکی طور پر وہ باہر نکلنے کے بعد بھی ہماری ہی تحویل میں ہوگا کیونکہ ایوانز پورے وقت اس کے ساتھ رہے گا۔" پھر وہ کوری سے بولا۔ "مجھے یہ آئیڈیا پسند آیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ کامیاب رہے گا۔ لیکن تمہیں یقین ہے کہ یہ سب کرلو گے؟"

"بالکل جناب۔" کوری پُراعتماد انداز میں بولا۔ "دراصل یہ نیلی کا آئیڈیا تھا۔ وہ چاہ رہی تھی کہ بیسٹر کو لانڈری سے کہیں اور منتقل کردیا جائے۔ میں نے تو اس سے اپنے حصے کی بات بھی نہیں کی بلکہ اس نے خود ہی پیشکش کی۔ وہ سمجھتی ہے کہ میں ایک احمق محافظ ہوں جسے پیسے کمانے نہیں آتے۔"

☆☆☆

جیل کے ملاقاتی کمرے میں نیلی اور بیسٹر ایک دوسرے کی جانب جھکے ہوئے سرگوشیوں میں مصروف تھے۔

"کیا تم اس شخص پر بھروسا کرسکتی ہو؟" بیسٹر کے انداز میں بے چینی تھی۔

"کیوں نہیں۔" نیلی نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ "پیسے کے لیے انسان سب کچھ کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ کاش، تم اس کی آنکھوں میں وہ چمک دیکھ سکتے جب میں نے اسے ایک لاکھ ڈالرز کی پیشکش کی تھی۔"

"میں اتنی زیادہ رقم اسے نہیں دے سکتا۔ زیادہ سے زیادہ دس ہزار ڈالرز وہ بھی کام ہونے کی صورت میں۔" اس نے کچھ دیر توقف کیا پھر بولا۔ "اگر تم اس کے ساتھ تنہائی میں کچھ وقت گزار لو تو شاید وہ اس رعایت پر آمادہ ہو جائے۔"

"بالکل نہیں... یہ کیسے ممکن ہے۔" وہ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔ "میں تمہاری ہوں اور ہمیشہ تمہاری ہی رہوں گی۔"

امپائرنگ

کھیل کے دوران امپائر کے فیصلوں پر مسلسل تنقید ہورہی تھی۔ سب سے زیادہ شور ایک شخص مچا رہا تھا۔ جب معاملہ امپائر کی برداشت سے باہر ہوگیا تو وہ اس شخص کے پاس پہنچا۔ "امپائرنگ میں کررہا ہوں یا تم کررہے ہو؟" اس نے جھلا کر پوچھا۔

"امپائرنگ!" اس شخص نے حیرت سے کہا۔ "وہ تو نہ تم کررہے ہو، نہ میں کررہا ہوں۔"

☆☆☆

"مجھے فخر ہے کہ میں نے تیس سال تک کرکٹ کھیلی اور کبھی 25 سے کم رنز نہیں بنائے اور تین سے کم وکٹیں نہیں لیں۔" جارج نے اپنے دوستوں کو بتایا۔

"کاش... میں بھی یہ بات کہہ سکتا۔" ٹیڈ نے بے حد یاس سے کہا۔

"کیوں نہیں کہہ سکتے؟" ہیری نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔

"آخر جارج نے بھی تو یہ بات کہی ہے۔"

☆☆☆

کرکٹ کھیلنے میں جارج کی مصروفیت حد سے گزر گئی۔ انتہا یہ ہوئی کہ وہ اتوار کے دن بھی کرکٹ کھیلنے میں لگا رہتا۔ ایک روز یہ صورت حال اس کی بیوی کی برداشت سے باہر ہوگئی، وہ پھٹ پڑی۔

"ہر وقت کرکٹ، ہر وقت کرکٹ... میں تو کہتی ہوں، اگر تم کسی اتوار کو کرکٹ کھیلنے نہ گئے تو شاید میں خوشی سے مرہی جاؤں گی۔"

"میں خوب سمجھتا ہوں۔" جارج نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "تم مجھے رشوت دینے کی کوشش کررہی ہو۔"

مرسلہ: طیب شاہین، منڈی بہاؤالدین

''ٹھیک ہے، میں تم پر بھروسا کر رہا ہوں۔ مجھے دھوکا مت دینا... سن رہی ہو؟''

''میں تمہیں کبھی دھوکا نہیں دے سکتی۔ تم ہی تو میری دنیا ہو اور یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔''

☆☆☆

اس وقت وہ کوری کے اپارٹمنٹ میں موجود تھی اور وہ دونوں کھانے کی میز پر باتیں کر رہے تھے۔ کوری نے مطلب کی بات زبان پر لاتے ہوئے کہا۔ ''میری بات غور سے سنو۔ اب منصوبے پر عمل کرنے کا وقت قریب آرہا ہے اور ہمیں اپنے تمام پتے شو کر دینے چاہئیں۔'' اس نے اپنی نظریں نیلی کے چہرے پر جمادیں اور بولا۔ ''اب وقت آگیا ہے کہ تم مجھے اس جگہ کے متعلق بتادو جہاں رقم چھپائی گئی ہے۔ اس سے ہمیں منصوبے کو فول پروف بنانے میں مدد ملے گی۔''

نیلی تذبذب کے عالم میں اپنا نچلا ہونٹ کاٹنے لگی۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھے جا رہے تھے۔ کسی نے پلک تک نہیں جھپکائی پھر نیلی ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''وہ رقم موڈیسٹو کے وسط میں واقع ایک پبلک اسٹور میں موجود ہے جہاں لوگ امانتاً اپنا سامان رکھواتے ہیں۔''

کوری غصے سے بولا۔ ''تم نے وہ رقم اب تک وہاں سے کیوں نہیں نکالی؟ یا اگر مجھے پہلے بتا دیتیں تو ہم دونوں مل کر کوئی بندوبست کر لیتے۔ لگتا ہے کہ تم ابھی تک بیسٹر کا ساتھ دے رہی ہو۔''

''نہیں، میری طرف سے وہ جہنم میں جائے۔'' اس کے لہجے میں ایسی ترتراہٹ تھی جیسے مشین گن سے گولیاں نکل رہی ہوں۔ ''بیسٹر کا کہنا ہے کہ اس اسٹور کے چاروں طرف خاردار تاروں کی باڑھ لگی ہوئی ہے اور وہاں چوبیس گھنٹے سیکیورٹی کمپنی کا پہرا رہتا ہے، ان لوگوں کے لیے جو شام کے بعد وہاں جانا چاہیں۔ مرکزی دروازے پر ایک کی بورڈ نصب ہے جو چھ ہندسوں کے کوڈ سے کھلتا ہے۔ بیسٹر نے بھی وہ کوڈ مجھے نہیں بتایا۔ وہ بہت بڑا اسٹور ہے اور میں نہیں جانتی کہ بیسٹر نے اس کے کس حصے میں لاکر کرائے پر لیا ہے۔ بیسٹر نے وہاں بھی نمبروں والا تالا لگا رکھا ہے جس کی ترتیب مجھے معلوم نہیں۔ اس لیے اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ وہ لاکر کس حصے میں واقع ہے، تب بھی اسے نہیں کھول سکتی۔''

یہ کہہ کر وہ زور زور سے رونے لگی اور اپنی دونوں مٹھیاں میز پر مارنے لگی۔ کوری نے بڑی مشکل سے اسے چپ کروایا۔ اس نے ٹشو پیپر سے نیلی کی آنکھیں صاف کیں اور پیار سے اس کی پشت تھپتھپانے لگا۔ پُرسکون ہو جانے کے باوجود اس کی آنکھوں میں احتجاج تھا۔ وہ شکایتی لہجے میں بولی۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں، تمہیں سب کچھ بتاؤں یا نہیں؟ بیسٹر سے جھوٹ بولوں یا نہ بولوں تاکہ وہ میری سنائی ہوئی کہانیوں پر شک نہ کرے۔''

''زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' وہ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔ ''میری بات غور سے سنو۔ تم یہ تو جانتی ہو کہ وہ اسٹور کہاں ہے؟''

''ہاں، میں گزشتہ دو سال سے ہر مہینے تیس ڈالر کا منی آرڈر بھیج رہی ہوں۔ اب تم میرا ہاتھ چھوڑ دو، تم سے مجھے تکلیف پہنچ رہی ہے۔''

کوری نے اس کے کہنے پر عمل کیا اور اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کے برابر آ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں بیسٹر کو جیل سے باہر نکالنے کا انتظام کر رہا ہوں۔ اس کے بعد ہم تینوں ایک ساتھ موڈیسٹو جائیں گے اور وہ رقم وہاں سے نکال لیں گے اور جب یہ رقم ہمارے ہاتھ لگ جائے گی تو بیسٹر کو حیران و پریشان چھوڑ کر ہم کہیں غائب ہو جائیں گے۔''

نیلی بے یقینی کے انداز میں بولی۔ ''کیا ہم یہ کر پائیں گے؟ وارڈن اور ایف بی آئی ایجنٹ کو چکما دے کر نکلنا آسان ہوگا اور بیسٹر کا کیا بنے گا... کیا ہمیں اسے قتل کرنا ہوگا؟''

''نہیں بے بی، ہم قاتل نہیں ہیں۔ ہم بیسٹر کو اسی لاکر میں بند کر دیں گے۔ دوسری صبح اس کا شور سن کر کوئی لاکر کھولے گا لیکن اس وقت تک ہم بہت دور جا چکے ہوں گے۔'' یہ کہہ کر اس نے نیلی کا جھکا ہوا سر اٹھایا اور اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے بولا۔ ''مجھے اس منصوبے کی کامیابی پر کوئی شبہ نہیں۔ تم بالکل بے فکر ہو جاؤ۔''

☆☆☆

دوسری صبح ڈپٹی وارڈن اور ایجنٹ ہیری نے کوری کو بتایا کہ منصوبے پر عمل کرنے کا وقت آگیا ہے اور اس کے پہلے مرحلے میں بیسٹر ڈریک کو جیل کی دیواروں سے نکال کر ڈیری فارم منتقل کر دیا گیا ہے۔

''یہ ایک باعزت کام ہے۔'' ڈفی نے اسے یاد دلایا۔ ''ڈیری فارم کی کوئی دیوار نہیں ہے، محض اس کے گرد ایک باڑھ لگا دی گئی ہے۔ قیدیوں کی آخری بار گنتی شام چھ بجے ہوتی ہے۔ وہ بڑی آسانی سے کسی کونے کھدرے میں جا کر

باڑھ پھلانگ سکتا ہے اور مزے سے چلتا ہوا گاڑی تک پہنچ جائے گا۔ وہاں چھت پر نہ کوئی سرخ لائٹ ہے اور نہ کوئی پہرے دار۔ وہاں کام کرنے والے قیدی بے ضرر قسم کے ہیں اور آج تک کسی نے وہاں سے بھاگنے کی کوشش نہیں کی۔ بیسٹر ڈریک یہ جرأت کرنے والا پہلا قیدی ہوگا۔''

''ٹھیک ہے، ہماری تیاری بھی مکمل ہے۔'' کوری بولا۔ ''نیلی مجھے اس ٹرانسفر کے عوض لوٹی ہوئی رقم میں سے ایک لاکھ ڈالرز دینے پر آمادہ ہو گئی ہے۔ وہ کل کی ملاقات میں بیسٹر کو بتا دے گی کہ سارے انتظامات مکمل ہیں۔ وہ رات میں مقررہ وقت پر ڈیری فارم کی باڑھ پھلانگ کر باہر آجائے اور ہائی وے پر چلتے ہوئے میری کار تک پہنچ جائے۔ جہاں سے میں اور نیلی اسے لے کر روانہ ہو جائیں گے۔'' پھر وہ ہیری سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے پاس وہ ٹریکنگ ٹرانسمیٹر ہے؟''

''ہاں، وہ میری کار میں رکھا ہوا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں اپنی گاڑی پارکنگ لاٹ میں لے آؤں گا اور تم وہ ٹرانسمیٹر اس میں نصب کر دینا۔''

ڈپٹی وارڈن نے بے یقینی کے انداز میں سر ہلایا اور بولا۔ ''میں ابھی تک اس اسکیم کا قائل نہیں ہو سکا۔ پہلے ہم نے کسی اطلاع کے بغیر اسے جیل کی چار دیواری سے باہر ڈیری فارم منتقل کر دیا اور اب اسے باہر سڑک پر جانے کی اجازت دے رہے ہیں۔ فرض کرو کہ راستے میں کسی نے اسے پکڑ لیا یا ہمارے ڈنکر نے وقت پر دھوکا دے دیا تو کیا ہوگا؟''

ہیری اپنی جگہ سے اٹھا اور ڈپٹی وارڈن کی میز پر دونوں ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے بولا۔ ''اب اس منصوبے پر کام شروع ہو چکا ہے اور اب ہمیں صرف سختی سے اس پر عمل کرنا ہے۔ دیکھو، یہ بہت ہی آسان منصوبہ ہے۔ پُرسکون ہو کر اس پر عمل کرنے کی کوشش کرو۔ کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی اور اگر کچھ ہوا تو ہم سنبھال لیں گے۔''

ہیری میز پر جھکا ہوا تھا اور ڈپٹی وارڈن کو اس کے رکھے ہوئے کوٹ کی اندرونی جیب میں سروس ریوالور صاف نظر آرہا تھا جو ایف بی آئی ایجنٹ ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ ڈپٹی وارڈن خوف زدہ ہو گیا اور ہکلاتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے، ہم منصوبے پر سختی سے عمل کریں گے۔''

''بہت خوب۔'' ہیری بولا پھر وہ کوری سے کہنے لگا۔ ''چلو تمہاری کار میں ٹریکر نصب کر دوں۔'' جب کوری اور ہیری دفتر سے باہر چلے گئے تو ڈفی نے اپنی میز کی نچلی دراز کھولی،

بچے جو سب سے اچھے

☆ ایک بچہ اسکول میں داخلہ لینے گیا۔ استاد صاحب نے پوچھا: ''تمہیں کیا آتا ہے، مجھے کچھ سناؤ۔''
بچہ بولا: ''سر جی! کہاں تک سنو گے کہاں تک سناؤں... ہزاروں ہی فسانے ہیں، کیا کیا سناؤں۔''

☆ بوڑھی عورت بچے سے: ''کیا تمہاری گھڑی ٹائم بتاتی ہے؟''
بچہ: ''نہیں بتاتی تو نہیں، البتہ دیکھنا پڑتا ہے۔''

☆ استاد نالائق بچے سے: ''تم کلاس کے سب سے نالائق اور نکمے بچے کیوں ہو؟''
بچہ: ''اس لیے کہ مجھ سے پہلے جو نکما تھا، وہ اسکول چھوڑ گیا۔''

☆ استاد بچے سے: ''میں تم سے اتنی دیر سے سوال پوچھ رہا ہوں تم جواب کیوں نہیں دیتے؟''
بچہ: ''میری امی کہتی ہیں بڑوں کو کبھی جواب نہیں دیتے۔''

☆ ایک بچے نے اپنے دوست کی تصویر بنائی اور اگلے دن اپنے دوست کو دکھائی۔ بچے کا دوست حیرت سے بولا: ''افسوس میں کتنا بدل گیا ہوں۔''

☆ باپ اپنے بچے سے: ''یہ تم میز پر کیا لکھ رہے ہو؟''
بچہ: ''ابا جان ماسٹر صاحب نے کہا تھا، میز پر مضمون لکھ کر لاؤ۔''

☆ استاد داخل ہونے والے چھوٹے بچے سے: ''بیٹا! ذرا گنتی تو سناؤ؟''
بچہ: ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ، نو، دس، غلام، بیگم، بادشاہ، اور بس۔''

☆ ایک بے انتہا موٹے آدمی کی شرٹ پر ڈھیر سارے جہاز بنے ہوئے تھے۔ ایک بچہ اسے دیکھ کر بار بار ہنستا۔ آخر موٹے آدمی نے جھڑک کر پوچھ ہی لیا: ''میری شرٹ پر جہاز ہے۔ کوئی کارٹون نہیں جو تم بار بار بتیسی نکال رہے ہو۔''
بچہ پیٹ کو پکڑ کے لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے بولا: ''میں اتنے بڑے ہوائی اڈے کو دیکھ کر ہنس رہا ہوں۔''

(پشاور سے عثمان غنی کا انتخاب)

اور اس میں سے اپنا اعشاریہ تین آٹھ کا سروس ریوالور نکال لیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی گڑبڑ کی صورت میں صرف ہیری مسلح ہو۔

☆☆☆

جیل کے باہر جب ہیری اور کوری نے پارکنگ لاٹ میں اپنی کاریں برابر برابر کھڑی کردیں تو ہیری نے اپنی گاڑی سے ایک ڈبا نکالا اور اسے کھولنے لگا۔ اس نے کوری سے پوچھا۔

''ڈنی کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟''

''کس سلسلے میں؟'' کوری نے الٹا سوال کر ڈالا۔

''تمہارا خیال ہے کہ وہ اس کام کے لیے تیار ہے؟ مجھے تو وہ کچھ جذباتی نظر آرہا ہے۔''

''میں نے بھی یہ بات محسوس کی ہے۔''

''اس منصوبے کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

''اچھا ہے، یہ یقیناً کارآمد ہوگا۔ البتہ ایک چیز مجھے پریشان کررہی ہے۔''

''وہ کیا؟''

''مجھے تم لوگوں نے بالکل نظرانداز کردیا ہے اور مجھ سے صرف سارجنٹ کی پروموشن کا وعدہ کیا گیا ہے جبکہ تم اور ڈنی بارہ لاکھ ڈالرز آپس میں بانٹ لو گے جبکہ میں بھی اس منصوبے میں برابر کا شریک ہوں اور اس اسکیم کو یہاں تک لانے میں میرا نمایاں کردار ہے۔ مجھے بھی اس رقم میں سے حصہ ملنا چاہیے۔''

ہیری نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ''تمہارا کیا مطالبہ ہے؟''

''اس رقم کو برابر تقسیم کرنے کی صورت میں تم دونوں کے حصے میں چھ چھ لاکھ ڈالرز آئیں گے۔ اگر اس میں سے ایک ایک لاکھ ڈالرز مجھے دے دو، تب بھی تم دونوں کے پاس پانچ پانچ لاکھ ڈالرز بچتے ہیں۔''

''اس طرح تم بھی دو لاکھ ڈالرز کے مالک بن جاؤ گے۔'' ہیری مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں حیران تھا کہ اب تک تم نے اپنے حصے کا مطالبہ کیوں نہیں کیا۔ مجھے تم سے یہی توقع تھی۔ تم اسمارٹ اور قابلِ بھروسا ہو جبکہ ڈنی ان معاملات سے محروم ہے۔ کیا خیال ہے اگر یہ رقم ہم دونوں آپس میں بانٹ لیں؟''

''تم یہ کس طرح کرو گے؟'' کوری نے بظاہر دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''بہت آسان ہے۔ ہم دونوں رقم لے کر [illegible] ہوجائیں گے اور جانے سے پہلے ڈپٹی وارڈن، مفرور مجرم اور اس کی محبوبہ کو لاکر میں بند کرکے نیا تالا لگادیں گے جو میں ساتھ لے کر آؤں گا۔ یہ ڈنی کا مسئلہ ہے کہ وہ بعد میں اپنی پوزیشن کی کس طرح وضاحت کرتا ہے۔''

''تم ایف بی آئی ایجنٹ ہو۔ کیا تمہارے لیے اس طرح غائب ہوجانا آسان ہوگا؟'' کوری نے پوچھا۔

''میں ایک سال پہلے ملازمت سے استعفا دے چکا ہوں لیکن میں نے ڈنی کو یہ بات نہیں بتائی۔ اس لیے کوئی مجھے تلاش نہیں کرے گا اور اگر تمہارے اندر ذرا سی بھی [illegible] ہے تو تم کل صبح ہی اپنا استعفا جیل کی انتظامیہ کے [illegible] کردینا۔ اس طرح تمہاری تلاش کا بھی کوئی جواز نہیں [illegible] گا۔ پھر ہم دونوں اپنی اپنی کاروں میں الگ الگ [illegible] پر روانہ ہوجائیں گے۔''

اب کوری کے مسکرانے کی باری تھی۔ وہ بولا۔ ''مسئلہ یہ ہے کہ تم ٹریکر کی مدد سے میرا تعاقب کرسکتے ہو جس سے مجھے تھوڑی بہت گھبراہٹ ہوسکتی ہے۔''

''میں تمہیں مانیٹر دے دوں گا۔ اس سے تم پتا لگا سکتے ہو کہ تمہارا تعاقب کیا جارہا ہے یا نہیں۔'' وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو جوان! ہمیں ایک دوسرے پر بھروسا کرنا چاہیے۔ میں لالچی نہیں ہوں اور چھ لاکھ ڈالرز پر [illegible] کروں گا۔ کیا ہم یہ سودا کرسکتے ہیں؟''

کوری نے ایک لمحے کے لیے نیلی، ڈپٹی وارڈن اور ہیسٹر ڈریگ کے بارے میں سوچا پھر بولا۔ ''مجھے منظور ہے۔''

ہیری نے ڈبا کھول کر اسے ٹریکر دکھایا جو ایک چھوٹے سے باکس کی شکل میں تھا اور اس میں ایک سوئچ لگا ہوا تھا۔ اس نے وہ باکس کار کے ایک دروازے کے ساتھ چپکا دیا اور بولا۔ ''اس میں انتہائی طاقتور مقناطیس لگا ہوا ہے۔ اگر تم اپنی کار کسی جیپ سے بھی ٹکرا دو، تب بھی یہ اپنی جگہ سے نہیں گرے گا۔''

ہیری نے اپنی کار سے ایک پرانا کمبل نکالا اور اسے کوری کی کار کے عقبی حصے کے نیچے بچھانے کے بعد کوٹ اتار کر اس پر لیٹ گیا۔ اس نے بڑی مہارت سے وہ ٹریکر کار کے نیچے لگایا اور اس کا سوئچ آن کردیا پھر وہ لیٹے لیٹے بولا۔ ''میری کار کے ڈیش بورڈ پر اس کا مانیٹر رکھا ہوا ہے۔ جاکر دیکھو، اس کی اسکرین سیاہ سے نیلے رنگ میں تبدیل ہوگئی۔''

جب کوری وہاں سے ہٹ گیا تو ہیری نے اپنی جیب

سے ایک دوسرا ٹریکر نکالا اور اسے پہلے والے ٹریکر کی مخالف سمت میں نصب کرکے اس کا سوئچ بھی آن کردیا۔

''اسکرین نیلی ہوگئی ہے۔'' کوری کی آواز آئی۔

''گڈ!'' یہ کہہ کر ہیری کار کے نیچے سے نکل آیا۔ اس نے کمبل لپیٹ کر اپنی کار میں رکھا اور اپنا کوٹ پہننے کے بعد اس نے کوری کو مانیٹر کے بارے میں بتایا اور بولا۔ ''اس کے ذریعے مجھے تمہاری کار کے محلِ وقوع کا پتا چلتا رہے گا جب تک کہ یہ کام انجام کو نہ پہنچ جائے۔''

اس نے اپنی دانست میں پکا کام کرلیا تھا۔ اب اگر کوری اسے ڈبل کراس کرنے کی صورت میں پہلا ٹریکر ہٹا دیتا، تب بھی وہ مانیٹر کی فریکوئنسی تبدیل کرکے دوسرے خفیہ ٹریکر کی مدد سے اس کا پیچھا کرسکتا تھا۔ سابق ایف بی آئی ایجنٹ ہونے کی وجہ سے وہ جانتا تھا کہ بے ایمان لوگوں سے معاملہ کرتے وقت محتاط رہنا چاہیے۔

☆☆☆

کوری کا خیال تھا کہ نیلی اپارٹمنٹ میں اس کا انتظار کررہی ہوگی لیکن اس کے بجائے وہ اپنے موٹیل میں بیٹھی اپنی تیاریوں میں مصروف تھی۔ اسے سب سے پہلے یہ دیکھنا تھا ہیسٹر نے اسے جو بیس ہزار ڈالرز دیے تھے، ان میں سے کتنے باقی بچے تھے۔ بینک ڈکیتی کے بعد کار میں فرار ہوتے ہوئے ڈریگ کا ذہن تیزی سے کام کررہا تھا۔ اتنی بڑی رقم کے ساتھ وہ میکسیکو کی سرحد پار نہیں کرسکتا تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا اور اس نے نوٹوں سے بھرے ہوئے دونوں تھیلے اسٹور میں رکھوا دیے۔ احتیاطاً اس نے چاقو کی مدد سے ایک بیگ کھول کر اس میں سے بیس ہزار ڈالرز کے نوٹ نکالے اور انہیں ایک لفافے میں ڈال کر قریبی پوسٹ آفس سے جنرل ڈلیوری کی معرفت نیلی کو پوسٹ کردیے۔ یہ سارا کام ایک گھنٹے کے اندر ہوگیا۔ اس کا خیال تھا کہ میکسیکو کی سرحد پار کرنے کے بعد جب معاملہ ٹھنڈا ہوجائے گا تو نیلی کسی دن موڈیسٹو آکر جنرل ڈلیوری سے نوٹوں کا وہ پیکٹ وصول کرلے گی۔ اس کے بعد وہ کہیں بھی جاکر اس رقم سے بنا گزارہ کرسکتے تھے۔

یہ ایک بہت اچھا منصوبہ تھا لیکن بدقسمتی سے وہ سرحد پار کرتے ہوئے کار چوری کے الزام میں پکڑا گیا اور اسے جیل ہوگئی۔ نیلی نے جیل کے قریب ہی وہ کمرا کرائے پر لے لیا اور گمنامی کی زندگی گزارنے لگی۔ ہیسٹر نے اسے سختی سے تاکید کر رکھی تھی کہ وہ زیادہ لوگوں سے ملنے جلنے سے گریز کرے اور نہ ہی کسی پر یہ ظاہر ہونے دے کہ وہ اور ہیسٹر لوٹی

گفتگو کے دوران

ہر دو اشخاص کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ وہ کسی بات پر ایک دوسرے سے متفق ہوجائیں، اس سلسلے میں دو نسانوں کی گفتگو سنیے۔

''سناؤ اتنا عرصہ کہاں رہے؟''

''میں اسپتال میں تھا۔''

''اوہ، یہ تو بہت برا ہوا۔''

''نہیں بہت اچھا ہوا۔ میں نے وہاں ایک نرس سے شادی کرلی۔''

''اوہ، یہ تو بہت اچھا ہوا۔''

''نہیں بہت بُرا ہوا۔ اس کے پہلے ہی نو بچے ہیں۔''

''اوہ، یہ تو بہت برا ہوا۔''

''نہیں بہت اچھا ہوا۔ ایک بہت بڑا مکان اس کی ملکیت ہے۔''

''اوہ، یہ تو بہت اچھا ہوا۔''

''نہیں بہت بُرا ہوا۔ چند روز قبل وہ مکان جل گیا۔''

''اوہ یہ تو بہت بُرا ہوا۔''

''نہیں بہت اچھا ہوا۔ وہ بھی بچوں سمیت مکان میں جل گئی۔''

''اوہ، یہ تو بہت اچھا ہوا۔''

''ہاں، یقیناً بہت اچھا ہوا۔''

مرسلہ: طارق عزیز، کوٹری

ہوئی رقم کے بارے میں کچھ جانتے ہیں جو بینک سے صرف دو میل کے فاصلے پر ایک اسٹور کے لاکر میں امانتاً رکھی ہوئی تھی۔

نیلی نے جنرل اسٹور سے بیس ہزار ڈالرز کا پیکٹ وصول کیا اور اسے احتیاط سے ڈریسر کی پچھلی دراز اور فرش کے درمیان بنے ہوئے چار انچ کے خلا میں چھپا دیا۔ اسے اس رقم کے چوری ہونے کا کوئی ڈر نہیں تھا کیونکہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس چھوٹے موٹیل میں رہنے والی لڑکی کے پاس اتنی رقم ہوسکتی ہے جس کا اپنا گزارہ بے روزگاری الاؤنس پر تھا۔ جب ہیسٹر کے فرار کی منصوبہ بندی مکمل ہوگئی تو اس نے نیلی سے کہا کہ وہ باقی ماندہ رقم وہاں سے نکال لے اور اس

کے لیے ایک ہینڈ گن خرید لے۔ اس نے نیلی کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ اسے یہ کام کس طرح کرنا ہے۔

☆☆☆

بیسٹر نے نیلی کو جس دکان کا پتا بتایا تھا، وہ بظاہر لوگوں کو آسان شرائط پر قرض دیا کرتے تھے لیکن درپردہ اسلحے کا کاروبار بھی کرتے تھے۔ جب نیلی اس دکان میں داخل ہوئی تو اس کا استقبال ایک گنجے شخص نے کیا جس نے آلۂ سماعت لگا رکھا تھا۔

''مجھے ایک گن چاہیے۔'' نیلی نے رازداری سے کہا۔

''میرے ساتھ آؤ۔'' وہ اسے دکان کے عقبی حصے میں لے گیا اور بولا۔ ''تمہیں کس قسم کا ریوالور چاہیے؟''

''اعشاریہ تین آٹھ۔'' بیسٹر نے اسے یہی بتایا تھا کیونکہ وہ خود ہتھیاروں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔

''میرے پاس دو برانڈز کے ریوالور ہیں۔'' وہ شوکیس کھولتے ہوئے بولا۔ ''اسمتھ اینڈ ولسن کی قیمت سات سو ڈالرز اور کولٹ آٹومیٹک آٹھ سو ڈالرز کا ہے۔''

نیلی نے کولٹ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یہی چاہیے۔''

''یہ تو تمہیں معلوم ہوگا کہ کیلی فورنیا کے قوانین کے مطابق تمہیں کتنے دن بعد یہ ریوالور مل سکتا ہے۔''

''مجھے ایک دوست نے بتایا تھا کہ ایک ہزار ڈالرز کے عوض میں یہ ریوالور فوری طور پر حاصل کرسکتی ہوں۔''

''کیا میں اس دوست کا نام جان سکتا ہوں؟'' دکان دار نے پوچھا۔

''اس کا نام بیسٹر ڈریک ہے۔''

''اوہ... ہاں، مجھے اس کے بارے میں پیغام مل چکا ہے۔ کیا تم نقد ادائیگی کے لیے تیار ہو؟''

''ہاں۔'' نیلی نے جواب دیا اور شوکیس میں رکھے ہوئے ریوالور کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''اس کی کیا قیمت ہے؟''

''دو سو پچاس ڈالرز لیکن انتظار کا عرصہ ختم کرانے کے لیے تمہیں مزید ایک ہزار ڈالرز دینا ہوں گے۔''

''ٹھیک ہے، مجھے ان دونوں کے لیے گولیاں بھی چاہئیں۔''

''میرے پاس اسلحہ بیچنے کا لائسنس نہیں ہے البتہ میں اپنے پاس سے انہیں لوڈ کردوں گا۔ اس کے لیے تمہیں مزید پچاس ڈالرز ادا کرنے ہوں گے۔ اس طرح کل رقم تین ہزار ایک سو ڈالر بنتی ہے۔'' نیلی نے رقم ادا کی اور دونوں ریوالور بیگ میں رکھ کر دکان سے باہر آگئی۔

☆☆☆

وقتِ مقررہ پر کوری نے ایک بیگ میں کچھ ضروری چیزیں رکھیں اور اپنا سروس ریوالور بھی لے لیا۔ اس نے اسے ڈرائیونگ سیٹ کے نیچے چھپایا پھر اس نے کار کے عقبی حصے کے نیچے ایک پرانا کمبل بچھایا اور لیٹ کر پنسل ٹارچ کی مدد سے ٹریکر تلاش کرنے لگا۔ اس نے بڑی احتیاط سے وہ ٹریکر نکالا اور باہر آکر اسے جھاڑیوں میں پھینک دیا۔ اس کام سے فارغ ہوکر وہ نیلی کو لینے کے لیے موٹل کی جانب روانہ ہوگیا۔

اپنے کمرے میں نیلی بھی تیاریوں میں مصروف تھی۔ اس نے ایک چھوٹے سے بیگ میں ضرورت کی چیزیں رکھیں اور چھوٹا سا ریوالور کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا جبکہ بیسٹر کے لیے خریدا جانے والا بڑا ریوالور ایک شاپنگ بیگ میں ڈال لیا جس میں بیئر کی چھ بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ ان کاموں سے فارغ ہوکر وہ کوری کا انتظار کرنے لگی۔

ادھر ہیری نے اپنے سروس ریوالور کے ساتھ ایک اضافی پستول بھی اپنی کہنی پر باندھ لیا پھر وہ اپنی کار چلاتا ہوا جیل کی پارکنگ لاٹ تک آیا۔ عین اسی وقت ڈپٹی وارڈن اپنے دفتر سے برآمد ہوا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کی کار تک آگیا۔ پسنجر سیٹ پر بیٹھتے ہی اس نے گھبراہٹ کے عالم میں پوچھا۔

''سب ٹھیک ہے؟''

''ہاں۔'' ہیری نے جواب دیا اور کار کا رخ سائکرو... جانے والی سڑک کی جانب موڑ دیا۔

کار روانہ ہوئی تو ڈفی کی نظر بے اختیار ڈیری فارم کی جانب چلی گئی جہاں سے عین اسی وقت بیسٹر کو فرار ہونا تھا۔ ڈفی کا حلق خشک ہونے لگا۔ اس نے کوٹ کی جیب سے ایک بوتل نکالی اور کوئی مشروب پینے لگا۔

''یہ کیا ہے؟'' ہیری نے ناگواری سے پوچھا۔

''اسکاچ۔'' ڈفی نے جواب دیا۔ ''تمہیں چاہیے؟''

''نہیں شکریہ۔'' ہیری نے جواب دیا۔ ''لیکن تم پیتے رہو۔'' اس کا خیال تھا کہ زیادہ پینے کے بعد یہ احمق اپنے ہوش و حواس میں نہیں رہے گا اور اس طرح اس پر قابو پانا آسان ہوجائے گا۔

ہیری نے اٹھ کر مانیٹر کا سوئچ آن کیا لیکن اس کی اسکرین خالی تھی۔ اسے کچھ گڑبڑ کا احساس ہوا تو وہ مانیٹر کی فریکوئنسی تبدیل کرنے لگا۔

''کیا ہوا، یہ کام نہیں کررہا؟'' ڈفی نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''نہیں، یہ بالکل ٹھیک ہے۔'' ہیری نے جھوٹ بولا۔ ''تم ایک اور ڈرنک لے لو۔''

اس نے آگے کی طرف جھک کر مانیٹر کا ڈائل آہستہ آہستہ گھمانا شروع کردیا اور تھوڑی سی کوشش کے بعد اسے دوسرے ٹریکر سے سگنل ملنا شروع ہوگئے۔ گویا کوری نے اسے دھوکا دیا تھا اور پہلا ٹریکر اپنی کار سے نکال دیا تھا۔ اس کے ہونٹ سختی سے بھنچ گئے۔ اب اسے چاروں کو ہر قیمت پر بند کرنا تھا۔

☆☆☆

مقررہ جگہ پر پہنچ کر کوری نے گاڑی سڑک کے ایک جانب پارک کی اور اس کی ہیڈ لائٹس بجھادیں اور نیلی سے بولا۔ ''اسے معلوم ہے کہ ہم یہاں انتظار کررہے ہیں؟''

''ہاں۔''

''ہم اسے کس طرح تلاش کریں گے؟''

''وہ خود ہی ہم تک پہنچ جائے گا۔''

عین اسی وقت پسنجر سیٹ والی کھڑکی پر ہلکی سی دستک سنائی دی۔ نیلی نے دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔ اسٹریٹ لائٹ کی مدھم روشنی میں کوری نے دیکھا کہ وہ ایک دبلے پتلے شخص سے بغل گیر ہورہی تھی پھر اس کے کانوں میں ایک مردانہ آواز آئی۔ ''ہائے بے بی۔''

''ہائے......'' نیلی نے جواب دیا۔ ''جلدی سے پچھلی سیٹ پر سوار ہوجاؤ۔ وہاں تمہاری خاطر کا سامان موجود ہے۔'' اس کا اشارہ بیئر کی بوتلوں کی جانب تھا۔

جیسے ہی وہ کار میں سوار ہوا، وہ بھی کوری کے برابر میں پسنجر سیٹ پر بیٹھ گئی اور بولی۔ ''روٹ 99 کی طرف موڑ لو اور جنوب کا رخ کرو۔''

☆☆☆

ایجنٹ ہیری نے مانیٹر پر کوری کی کار کی پوزیشن دیکھی اور اندازہ لگایا کہ وہ اس سے تقریباً چھ میل پیچھے ہے۔ اس نے بھی گاڑی ہائی وے کی جانب موڑ لی اور ایکسلریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔

''اب یہ آلہ درست کام کررہا ہے؟'' ڈفی نے پوچھا۔

''ہاں، بہت عمدہ کام کررہا ہے۔'' اس نے ڈپٹی وارڈن کی طرف دیکھا اور سوچنے لگا کہ اب کسی شخص پر مزید اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ اس نے ڈپٹی وارڈن سے کہا۔ ''کیوں نہ تم ایک ڈرنک اور لے لو۔ اس سے تمہیں سکون ملے گا۔''

''ہاں اگر تم کچھ خیال نہ کرو۔'' یہ کہہ کر اس نے کوٹ کی اندرونی جیب سے بوتل دوبارہ نکال لی اور گھونٹ گھونٹ حلق میں اتارنے لگا۔

☆☆☆

بیسٹر ڈریک کے آجانے کی وجہ سے کوری کی کار کے اندر کا ماحول خاصا کشیدہ ہوگیا تھا۔ بیسٹر بیئر کی دو بوتلیں چڑھا چکا تھا اور اس نے نیلی سے ریوالور لے کر اپنی ٹانگ پر باندھ لیا تھا۔ ہائی وے 99 پر پہنچ کر کوری نے پوچھا۔ ''ابھی کتنی دور اور جانا ہے؟''

نیلی کی جگہ بیسٹر نے جواب دیا۔ ''تمہیں اس بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ بس تم خاموشی سے کار چلاتے رہو۔''

''اور تم جو چاہو کہتے رہو۔''

''سامنے دیکھو۔ یہاں تم باس نہیں ہو۔'' بیسٹر غراتے ہوئے بولا۔

بارش کافی تیز ہورہی تھی اس لیے کوری نے کار کی رفتار پچپن میل فی گھنٹا سے نہیں بڑھنے دی۔ انہیں سفر کرتے ہوئے آدھا گھنٹا ہوچکا تھا اور اب وہ اسٹاک ٹون کے پاس سے گزر رہے تھے۔ کوری کی نظر سڑک کے کنارے لگے ہوئے سنگِ میل پر گئی جس پر لکھا ہوا تھا... موڈیسٹو 25 میل۔

☆☆☆

کوری اور ہیری کی کاروں کے درمیان بارہ گاڑیاں رہ گئی تھیں اور ہیری بڑے محتاط انداز میں اس فاصلے کو برقرار رکھتے ہوئے ڈرائیونگ کررہا تھا۔ اس کے برابر میں بیٹھے ڈفی کا سر کھڑکی سے لگا ہوا تھا۔ وہ خراٹے تو نہیں البتہ گہری گہری سانس ضرور لے رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ کار کا دروازہ کھول کر اس احمق شرابی کو سڑک پر پھینک دے۔ ویسے تو وہ ان چاروں کو قتل کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ ان کی لاشوں کو اسٹور میں رکھ کر باہر سے تالا لگا سکتا تھا جو اس نے آج

روگر..... آپریشن تو روز ہوتے ہیں..... آج
پھٹی ہوئی پتلون بھی سی لی جائے

صبح ہی خریدا تھا۔ ان لاشوں کا پتا اس وقت چلتا جب اسٹور سے اٹھنے والی ناقابلِ برداشت بُو لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کر لیتی۔ جب تک وہ بہ آسانی ارجنٹائن میں اپنا ٹھکانا بنا لیتا۔

وہ ان تمام امکانات کا جائزہ لے رہا تھا کہ اس کی نگاہ مانیٹر پر گئی۔ اس نے دیکھا کہ کوری کی کار ایک سائن بورڈ پر پہنچ کر ذیلی سڑک پر مڑ گئی تھی۔ اس بورڈ پر لکھا تھا۔ موڈیسٹو، اگلا دایاں موڑ۔۔۔ ”میں پاگل ہو جاؤں گا۔“ ہیری نے اس موڑ پر پہنچ کر سوچا۔ یہ وہی حصہ تھا جہاں بینک ڈکیتی ہوئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ لوٹی ہوئی رقم اس قصبے سے باہر ہی نہیں لے جائی گئی۔ اس نے بے یقینی کے انداز میں اپنا سر ہلا دیا۔

☆☆☆

اسٹور کے مرکزی دروازے پر پہنچ کر ہیسٹر ڈریگ کار سے اترا۔ اس نے کوری کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ ”تم یہیں ٹھہرو۔ گاڑی کا انجن اسٹارٹ رکھنا۔“ پھر وہ اعشاریہ تین آٹھ کا ریوالور دکھاتے ہوئے بولا۔ ”کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش مت کرنا۔“

”بے فکر رہو۔“ کوری نے جواب دیا۔ ”مجھے صرف ایک لاکھ ڈالرز سے غرض ہے۔“

جب ہیسٹر داخلی پوسٹ کی جانب بڑھنے لگا تو کوری نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر سیٹ کے نیچے رکھا ہوا پستول نکال لیا۔ نیلی نے اس کی یہ حرکت دیکھ لی لیکن منہ سے کچھ نہ بولی۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ پرس پر رکھ لیا جس میں اعشاریہ دو پانچ کا ریوالور رکھا ہوا تھا۔

☆☆☆

ہیری نے کوری کی کار کو رکتے ہوئے دیکھا تو اس نے فوراً اپنی گاڑی کی ہیڈ لائٹس بجھا دیں اور کار ایک جانب کھڑی کر دی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ فوری ایکشن کرنا ہے۔ پسنجر سیٹ پر ڈنی نشے میں دھت پڑا ہوا تھا۔ ہیری نے سوچا کہ اس سے بعد میں بھی نمٹا جا سکتا ہے۔ چنانچہ وہ کار سے باہر آ گیا لیکن اس نے دروازہ بند نہیں کیا تاکہ شور نہ ہو۔ وہ درختوں کی آڑ لیتا ہوا حفاظتی باڑھ کی جانب بڑھ گیا۔ سروس ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا۔

☆☆☆

گیٹ پوسٹ پر پہنچ کر ہیسٹر نے کی بورڈ پر لگے نمبروں کو ایک ایک کر کے چھونا شروع کیا۔ ہر بٹن کے ساتھ ہی ہلکی سی بیپ کی آواز ابھرتی۔ اس نے آٹھ ہندسوں کو چھونے کے بعد ایک طرف لگا ہوا انٹر کا بٹن دبایا تو گیٹ آہستہ آہستہ کھلنا شروع ہو گیا۔ وہ پلٹ کر واپس کار کی طرف آیا۔

دوسری جانب ہیری آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا کوری کی کار کے اتنا قریب آ گیا تھا کہ وہ گیٹ پر لگی ہوئی طاقتور روشنیوں کی زد میں نہ آ سکے۔ اسے اطمینان تھا کہ کار میں سوار تینوں افراد کی توجہ کھلنے والے گیٹ کی طرف ہو گی۔ وہ پیچھے کی طرف جھکتے ہوئے سڑک کی دوسری جانب درختوں کی آڑ میں چلا گیا۔ وہ کچھ دیر دم سادھے وہاں کھڑا رہا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ اس کی نقل و حرکت کو کسی نے نہیں دیکھا تو اس نے جیب سے رومال نکالا اور چہرے کا پسینا پونچھنے لگا۔ گیٹ تک کا فاصلہ اپنے ذہن میں رکھتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ ہر بار کوڈ دبانے کے بعد یہ گیٹ کتنی دیر کھلا رہتا ہو گا پھر وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔

☆☆☆

جب گیٹ پوری طرح کھل گیا تو ہیسٹر نے کوری کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ ”گاڑی اندر لے جا کر سیدھے ہاتھ کی طرف موڑ لو۔“

کوری نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور گیٹ سے گزرنے کے بعد گاڑی کو دائیں جانب موڑ دیا۔ ”سیکشن ڈی کی طرف چلو، وہاں سے بائیں جانب مڑنا ہے۔ تمہیں بورڈ پر نشان نظر آ جائیں گے۔“

کوری نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ اور دوسرا ہاتھ اپنی بائیں ٹانگ پر بندھے ہوئے ریوالور پر رکھ دیا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو چکی تھی۔

ہیری نے دیکھ لیا تھا کہ جیسے ہی کوری کی گاڑی گیٹ سے گزری، بزر بجنے لگا اور اس کے ساتھ ہی گیٹ بھی آہستہ آہستہ بند ہونے لگا۔ اس نے تیزی سے گیٹ کی جانب دوڑ لگائی لیکن اس کے وہاں پہنچنے تک گیٹ بند ہو چکا تھا۔ ہیری بے بسی سے اس کی جانب دیکھنے لگا جیسے اس کی ٹرین چھوٹ گئی ہو لیکن وہ ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں تھا۔

☆☆☆

سیکشن ڈی سے پچاس گز آگے آنے کے بعد ہیسٹر نے کار روکنے کے لیے کہا۔ وہاں ایک جیسے کمروں کی قطار تھی۔ ہیسٹر بولا۔ ”کمرا نمبر 276 کے سامنے گاڑی کھڑی کر کے ہمارا انتظار کرو۔“

کوری نے اس کے کہنے کے مطابق مقررہ جگہ پر گاڑی کھڑی کر دی اور انجن بند کرنے کے بعد چابی اگنیشن میں ہی لگی چھوڑ دی۔

”ٹھیک ہے، باہر آ جاؤ۔“ ہیسٹر نے اپنے پروگرام میں تبدیلی کرتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی اس کی گردن پر ریوالور کی نال رکھتے ہوئے بولا۔ ”کوئی الٹی سیدھی حرکت نہ کرنا۔“ پھر وہ نیلی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”تم بھی باہر آ جاؤ۔“

کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کوری نے بڑی صفائی سے اپنا ریوالور بائیں ٹانگ سے الگ کر کے کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال لیا۔ جیسے ہی وہ باہر آیا، ہیسٹر نے اسے حکم دیا۔

”وہاں کھڑے ہو جاؤ۔“ پھر اس نے نیلی کو اپنے پاس بلایا اور اسے ریوالور دیتے ہوئے بولا۔ ”اسے کور کیے رکھنا۔“

اب ہیسٹر کی توجہ دروازے پر لگے ہوئے نمبروں والے تالے پر تھی جبکہ نیلی اس کے حکم کے مطابق کوری پر پستول تانے کھڑی تھی۔ اسے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن مصلحتاً ایسا کرنا ضروری تھا۔

ایک ہلکی سی کلک کے ساتھ تالا کھل گیا اور ہیسٹر نے شٹر اوپر اٹھا دیا۔ ان تینوں کی نظریں اسی جانب تھیں جہاں گرد میں اٹے ہوئے دو سلیٹی رنگ کے بیگ رکھے ہوئے تھے۔ ان میں بھی تالا لگا ہوا تھا البتہ ان میں سے ایک کونے سے تھوڑا سا کھلا ہوا تھا جس میں سے نوٹ جھانک رہے تھے۔

☆☆☆

ہیری بہ مشکل تمام بند ہوتے گیٹ سے گزرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کوشش میں اس کی دائیں کہنی پر ضرب آئی۔ یقیناً اس میں ہلکا سا فریکچر ہو گیا تھا لیکن ہیری نے اس پر توجہ نہیں دی اور بائیں ہاتھ میں ریوالور تھامے اس جانب کا رخ کیا جہاں کوری کی کار گئی تھی۔ جب وہ سیکشن ڈی سے آگے دروازوں کی قطار کی جانب بڑھا تو اسے کوری کی کار نظر آ گئی پھر اس کی نظر ایک کھلے ہوئے دروازے پر گئی جہاں سے روشنی باہر آ رہی تھی۔ ہیری کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے آہستہ آہستہ روشنی کی جانب بڑھنا شروع کیا۔ وہ تقریباً وہاں پہنچ چکا تھا لیکن اچانک ہی اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے اور وہ ایک آڑ میں ہو گیا۔

☆☆☆

ہیسٹر کے حکم کے مطابق کوری کمرے سے باہر نکل کر اپنی کار تک آیا اور ڈگی کھول دی جہاں کوری اور نیلی کے بیگ رکھے ہوئے تھے۔ ہیسٹر نے مشکوک انداز میں نیلی کو دیکھا اور بولا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ تم نے مجھے یہاں چھوڑ کر اس احمق کے ساتھ جانے کا پروگرام بنایا تھا؟“

نیلی نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ کوری سے بولا۔ ”اس سامان کو باہر نکالو۔“ کوری نے وہ دونوں بیگ نکال کر

کمرے کے اندر رکھ دیے تو ہیسٹر نے دوسرا حکم جاری کیا۔ ”اب دونوں بیگ لا کر ڈگی میں رکھ دو۔“

جب رقم سے بھرے ہوئے دونوں بیگ کار میں رکھ دیے گئے تو ہیسٹر نے کوری کو دوبارہ اندر چلنے کے لیے کہا۔

☆☆☆

ہیری ایک آڑ میں چھپا ہوا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ جب اس نے ان دونوں کو کمرے میں جاتے دیکھا تو وہ بھی ان کے پیچھے یہ سوچ کر لپکا کہ اب یا کبھی نہیں۔ کمرے کے اندر پہنچ کر اس نے ان پر ریوالور تان لیا اور بولا۔ ”کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔“ پھر اس نے ڈریگ سے کہا۔ ”میں ایف بی آئی ایجنٹ ہوں، اپنا ہتھیار پھینک دو۔“

ہیسٹر نے اپنا ریوالور نیچے کر لیا لیکن اس نے زمین پر نہیں پھینکا۔ ہیری نے آگے بڑھ کر تیزی سے اپنے ریوالور کی نال نیلی کے سر پر رکھ دی اور بولا۔ ”ڈریگ ہتھیار پھینک دو ورنہ میں اس عورت کو گولی مار دوں گا۔“

ہیسٹر نے قہقہہ لگایا اور اپنا ریوالور بلند کرتے ہوئے بولا۔ ”تم یہ شوق پورا کر سکتے ہو۔ مجھے اس دھوکے باز عورت کی ضرورت نہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے ریوالور کا ٹریگر دبا دیا لیکن کوئی آواز نہ نکلی۔ ریوالور کا چیمبر خالی تھا۔ ہیسٹر نے بوکھلاتے ہوئے تین مرتبہ گولی چلانے کی کوشش کی مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

اب قہقہہ لگانے کی باری ہیری کی تھی۔ ”تمہارے دماغ کا خانہ بالکل خالی ہے۔ تمہیں کسی نے یہ نہیں بتایا کہ ہتھیار استعمال کرنے سے پہلے اسے چیک بھی کرنا چاہیے۔“ پھر وہ نیلی کو ایک طرف دھکیلتے ہوئے بولا۔ ”تم بھی احمق ہو جو اس شخص کے ساتھ رہ رہی ہو۔“

اس نے ہیسٹر کا نشانہ لیا اور اپنے ریوالور سے دو گولیاں اس کے سینے میں اتار دیں پھر وہ کوری کی جانب مڑا جو اپنا ریوالور نکالنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس سے پہلے کہ ہیری اس پر فائر کرتا، نیلی نے بالکل قریب سے اس کا نشانہ لیا اور اپنے اعشاریہ دو پانچ کے ریوالور سے اس کی کھوپڑی میں سوراخ کر دیا۔ اتنی دیر میں کوری بھی اپنا ریوالور نکال چکا تھا۔ وہ دونوں کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑے رہے پھر نیلی بولی۔ ”ہمیں فوراً یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“

☆☆☆

باہر نکلنے میں انہیں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ جیسے ہی ان کی کار گیٹ پر پہنچی، وہ خودکار طریقے سے کھل گیا۔ کوری نے کار باہر نکالی۔ اب اس کی ڈگی میں ان کے سامان کے

علاوہ رقم سے بھرے ہوئے دو بیگ بھی تھے۔ انہوں نے بیسٹر اور ہیری کی لاشیں کمرا نمبر 276 میں ہی چھوڑ دی تھیں اور باہر سے تالا لگا دیا تھا۔ ویسے بھی نیلی اسے بتا چکی تھی کہ وہ اس کمرے کا تین ماہ کا کرایہ پیشگی ادا کر چکی ہے۔

باہر نکلنے کے بعد کوری نے سوچا کہ اب وہ آزاد اور محفوظ ہیں۔ نیلی اس کے برابر والی سیٹ پر اطمینان سے ٹیک لگائے بیٹھی ہوئی خاصی مطمئن دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے خیال میں کہانی کے تمام کردار اپنے اپنے ٹھکانے پر پہنچ چکے تھے لیکن وہ ڈنی کو بھول گئے تھے۔

اچانک ایک فائر ہوا۔ گولی ونڈ شیلڈ پر لگی اور شیشے کے ٹکڑے نیلی کے چہرے سے ٹکرائے۔ اس نے زوردار چیخ ماری۔ دوسرا نشانہ نیچا رہا اور گولی کار کے ریڈی ایٹر کو لگی۔ کوری نے جلدی سے کار کی رفتار کم کی اور ایک وین کے پیچھے لے جا کر روک دی جو ایک گودام کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ تیسری گولی ڈرائیور کے ساتھ والے شیشے پر لگی اور کوری کے پاس سے گزر گئی۔ اس نے جھک کر ٹوٹے ہوئے شیشے سے دیکھا۔ ڈنی کسی شرابی کے مانند ہاتھ میں پستول لیے لڑکھڑاتا ہوا اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔

کوری نے اپنی طرف کا دروازہ کھولا اور اس نے بھی گولیاں چلانا شروع کر دیں۔ ڈنی کی ایک گولی اس کے دائیں بازو کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ وہ تھوڑا سا لڑکھڑایا لیکن اس نے اپنے آپ کو گرنے سے بچا لیا اور لگاتار چار گولیاں ڈنی کے سینے میں اتار دیں۔ وہ لہراتا ہوا زمین پر جا گرا۔

کوری ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تو اسے گیس کی بو محسوس ہوئی۔ وہ سمجھ گیا کہ ڈنی کی ایک گولی گیس ٹینک پر بھی لگی ہے۔ نیلی دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے بیٹھی تھی اور اس کی انگلیوں کے درمیان سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے نیلی کا بازو پکڑا اور اسے کار سے باہر نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ اچانک ایک فائر ہوا۔ ڈنی ابھی زندہ تھا۔ اس نے سڑک پر لیٹے لیٹے آخری گولی چلائی تھی جو گیس ٹینک پر لگی اور کار کا پچھلا حصہ شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا۔

کوری چلایا۔ "جلدی کرو۔" اس نے پوری قوت سے نیلی کو باہر کھینچنے کی کوشش کی۔ شعلوں نے پوری طرح کار کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح نیلی کو کار سے دور لے جانے میں کامیاب ہو گیا پھر ایک زوردار دھماکا ہوا اور کار کے پرخچے اڑ گئے۔ اس کے ساتھ ہی ڈگی میں رکھے ہوئے بارہ لاکھ ڈالرز بھی شعلوں کی نذر ہو گئے۔

☆☆☆

چاروں طرف سے پولیس کی گاڑیاں، فائر انجن اور ایمبولینس کے سائرن کی آوازیں آنے لگیں۔ کوری، نیلی کا ہاتھ پکڑے ایک بلاک کے فاصلے پر تنگ بغلی گلی میں گھس گیا۔ مکانوں کی روشنیاں جل اٹھیں اور لوگ صورتِ حال جاننے کے لیے باہر آنے لگے۔ گلی کے اختتام پر مکانوں کی قطار ختم ہو گئی۔ کوری سانس لینے کے لیے رکا۔ وہاں ایک بوڑھا شخص وہیل چیئر پر بیٹھا آسمان کی طرف بلند ہوتے ہوئے شعلوں کو دیکھ رہا تھا۔

"اے مسٹر۔" کوری نے اس سے پوچھا۔ "کیا یہ سڑک شہر کی طرف جاتی ہے؟"

"یہ سڑک۔" بوڑھے نے تجسس سے ان کے زخمی چہروں کی طرف دیکھا اور بولا۔ "یہ سڑک کہیں نہیں جاتی۔ اس کا اختتام قبرستان پر ہوتا ہے۔"

کوری غراتے ہوئے بولا۔ "شکریہ۔" اور ہمت کر کے آگے بڑھ گیا۔

ان کے جانے کے بعد بوڑھے نے فٹ پاتھ پر خون کے قطرے دیکھے تو چونک گیا۔ اس نے وہیل چیئر کے ذریعے اس پولیس وین تک پہنچنے کی کوشش کی جو گلی کے آخری سرے پر کھڑی ہوئی تھی۔

وہ دونوں قبرستان میں ایک قبر کے کتبے سے ٹیک لگائے بیٹھے ہوئے تھے۔ کار کے شیشے بکھر کر اس کے چہرے پر لگے تھے اور جگہ جگہ سے خون بہہ رہا تھا جبکہ آگ کے شعلوں سے اس کے سر کے بال بری طرح جھلس گئے تھے۔ نیلی کا حال بھی اس سے مختلف نہ تھا۔ اس کے بال بھی جھلس گئے تھے لیکن چہرہ محفوظ تھا۔ اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے کوری کی طرف دیکھا اور روتے ہوئے بولی۔ "اب کیا ہوگا کوری! ہم تو بالکل برباد ہو گئے۔"

"نیت میں فتور آ جائے تو ہر کام کا یہی انجام ہوتا ہے۔" ابھی اس کا جملہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ قبرستان کے گیٹ پر پولیس کی دو گاڑیاں آ کر رک گئیں اور ان میں سے چار آفیسر نکل کر ان کی جانب بڑھنے لگے۔ نیلی نے اپنا پستول نکالنے کی کوشش کی لیکن کوری نے اسے روک دیا اور بولا۔ "کوئی فائدہ نہیں، ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے دونوں ہاتھ کھڑے کر دیے۔ نیلی نے بھی اس کی تقلید کی۔ اس وقت کوری کو شدت سے پچھتاوے کا احساس ہوا۔ کاش اس نے بوڑھے سے راستہ پوچھنے کی غلطی نہ کی ہوتی۔

*

کوششِ ناکام

جمال دستی

ہر کام کی انجام دہی کے لیے رقم اور وقت دونوں صرف ہوتے ہیں... اور کچھ لوگ یہ دونوں چیزیں ہی بے مصرف ضائع کرا دیتے ہیں... اس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا... اس نے کوشش کی... مقصد حاصل کیا اور پھر... اس کی تمام کوششیں رائگاں چلی گئیں...

جاسوسی کے مزاج سے ہم آہنگ ایک پرتجسس کہانی کے پیچ و خم...

مارٹن نے اپنا چہرہ اخبار کی اوٹ میں اس طرح چھپا رکھا تھا کہ صرف اس کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں جن سے وہ... بہ آسانی ہوٹل گرانٹ کے بار کے داخلی دروازے اور اس بوتھ کو دیکھ سکتا تھا جہاں اس کا کلائنٹ بے چینی کے عالم میں کسی کا انتظار کر رہا تھا۔ کاؤنٹر کی عقبی دیوار پر لگے ہوئے کلاک میں سوئی نو کا ہندسہ عبور کر چکی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ ولیم کا ملاقاتی وقت پر نہیں پہنچ پایا۔ مارٹن کے لیے یہ کوئی انوکھی اور غیر متوقع بات نہیں تھی۔ اکثر اوقات بلیک میلر دباؤ بڑھانے

کے لیے متعلقہ شخص کو انتظار کی کوفت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

ولیم نے شاید بیسویں بار گھڑی پر نظر ڈالی اور اپنے گالوں کو نوچنے لگا۔ لیکن پہلے سے طے شدہ انتظام کے تحت اس نے مارٹن کی جانب دیکھنے سے گریز کیا۔ اس کے برابر والی نشست پر ایک لفافہ رکھا ہوا تھا جس میں پانچ ہزار ڈالرز کے نوٹ تھے۔ یہ وہ رقم تھی جو بلیک میلر کو دینے کے لیے ولیم اس جگہ آیا تھا۔ مارٹن کی نظروں کے سامنے جو اخبار تھا، وہ بھی شہر کے دوسرے اخباروں کی طرح جنگ کی خبروں سے بھرا ہوا تھا۔ مثلاً اٹلانٹک فلیٹ، کیوبا کے سمندر کی جانب روانہ ہو چکا تھا۔ ایڈمرل ڈیوی کا ایشیائی اسکواڈرن فلپائن کی طرف جا رہا تھا اور صدر میکنلے نے رضا کار سپاہیوں سے فوج میں شمولیت کی اپیل کی تھی۔ مارٹن کے لیے ان خبروں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ان میں سے بیشتر زرد صحافت کا شاہکار تھیں۔ اس کے برعکس وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اس کا کلائنٹ کس طرح بلیک میلر کا مطالبہ پورا کرنے پر تیار ہو گیا ہے جو بڑھتے بڑھتے دس ہزار ڈالرز تک پہنچ گیا تھا۔

اس نے ولیم سے وجہ جاننے کی کوشش کی لیکن اس نے اس سلسلے میں کچھ بتانے سے انکار کر دیا۔ وہ پیشے کے لحاظ سے بینکر تھا اور پچپن سال کی عمر میں بھی قابلِ رشک صحت کا مالک تھا۔ اس کی بیوی ایک سماجی کارکن تھی جبکہ نوجوان لڑکی ابھی پڑھ رہی تھی۔ جب اس سے یہ سوال پوچھا گیا تو وہ اس طرح نظریں چرانے لگا جیسے اس سے کوئی جرم سرزد ہو گیا ہو۔ اس کا چہرہ چغلی کھا رہا تھا کہ اس کا تعلق ایسی عورتوں سے ہے جنہیں معاشرے میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ وجہ کچھ بھی ہو لیکن ولیم نے بلیک میلر کا مطالبہ تسلیم کرتے ہوئے پانچ ہزار ڈالرز کی پہلی قسط ادا کر دی جو کہ ایک غلط فیصلہ تھا۔ البتہ صحیح فیصلہ اس نے یہ کیا کہ کارنیڈ اور مارٹن، نامی فرم کی خدمات حاصل کر لیں جو پیشہ ور سراغ رساں تھے تاکہ اس کا بلڈ پریشر مزید بڑھنے سے رک جائے جو دوسرا مطالبہ ہونے پر پہلے ہی کافی بڑھ گیا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ شخص پریشان، خوف زدہ ... اور اپنے کسی جرم کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہو لیکن اس کے بے وقوف ہونے میں کوئی شک نہیں تھا جو سمجھ رہا تھا کہ بلیک میلر کو دو مرتبہ رقم ادا کرنے کے بعد ساری زندگی کے لیے اس کی جان چھوٹ جائے گی۔

مارٹن نے سامنے رکھے ہوئے گلاس سے جوس کا ایک گھونٹ لیا اور اخبار کا صفحہ پلٹنے کے بعد اس پر نظریں جما دیں۔ ولیم نے ایک بار پھر دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا۔ نو بج کر دس منٹ ہو چکے تھے اور گلاس میں بچی ہوئی وسکی ایک ہی مرتبہ حلق میں انڈیل لی۔ ٹھیک اسی وقت بلیک میلر آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا بڑے محتاط انداز میں بار میں داخل ہوا۔ اس کی یہ احتیاط دیکھ کر مارٹن چوکنا ہو گیا جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہی بلیک میلر ہے۔ دوسری پہچان اس کا لباس تھا۔ اس نے لمبا سا اوورکوٹ پہن رکھا تھا اور سر پر رکھا ہوا ہیٹ اس طرح آگے کی طرف جھکا رکھا تھا جس سے اس کا آدھا ماتھا چھپ گیا۔ گلے میں اونی مفلر اس طرح لپیٹ رکھا تھا کہ اس کے چہرے کا نچلا حصہ اس میں چھپ جائے۔ نومبر کی اس سرد رات میں کسی نے اس پر دھیان دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

وہ لمحہ بھر کے لیے راہداری میں رکا اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا پھر اس کی نظریں اس بوتھ کی جانب اٹھ گئیں جہاں ولیم بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ مارٹن بھی کن انکھیوں سے اسے بوتھ کی طرف جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ اس کا آدھا چھپا ہوا چہرہ ولیم کے بتائے ہوئے حلیے کے مطابق تھا جو اس نے بلیک میلر سے پہلی ملاقات کے دوران ذہن نشین کر لیا تھا۔ درمیانی عمر، اوپر کو اٹھی ہوئی ناک، صاف رنگ اور اوسط درجے کی جسامت۔ کوکہ اوورکوٹ کی وجہ سے اس کا صحیح اندازہ لگانا مشکل تھا۔

اسے بوتھ میں داخل ہوتا دیکھ کر ولیم کے اعصاب تن گئے۔ ان کے درمیان دھیمی آواز میں الفاظ کا تبادلہ ہوا۔ اس کے بعد ولیم نے میز کے نیچے سے وہ لفافہ اسے پکڑا دیا۔ بلیک میلر نے اسے تھوڑا سا کھول کر دیکھا اور اپنا اطمینان کرنے کے بعد دوبارہ بند کر دیا۔ پھر اس نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک بڑا لفافہ نکالا اور اسے میز پر رکھ کر ولیم کی جانب کھسکا دیا۔ ولیم نے اسے کھولا اور اس میں رکھے ہوئے کاغذات چیک کرنے لگا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ انتہائی ذاتی نوعیت کے خطوط تھے۔ یہ یقیناً بلیک میلنگ کے لیے استعمال ہونے والے تمام کاغذات نہیں تھے اور ان کی بقیہ تعداد کو حاصل کرنا مارٹن کی ذمے داری تھی۔

جب وہ دونوں اپنی گفتگو ختم کر چکے تو مارٹن نے بھی اخبار تہ کر کے میز پر رکھ دیا۔ اپنا ہیٹ اور چھتری اٹھائی اور ٹہلتا ہوا ہوٹل کی لابی کی طرف آ گیا۔ وہ کوریڈور میں ایک ایسی جگہ کھڑا ہو گیا جہاں سے بار کے داخلی دروازے پر نظر رکھی جا سکتی تھی۔ وہ بلیک میلر اسی راستے سے گزرتا کیونکہ اس کے علاوہ باہر جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اسے دو منٹ سے بھی کم انتظار کرنا پڑا۔ وہ شخص بوتھ سے باہر نکلا اور اس

دروازے سے باہر نکل گیا جو منٹگمری اسٹریٹ پر کھلتا تھا۔ مارٹن نے بھی بیس قدم پیچھے رہ کر اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی تھی۔ مارٹن کو امید تھی کہ وہ شخص ہوٹل کے سامنے والے اسٹینڈ سے کوئی ٹیکسی کرے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس نے منٹگمری اسٹریٹ پار کی اور آخری کونے پر پہنچ کر جیسی اسٹریٹ پر مڑ گیا۔ مارٹن چند سیکنڈ بعد اس کونے تک پہنچا۔ اس نے وہاں رک کر اِدھر اُدھر دیکھا اور جیسی اسٹریٹ پر مڑنے سے پہلے یقین کر لیا کہ اسے کوئی نہیں دیکھ رہا جبکہ بلیک میلر کو بظاہر اپنے تعاقب کا کوئی خوف نہیں تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا بارش میں بھیگتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ بھی پیچھے مڑ کر دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔

دو بلاک کا فیصلہ طے کرنے کے بعد بلیک میلر ایک اور گلی میں مڑ گیا جو بارود والی گلی کہلاتی تھی۔ کسی نے مارٹن کو اس نام کا پس منظر بتاتے ہوئے کہا تھا کہ ریاستوں کے درمیان جنگ کے دنوں میں مقامی فوجیوں سے ہمدردی رکھنے والوں نے اس گلی کے ایک مکان میں بارود کی بہت بڑی مقدار ذخیرہ کر لی تھی۔ یہ گلی بھی جیسی اسٹریٹ کی طرح اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔

گلی کے کونے سے تھوڑی دور آگے جانے کے بعد لمبی ناک والے بلیک میلر نے ایک تاریک عمارت کے سامنے گلی پار کی جو جیسی اسٹریٹ کی طرف کھلنے والے سیلون اور ایک پرائیویٹ مکان کے درمیان واقع تھی۔ اس کی کھڑکی کے شیشے پر کچھ لکھا ہوا تھا جو اندھیرا ہونے کی وجہ سے دور سے نہیں پڑھا جا رہا تھا۔ اس شخص نے کھڑکی کے برابر والے دروازے میں چابی گھمائی اور دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

مارٹن اس عمارت کے قریب پہنچ کر لیمپ پوسٹ کی مدھم روشنی میں کھڑکی کے شیشے پر لکھی ہوئی تحریر پڑھنے لگا۔ اس پر لکھا ہوا تھا۔ سگار، پائپ، تمباکو وغیرہ۔ پروپرائٹر سونڈر برگ۔ اس نے کھڑکی کے اندر کی جانب لگے ہوئے پردوں کی درمیانی جگہ سے اندر جھانکنے کی کوشش کی تو وہ بمشکل ایک چھوٹا سا کاؤنٹر دیکھ پایا۔ اس نے ٹھنڈے شیشے سے اپنے کان لگا دیے لیکن اسے تیز ہوا چلنے کی آواز کے علاوہ کچھ بھی نہیں سنائی دیا۔

وہ آگے بڑھ گیا۔ ایک تنگ راستہ اس سگار اسٹور اور برابر والے مکان کو الگ کرتا تھا۔ یہ ایک قدیم طرز کا دو منزلہ مکان تھا۔ نچلی منزل کے ڈرائنگ روم کی کھڑکی پر پردہ نہیں تھا اور وہاں سے بلب کی زرد روشنی باہر آ رہی تھی۔ اسے وہاں شال میں لپٹی ہوئی ایک سفید بالوں والی عورت نظر آئی جو کرسی کے ساتھ ٹیک لگائے نیم دراز تھی۔

مکان سے کچھ فاصلے پر مارٹن نے رک کر اپنی چھتری بند کی۔ بارش وقتی طور پر رک چکی تھی۔ اس نے اپنے کپڑوں پر سے پانی جھاڑا اور واپس مکان کی طرف چل دیا۔ کرسی پر بیٹھی ہوئی عورت اپنی جگہ موجود تھی اور اسے یقین تھا کہ وہ عورت سو چکی ہے۔ لیمپ سے آنے والی روشنی اب اسٹور کی کھڑکی پر پڑ رہی تھی جبکہ اسٹور کا سامنے والا حصہ بدستور تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ شخص غالباً سونڈر برگ ہی تھا جو اسٹور کے کسی کمرے میں داخل ہو چکا تھا۔

مارٹن نے ایک دفعہ رک کر پھر کچھ سننے کی کوشش کی لیکن ایک بار پھر اسے اندر کی خاموشی کے سوا کچھ نہ سنائی دیا۔ اس نے اسٹور کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن اندر سے چٹخنی لگی ہوئی تھی۔

اسی اثنا میں اسے جیسی اسٹریٹ کی طرف سے بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ خراب موسم اور اندھیرے کے باوجود اسے ایک پولیس کا گشتی سپاہی اپنی جانب آتا دکھائی دیا۔ اسے دیکھ کر مارٹن کا موڈ خراب ہو گیا۔ وہ پولیس والا پوچھ گچھ میں اس کا وقت ضائع کرتا اور اس طرح اس کے کام میں خلل پڑنے کا خدشہ تھا۔ وہ اسٹور کے دروازے کے پاس سے ہٹ گیا اور خود ہی اس جانب چل دیا جہاں سے وہ پولیس والا آ رہا تھا۔

وہ پولیس والا درمیانی عمر کا آئرش تھا۔ اس نے لالٹین اونچی کر کے اس کا چہرہ دیکھا اور رسمی انداز میں بولا۔ ”شام بخیر جناب! موسم بہت خراب ہے۔“

”میں مزید خراب ہونے کی توقع کر رہا ہوں۔“

”یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ میں نے آپ کو اس سے پہلے یہاں دیکھا ہے۔ کیا آپ اسی گلی میں رہتے ہیں؟“

”نہیں، میں یہاں کسی سے ملنے آیا تھا۔“

”کیا میں اس کا نام پوچھ سکتا ہوں؟“ سپاہی نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

”سونڈر برگ، سگار اسٹور کا مالک۔“

”ہاں، میں نے اسے ایک دو مرتبہ دیکھا ہے لیکن کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ دراصل مجھے ڈیوٹی دیتے ہوئے ابھی صرف دو ہفتے ہوئے ہیں۔ میرا نام میگوڈ ہے۔ اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیں؟“

اس سے پہلے کہ مارٹن کوئی بہانہ بنا کر اس پولیس والے سے جان چھڑاتا، رات کے سناٹے میں فائر کی آواز گونجی اور اسے یہ جاننے میں بالکل بھی دیر نہیں لگی کہ یہ گولی

اسٹور کی عمارت کے اندر ہی چلائی گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ پولیس والا کوئی حرکت کرتا، مارٹن عمارت کی طرف دوڑ لگا چکا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے میگور بھی چلاتا ہوا آرہا تھا۔ جب وہ اسٹور کے دروازے پر پہنچا تو اسے ایک اور آواز سنائی دی۔ اس نے جلدی سے چھتری زمین پر پھینک کر کوٹ کی جیب سے پستول نکال لیا۔ چند سیکنڈ بعد وہ بغلی گلی میں داخل ہوگیا۔ وہاں مکمل سناٹا تھا اور اس کے آخری سرے تک کسی نقل و حرکت کے آثار نہیں تھے۔ وہ ایک روشن کھڑکی کے پاس رک گیا۔

کھڑکی میں عمودی لوہے کی سلاخیں قریب قریب لگی ہوئی تھیں جن میں سے بلی بھی نہیں گزر سکتی تھی۔ اندر کی جانب لگے پٹ کے شیشے گندے اور بارش میں بھیگے ہوئے تھے لیکن وہ ان سلاخوں کے درمیان سے کسی ایسے شخص کو زمین پر لیٹا ہوا دیکھ سکتا تھا جو فائرنگ کے نتیجے میں ہلاک یا زخمی ہوا ہو۔ مگر اسے وہاں کچھ نظر نہیں آیا۔ کھڑکی کی سلاخوں کے درمیان اتنا فاصلہ تھا کہ اس میں سے ہاتھ اندر جاسکتا تھا۔ اس نے کھڑکی کے پٹ کو دھکا دینے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔

میگور اس کے برابر میں لالٹین لیے ہوئے کھڑا تھا۔ اس کی روشنی میں مارٹن نے دیکھا کہ ایک راستہ گودام کی دیوار پر جاکر ختم ہورہا تھا۔ وہ کافی اونچی تھی اور اسے پھلانگنا مشکل تھا۔

اتنی دیر میں میگور بھی اپنی لالٹین سمیت وہاں پہنچ گیا۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا تم نے کسی کو دیکھا؟“

”نہیں۔“

”کیا اس دروازے کو کھولا جاسکتا ہے؟“

”نہیں، اندر سے چٹخنی لگی ہوئی ہے۔“

میگور دروازے پر طاقت آزمائی کرنے لگا۔ اس دوران میں مارٹن نے ایک اور تیلی جلائی اور گلی کے دوسرے حصے کا معائنہ کرنے لگا۔ یہ گلی متصل مکان کے آگے سے گزرتی تھی اور اسی طرح اونچی باڑھ پر جاکر ختم ہوجاتی تھی۔ اس مکان کا عقبی دروازہ بھی اندر سے بند تھا۔

میگور نے لالٹین اوپر اٹھائی اور بولا۔ ”چلو، سامنے کی طرف چلتے ہیں۔“

مارٹن اس کے ساتھ چل پڑا۔ گلی سے گزرتے ہوئے میگور نے پوچھا۔ ”کیا تمہارے دوست سونڈر برگ کو گولی لگی ہے؟“

”یقین سے نہیں کہہ سکتا۔“

جب وہ گلی سے باہر آئے تو مارٹن نے دیکھا کہ وہ عورت کرسی سے اٹھ کر سامنے والی کھڑکی میں کھڑی [illegible] جانب جھانک رہی ہے۔ ایک اور شخص بھی سڑک پر [illegible] دیا۔ اس نے بھی اوورکوٹ اور ہیٹ پہن رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں چھتری تھی۔ وہ قریب ہی کھڑا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ مارٹن کو اندازہ ہوگیا کہ جس کسی نے بھی فائر کی آواز سنی ہوگی وہ صورت حال جاننے کے لیے ضرور باہر آئے گا۔

ابھی تک سگار اسٹور سے کوئی شخص بارود والی گلی کی طرف باہر نہیں نکلا تھا اور اسٹور کا دروازہ بدستور بند تھا۔ میگور نے کہا۔ ”ہمیں یہ دروازہ توڑنا ہوگا۔ ممکن ہے سونڈر برگ یا اندر جو کوئی بھی ہے، وہ ابھی زندہ ہو۔“

دونوں نے مل کر پوری طاقت سے زور لگانا شروع کر دیا۔ بالآخر دروازے کی اندرونی چٹخنی ایک آواز کے ساتھ کھل گئی۔ وہ دونوں اندر داخل ہوئے۔ میگور نے لالٹین کی روشنی میں اسٹور کا جائزہ لیا۔ وہاں دیوارگیر شیلف میں تمباکو اور سگار کے ڈبے رکھے ہوئے تھے پھر انہوں نے کاؤنٹر کی طرف دیکھا، وہ خالی پڑا ہوا تھا۔

اسٹور کے عقبی کمرے کا دروازہ بھی اندر سے بند تھا۔ اسے توڑنے میں انہیں زیادہ مشکل پیش آئی۔ یہ کمرا [illegible] عمارت کے دو تہائی رقبے پر پھیلا ہوا تھا اور وہاں فرش پر [illegible] شخص چت پڑا ہوا تھا جس کا تعاقب کرتے ہوئے [illegible] یہاں تک آیا تھا۔ البتہ اب اس کے جسم پر اوورکوٹ اور ہیٹ نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ گھر میں داخل ہونے کے بعد اس نے یہ چیزیں اتار دی ہوں گی۔ اس کے سینے پر زخموں کے دو نشان تھے جن سے ابھی تک خون بہہ رہا تھا۔

میگور نے گھٹنوں کے بل جھک کر اس کی نبض دیکھی اور بولا۔ ”یہ مرچکا ہے۔“

مارٹن نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی اور کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ اس کمرے میں پرانے فرنیچر کے علاوہ مسہری، چولہا اور ایک میز تھی۔ اس کمرے میں صرف ایک الماری ایسی تھی جس میں کوئی چھپ سکتا تھا۔ لیکن جب اسے کھول کر دیکھا گیا تو اس میں چند سستے کپڑوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔

میگور بولا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟“

”کیا؟“

”ظاہر ہے کہ اس نے اپنے آپ کو گولی ماری ہے۔ یہ سیدھا سیدھا خودکشی کا کیس ہے۔“

”کیا تمہارے خیال میں اس نے خودکشی کی ہے؟“

”اس کے علاوہ کیا ہوسکتا ہے۔ تمام دروازے اور کھڑکیاں اندر سے بند ہیں اور یہاں کوئی اور نظر نہیں آرہا۔“

”خودکشی یا قتل؟“ مارٹن سوچ میں پڑ گیا۔ کم از کم تین وجوہات کی بنا پر وہ اسے قتل سمجھنے پر مجبور تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ مقتول کے سینے میں دو گولیاں لگی تھیں جبکہ خودکشی کرنے والا عموماً اپنے سر میں گولی مارتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ جس پستول سے فائر کیے گئے، وہ لاش سے کافی فاصلے پر پڑا ہوا تھا جبکہ خودکشی کرنے کی صورت میں پستول مرنے والے کے ہاتھ سے فوراً ہی چھوٹ کر اس کے قریب ہی گر جاتا۔ اور تیسری اہم بات یہ تھی کہ اس نے ولیم سے جو پانچ ہزار ڈالرز وصول کیے تھے، وہ غائب تھے۔

مارٹن نے اس بارے میں میگور سے کوئی بات نہیں کی۔

”مجھے ہیڈ کوارٹر کو اس واقعے کی اطلاع دینا ہوگی۔“ میگور نے کہا۔ ”قریبی ٹیلی فون بوتھ دو بلاک کے فاصلے پر ہے۔ میرے واپس آنے تک یہیں ٹھہرنا اور کسی کو لاش کے پاس مت آنے دینا۔“

یہ کہہ کر میگور تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔ اس کے جانے کے بعد مارٹن نے اس جگہ کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ مرنے والے کے کوٹ اور پتلون کی جیبوں سے کوئی خاص چیز نہ مل سکی سوائے ایک انشورنس کارڈ کے جس کی مدت ختم ہوچکی تھی لیکن اس سے اس کی شناخت ہوسکتی تھی۔ وہ ریمنڈ سونڈر برگ ہی تھا۔ جس پستول سے اس پر فائر کیا گیا، اس کے چیمبر میں دو گولیاں کم تھیں لیکن پانچ ہزار ڈالرز کے لفافے کا کہیں پتا نہیں تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ سونڈر برگ وہ لفافہ لے کر کمرے میں داخل ہوا تھا۔ تو کیا یہ سمجھا جائے کہ جس شخص نے اسے گولی ماری، وہ لفافہ لے کر رفوچکر ہوگیا؟ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ بند دروازوں اور کھڑکیوں سے کس طرح فرار ہوگیا اور وہ بھی چند سیکنڈ کے اندر کیونکہ فائر کی آواز سنتے ہی مارٹن نے عمارت کی جانب دوڑ لگادی تھی۔

رات کے سناٹے کو لوگوں کی آوازوں نے ختم کر دیا لیکن کسی نے بھی اندر آنے کی کوشش نہیں کی۔ مارٹن نے بڑبڑاتے ہوئے کھڑکی بند کی اور خود اسٹور کے ٹوٹے ہوئے دروازے کے درمیان کھڑا ہوگیا۔ برابر والے مکان کے ڈرائنگ روم کی لائٹ بند ہوچکی تھی اور سفید بالوں والی عورت شال لپیٹے پورچ میں کھڑی ہوئی تھی جبکہ بارود والی گلی میں جمع ہونے والوں کی تعداد ایک درجن سے کم تھی جو قریبی گھروں سے نکل کر آئے تھے۔ وہ مارٹن سے واقعے کے بارے میں سوالات کررہے تھے۔ اس نے انہیں وہی کچھ بتایا جو میگور نے کہا تھا۔

میگور کے واپس آنے تک کچھ لوگ اپنے گھروں کو جاچکے تھے۔ اس نے باقی لوگوں کو بھی منتشر کر دیا۔ البتہ سفید بالوں والی عورت ابھی تک پورچ میں کھڑی ہوئی تھی۔ جب گلی میں سناٹا چھا گیا تو وہ بھی اپنے اندھیرے مکان میں چلی گئی۔

مارٹن نے میگور سے پوچھا کہ کیا وہ اس عورت کا نام جانتا ہے اور یہ کہ کیا وہ اس گھر میں اکیلی رہتی ہے تو اس نے جواب دیا۔ ”میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں نے ہمیشہ اس مکان میں اندھیرا ہی دیکھا ہے۔“

تھوڑی دیر بعد ہی پولیس کی ایمبولینس اور تین آفیسر وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے مارٹن اور میگور پر کوئی توجہ نہ دی اور لاش کا معائنہ کرنے لگے۔ اب مارٹن کو اپنی چھتری کا خیال آیا جو پستول نکالتے وقت اس کے ہاتھ سے گر گئی تھی مگر وہ چھتری اسے کہیں نظر نہیں آئی۔ شاید وہاں جمع ہونے والوں میں سے کوئی اسے اٹھا کر لے گیا ہوگا۔ وہ برابر والے مکان کے سامنے سے گزرا۔ کھڑکی کا پردہ برابر ہوچکا تھا اور اندر روشنی نظر نہیں آرہی تھی۔ اس نے دروازے کی گھنٹی بجائی لیکن وہ کام نہیں کررہی تھی۔ لہٰذا اس نے آہستہ سے دستک دی۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ دوسری بار دستک دینے پر اندر سے ایک باریک آواز آئی۔ ”کون ہے؟“

”پولیس آفیسر!“ مارٹن نے جھوٹ بولا۔ ”مجھے تم سے کچھ سوالات کرنے ہیں۔ زیادہ وقت نہیں لوں گا۔“

کچھ دیر خاموشی رہی پھر کنڈی کھلنے کی آواز آئی اور وہ عورت باہر آگئی۔ اب بھی اس نے سیاہ لباس پر شال لپیٹی ہوئی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں چھتری اور دوسرے میں موم بتی تھی۔ وہ اسے دیکھتے ہی بولی۔

”میں جانتی ہوں۔ تم یہ واقعہ رونما ہونے سے پہلے یہاں موجود تھے۔“

”تم اس کھڑکی سے میری جاسوسی کررہی تھیں مسز...؟“

”کلارا۔“ وہ اپنا نام بتاتے ہوئے بولی۔ ”ہاں، میں شام کے وقت یہاں بیٹھ کر باہر کا نظارہ کرتی ہوں۔“

”کیا تم نے آج شام کسی شخص کو سگار اسٹور میں آتے جاتے دیکھا تھا؟“

"نہیں، مسٹر سونڈر برگ کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا؟"

"وہ اپنے مکان میں مردہ پائے گئے۔"

"اوہ۔" وہ تاسف کرتے ہوئے بولی۔

"انہوں نے خودکشی کر لی یا کسی اور نے انہیں قتل کر دیا، ابھی اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیا تم نے فائر کی آواز سنی تھی؟"

"ہاں اور مجھے ایسا لگا جیسے یہ آواز وہیں سے آئی ہے لیکن مجھے یقین نہیں تھا۔"

"تم اس گھر میں اکیلی رہتی ہو؟"

"ہاں، میرے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔"

"آج رات تم سے ملنے کوئی آیا تھا؟"

"اب مجھ سے ملنے کوئی نہیں آتا۔"

"کیا تم نے گولی چلنے سے پہلے یا بعد میں بغلی یا عقبی راستے پر کسی کے قدموں کی آواز سنی؟"

"ہاں، صرف تمہارے اور دوسرے پولیس والے کے قدموں کی آواز سنی تھی۔" پھر وہ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولی۔ "آہ..... بے چارہ سونڈر برگ۔"

پھر وہ کچھ توقف کے بعد بولی۔ "کچھ اور پوچھنا ہے کیونکہ میرے لیے اس سردی میں کھڑے ہونا بہت مشکل ہے۔"

"نہیں، بس اتنا ہی کافی ہے۔"

وہ یہ سنتے ہی گھر کے اندر چلی گئی تو وہ بھی واپس آ گیا۔ سونڈر برگ کی لاش ایمبولینس میں رکھی جا چکی تھی۔ اس نے سڑک پار کی اور جیسی اسٹریٹ کی طرف چل دیا لیکن اس کا دماغ ابھی تک سونڈر برگ کی موت میں الجھا ہوا تھا۔

☆☆☆

دوسری صبح جب وہ اپنے دفتر پہنچا تو سینا پہلے سے اپنی میز پر موجود تھی۔ وہ ایک خوب صورت عورت تھی۔ متناسب جسم، جھیل جیسی گہری آنکھیں اور سیاہ چمک دار بال جو اس کے شانوں پر جھولتے رہتے تھے۔ اس روز وہ سیاہ رنگ کا منی اسکرٹ پہن کر آئی تھی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اس کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر دیتا لیکن رات بھر جاگنے کی وجہ سے اس کا سر بھاری ہو رہا تھا اور ابھی تک اس کے دماغ میں یہی سوال گونج رہا تھا کہ سونڈر برگ کو کس نے قتل کیا۔ اس سے پہلے وہ کئی مشکل ترین کیس حل کر چکا تھا لیکن اس کیس میں ابھی تک وہ بے بس نظر آ رہا تھا۔

سینا نے کہا۔ "کچھ دیر پہلے مسٹر ولیم کا فون آیا تھا۔ وہ اس بات پر پریشان ہیں کہ تم نے ان سے گزشتہ رات [illegible] کیوں نہیں کیا۔"

"ہوں۔" مارٹن نے ہنکارا بھرا۔

"ان کا کہنا تھا کہ تم دفتر پہنچتے ہی ان سے بات کرو۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تھوڑی دیر بعد ان سے رابطہ کروں گا لیکن میرے پاس ان کے لیے جو خبر ہے، اسے سن کر وہ خوش نہیں ہوں گے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم بلیک میلر تک پہنچنے میں ناکام رہے؟"

"ہاں، سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔ بلیک میلر [illegible] سونڈر برگ تھا اور وہ بارود والی گلی میں ایک سگار اسٹور کا مالک تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کاغذات اور [illegible] واپس لینے کی کوشش کرتا جو مسٹر ولیم نے اسے دیے تھے کسی نے اسے اس کے گھر میں قتل کر دیا۔"

"قتل۔" وہ چونکتے ہوئے بولی۔ "مجھے یقین نہیں کہ تم ایسا بھونڈا مذاق بھی کر سکتے ہو۔"

"کیا تم سمجھتی ہو کہ میں بھونڈا مذاق کرتا ہوں؟"

"سچ سچ بتاؤ کہ گزشتہ شب کیا ہوا؟"

وہ اس کے سامنے بیٹھ گیا اور گزشتہ شب پیش آنے والا واقعہ تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا۔

"یہ تو بڑی پیچیدہ کہانی ہے۔" وہ اس کے خاموش ہونے پر بولی۔ "لیکن شاید اتنی پراسرار نہیں جتنی کہ نظر آتی ہے۔"

"لگتا ہے کہ یہ طے شدہ منصوبہ تھا تاکہ سونڈر برگ کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کر کے اس سے پانچ ہزار ڈالرز واپس لے لیے جائیں۔"

"اس کے لیے کسی تیسرے فرد کا انتخاب کیا گیا؟"

"ہاں ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ قاتل پہلے سے اس کے گھر میں چھپ کر اس کے آنے کا انتظار کر رہا ہوگا۔ اس کے کمرے کا چولہا گرم تھا اور سونڈر برگ کو اتنی مہلت بھی نہ ملی کہ وہ اس کی آگ بجھا دیتا۔"

"اس کے لیے اتنا کھٹ راگ پھیلانے کی کیا ضرورت تھی۔" سینا بولی۔ "وہ سیدھے سیدھے سونڈر برگ کو گولی مارتے اور لوٹی ہوئی رقم لے کر چلے جاتے۔"

"تاکہ یہ قتل، خودکشی نظر آئے۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ فائر کرنے کے بعد کسی شخص کے لیے اس عمارت سے باہر نکلنا ممکن نہیں تھا؟"

"ہاں، سامنے اور پیچھے کے دونوں دروازے اندر سے بند تھے۔ اسی طرح کوارٹر کا دروازہ بھی بند تھا۔ دکان کی واحد کھڑکی بھی بند تھی اور اس میں تالا لگا ہوا تھا۔"

"اگر وہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے تو اس سے ایک ہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ قاتل بلڈنگ کے اندر گیا ہی نہیں۔"

"ایسا ہو سکتا ہے۔" مارٹن نے کہا۔ "لیکن کچھ حقائق اس کے برعکس ہیں۔ مثلاً لفافے کا غائب ہو جانا، میز پر ایک وہسکی کی اور دو گلاسوں کی موجودگی پھر جس پستول سے فائر کیے گئے وہ مقتول کی لاش سے کافی فاصلے پر پڑا ہوا تھا۔ مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قاتل اور مقتول دونوں ایک ساتھ اس بند کمرے میں گئے تھے۔"

"تم نے فائرنگ کے فوراً بعد ایک اور آواز بھی سنی تھی۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ کیسی آواز تھی؟"

"نہیں، ایسا لگا جیسے کسی کا پاؤں دیوار سے ٹکرایا ہو۔ وہ کچھ ایسی ہی آواز تھی۔"

"کیا تم نے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنی تھی؟"

"نہیں، میں نے اس کے سوا کوئی آواز نہیں سنی۔"

وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو کر دفتر میں بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ اگر قاتل عمارت سے نکلنے میں کامیاب ہو بھی گیا تب بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اتنی جلدی کیسے غائب ہو سکتا ہے۔ "اتنی دیر میں تو کلی بھی... باڑھ کو نہیں پھلانگ سکتی اور نہ ہی گودام کی دیوار پر چڑھ سکتی ہے۔"

"تب تو فرار کا ایک ہی راستہ باقی رہ جاتا ہے۔" سینا بولی۔

"تمہارا اشارہ کلارا کے گھر کے عقبی دروازے کی طرف ہے لیکن جب میں نے اسے کھولنے کی کوشش کی تو وہ اندر سے بند تھا اور کلارا کا کہنا ہے کہ اس کے گھر کوئی مہمان نہیں آیا۔"

"وہ جھوٹ بھی بول سکتی ہے۔"

مارٹن اس کی بات سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ سینا بولی۔ "میں نہیں سمجھتی کہ وہ خود یہ جرم کر سکتی ہے۔"

"وہ اسی سال کی ہے۔" مارٹن نے کہا۔ "اس کے علاوہ میں نے خود اسے فائر ہونے سے دو منٹ پہلے کھڑکی کے قریب بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔"

"ممکن ہے کہ وہ مجرم کو بچانے کے لیے جھوٹ بول رہی ہو جو اس کا کوئی رشتے دار بھی ہو سکتا ہے اور جب تم اس سے بات کر رہے تھے تو قاتل اس کے گھر میں چھپا ہوا ہو۔"

"اس کا امکان ہے۔ مجھے بھی اس کی حرکات اور گفتگو پر شک ہونے لگا ہے لیکن میں براہِ راست اس پر انگلی نہیں اٹھا سکتا۔"

"تم ایک بار پھر اس سے بات کیوں نہیں کر لیتے؟" سینا نے مشورہ دیا۔

"ہاں، یہی کرنا پڑے گا۔"

☆☆☆

بارود والی گلی میں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ پولیس نے سگار اسٹور کو سیل کر دیا تھا جبکہ برابر والے گھر کی کھڑکی پر بدستور پردہ پڑا ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر کھڑکی کو دیکھتا رہا پھر آگے بڑھ کر دروازے پر دستک..... دی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے دوسری اور تیسری بار یہی عمل دہرایا لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اس نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا اور ایک چابی سے دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے اندر پہنچ کر کچھ سننے کی کوشش کی لیکن وہاں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پھر وہ زور سے بولا۔ "کوئی ہے؟" لیکن اس کی آواز گھر کی خاموشی میں گونج کر رہ گئی۔

وہ ایک محراب سے گزر کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ وہ قدرے سرد تھا اور لگتا تھا کہ آتش دان کو عرصے سے گرم نہیں کیا گیا۔ کمرے میں پرانا اور بوسیدہ فرنیچر پڑا ہوا تھا۔ کھڑکی کے پاس رکھی ہوئی کرسی کا ایک ہتھا غائب تھا اور میز پر رکھا ہوا لیمپ بھی کمرے کی فضا کی طرح سرد تھا۔ مارٹن نے جلدی جلدی اوپر نیچے کے کمروں کی تلاشی لی۔ ایک کمرے میں اسے لوہے کے پلنگ نظر آئے۔ یہ غالباً ماسٹر بیڈ روم تھا جبکہ دوسرا کمرا خالی تھا۔

وہ گھر سے باہر نکل کر بغلی گلی میں داخل ہو گیا پھر اس نے عقبی گلی کا جائزہ لیا اور اس کے خیال کی تصدیق ہو گئی کہ کسی طرف سے بھی باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ باڑھ... بہت اونچی تھی اور اسے پھلانگنا ممکن نہ تھا۔

وہ پھر عمارت کے سامنے کی طرف آیا اور قریبی پڑوسی کے مکان پر دستک دی جس نے بتایا کہ سگار اسٹور کے برابر والا مکان گزشتہ چار ماہ سے خالی ہے۔ پولیس کے سپاہی میگور کا بھی یہی کہنا تھا کہ اس نے ہمیشہ اس مکان میں اندھیرا دیکھا تھا جبکہ وہ بوڑھی عورت کہہ رہی تھی کہ وہ اکثر شام کو کھڑکی میں بیٹھا کرتی ہے۔ دوسرے پڑوسیوں اور جیسی اسٹریٹ کے کونے پر واقع ایک دکان کے مالک نے بھی اس مکان کے خالی ہونے کی تصدیق کی۔

وہاں سے واپس آنے کے بعد اسے احساس ہونے

لگا کہ اس معمے کو اب حل ہو جانا چاہیے۔ تمام واقعات کی کڑیاں ملانے کے بعد وہ جان گیا تھا کہ سونڈر برگ کو اس کے بند مکان میں کیوں اور کیسے قتل کیا گیا تھا۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ اس قتل کا ذمے دار وہی شخص ہے جس نے یہ حالات پیدا کیے تھے۔

☆☆☆

جب مارٹن منٹگمری اسٹریٹ کی برانچ میں پہنچا تو ولیم اپنے دفتر میں اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ غصے سے بولا۔ ”تم نے پروگرام کے مطابق مجھ سے رات کو رابطہ کیوں نہیں کیا؟ اب یہ نہ کہنا کہ تم اس بلیک میلر کا تعاقب کرنے اور اس کی شناخت میں ناکام رہے۔“

”ان میں سے ایک بلیک میلر جسے تم نے رقم کی ادائیگی کی تھی، وہ بارود والی گلی میں واقع سگار اسٹور کا مالک ریمنڈ سونڈر برگ تھا۔“

”ان میں سے ایک بلیک میلر؟“ ولیم نے تعجب سے کہا۔ ”میں سمجھا نہیں۔“

”اس کے ساتھی نے میرے پہنچنے سے پہلے اسے گولی ماردی اور رقم کا لفافہ لے کر فرار ہو گیا۔“

ولیم حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ”لیکن وہ کون ہے...؟“

”تمہارے سوال کا جواب بعد میں دوں گا۔ پہلے تم میرے چند سوالوں کے جواب دو۔ تمہیں کس لیے بلیک میل کیا جا رہا تھا؟“

”میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں۔ اس کے سوا کچھ نہیں بتا سکتا۔“

”تمہیں بتانا ہوگا اگر اپنی رقم اور بقیہ کاغذات کی واپسی چاہتے ہو۔“

ولیم نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”کیا ان کاغذات کا تعلق کسی عورت سے ہے؟“ مارٹن نے ہوا میں تیر چلایا۔ ”جس سے تمہارے ناجائز تعلقات تھے؟“

”تم سمجھ سکتے ہو کہ اس عمر میں...“

”مجھے وجہ جاننے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تم مجھے صرف اس عورت کا نام بتا دو۔“

”پالین ڈورتھی۔“ ولیم نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”وہ کیا کام کرتی ہے؟“

”وہ اسٹیج ڈانسر اور اداکارہ ہے اور اپنے فن میں ماہر ہے۔“

”میرا بھی یہی خیال تھا۔“ مارٹن طنزیہ انداز میں ...

”وہ کس تھیٹر میں کام کرتی ہے؟“

”کینٹی تھیٹر میں لیکن اس کی خواہش ہے کہ ایک روز نیویارک کے اسٹیج پر اپنے فن کا مظاہرہ کرے۔“

”کیا وہ اب بھی اسی تھیٹر میں ہے؟“

”میری دو ماہ پہلے اس سے وہیں پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے بعد ہم باقاعدگی سے ملنے لگے۔“

مارٹن اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بولا۔ ”جب تمہیں پہلی بار بلیک میلر کی طرف سے دھمکی ملی تو تم نے اس عورت ... اس بارے میں بتایا تھا؟“

”بالکل۔“ ولیم بولا۔ ”اسے یہ جاننے کا حق تھا۔“

”وہ کس طرح؟“

”اس بلیک میلنگ کی بنیاد وہ خطوط تھے جو میں ... اسے لکھے۔“

”وہ خطوط بلیک میلر تک کس طرح پہنچے؟“

”انہیں گزشتہ ہفتے اس کے کمرے سے چرا لیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ تھوڑے سے زیورات بھی لے گئے۔ یہ شخص سونڈر برگ عادی چور تھا چنانچہ اس نے ان خطوط سے فائدہ اٹھانے کا سوچا۔“

”کیا پالین نے ہی تمہیں مشورہ دیا کہ بلیک میلر کو پانچ ہزار ڈالرز کی پہلی قسط ادا کر دی جائے؟“

”ہاں اور میں اس سے متفق تھا کیونکہ اس وقت مجھے بھی فیصلہ مناسب لگا۔“

”لیکن جب دو دن پہلے اس نے دوسرا مطالبہ کیا تو تم نے پالین کو یہ نہیں بتایا کہ تم نے اس بلیک میلر سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے میری خدمات حاصل کر لی ہیں؟“

”ہاں، میں نے یہی مناسب سمجھا۔“

”اور جب تم نے اسے یہ بات بتائی تو یہ بھی واضح کر دیا کہ دوسری قسط کی ادائیگی کے موقع پر میں بھی وہاں موجود رہوں گا تاکہ بلیک میلر کا تعاقب کر کے اسے پہچان سکوں۔“

”کیا مجھے اسے نہیں بتانا چاہیے تھا؟“ وہ ایک دم غصے میں آ گیا اور بولا۔ ”تم یہ نہیں سوچ سکتے کہ پالین کا اس معاملے میں کوئی کردار تھا۔“

”میں سوچ کے بجائے حقائق کی بنیاد پر بات کرتا ہوں۔ تم نے اسے کہاں ٹھہرایا ہوا ہے؟“

”اسٹاکٹن اسٹریٹ کے ایک فلیٹ میں۔“

”کیا اس وقت وہ گھر پر ہوگی یا تھیٹر پر؟“

”کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ دونوں میں سے کسی ایک جگہ مل سکتی ہے۔“

”میرے ساتھ چلو۔ مجھے امید ہے کہ اس سے ملنے کے بعد تم پر حقیقت واضح ہو جائے گی۔“

☆☆☆

وہ انہیں کینٹی تھیٹر کے ڈریسنگ روم میں مل گئی۔ مارٹن کی توقع کے مطابق وہ جوان اور خاصی پُرکشش تھی۔ مارٹن کو دیکھ کر وہ تھوڑا سا گھبرائی لیکن فوراً ہی اس نے اپنے آپ پر قابو پالیا۔

”یہ صاحب کون ہیں؟“ اس نے ولیم سے پوچھا۔

”یہ وہی سراغ رساں ہے جس کے بارے میں تمہیں بتایا تھا۔ میں تمہیں زحمت دینے کی معذرت چاہتا ہوں لیکن یہ تم سے ملنے پر مصر تھا۔“

”کس سلسلے میں؟“

”اس نے کھل کر تو نہیں کہا لیکن اس کا خیال ہے کہ تم کسی نہ کسی طرح اس بلیک میلنگ میں شامل ہو۔“

اب تک چپ رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا لہٰذا مارٹن بولا۔ ”شامل نہیں بلکہ اسی نے یہ اسکیم تیار کی تھی۔“

پالین نے اپنی پلکیں اوپر اٹھائیں اور پھر جھکاتے ہوئے بولی۔ ”یہ محض بکواس ہے۔“

مارٹن کی نظریں ڈریسنگ روم کا جائزہ لینے لگیں۔ وہاں الماری میں مختلف لباس لٹکے ہوئے تھے اور بڑی سی ڈریسنگ ٹیبل پر میک اپ کا سامان سجا ہوا تھا۔ وہ ایک میز تک گیا اور وہاں سے سفید بالوں والی وگ اٹھاتے ہوئے بولا۔

”یہی وہ وگ ہے جو تم نے گزشتہ شب لگا رکھی تھی مسز کلارا؟“

وہ اب بھی بالکل نہیں گھبرائی اور بولی۔ ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”تم نے بڑی کامیابی سے مسز کلارا کا روپ دھارا تھا۔ سفید بال، شال، سیاہ لباس، کمزور سی آواز اور چھڑی کے سہارے کھڑے ہونے کا انداز سب کچھ بے حد مکمل تھا اور رات کی سیاہی میں کوئی نہیں پہچان سکتا تھا کہ تمہارے چہرے، گردن اور ہاتھوں پر جھریاں میک اپ کا کمال تھا۔“

”اور میں یہ کردار کہاں ادا کر رہی تھی؟“ وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

”بارود والی گلی میں ریمنڈ کے اسٹور کے برابر والے خالی مکان میں۔ تم ریمنڈ کو اس کے گھر میں قتل کرنے سے پہلے اور بعد میں اسی خالی مکان میں موجود تھیں۔“

ولیم حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ”قتل... دیکھو مارٹن! بلیک میلنگ کی حد تو ٹھیک ہے لیکن قتل...“

پالین غصے سے بولی۔ ”یہ فضول باتیں کر رہا ہے۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ بارود والی گلی کہاں ہے اور نہ ہی میں ریمنڈ سونڈر برگ نامی کسی شخص کو جانتی ہوں۔“

”لیکن تم ایسا کر چکی ہو۔ میرا اندازہ ہے کہ اس کے ساتھ بھی تمہارے ایسے ہی تعلقات تھے جیسے مسٹر ولیم کے ساتھ ہیں۔ پھر تم نے اپنے حسن و خوب صورتی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے بلیک میلنگ اسکیم میں شامل کر لیا۔“

”ناقابل یقین۔“ ولیم چلایا۔

”لیکن تمہاری نیت ٹھیک نہیں تھی اور تم پورے دس ہزار ڈالرز خود ہی ہڑپ کرنا چاہ رہی تھیں تاکہ بڑی اداکارہ بننے کے لیے نیویارک جا سکو۔“

پالین نے ایک بار پھر پلکیں جھپکائیں لیکن کچھ نہیں بولی۔ مارٹن سمجھ گیا کہ اس کا اندازہ درست ثابت ہو رہا ہے۔ ”میں تمہیں داد دیتا ہوں مس پالین۔“ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

”تم نے بڑی عمدگی سے یہ منصوبہ بنایا۔ دو دن پہلے تمہیں مسٹر ولیم نے بتا دیا تھا کہ میں گزشتہ شب ہوٹل میں موجود رہوں گا چنانچہ تمہیں اپنی تیاری کے لیے وقت مل گیا۔ شاید تمہیں ریمنڈ نے اس خالی مکان کے بارے میں بتایا ہوگا اور وہاں تک پہنچنے میں مدد بھی کی ہوگی۔ گزشتہ شام کسی وقت تم وہاں گئیں اور اپنی تیاریوں کو آخری شکل دی۔ میک اپ کے ذریعے ایک بوڑھی عورت کا روپ دھارا، کرسی کا انتظام کیا اور ایسا منظر تشکیل دیا جیسے وہاں ایک بوڑھی عورت بیٹھی ہو۔“

”اور یہ سب میں نے کس طرح کیا؟“

”تم نے کرسی میں ایک ڈمی کو بٹھایا۔ اس کے چہرے پر بالوں کی وگ لگائی اور اس کے گرد بڑی سی چادر لپیٹ دی۔ آج صبح اس گھر کی تلاشی کے دوران وہ ڈمی مجھے ایک الماری میں رکھی ہوئی مل گئی۔“

ولیم کو اب بھی یقین نہیں آیا۔ وہ مسلسل بولے جا رہا تھا۔ پالین نے کہا۔ ”مجھے یہ ڈراما کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”مجھے دھوکا دینے کے لیے۔ تم جانتی تھیں کہ میں ریمنڈ کا پیچھا کروں گا۔ تم کام نکل جانے کے بعد اسے راستے

سے ہٹانا چاہ رہی تھیں اور تم نے یہ کام اتنی ہوشیاری سے کیا کہ لوگ اسے قتل کے بجائے خودکشی سمجھیں۔ اپنے آپ کو دوسروں کی نظروں سے اوجھل کرنے کے لیے تم نے زبردست تخلیقی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ تم اسی راستے سے واپس آگئیں جس سے اس کے گھر میں داخل ہوئی تھیں۔ یعنی عقبی گلی میں کھلنے والے دروازے سے۔ تم نے بوڑھی عورت کے میک اپ کے بارے میں سونڈر برگ کو کیا بتایا ہوگا، اس کی کوئی اہمیت نہیں لیکن مجھے شبہ ہے کہ اس نے تمہاری وضاحت پر یقین کرلیا ہوگا۔ تم نے اسے قائل کرلیا ہوگا کہ لفافے کی موجودگی اس کے لیے خطرناک ہو سکتی ہے کیونکہ میں اس کا تعاقب کررہا ہوں۔ وہ تمہاری باتوں میں آگیا اور لفافہ تمہارے حوالے کردیا۔ اس کے بعد تم عقبی دروازے سے باہر آگئیں اور اسے تاکید کردی کہ وہ گھر کے تمام دروازے اندر سے بند کرلے۔"

"پھر تم یہ کس طرح کہہ سکتے ہو کہ میں نے اس کے بند گھر میں اسے قتل کردیا؟"

"تم بغلی گلی کی طرف کھلنے والی کھڑکی پر آگئیں اور اس طرح دستک دی جیسے کچھ بھول گئی ہو۔ جیسے ہی سونڈر برگ نے کھڑکی کا شٹر اٹھایا، تم نے سلاخوں کے درمیان ہاتھ ڈال کر اس پر دو فائر کردیے اور پستول اندر کی جانب فرش پر پھینک دیا۔ قدرتی طور پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور وہ پیچھے کی جانب گر گیا۔ شٹر تیزی سے نیچے آیا اور اس کے گرنے سے زوردار آواز پیدا ہوئی۔ یہ وہی آواز تھی جو فائر کے فوراً بعد میں نے سنی تھی۔ اس کے بعد تم چند سیکنڈ میں عقبی گلی میں داخل ہوگئیں اور برابر والے خالی مکان کے پچھلے دروازے سے اندر داخل ہو کر اسے اندر سے بند کر دیا۔ تم نے ڈرائنگ روم کی کھڑکی کا پردہ برابر کیا۔ ڈمی کو کرسی سے اٹھا کر الماری میں رکھا اور خود وگ لگا کر اور شال لپیٹ کر کرسی پر بیٹھ گئیں۔ جب میں نے تمہارا دروازہ کھٹکھٹایا تو تم لاٹھی اور موم بتی ہاتھ میں لیے ہوئے باہر آگئیں۔ لیکن تم نے موم بتی کو اس زاویے سے پکڑ رکھا تھا کہ تمہارا میک اپ زدہ چہرہ اندھیرے میں رہے۔"

ولیم اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "یہ سب کچھ میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔"

پالین بولی۔ "تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ قتل میں نے کیا ہے؟"

"جب مجھے وہ دس ہزار ڈالرز مل جائیں گے تو ثبوت خود بخود سامنے آجائے گا۔ تم نے وہ رقم کہاں چھپا رکھی ہے... یہیں ہے یا گھر میں؟"

"تم دونوں جگہ کی تلاشی لے سکتے ہو۔" پالین نے اسے فراخ دلی سے پیشکش کی۔

ولیم ان دونوں کے درمیان آن کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "میں نہیں جانتا کہ تم اس معصوم عورت کو دھمکا کر کیا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہو لیکن اب مجھے تمہاری خدمات کی ضرورت نہیں رہی۔ آئندہ تم نے مجھے یا مس پالین کو پریشان کرنے کی کوشش کی تو تمہیں پولیس اور میرے وکیل کو جواب دینا ہوگا۔"

☆☆☆

دفتر واپس آنے کے بعد وہ کافی دیر خاموش اور گم سم بیٹھا رہا۔ سینا اسے تسلی دیتے ہوئے بولی۔ "اپنے آپ کو سنبھالو۔ کہیں تمہارا بلڈ پریشر نہ بڑھ جائے۔"

"بھاڑ میں گیا بلڈ پریشر۔" وہ جھلاتے ہوئے بولا۔ "وہ عورت قتل کرنے کے باوجود بھی آزادانہ گھوم رہی ہے۔"

"بدقسمتی سے تم اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرسکتے کیونکہ تمہارے پاس اس کے جرم کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔"

وہ کچھ نہیں بولا بس منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگا۔ سینا اسے تسلی دیتے ہوئے بولی۔

"جان! میں اور تم اچھی طرح جانتے ہیں کہ بعض اوقات انصاف فوراً نہیں ملتا۔ پالین جیسی عورتیں ایک عرصے تک سزا سے محفوظ رہتی ہیں لیکن ان کا انجام بہت برا ہوتا ہے۔"

"لیکن میری ساری کوشش رائیگاں چلی گئی۔"

"ہرگز نہیں۔ تمہیں اطمینان ہونا چاہیے کہ تم نے ایک جرم کا سراغ لگایا۔ کیا یہ کافی نہیں ہے؟"

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ اس نے اپنا کام مہارت اور ایمان داری سے انجام دیا تھا۔ اگر مجرم کو سزا نہ ہو سکی تو اس میں اس کی کوئی غلطی نہیں تھی۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ولیم جیسے لوگ ایسی عورتوں کے چکر میں بے وقوف بن جاتے ہیں۔ یہ مردوں کی کون سی قسم ہے؟"

سینا نے اسے خاص انداز سے دیکھا اور بولی۔ "مردوں کی کوئی قسم نہیں ہوتی۔ عورتوں کے معاملے میں سبھی مرد ایک جیسے ہوتے ہیں لیکن شاید تم کبھی یہ بات نہ سمجھ سکو......"

دل گرفتہ

سلیم انور

وقت... حالات اور رویے جذبات کے اتار چڑھاؤ میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں... مگر بعض اوقات یہ تمام عناصر بیک وقت اثر انداز ہو جاتے ہیں... اور پھر جذبات کی شدت کی روانی جنون کی حدوں کو چھو لیتی ہے... وہ جذبات کے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا... اور کسی بھی طرح لبِ ساحل تک پہنچنا چاہتا تھا...

اس دوست کی خیر خواہی جس نے زندگی کی ناؤ کو منجدھار کر دیا...

"تم وہی چاہتے ہو جو سب چاہتے ہیں۔" گارلینڈ نے کہا۔ "اس لیے پوچھنے میں کسی قسم کی شرم محسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

گارلینڈ کی عمر چالیس برس کے لگ بھگ تھی۔ اس کا جسم چوڑا تھا لیکن وہ فربہ نہیں تھا۔ اس کی ناک باریک، ستواں اور چہرہ رومن ٹائپ کا تھا۔ اس کے چھوٹے سے دفتر میں ائرکنڈیشنر چل رہا تھا لیکن اس کے باوجود اس کی ہلکی نیلے رنگ کی ڈریس شرٹ کی بغلوں میں نمی دکھائی دے رہی تھی۔

اس لڑکے کی عمر چوبیس پچیس برس کے درمیان تھی۔ وہ گارلینڈ کی میز کے سامنے کرسی پر بیٹھا بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ بے چینی اس کے انداز سے عیاں تھی۔ ”مجھے کسی نے تمہارا حوالہ نہیں دیا اور نہ کسی نے تمہاری سفارش کی ہے۔ میں نے اخبار میں تمہارا کلاسیفائڈ اشتہار دیکھا تھا: گارلینڈ ڈیٹیکٹیو ایجنسی... شیڈوز ایوری ویئر۔ مجھے کسی پرائیویٹ سراغ رساں کی خدمات حاصل کرنے کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں۔“ اس لڑکے نے کہا۔

”یہ بھی دیگر کاروباری معاملات کی طرح ہے۔“ گارلینڈ نے اسے یقین دلانے والی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”صرف یہ کہ تم یہاں جس چیز کے لیے ادائیگی کرو گے، وہ حقائق ہوں گے... ترے حقائق! ان حقائق کو حاصل کرنا میرا کاروبار ہے۔ کہنے کو تو یہ ایک معمولی کام لگتا ہے لیکن سچ کے حصول کی کوشش کے لیے میں نے خود کو وقف کیا ہوا ہے۔“

اس لڑکے نے اپنا نام ڈیسمنڈ بتایا تھا۔ اس نے ایک آہ بھری تو اس کی عینک کے بھاری فریم کے اوپر پیشانی پر دو عمودی لکیریں ابھر آئیں۔ یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے وہ کسی اعصابی ہیجان میں مبتلا ہو۔ ”تب میرا خیال ہے کہ ہم کام کی بات کر سکتے ہیں۔ اس لیے کہ میں سچ ہی جاننا چاہتا ہوں۔“

”پہلے پختہ فیصلہ کر لو۔“ گارلینڈ نے اپنی کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ”بعض اوقات میرے کلائنٹس کو اپنی رقم کے عوض بہت زیادہ سچ حاصل ہو جاتا ہے۔“

”میں یقین سے کہہ رہا ہوں۔“ اس نے اپنے دونوں ہاتھ مسلتے ہوئے کہا۔ ”میں اس کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔“

”اپنی بیوی کے بارے میں؟“

ڈیسمنڈ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”ہاں، اس کا نام جینٹ ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ میرے پیچھے کسی سے ملتی ہے۔“

گارلینڈ نے اپنا سگار سلگانے کے لیے ماچس جلائی اور پوچھا۔ ”وہ کون ہے؟“

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔“ ڈیسمنڈ نے ایک بار پھر ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ”بس یہ جانتا ہوں کہ کوئی ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ اندازہ تم نے اپنی بیوی کی حرکات و سکنات سے لگایا ہوگا۔“ گارلینڈ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”کوئی بھی شخص اپنی بیوی کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتا ہے۔ تم چاہتے ہو کہ میں اس کا پیچھا کروں اور اس بارے میں تمہیں رپورٹ دوں؟“

”میں یہی چاہتا ہوں۔“ ڈیسمنڈ نے سنجیدگی سے کہا پھر اس کے ہونٹوں پر ایک نروس سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ ”اگر تمہارے کام کرنے کا یہی طریقہ ہے۔“

”ہاں طریقہ کار یہی ہے۔“ گارلینڈ نے [illegible] میں کہا۔ ”تیس ڈالرز یومیہ میری معمول کی فیس ہے۔ اخراجات اس کے علاوہ ہوں گے۔“

”یقیناً... میں یہ نہیں چاہتا کہ تم ہر روز اس کا تعاقب کرو۔“ ڈیسمنڈ نے کہا۔ ”کیا میں تمہیں اس وقت بتا... جب میرے خیال کے مطابق وہ... مجھے غافل سمجھ کر جا رہی ہو اور تب تم اس کا پیچھا کرو؟“

”اگر تم یہی چاہتے ہو تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“ گارلینڈ نے حامی بھرتے ہوئے کہا۔ ”تم مجھے اپنی بیوی کے بارے میں بھی تو کچھ بتاؤ؟“

ڈیسمنڈ نے تھوک نگلتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ ”جینٹ، سینڈرز الیکٹرونکس میں بطور سیکریٹری کام کرتی ہے۔ شام پانچ بجے اس کی چھٹی ہو جاتی ہے لیکن گزشتہ کئی دن سے وہ دیر سے گھر آ رہی ہے۔ کبھی میرے آنے کے ایک گھنٹے بعد یا اس سے بھی دیر میں۔ میں چھ بجے گھر پہنچتا ہوں۔ اس کے پاس دیر سے گھر آنے کا ہمیشہ کوئی نہ کوئی بہانہ ہوتا ہے... کار خراب ہو گئی تھی، ضروری رپورٹیں ٹائپ کرنی تھیں، بعض اوقات اسے ڈرائیو کر کے کہیں جانا پڑتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ میں محبت کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی بدگمان ہوں جیسا کہ وہ کہتی ہے لیکن... دیکھو، میں [illegible] بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔“

”یقیناً۔“ گارلینڈ نے کہا۔ ”تم اچھے ذہن [illegible] رکھو۔ کسی نہ کسی طور پر تمہیں کم از کم اس بارے میں یقیناً پتا چل ہی جائے گا۔“

”میں بھی اسی نظریے سے دیکھ رہا ہوں۔“ ڈیسمنڈ نے... انگوٹھے سے اپنی پتلون کی کریز درست کرتے ہوئے کہا۔ ”کل رات جینٹ کھانے پر کہیں باہر جائے گی۔ اس کے ہمراہ ایک اور لڑکی ہوگی جو سینڈرز الیکٹرونکس میں اس کے ساتھ کام کرتی ہے۔ پھر وہ کوئی شو دیکھنے جائیں گی۔ یہ ایک ایسا سلسلہ ہے جو اب اکثر ہوتا رہتا ہے... یعنی کہ وہ سہیلیوں کے ساتھ کہیں باہر جا رہی ہے۔“

”اور تم چاہتے ہو کہ کام سے چھٹی ہونے کے بعد جب وہ دفتر سے باہر نکلے تو میں اس کے پیچھے لگ جاؤں اور اس کی اس شب کی تمام رپورٹ تمہیں پیش کر دوں؟“ گارلینڈ نے کہا۔

”بالکل ٹھیک۔“ ڈیسمنڈ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”کل رات میں فری ہوں۔“ گارلینڈ نے بتایا۔ ”مجھے تمہارا کیس لے کر خوشی ہوگی۔“

ڈیسمنڈ کے ہونٹوں پر ممنونیت بھری مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس نے اپنی چیک بک نکال لی۔

جب ڈیسمنڈ پیشگی ادائیگی کا چیک لکھ رہا تھا تو گارلینڈ نے کہا۔ ”کیا تمہارے پاس اپنی بیوی کی کوئی تصویر ہے؟“

ڈیسمنڈ نے اثبات میں جواب دیا اور گارلینڈ کو چیک کے ساتھ ایک دبلی پتلی سنہری زلفوں والی لڑکی کی تصویر بھی تھما دی۔ تصویر میں وہ لڑکی بیس بائیس کے بجائے چودہ برس کی لگ رہی تھی۔ کنگھی کیے ہوئے لانبے سیدھے بال۔ وہ منہ کھول کے ہنس رہی تھی اور اس کے دانت نمایاں دکھائی دے رہے تھے۔

”وہ ایک سرخ واکس ویگن کار چلا رہی ہوگی۔“ ڈیسمنڈ نے بتایا۔ ”اس نے جس لڑکی کے ہمراہ جانے کا بتایا ہے، وہ اخروٹی رنگت کے بالوں والی... پستہ قد ہوگی اور ایک کنورٹیبل کار چلا رہی ہوگی۔“

”میں جب تمہاری بیوی کو دیکھوں گا تو پہچان لوں گا۔“ گارلینڈ نے تصویر اپنی قمیص کی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں اس ہفتے کے آخر میں رپورٹ تمہیں میل کر دوں گا۔“

”نہیں، نہیں۔ ایسا مت کرنا۔“ ڈیسمنڈ نے بے ساختہ کہا۔ ”بعض اوقات ڈاک جینٹ وصول کر لیتی ہے۔“

گارلینڈ کو کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ ”آل رائٹ... اگر تم چاہو تو دفتر آ کر یہاں سے رپورٹ لے سکتے ہو۔“ یہ کہہ کر وہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

ڈیسمنڈ نے شکریہ ادا کرتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا اور دروازے کی جانب پلٹ گیا۔

دروازے کے پاس پہنچ کر وہ رک گیا اور شانے اچکاتے ہوئے بولا۔ ”میں بس اپنے یقین کی خاطر یہ جاننا چاہتا ہوں اور کچھ نہیں...“

”جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں بھی اسی حد تک کام کرتا ہوں۔“ گارلینڈ نے کہا۔ ”میں بات کو پوری طرح سمجھتا ہوں۔“

ڈیسمنڈ مسکرا دیا اور دروازے کو بے آواز بند کرتا ہوا دفتر سے نکل گیا۔

گارلینڈ کچھ دیر بیٹھا اپنے اسکریچ پیڈ پر بے خیالی میں آڑی ترچھی لکیریں بناتا رہا۔ پھر اس نے پیڈ میں سے ایک صاف کاغذ پھاڑا اور اس پر چند نوٹس لکھنے کے بعد اس کاغذ اور جینٹ ڈیسمنڈ کی تصویر کو پیلے رنگ کے ایک فولڈر میں رکھ دیا۔ اس کے بعد اس نے اپنی میز کے کیلنڈر پر یہ یادداشت تحریر کر دی: پانچ بجے سینڈرز الیکٹرونکس، جینٹ ڈیسمنڈ۔

☆☆☆

سینڈرز الیکٹرونکس شہر کے مغرب میں تیزی سے بڑھتی

ہوئی ایک نمایاں نئی بزنس کمیونٹی میں واقع تھی۔ اس کی عمارت صاف ستھری اور جدید طرز کی تھی۔

گارلینڈ اس عمارت کے مقابل اپنی گرے ہارڈ ٹاپ کار میں اسٹیئرنگ وہیل پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی نصف توجہ کار کے ریڈیو سے نشر ہونے والی موسیقی پر مرکوز تھی جبکہ بقیہ نصف توجہ سے وہ سینڈرز الیکٹرونکس کے شیشے کے بڑے سے داخلی دروازے کو دیکھ رہا تھا۔

وہ سکون سے بیٹھا ہوا تھا اور اب اپنے اس کام میں صبر کرنے کا عادی ہو گیا تھا۔ اس نے ایک بار بھی اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی جبکہ گھڑی کی سوئیاں دھیرے دھیرے پانچ بجے کی جانب بڑھ رہی تھیں۔

گارلینڈ کو یاد نہیں تھا کہ اس قسم کی صورتِ حال میں وہ کتنی مرتبہ کسی ایک یا دوسری جگہ اس طرح صبر و سکون کے ساتھ بیٹھ چکا تھا۔ شہر میں متشکک شوہروں یا بیویوں کی تعداد ہزاروں میں رہی ہوگی۔ کچھ اتنی ہی تعداد بے وفا شوہروں اور بیویوں کی بھی ہوگی۔ اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

گارلینڈ ہر ویک اینڈ پر اخبار کے کلاسیفائیڈ سیکشن کے سیکیورٹی پرائیویٹ انویسٹی گیٹرز کالم میں اپنا مختصر سادہ سا اشتہار چھپواتا تھا۔ شہر میں ایسی بیویوں اور شوہروں کی کمی نہیں تھی جو اپنے رفیقِ حیات کے بارے میں بے وفائی کے شبہے میں مبتلا تھے۔ ان میں سے کوئی نہ کوئی اپنے شبہے کی تصدیق کے لیے گارلینڈ کے پاس آجاتا تھا اور اس کی خدمات مستعار لے لیتا تھا۔

اچانک گارلینڈ کی توجہ کار کے ریڈیو سے نشر ہونے والی موسیقی پر سے ہٹ گئی۔ اس نے جینٹ کو سینڈرز الیکٹرونکس کی عمارت سے نکلتے دیکھا۔ وہ سہ پہر کی تیز چمک دار دھوپ میں آہستہ آہستہ قدموں سے پارکنگ لاٹ کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اس کے لمبے اسٹریپ کا پرس اس کے شانے پر لٹکا ہوا تھا جسے وہ بے پروائی سے لہراتے ہوئے قدم بڑھا رہی تھی۔

گارلینڈ، جینٹ کے اطراف میں موجود مردوں کا جائزہ لینے لگا۔ ان کی تعداد چند ایک تھی لیکن کوئی بھی جینٹ پر کوئی خاص توجہ نہیں دے رہا تھا۔ ان کے مابین رسمی سلام دعا کے سوا اور کوئی گفتگو نہیں ہو رہی تھی۔

گارلینڈ نے یہ بات خصوصی طور پر نوٹ کی کہ جینٹ اپنی تصویر کے مقابلے میں کہیں زیادہ دلکش اور حسین تھی۔ اس کا جسم بھی قدرے بھرا ہوا تھا اور شیپ میں تھا۔ اس کے باوجود وہ انتہائی کم عمر لگ رہی تھی۔ وہ اس قسم کی عورت دکھائی دے رہی تھی جو ہر وقت ہنستی مسکراتی رہتی ہیں۔

گارلینڈ کی نظریں جینٹ پر جمی ہوئی تھیں جو آہستہ قدموں کے ساتھ اپنی سرخ واکس ویگن کے پاس پہنچ گئی تھی۔ اس نے اپنی کار کی کھڑکیوں کے شیشے نیچے گرائے تاکہ کار کے اندر کی تپش کم ہو جائے۔ پھر خود کار سے باہر کھڑی ہو کر یوں کھڑی ہو گئی جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہو۔

چند منٹ بعد سیاہ اخروٹی بالوں والی ایک پستہ قد لڑکی سینڈرز الیکٹرونکس کی عمارت سے نمودار ہوئی اور تیز تیز قدموں سے جینٹ کی جانب بڑھنے لگی۔ ان دونوں نے آپس میں کچھ مختصر سی بات کی۔ پھر جینٹ نے اپنی کار کی کھڑکیوں کے شیشے دوبارہ اوپر چڑھا دیے۔ وہ دونوں زردی بھورے رنگ کی کنورٹیبل میں سوار ہو گئیں جس کی چھت پیچھے گری ہوئی تھی۔ پھر وہ دونوں وہاں سے روانہ ہو گئیں۔

گارلینڈ نے بھی اپنی کار اسٹارٹ کی اور ان دونوں کا تعاقب شروع کر دیا۔

ان دونوں لڑکیوں کا پہلا پڑاؤ ایک اٹالین ریسٹورنٹ تھا جہاں انہوں نے پیزا اور سلاد کھایا۔ وہاں سے نکل کر وہ دونوں ایک ڈپارٹمنٹ اسٹور میں چلی گئیں اور تقریباً گھنٹے تک گھومتی رہیں۔ انہوں نے وہاں کوئی خریداری نہیں کی۔ گارلینڈ بھی ان کے تعاقب میں ڈپارٹمنٹل اسٹور میں فضول چلتا رہا حتیٰ کہ اس کی ٹانگیں دکھنے لگیں۔

ڈپارٹمنٹل اسٹور سے نکل کر وہ دونوں لڑکیاں کار میں سوار ہو کر فلم دیکھنے شہر کے وسط میں واقع ایک تھیٹر میں جا پہنچیں۔ "میری جوان ماما" نامی اس فلم کی نمائش تین ماہ سے جاری تھی۔

گارلینڈ کو بھی مجبوراً یہ فلم دیکھنا پڑ گئی۔ البتہ اسے فلم دیکھ کر بوریت نہیں ہوئی۔

فلم دیکھنے کے بعد وہ دونوں لڑکیاں کار میں سوار ہو کر ایک قریبی لاؤنج میں چلی گئیں اور وہاں مشروبات سے دل بہلانے کے دوران آپس میں خوش گپیاں کرتی رہیں۔ وہاں سے اٹھ کر وہ دونوں واپس سینڈرز الیکٹرونکس کی پارکنگ لاٹ میں جا پہنچیں جو اس وقت اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔

جینٹ اس لڑکی کی کنورٹیبل سے اتر کر اپنی سرخ واکس ویگن میں بیٹھ گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو الوداع کہا اور پھر جینٹ وہاں سے سیدھی اپنے گھر چلی گئی۔ اس کا اپارٹمنٹ شہر کے شمالی کنارے پر واقع تھا۔ یہ ماڈرن طرز کا لیکن ایک سستا سا اپارٹمنٹ تھا۔

اور رات ایک بجے تک وہ اپنے بیڈ پر اپنے شوہر کے برابر میں لیٹ چکی تھی جہاں اسے ہونا چاہیے تھا۔

جب اپارٹمنٹ کی لائٹیں بجھ گئیں تو گارلینڈ نے اپنا سگار سلگا لیا اور کار کی موسیقی سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اس نے نصف گھنٹے تک انتظار کیا پھر وہاں سے اپنے گھر چل دیا۔

☆☆☆

یہ جمعرات کا دن تھا۔

گارلینڈ دفتر سے نکلنے کی تیاری کر رہا تھا جب ڈیسمنڈ اپنی بیوی کی حرکات و سکنات کی رپورٹ لینے کے لیے اس کے دفتر میں داخل ہوا۔ وہ پہلے دن اپنی آمد کے مقابلے میں کہیں زیادہ نروس دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے گارلینڈ کے مقابل میز کے پیچھے کرسی پر بیٹھ گیا اور انتظار کرنے لگا۔

"اس طرح نروس ہونے کی ضرورت نہیں جیسے کہ اب دنیا کا خاتمہ ہو رہا ہے۔" گارلینڈ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ جواباً ڈیسمنڈ کے چہرے پر کوئی مسکراہٹ نہیں ابھری۔ اس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ "وہ کہاں گئی تھی؟"

گارلینڈ نے اپنی کہنیاں میز کے اوپر ٹکائیں اور سنجیدہ نظروں سے ڈیسمنڈ کو دیکھنے لگا پھر بولا۔ "ایک ریسٹورنٹ میں، وہاں سے ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور میں، پھر ایک فلم دیکھنے، وہاں سے ایک لاؤنج میں اور پھر وہاں سے بیڈ پر۔"

"بیڈ" کے لفظ پر ڈیسمنڈ کی آنکھوں میں ایک چمک سی ابھر کر رہ گئی اور اس پر تناؤ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

"تم وہ پہلے شوہر نہیں ہو جس کے ساتھ ایسا ہوا ہو۔" گارلینڈ نے کہا۔

"وہ شخص کون تھا؟" ڈیسمنڈ نے پوچھا۔ اس کی آواز بلند اور لہجے میں شدت تھی۔

گارلینڈ نے ایک بڑا سا براؤن لفافہ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس کا حلیہ اس میں درج ہے۔"

ڈیسمنڈ اپنی کرسی پر آگے کی جانب یوں جھکا جیسے وہیں لڑھک جائے گا۔ پھر قدرے کپکپاتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "تم نے حقیقت میں... کیا دیکھا؟"

"میں نے انہیں موٹل کے ایک کمرے میں جاتے ہوئے دیکھا۔ پھر وہ ایک گھنٹے کے بعد وہاں سے نکل آئے تھے۔" گارلینڈ نے پُرسکون لہجے میں بتایا۔ "بس یہی کچھ دیکھا۔"

"بس یہی کچھ!" ڈیسمنڈ نے دہرایا۔ اس کا چہرہ غصے کی شدت سے مسخ سا ہو گیا تھا۔

"میں نے کمرے تک جا کر کھڑکی سے اندر جھانکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔" گارلینڈ نے کہا۔ "اور تم نے میری خدمات صرف اپنی بیوی کا پیچھا کرنے اور اس کی سرگرمیوں کے بارے میں رپورٹ دینے کے لیے حاصل کی تھیں۔ موٹل کے کمرے کے اندر کیا ہوا، اس بارے میں مجھے کچھ علم نہیں ہے لیکن میرے خیال میں وہاں کچھ نہیں ہوا ہوگا۔"

"کچھ نہیں ہوا ہوگا؟ کیا تم سنجیدہ ہو؟"

"میرے خیال سے نہیں۔" گارلینڈ نے اپنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارا نکتہ سمجھ رہا ہوں۔ میں جس پیشے سے تعلق رکھتا ہوں اس میں آپ کچھ تصور نہیں کر سکتے۔ آپ کے پاس حقیقی ثبوت ہونا چاہیے۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ اس رپورٹ کو گھر لے جاؤ اور اسے پڑھ لو۔ لیکن پہلے اپنے غصے کو ٹھنڈا کر لو پھر یہ فیصلہ کرنا کہ تمہیں یہاں سے کہاں جانا ہے۔ اگر تم محسوس کرتے ہو کہ تمہیں مزید کچھ جاننے کی ضرورت ہے تو مجھے تمہاری مدد کر کے خوشی ہوگی۔ تمہیں لازمی ثبوت چاہئیں جیسے کہ فوٹوگراف وغیرہ تو وہ بھی حاصل کیے جا سکتے ہیں لیکن پہلے تم اپنا غصہ ٹھنڈا کر لو اور اس بارے میں ٹھنڈے دل سے سوچو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔"

"وہ دیکھنے میں کیسا لگتا ہے؟" ڈیسمنڈ نے پوچھا۔

"درمیانہ قد اور درمیانی کاٹھ، ہو سکتا ہے کہ قد ذرا لمبا ہو۔ ادھیڑ عمر، سیاہ اسپورٹ کوٹ۔ بالوں میں ہلکی سی سفیدی۔" گارلینڈ باتیں کرنے کے ساتھ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اس قسم کے شوہر اپنی نوجوان بیویوں کے بارے میں ہمیشہ تصور کرتے ہیں کہ وہ ادھیڑ عمر مردوں کی جانب زیادہ راغب ہوتی ہیں۔ اور اس شخص کا جو حلیہ اس نے بیان کیا تھا، وہ قدرے مبہم تھا کیونکہ بیشتر ادھیڑ عمر کے لوگوں کا حلیہ کم و بیش ایسا ہی ہوتا تھا۔ البتہ اس نے جو تفصیل بیان کی تھی، اس کا مقصد اپنے کلائنٹ کے ذہن میں حقیقی حلیے کا تصور پیدا کرنا تھا۔ البتہ اپنی رپورٹ میں اس نے خاصا سنسنی خیز اور ٹھیک ٹھاک مواد شامل کیا تھا۔

ڈیسمنڈ کے جبڑوں کے عضلات مسلسل پھڑپھڑا رہے تھے اور وہ بار بار اپنے سر کو اثبات میں ہلا رہا تھا۔ اس نے گارلینڈ کا دیا ہوا براؤن لفافہ سختی سے اپنے ہاتھ میں دبوچ لیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے گھٹی ہوئی آواز میں گارلینڈ کا شکریہ ادا کیا۔

"آئی ایم سوری مسٹر ڈیسمنڈ۔" گارلینڈ نے کہا۔ "میں نے تمہیں متنبہ کرنے کی کوشش کی تھی کہ بعض اوقات سچ ایک ایسی چیز ہو سکتی ہے جو اس سے مختلف ہوتی ہے جو ہم

جاتے ہیں۔"

"میں بھی بس جاننا چاہتا تھا۔" ڈیسمنڈ نے دروازے کی جانب قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔ "یہ بات مجھے پاگل کیے دے رہی تھی اور یہ سچ تلاش کرنے پر مجھے کوئی افسوس نہیں ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

ڈیسمنڈ کے جانے کے بعد گارلینڈ نے اپنی میز کی سب سے نچلی دراز سے اسکاچ کی بوتل نکالی اور گلاس میں انڈیلنے کے بعد اطمینان سے اس کے گھونٹ لینے لگا۔ چند منٹ میں اس نے پورا گلاس خالی کردیا پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے دفتر کی لائٹیں بند کردیں۔

اسے یقین تھا کہ ڈیسمنڈ واپس ضرور آئے گا۔ ایسے کلائنٹ مزید جاننے کے لیے بے تاب ہوجاتے ہیں۔ وہ دہلا دینے والی تفصیلات کی جستجو میں لگ جاتے ہیں اور ایسے ثبوت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو طلاق کے حصول میں بھرپور مدد دے سکیں۔ ڈیسمنڈ ٹائپ کے لوگوں میں عام طور پر یہ غیر صحت مندانہ تجسس کچھ زیادہ ہی غالب رہتا ہے۔ بیوی کی بے وفائی ایک زخم کے کھرنڈ میں ہونے والی خارش کے مانند ہوتی ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

اور گارلینڈ کے لیے ڈیسمنڈ کی یہ خارش اس لحاظ سے منافع بخش تھی کہ اسے یومیہ تیس ڈالرز کی آمدنی متوقع تھی۔ وہ اس معاملے میں ڈیسمنڈ سے مزید چند سو ڈالرز اینٹھ سکتا تھا۔ پھر وہ ڈیسمنڈ سے یہ کہہ دیتا کہ تصویریں حاصل کرنا ناممکن ہے کیونکہ اس کی بیوی اور اس کے عاشق کو یہ شبہ ہوگیا ہے کہ ان کا تعاقب کیا جاتا ہے۔

فرض کریں ڈیسمنڈ یا پھر گارلینڈ کا کوئی بھی کلائنٹ یہ اندازہ لگانے میں کامیاب ہوجاتا ہے کہ اس سے دھوکے سے رقم اینٹھی گئی ہے تو پھر؟ حالانکہ ابھی تک ایسا نہیں ہوا تھا۔ تو پھر وہ کیا کرے گا؟ کیا یہ معاملہ عام کرے گا؟ اپنی بیوی کے روبرو یہ اعتراف کرے گا کہ اس نے اس کی نگرانی کے لیے ایک پرائیویٹ سراغ رساں کی خدمات حاصل کی تھیں؟ لیکن اس بات کا امکان کم ہی تھا۔

گارلینڈ نے گنگناتے ہوئے اپنے دفتر کے دروازے پر تالا لگایا اور مگن انداز میں چلتا ہوا ہال کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

اگلے روز صبح گارلینڈ نے حسب معمول دفتر جاتے ہوئے راستے سے اخبار خریدا لیکن عادت کے مطابق اس پر نگاہ ڈالنا ضروری نہیں سمجھا۔

دفتر پہنچنے کے بعد اس نے بلیک کافی کا ایک گھونٹ لیا اور اپنی میز پر جا بیٹھا۔ پھر جونہی اس نے اخبار کھولا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی بم پھٹ پڑا ہو۔ اس پر صدمے کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ گیا اور وہ سکتے کے عالم میں بیٹھا رہ گیا۔

اخبار کے صفحۂ اول پر ڈیسمنڈ کی مسکراتی تصویر چھپی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ دو تصویریں اور بھی تھیں۔ تصویروں کے ساتھ سرخی یہ تھی:

"نوجوان نے اپنی بیوی اور اس سے شادی کے خواہاں مرد کو شوٹ کرنے کے بعد خود کو بھی مار ڈالا۔"

گارلینڈ نے اخبار کو اپنی میز کے اوپر پھیلا دیا اور اسے یوں مضبوطی سے پکڑ لیا جیسے وہ کہیں ہوا سے اڑ نہ جائے۔ پھر اس نے آگے جھک کر تیزی سے اخبار پر نظریں دوڑانا شروع کردیں۔

"گزشتہ شب ڈیسمنڈ نامی نوجوان سینڈرز الیکٹرونکس کے پارکنگ لاٹ میں اپنی بیوی کا انتظار کررہا تھا۔ جونہی اس کی بیوی وہاں پہنچی، اس نے کچھ کہے بغیر اس پر ریوالور سے فائر کردیا۔ پھر اس کی لاش کے پاس سے گزرتا ہوا سینڈرز الیکٹرونکس کے پریذیڈنٹ کے دفتر میں داخل ہوا اور ریمنڈ سینڈرز پر تین گولیاں چلائیں۔ پھر اس نے خود کو بلڈنگ کے آخر میں بنے ہوئے واش روم میں بند کرلیا۔ جب پولیس عمارت میں داخل ہوئی تو اس نے ریوالور سے خودکشی کا خاتمہ کرلیا۔ پولیس کا کہنا ہے کہ ڈیسمنڈ نے اپنے پیچھے ایک تحریر بھی چھوڑی ہے۔"

گارلینڈ کی نظریں اخبار کے اوپری حصے میں چھپی ہوئی دیگر دو تصاویر کی جانب اٹھ گئیں۔ ان میں سے ایک تصویر جینٹ ڈیسمنڈ کی تھی۔ دوسری تصویر ایک ادھیڑ عمر شخص کی تھی جس کے بالوں میں ہلکی سفیدی جھلک رہی تھی۔

گارلینڈ سوچنے لگا کہ اسے یہ عام سا حلیہ بیان کرتے وقت کوئی ڈر خوف محسوس نہیں ہوا تھا لیکن اس مرتبہ یہ عام سا حلیہ عام ثابت نہیں ہوا تھا۔

گارلینڈ نے اخبار پر سے توجہ ہٹائی اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے گرما گرم کافی ایک ہی گھونٹ میں حلق سے نیچے اتار لی۔ گرما گرم کافی معدے میں پہنچتے ہی اس کا ذہن بیدار ہوگیا۔ اب وہ مزید کھلے ذہن کے ساتھ اس معاملے پر غور کرسکتا تھا۔ اخبار کا کہنا تھا کہ ریمنڈ سینڈرز شادی شدہ تھا اور تین بیٹیوں کا باپ تھا۔ اس کی سب سے بڑی بیٹی کی عمر سولہ برس تھی۔ اسے بازو اور پہلو میں سطحی زخم آئے تھے

اور وہ ہسپتال میں داخل تھا۔ اس نے اسپتال کے بیڈ سے ان تمام باتوں کی تردید کی تھی جو اس کی سیکریٹری کے شوہر کے خودکشی کے پیغام میں تحریر تھیں۔

گارلینڈ اپنی میز سے اٹھ کر کافی تیار کرنے والی الیکٹرک مشین کے پاس چلا گیا۔ اس نے اسٹرانگ کافی کا ایک اور کپ بھرا اور اپنی میز پر واپس آگیا۔

وہ گرما گرم کافی کے گھونٹ پیتے ہوئے سوچنے لگا۔ کیا کوئی بھی ریمنڈ سینڈرز کی بات پر یقین کرلے گا؟ اس کی بیوی؟ اس کے دوست؟ اس کے کاروباری شناسا؟ بعض یقین کرلیں گے اور بعض یقین نہیں کریں گے... لیکن اکثر یقین نہیں کریں گے۔

البتہ اصل بات پولیس کے یقین کرنے کی ہے اور کیا پولیس قتل اور خودکشی کے اس کیس کا تعلق گارلینڈ سے جوڑنے میں کامیاب ہوجائے گی؟ اگر ایسا ہوا تو گارلینڈ کو یہ شہادت دینے کے لیے خود کو تیار رکھنا ہوگا کہ اس کے جائزے کے مطابق ریمنڈ سینڈرز اور جینٹ ڈیسمنڈ کے درمیان ناجائز تعلقات قائم تھے۔

یہ کہانی بدستور اخبارات کی زینت بنی رہی۔ لگ بھگ ایک ہفتے بعد اخبار نے ریمنڈ سینڈرز کی ذاتی زندگی کے بارے میں اچھی خاصی چھان بین کرلی اور بے تاب قارئین کے لیے یہ تفصیل صفحۂ اول پر نمایاں شائع کردی گئی۔

اس کے پڑوسیوں کا کہنا تھا کہ ریمنڈ سینڈرز ہمیشہ ایک پیار کرنے والا شوہر اور باپ دکھائی دیتا تھا لیکن دوسری جانب وہ سرد مزاج بھی واقع ہوا تھا اور شاذ و نادر ہی گھر پہ رہتا تھا۔

تیسرے ہفتے کے اختتام پر اخبارات نے یہ خبر دی کہ ریمنڈ سینڈرز کی بیوی اسے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔

چوتھے ہفتے کے آغاز میں ایک ہوم سائڈ سراغ رساں نے گارلینڈ کے دفتر کے دروازے پر دستک دی۔ اس کی مونچھیں بڑی اور نام سورینو تھا۔ اس نے بتایا کہ گارلینڈ نے ڈیسمنڈ کی بیوی کی سرگرمیوں کے متعلق جو رپورٹ اسے دی تھی، وہ پولیس کو ڈیسمنڈ کی کار کے فلور میٹ کے نیچے رکھی ہوئی مل گئی ہے۔

ادھر کسی طرح اخبارات نے بھی وہ رپورٹ اچک لی اور شام کے اخبارات میں گارلینڈ کی تصویر کے ساتھ وہ رپورٹ بھی شائع ہوگئی۔ گارلینڈ نے اپنی رپورٹ کی صحت سے انکار نہیں کیا اور پولیس کو اس بارے میں اپنے دستخط سے تحریری بیان دے دیا۔ البتہ اس نے پریس رپورٹرز سے

اصل وجہ

ایک شخص نے عمدہ سا کپڑا خریدا اور سوٹ سلوانے کی غرض سے ایک درزی کے پاس گیا۔ درزی نے کپڑا لے کر ناپا اور کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "کپڑا کم ہے، اس کا ایک سوٹ نہیں بن سکتا۔"

وہ دوسرے درزی کے پاس چلا گیا۔ اس نے ناپ لینے کے بعد کہا۔ "آپ دس دن بعد سوٹ لے جایئے۔"

وقتِ مقررہ پر وہ درزی کے پاس پہنچ گیا۔ سوٹ تیار تھا۔ ابھی سلائی کے پیسے ادا کر ہی رہا تھا کہ دکان میں درزی کا پانچ سالہ لڑکا داخل ہوا۔ اس شخص نے دیکھا کہ لڑکے نے بالکل اسی کپڑے کا سوٹ پہن رکھا تھا۔

تھوڑی سی بحث کے بعد درزی نے اقرار کرلیا۔

اب وہ شخص پہلے درزی کے پاس گیا اور پھنکارتے ہوئے کہا۔ "تم تو کہتے تھے کپڑا کم ہے لیکن تمہارے حریف نے اسی کپڑے سے نہ صرف میرا بلکہ اپنے لڑکے کا بھی سوٹ بنالیا۔"

درزی صبر و تحمل سے سنتا رہا پھر کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔ "لڑکے کی عمر کیا ہے؟"

"پانچ سال۔"

درزی چہک کر بولا۔ "میں بھی کہوں وجہ کیا ہے۔ جناب! میرے لڑکے کی عمر اٹھارہ سال ہے۔"

مرسلہ: جہانزیب، کراچی

کوئی بات کرنے سے سختی سے انکار کردیا۔

یہ جمعے کا دن تھا جب گارلینڈ اپنے دفتر کے قریب ایک جزوی ویسٹرن اسٹیک ہاؤس میں لنچ کررہا تھا۔ جب اس نے کھانے کی پلیٹ پر سے نظریں اٹھا کر سامنے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ میز کے مقابل سراغ رساں سورینو براجمان تھا۔ اسے سراغ رساں کی آمد کا احساس تک نہیں ہوا تھا۔

سیاہ مونچھوں والا سراغ رساں اپنی پیشہ ورانہ سپاٹ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا لیکن گارلینڈ کو اس کی براؤن آنکھوں میں عیاں مدھم سی چمک کسی طور نہیں بھا رہی تھی۔

"مسٹر گارلینڈ۔" سورینو نے سنجیدہ لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ "تم ایک نہایت گھٹیا کاروباری شخصیت ہو۔"

"یہ بات مجھے بارہا سننے کو مل چکی ہے۔" گارلینڈ نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا اور اسٹیک کا ایک اور لقمہ اٹھا کر منہ میں رکھ لیا اور اسے چبانا شروع کردیا۔

سراغ رساں سوریتو کی بڑی سی آنکھیں کسی مجسمے کی پینٹ کی ہوئی ساکت آنکھوں کے مانند اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ "ہم نے تمہاری اس رپورٹ کو چیک کر لیا ہے۔" سوریتو نے گارلینڈ سے کہا۔ "فلورنس نامی ایک لڑکی کا کہنا ہے کہ وہ رات گئے تک جیسٹ ڈیسمنڈ کے ہمراہ تھی۔ ہارمنز ریسٹورنٹ کی ویٹرس نے تصدیق کی ہے کہ اس نے ان دونوں لڑکیوں کو پیزا اور سلاد سرو کیا تھا۔ اسے وہ دونوں اس لیے یاد رہیں کہ وہ اسے ٹپ دینا بھول گئی تھیں۔ ریکوز لاؤنج کی بارمیڈ کا کہنا ہے کہ اس نے ان دونوں لڑکیوں کو وہسکی سرو کی تھی۔ کنگز لینڈ موٹل کے ڈیسک مین نے ان دونوں لڑکیوں یا مسٹر ریمنڈ سینڈرز کو پہچاننے سے انکار کر دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی اس کے موٹل میں کبھی نہیں آیا۔"

"دنیا ایک مصروف جگہ ہے۔ کون کسی پر توجہ دیتا ہے۔ ہر کوئی اپنے میں مگن رہتا ہے۔" گارلینڈ نے جواب دیا۔

"لیکن مسٹر گیلووے نے توجہ دی ہے۔"

گارلینڈ نے اپنی آئس ٹی کا ایک گھونٹ بھرا اور بولا۔ "یہ مسٹر گیلووے کون ہے؟"

"یہ وہ شخص ہے جس کے ہمراہ تمہاری رپورٹ کی ہوئی بیشتر شب ریمنڈ سینڈرز نے کاروباری گفتگو میں گزاری تھی۔" سراغ رساں سوریتو نے بتایا۔ اس کے لہجے میں نفرت کی ہلکی سی جھلک عیاں تھی۔

گارلینڈ نے دھیرے سے اپنے اسٹیک کا ایک اور لقمہ بھرا پھر آہستگی کے ساتھ اپنے سفید نیپکن سے منہ کو پونچھنے لگا۔ "اوکے۔" اس نے کہا۔

"اوکے کیا؟" سوریتو نے سر کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

"میں نے جھوٹ بولا تھا لیکن جھوٹ بولنا کوئی جرم نہیں ہے۔ صرف گناہ ہے۔" گارلینڈ نے کہا۔

سوریتو نے اپنی نفرت بھری نگاہیں گارلینڈ کے چہرے پر جما دیں۔ "یہ گناہ بھی ہے اور قتل کا جرم بھی مسٹر گارلینڈ۔" اس کی آواز دھیمی تھی۔ "تم نے نہ صرف دو افراد کا قتل کیا ہے بلکہ ایک شخص کی زندگی بھی تقریباً تباہ کر دی ہے۔"

"ٹیکنیکل طور پر نہیں۔" گارلینڈ نے سراغ رساں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ "اور نہ ہی قانونی طور پر۔"

"تمہیں جو پبلسٹی ملنے والی ہے، اس کے بعد تم کل سے اس ریاست میں کوئی کاروبار نہیں کر سکو گے۔" سراغ رساں سوریتو نے غصے سے کہا۔ "تمہارا انویسٹی گیٹر لائسنس منسوخ ہو جائے گا اور تمہاری کوئی کاروباری عزت باقی نہیں رہے گی۔ قانون تمہیں چھو نہیں سکتا کیونکہ ٹریگر تم نے نہیں دبایا تھا لیکن اس کے باوجود بھی تم ایک قاتل ہو۔"

"تم جذبات کی رو میں بہہ رہے ہو۔" گارلینڈ نے کہا۔ "یہ ڈیسمنڈ تھا جس نے اپنی بیوی اور خود کو قتل کیا ہے۔ وہ ذہنی اور جذباتی طور پر غیر مستحکم تھا۔"

سراغ رساں سوریتو ناقابلِ یقین نظروں سے گارلینڈ کو گھورنے لگا۔

پھر سوریتو اچانک اٹھ کھڑا ہوا، گھوما اور دروازے کی سمت چل دیا۔

گارلینڈ کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ سوریتو غصے سے ریسٹورنٹ کے بھاری لکڑی کے دروازے کو [illegible] اور باہر سڑک پر نکل کر غائب ہو گیا۔

گارلینڈ نے میٹھا کھانا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ جو کچھ برا ہونا تھا، وہ ہو چکا تھا اور وہ جانتا تھا کہ وہ اس مرحلے سے بھی گزر جائے گا۔ اتنے برسوں سے اس کاروبار سے وابستہ ہونے کا ایک فائدہ یہ ہوا تھا کہ وہ ڈھیٹ ہو چکا تھا۔ وہ اس سے قبل بھی اسی نوعیت کی بدترین افتاد جھیل چکا تھا۔

سراغ رساں سوریتو نے اس کاروبار کی مخالفانہ ناموافق پبلسٹی کے بارے میں جو کچھ کہا تھا، وہ درست تھا۔ پھر اس کے انویسٹی گیٹر لائسنس کی تنسیخ اسے بے دست و پا کر دینے کے لیے کافی تھی۔

گارلینڈ نے پولیس اور رپورٹرز کی بار بار مداخلت سے بچنے کی خاطر سچ پر مبنی ایک رسمی تحریری بیان دے دیا۔ اس جج نے جیسٹ ڈیسمنڈ کو بدکاری کے الزام سے بری قرار دے دیا۔

گارلینڈ نے اگلے روز صبح اخبار میں پڑھا کہ ریمنڈ سینڈرز کی بیوی، بیٹیوں سمیت اس کے پاس واپس آ گئی ہے اور وہ سب ایک بار پھر یکجا ہو گئے ہیں۔ گارلینڈ کی نگاہ میں یہ ہالی ووڈ کی فلموں کے حقیقی انجام کی طرح تھا۔

پھر اس نے اپنی میز صاف کرنا شروع کر دی۔ اس کے لیے یہ سب ایک نئے اسکرپٹ کے آغاز کی طرح تھا۔ لیکن ایک ہوشیار کاروباری شخصیت کے لیے کسی فائدہ مند کاروبار کی جستجو مشکل نہیں تھی۔ وہ کسی دوسری ریاست میں ایک اور ڈیٹیکٹیو ایجنسی کا آغاز کر سکتا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا ملک تھا اور اس میں ایسے احمقوں کی کمی نہیں تھی جو گارلینڈ کو وہ کچھ بہ خوشی عطا کر سکتے تھے جس کا وہ خواہش مند تھا۔

اس نے اپنی فائلیں اور آفس کا سامان پیک کرنا شروع کر دیا۔ اسے احساس تھا کہ اس پر جو کچھ گزری تھی، وہ اس کی ہلاکت خیزی کا سبب بھی بن سکتی تھی۔ لیکن اس کے مضبوط نروس سسٹم نے اسے خود پر طاری کرنے سے بچا لیا تھا۔

اسے اچھا لگ رہا تھا کہ اب وہ کسی دور دراز نامعلوم شہر میں اپنے کاروبار کو نئے انداز میں شروع کر سکے گا۔

جب گارلینڈ اپنی میز کی سب سے نچلی دراز ٹٹولنے کے لیے نیچے جھکا کہ کہیں کوئی شے بھول نہ جائے تو اسے باہر ہال کی جانب سے ایک مخصوص آواز سنائی دی۔ ایک قسم کی چرچرانے کی آواز۔ وہ اپنی کرسی پر سیدھا تن گیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

ابھی وہ آواز کی نوعیت جاننے کے ارادے سے دروازے کی جانب قدم اٹھانا چاہ رہا تھا کہ اس کے آفس کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا۔

جو شخص دروازے میں کھڑا ہوا تھا، اس کے عقب میں فرش پر گارلینڈ کو چمڑے کا گن کیس دکھائی دیا جس کی زپ کھلنے کی آواز اسے سنائی دی تھی۔

وہ گن خاصی لمبی اور قیمتی تھی۔ اس کے دستے کو خوب صورتی سے تراشا گیا تھا۔ یہ بارہ بور کی ڈبل بیرل اسکیٹ گن تھی۔ اس قسم کی گن سے دولت مند اسپورٹس مین اپنے یورپ کے ویک اینڈز پر مٹی کے پرندے اچھال کر بہ طور ہدف نشانہ بازی کرتے ہیں۔

یہ گن ریمنڈ سینڈرز نے مہارت کے ساتھ اپنے ہاتھوں میں تھامی ہوئی تھی اور وہ کسی طور پر یورپ میں جانے کے لیے نظر نہیں آ رہا تھا۔

ریمنڈ سینڈرز نے پاورفل شاٹ گن کو گارلینڈ پر تانتے ہوئے اپنے ایک پیر سے دروازے کو بند کر دیا اور ایک قدم آگے بڑھ آیا۔

گارلینڈ پر اس سے قبل صرف ایک بار گن تانی گئی تھی لیکن اس نے صورت حال کو بہ خوبی ہینڈل کر لیا تھا۔ البتہ اس وقت وہ خوف زدہ تھا لیکن اس نے اپنی آواز پر قابو قائم رکھا۔ اس کی کوشش تھی کہ ریمنڈ سینڈرز ذرا سی غفلت دکھائے تو وہ اس کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر اسے چھاپ لے۔

"کرسی لے لو۔" گارلینڈ نے میز کے نزدیک رکھی ہوئی کشن والی کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ریمنڈ سینڈرز نے اس کی پیشکش پر کوئی توجہ نہیں دی۔

"تم نے مجھے بے انتہا رنج پہنچایا ہے مسٹر گارلینڈ۔ اتنا گہرا کہ تم اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔"

"اور اگر تم نے ٹریگر دبا دیا تو تمہیں اس سے بھی کہیں زیادہ رنج ہوگا۔" گارلینڈ نے شاٹ گن کے بیرل کے دونوں مہیب سوراخوں پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ کلوز رینج میں اس قسم کی گن کیا تباہی پھیلا سکتی ہے۔ ریمنڈ سینڈرز کی انگلی کی ایک جنبش گارلینڈ کو گوشت اور ہڈیوں کے ٹکڑوں میں یوں بکھیر دے گی جیسے کہ مٹی کے پرندوں کے پرخچے اڑا دیتی ہے۔

"میں نہیں سمجھتا کہ مجھ میں اب مزید کوئی غم برداشت کرنے کی قوت باقی رہ گئی ہے۔" ریمنڈ سینڈرز نے بیزار کن لہجے میں کہا۔

"اس کی ضرورت بھی نہیں۔" گارلینڈ نے تیزی سے کہا۔ "پورا معاملہ اب ختم ہو چکا ہے۔ تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچی، کوئی نقصان نہیں ہوا... تم اپنی فیملی سے دوبارہ مل گئے ہو... تمہاری شہرت پر کوئی داغ نہیں لگا... تمہاری بیوی اب پہلے سے کہیں زیادہ تم پر اعتبار اور تم سے پیار کرے گی۔"

"کوئی نقصان نہیں ہوا، کوئی گزند نہیں پہنچی۔" ریمنڈ سینڈرز نے عجیب ہنستی ہوئی دھیمی آواز میں کہا تو گارلینڈ کو یوں محسوس ہوا جیسے خوف کی تیز لہر اس کے وجود میں سرایت کر گئی ہو۔ "کوئی نقصان نہیں ہوا، کوئی گزند نہیں پہنچی..." وہ دہرا رہا تھا۔ اذیت اس کے لہجے اور ... چہرے سے عیاں تھی۔ اس نے شاٹ گن اپنے کاندھے سے لگائی اور بیرل کو گارلینڈ کے سینے کی جانب کر دیا۔

"رک جاؤ، سینڈرز! تمہارے پاس مجھے مارنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ میں تو تمہیں جانتا تک نہیں۔ میرا مقصد کبھی بھی تمہیں نقصان پہنچانا نہیں تھا اور نہ ہی تمہیں کوئی نقصان پہنچایا ہے... اور سب کچھ اب ایسا ہی جیسا پہلے تھا... پلیز!" گارلینڈ کا دل اس تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ وہ اسے اپنی پسلیوں سے ٹکراتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی یہ خواہش شدت اختیار کر رہی تھی کہ وہ بغلی دروازے کی سمت دوڑ پڑے لیکن اس کے باوجود وہ جانتا تھا کہ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔

"تم سمجھے نہیں۔" ریمنڈ سینڈرز نے نرم مگر کمزور آواز میں کہا۔ "میں جینیٹ سے واقعی محبت کرتا تھا... بے انتہا محبت... بہت بہت زیادہ محبت۔"

ان دونوں کی نظریں ایک لمحے کے لیے ایک دوسرے سے الجھ گئیں پھر اچانک گارلینڈ دروازے کی جانب دوڑ پڑا۔

اسی لمحے ایک زوردار دھماکا ہوا۔ یہ ڈبل بیرل شاٹ گن کا فائر تھا جس نے اچھل کر بھاگتے ہوئے گارلینڈ کے پرخچے اڑا دیے۔

تیس سیکنڈ بعد ایک اور فائر ہوا اور پھر خاموشی چھا گئی!

*

سرورق کی پہلی کہانی

کہتے ہیں کہ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے... واقعی میں دم نکل جاتا ہے... خواہشیں تمام نہیں ہوتیں... کائنات میں کچھ ایسی ہستیاں ہیں کہ جنہیں قدرت کی طرف سے ہر نعمت کا تحفہ ملتا ہے... عزت... شہرت... دولت... صحت اور سب سے اہم خوش قسمتی... مگران سب لوازماتِ زندگی کے باوجود وہ عنایت... قناعت... اور اعتدال اختیار کرنے کے بجائے کچھ اور کی چاہ میں مبتلا رہتے ہیں... ان کی تلاش اور ہوس کبھی ختم نہیں ہوتی... ایک ایسے ہی مشکل پسند شخص کا قصہ... ہر شے جس کی قوتِ خرید میں تھی... مگر وہ لوگوں کے مقدر خریدنے کا متمنی تھا... اپنی تقدیر کے بدلے دوسروں کی تقدیر کا سودا کرنا چاہتا تھا... ماورائی اور پُراسرار علوم کے شوقین افراد کے لیے ایک خاص تحریر...

زندگی اور مقدر کے سودے کرنے والے سوداگر کی ...

مختار آزاد

یہ 1956 کی بات ہے۔ انگریز راج کے خاتمے اور تقسیم کے بعد پیش آنے والے مسائل سے اٹھنے والی گرد کسی حد تک بیٹھنے لگی تھی مگر پھر بھی روزانہ اخبارات اس طرح کی خبروں سے بھرے ہوتے تھے جنہیں پڑھ کر میری طبیعت خراب ہونے لگتی۔ میں نے انگریز دور میں پولیس سروس شروع کی اور ان کے جانے کے صرف دو سال بعد اسسٹنٹ کمشنر بمبئی پولیس کے عہدے سے ریٹائر ہو گیا۔ میری بیوی کئی سال پہلے ہی سورگ باسی ہو چکی تھی۔ تین بیٹیاں تھیں، دو لندن میں اور ایک دلی میں تھی۔ بیٹا لندن میں تعلیم مکمل کر کے وہیں روزگار سے لگ گیا تھا۔ میں بمبئی کے مضافات میں کھنڈالا جانے والے راستے کے قریب ایک فارم ہاؤس میں رہتا تھا۔ یہ میرے زمیندار باپ کی وہ آخری نشانی تھی جو میرے سوا اس دنیا میں باقی بچی تھی۔

وہ دسمبر کے وسط کی ایک صبح تھی۔ میں حسبِ معمول برآمدے کے سامنے نرم نرم دھوپ تاپتے ہوئے اخبار پڑھنے میں مصروف تھا۔ میری نظریں اس وقت اخبار پر نہیں بلکہ دنیا کے مسائل پر تھیں۔ اس وقت دنیا کو کئی سنگین بحران درپیش تھے۔ ہنگری میں انقلاب پر تول رہا تھا، نہر سوئز کے معاملے نے پوری دنیا کی توجہ حاصل کر رکھی تھی، کیوبا کے پہاڑی جنگلوں سے فیدل کاسترو گوریلا جنگ کی کمان کر رہا تھا اور نوجوان راک اسٹار ایلوس پریسلے امریکی پاپ موسیقی کے اُفق پر جگمگانے کی جدوجہد کر رہا تھا... میں انہی عالمی مسائل کی تشویش میں مبتلا تھا کہ فون کی گھنٹی نے میرے دماغ کو واپس ہندوستان پہنچا دیا۔

”ہیلو... اے سی پی ریٹائرڈ ٹھکر دیال بول رہا ہوں۔“

”نمستے ٹھکر جی!“

”ارے آپ...“ میں نے چونکتے ہوئے کہا۔ ”بھئی روی مشرا جی! کہاں ہیں آپ؟ اب تو آپ کا چہرہ بھی نگاہوں میں دھندلانے لگا ہے۔“ میں نے شکایتی لہجے میں کہا۔

”ناراضی بجا... پر اس وقت تو مجھے تم سے کام آن پڑا ہے۔“

”کہیے...“ یہ کہہ کر میں نے بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔ ”بھئی ملازمت سے ریٹائر ہوا ہوں، زندگی سے نہیں۔ اب بھی کام آسکتا ہوں آپ کے۔“

”مسئلہ فون پر بتانے والا نہیں۔“ انہوں نے جواب دیا۔ ”تم میرے پاس آسکتے ہو؟“ انہوں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

”ارے کیوں نہیں۔ بتایئے کب حاضر ہو جاؤں؟“

”آج شام چار بجے تک میرے پاس پہنچ سکتے ہو؟“

”ضرور، بس طے ہوا شام ساڑھے تین چار بجے کے درمیان میں آپ کے ہاں پہنچ رہا ہوں۔“

میں مقررہ وقت سے ذرا پہلے ہی روی مشرا کے ہاں پہنچ گیا۔ وہ میرے ہی منتظر تھے۔

”بات یہ ہے کہ میری ایک پرانی دوست نے مجھ سے مدد کی درخواست کی ہے مگر میں یہ کام اکیلے نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“ رسمی باتوں کے بعد انہوں نے اصل بات شروع کی۔

”کہیے... کیا بات ہے؟“

”بات یہ ہے کہ وہ عمر میں تو مجھ سے بہت چھوٹی ہے

البتہ جن دنوں میں بمبئی فلم نگری میں شب و روز گزار رہا تھا، تب اس سے ملاقات ہوئی تھی۔“ انہوں نے کہنا شروع کیا۔ ”ویسے وہ فلم میں تو کوئی خاص کام نہ کر سکی البتہ تھیٹر پر اچھا کام کر چکی ہے۔ میرے ساتھ بھی اس نے کئی ڈرامے اسٹیج کیے تھے مگر قسمت نے ساتھ نہیں دیا۔“ یہ کہہ کر انہوں نے سرد آہ بھری۔ ”تم تو جانتے ہو کہ تقسیم کے بعد بمبئی کی فلم اور اسٹیج دنیا پر کئی سال بڑے بھاری گزرے تھے۔ بہت کچھ اُجڑ گیا تھا۔“

”یہ تو ہے۔“ میں نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ سچ بات یہ ہے کہ میں بھی فلم اور تھیٹر کا رسیا تھا اور ان سے دوستی کی وجہ بھی یہی بات بنی تھی۔

”تقسیم کی دھول بیٹھی تو وہی سامنے رہ گئے جو پہلے ہی اپنی دھاک اچھی طرح بٹھا چکے تھے۔ رہی بے چاری شوبھا تو اسے کون یاد رکھتا۔ بس! یوں سمجھو کہ بے چاری تقسیم کی نذر ہو گئی۔“

”تو ہوا کیا ہے اُسے؟“

”وہ یہیں رہتی ہے بمبئی میں۔ شوہر کی وفات کے بعد اس نے کسی اسٹاک بروکر کے پاس بطور سیکریٹری نوکری کر لی تھی اور اب اس کا قتل، معاف کرنا شاید حادثاتی موت ہو گئی ہے۔“

”کیا مطلب...؟“ میں مشرا جی کا آخری جملہ سن کر چونک گیا۔ ”قتل یا حادثہ...“ میرا لہجہ استفساریہ تھا۔

”فی الحال تو میں اس سوال کا جواب پورے یقین سے نہیں دے سکتا۔“ انہوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”البتہ شوبھا دیوی کا اصرار ہے کہ اُس کا قتل ہوا ہے اور جب میں نے اخبار نکال کر خبر پڑھی تو اس میں پولیس کا دعویٰ تھا کہ موت حادثاتی ہے۔“

”تو وہ کیا چاہتی ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”پولیس کو یقین دلانا کہ اس کا مرحوم باس حادثے کا شکار نہیں ہوا بلکہ اسے قتل کیا گیا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکے۔ ”مگر اس بے چاری کی بات پر پولیس کو یقین نہیں اور اب وہ چاہتی ہے کہ میں اس کے لیے کچھ کروں۔“ وہ یہ کہہ کر خاموش ہوئے اور میری طرف دیکھنے لگے۔

”وہ تو ٹھیک ہے مگر میں کیا کر سکتا ہوں؟“

”تفتیش...“ انہوں نے مسکرا کے کہا۔ ”اس کیس کی تفتیش کر کے حقائق کا پتا چلانا ہوگا اور شوبھا بھی یہی چاہتی ہے۔“ انہوں نے معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ ”تم نے کرائم برانچ میں پوری زندگی بسر کی ہے۔ میری

درخواست ہے کہ تم اس کیس کی تفتیش کرو اور میں تمہارا پارٹنر بنوں۔“

ان کی بات سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ ملازمت سے ریٹائر ہوئے کم و بیش دس برس ہو رہے تھے اور اب تو مجھے جرم کی خبروں سے چڑ ہو چکی تھی۔ کوئی اور ہوتا تو میں انکار کر دیتا مگر میں مشرا جی کی بہت عزت کرتا تھا۔ کم و بیش پچیس سال کی دوستی تھی ہماری۔

روی مشرا سے میری پہلی ملاقات فلم اسٹوڈیو کے کینٹین میں ہوئی تھی۔ تب وہ شوقیہ طور پر فلموں میں چھوٹے موٹے کردار ادا کرتے تھے۔ ویسے وہ بمبئی کے ایک کالج میں انگریزی پڑھاتے تھے۔ اچھے خاصے کھاتے پیتے گھرانے سے تھے۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ اُن کی لمبی سی سرخ کیڈلاک کار میں اکثر دوست رات کو بمبئی کی سنسان سڑکوں پر سیر کو نکلا کرتے تھے۔ بڑے من موجی اور زندہ دل انسان تھے۔ جتنی فلم سے دلچسپی تھی، اتنی ہی ادب اور کم و بیش... پُراسرار علوم سے... اکثر ان کے قصے سنتے سنتے رات بیت جاتی تھی مگر اُن پر تھکن کا رتی بھر اثر نظر نہ ہوتا تھا۔

”کس سوچ میں پڑ گئے؟ کیا آزمائش میں ڈال دیا تمہیں؟“

میں خیالوں سے چونکا۔ ”ہرگز نہیں... بس! ذرا گزرے دن یاد آ گئے تھے۔“

”صاف صاف کہو جوانی یاد آ گئی تھی۔“ اپنی عادت کے مطابق وہ بڑے آداب اور رکھ رکھاؤ سے ملے تھے مگر اب حسبِ عادت بے تکلفی پر اتر آئے تھے۔

”تم اور ولایتی شراب بالکل ایک جیسے ہو۔ آہستہ آہستہ اندر اتارتے جاؤ اور لحہ بہ لحہ سرور کو بڑھتا محسوس کرتے جاؤ۔“ میں بھی اب بے تکلفی پر اتر آیا۔

”رہنے دو۔“ وہ مسکرائے۔ ”یہ بتاؤ، کام کرو گے؟“ انہوں نے آگے بڑھ کر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”اب تمہارے معاملے میں انکار کی ہمت تو کم از کم میرے اندر نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے میں مسکرا دیا۔

”ہمت کر بھی نہیں سکتے۔“ انہوں نے کہا۔ ”جانتے ہو... میں اُستاد ہوں۔“

”بوڑھے ہو گئے ہو مگر عادتیں وہی ہیں۔“

”وہ عادتیں ہی کیا جو عمر کے ساتھ بدل جائیں۔“ روی مشرا نے برجستگی سے جواب دیا۔

”یہ بتاؤ، تفتیش کب سے شروع کرنی ہے؟“ میں نے ذرا سنجیدہ ہوتے ہوئے استفسار کیا۔

”ٹھیک، تیس منٹ بعد سے۔“ انہوں نے گھڑی پر نظر ڈالنے کے بعد میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں تفتیش کا آغاز شوبھا دیوی سے کرنا ہوگا۔ پانچ منٹ بعد ہم تمہاری گاڑی میں سوار ہو کر اس کی طرف جائیں گے۔ تم نیچے پہنچو، میں کوٹ پہن کر آتا ہوں۔“

”اوکے سر!“ میں کھڑا ہو گیا۔ ”نیچے جا کر گیٹ کے سامنے گاڑی لگاتا ہوں، آپ پہنچیں۔“

شوبھا دیوی بمبئی کے متوسط طبقے کے علاقے میں رہتی تھی۔ اس کا فلیٹ جوہو میں واقع مشرا کے گھر سے خاصے فاصلے پر تھا۔ راستے میں وقت گزاری کے لیے ہم دونوں کیس پر باتیں کرتے رہے۔ مشرا کا خیال تھا کہ معاملہ اس لیے نازک ہے کہ شوبھا نے خود کو دولت، قسمت اور وقت سے پہلے موت کے جال میں پھنسا لیا ہے اور پرانا دوست ہونے کے ناتے انہیں اس کی ہر حال میں مدد کرنی چاہیے اور وہ ایسا ہی کر رہے تھے۔

☆☆☆

جوہو سے نکلے ہوئے ہمیں تقریباً ایک گھنٹا ہو چکا تھا اور پچھلے پچیس تیس منٹ سے ہم شوبھا دیوی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے مگر اب تک دیوی جی کے منہ سے کام کی کوئی بات نہیں سنی تھی۔ وہ دونوں آپس میں ہی باتیں کیے جا رہے تھے۔ مجھے تو یوں لگ رہا تھا کہ میرے یہاں آنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میں نے بیٹھے بیٹھے شوبھا دیوی پر نظر ڈالی۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر پینتالیس سے اڑتالیس سال کے قریب ہوگی۔ وہ میرے اور مشرا سے کم و بیش پندرہ سترہ برس ضرور چھوٹی ہوگی۔ وہ ماضی کی گمنام اداکارہ تھی مگر اب بھی اس کا حسن کافی تابندہ تھا۔ سیاہ لمبے اور گھنے بال، جھیل جیسی گہری غلافی آنکھیں، لمبا قد، پتلے پتلے ہونٹ، چھریرا بدن اور ہلکی گندمی رنگت، خوبصورت چہرہ جس کی دلکشی بڑھانے کے لیے ہلکا پھلکا میک اپ... ان سب نے مل کر اسے عمر سے کافی چھوٹا بنا دیا تھا۔ میں نے ایک ہی نظر میں اس کے سراپا کا بھرپور جائزہ لے لیا تھا۔

”شوبھا تمہارا اصل نام ہے؟“ میں نے ایک پینٹنگ پر نظر ڈالنے کے بعد اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز کرتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں...“ اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”اب تو یہی میرا نام ہے مگر پیدائشی نہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے کچھ توقف کیا۔ ”پیدائش کے بعد میرا نام للیتا رکھا گیا تھا مگر...“ وہ

کہتے کہتے رکی۔ ”میرا تجربہ ہے کہ فلم اور تھیٹر کی دنیا میں نام بدلنے سے قسمت نہیں بدلتی۔ کم از کم میں تو اپنا نام بدلنے کے باوجود فلم اور تھیٹر سے نہ تو نام کما سکی اور نہ ہی دولت مگر پھر بھی، اب شوبھا ہی میرا نام ہے۔“

”اپنے بارے میں ایسا مت سوچو۔ تم نہیں جانتیں کہ تھیٹر پر تمہاری اداکاری کا جادو کس طرح ناظرین پر اثر انداز ہوتا تھا۔ تمہاری اداکاری تو بہت جاندار ہوتی تھی۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر...“

”چھوڑو یہ اگر مگر...“ مشرا جی نے قطع کلامی کی۔ ”تمہیں وہ پری فون ڈراما یاد ہے۔“

”جو کرچین آفیسرز کلب کی ڈرامیٹک سوسائٹی میں کیا تھا کرسمس کے موقع پر۔“ شوبھا نے تصدیق چاہی۔ اس کے چہرے پر خوشگوار حیرت تھی۔

”ہاں بالکل وہی۔“

”وہ بھلا میں کیسے بھول سکتی ہوں۔ اس میں کامریڈ کی چاندی جیسی لمبی داڑھی...“ شوبھا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ”تمہیں پتا ہے، جب اس نے مجھے گلے لگایا تو اس کی نقلی داڑھی کے چند بال میری ناک میں گھس گئے تھے۔ مجھے چھینک آ رہی تھی۔ میں تو میں ہی جانتی ہوں، کتنی مشکل سے چھینک روکی تھی مگر وہ ہنس پڑی۔ ”اس کے لیے مجھے مقررہ وقت سے زیادہ دیر تک اس کمبخت کو گلے سے چمٹانا پڑا تھا۔“ یہ کہہ کر وہ ایک بار پھر زور زور سے ہنسنے لگی۔ جب اس کی ہنسی تھمی تو وہ میری طرف مڑی۔ ”وہ آئرش دیومالائی داستان پر مبنی ڈراما تھا۔ اس وقت اگر میں چھینک دیتی تو پورے ڈرامے کا مزہ کرکرا ہو جاتا۔ بڑا سنجیدہ سین تھا وہ۔ لوگ ہال میں رو رہے تھے۔“ یہ کہہ کر وہ پھر ہنس پڑی۔ ”ذرا سوچو...“ اس نے پھر مجھے مخاطب کیا۔ ”اگر میں چھینکتی تو پھر ٹریجڈی سین میں کامیڈی کیسی لگتی؟“

”صحیح کہہ رہی ہو۔“ میں بھی مسکرا دیا۔

میں اِدھر اُدھر کی باتوں کے بجائے کام کی بات کرنے میں زیادہ دلچسپی رکھتا تھا اس لیے فوراً مطلب کی بات پر آ گیا۔

”راستے میں مشرا جی نے مجھے کچھ اخباری تراشے دکھائے تھے جو سیموئیل کی موت سے متعلق تھے۔ ان خبروں کے مطابق اسٹاک بروکر سیموئل شائے ہفتہ بھر پہلے اپنے پائیں باغ کی ماربل سیڑھیاں اترتے ہوئے پھسلا اور نیچے جا گرا جس کے نتیجے میں اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹی اور وہ فوراً مر گیا۔“

”وہ پاؤں پھسلنے کا واقعہ نہیں تھا۔“ میری بات مکمل ہوتے ہی شوبھا نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

میں نے استفساریہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”کسی نے اسے پیچھے سے دھکا دیا تھا۔ وہ حادثہ نہیں بلکہ قتل تھا۔“

”تم اس نتیجے تک کیسے پہنچیں؟“ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی مشرا جی نے پوچھ لیا۔

”کئی باتیں ایسی ہیں جو حادثے کے بجائے قتل کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔“ شوبھا نے ٹھوس لہجے میں بتانا شروع کیا۔ ”پہلی مشکوک بات وہ مقام ہے جہاں سے اس کی لاش ملی۔ دوسری وہ بات جو مرنے والے روز ناشتے پر سیموئل نے مجھ سے کہی تھی۔“ یہ کہہ کر اس نے لحہ بھر توقف کیا اور پھر کہنے لگی۔ ”ساتھ ہی دوسروں کے مقدر جو اس نے مول لے لیے تھے۔“

”مقدر مول لے لیے تھے؟“ مشرا جی نے چونکتے ہوئے سوالیہ لہجے میں کہا۔ مقدر والی بات سن کر میں بھی حیران رہ گیا تھا کہ وہ کیا بول رہی ہے۔ ”یہ مقدر مول لینے سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ یہ کہتے ہوئے مشرا جی کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

”میرا خیال ہے کہ آپ لوگوں کو تفصیل سے سب کچھ بتانا پڑے گا۔“

”بالکل...“ مشرا نے لقمہ دیا۔ میں نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔

”بات یہ ہے کہ شوہر کی وفات کے بعد مجھے مالی مسائل تو درپیش نہیں ہوئے مگر اُن کے بعد...“ شوبھا کہتے کہتے رکی۔ اس کی آنکھوں میں نمی اُتر آئی تھی۔ ”آنند ورما کے بعد تو میرے لیے زندگی کے معنی ہی ختم ہو گئے۔ ہر وقت اُن کی یاد اور یہ تنہا گھر...“ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ”میں مر جاتی اگر گھر سے نہ نکلتی۔ مجھے زندہ رہنے کے لیے کوئی مصروفیت چاہیے تھی۔“ اس نے کچھ لمحوں کا توقف کیا۔ ”یہ پچھلی سردیوں کی بات ہے۔ سمجھو تقریباً سال ہو چکا اس بات کو۔ ان دنوں اخبار میں ایک اشتہار دیکھا۔ یہ سیموئل شائے کی اسٹاک کمپنی کی طرف سے تھا۔ انہیں خاتون پرائیویٹ سیکریٹری چاہیے تھی۔ میں نے بھی درخواست دی۔ سیموئل شائے نے ہی انٹرویو لیا اور مجھے منتخب کر لیا گیا۔ وہ اس بات سے خوش تھا کہ میں تنہا تھی۔ اور تن دہی اور پوری توجہ سے اپنا کام کر سکتی تھی۔ ویسے بھی وہ نہایت سنجیدہ اور مہذب طبیعت کا

مالک تھا ورنہ مجھ ادھیڑ عمر کی جگہ کوئی نوجوان سیکریٹری رکھتا، جیسا کہ اس طرح کے سارے مال دار لوگ کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ رکی۔ "سچ پوچھو تو مجھے زندہ رہنے کے لیے واقعی ایک ملازمت کی ضرورت تھی اور یہ ملازمت میرے زندہ رہنے کی ایک وجہ بن گئی تھی۔" اس نے خاموش ہو کر ہماری طرف دیکھا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "شریکِ حیات میں سے کسی ایک کا بچھڑنا، دوسرے کی پوری زندگی کو تباہ و برباد کر ڈالتا ہے۔ میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں۔" مجھے اپنی مرحومہ بیوی یاد آ گئی تھی۔

"میں اس کے پاس بطور پرائیویٹ سیکریٹری کام کر رہی تھی مگر حقیقت یہ ہے کہ میری ذمّے داری کا دائرہ ایک دو چیزوں تک ہی محدود نہیں تھا۔ جوں جوں وہ مجھ پر اعتماد کرتا گیا، میری ذمّے داریاں بھی بڑھتی گئیں۔ میں اس کی ایونٹ آرگنائزر بھی تھی۔ اس کی تمام تر مصروفیات کا شیڈول اس کی ہدایت پر میں ہی تیار کرتی تھی۔" شوبھا نے دوبارہ بات شروع کی۔ "اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ہفتے میں دو تین بار اس کی مصروفیات کے سبب مجھے رات گئے تک کام کرنا پڑتا اور اکثر رات زیادہ ہونے کے سبب میں انیکسی میں جا کر سو جاتی تھی۔ ویسے بھی وہ بہت اچھے کردار کا مالک تھا۔ وہ بہت لیے دیے رہنے والا شخص تھا۔ دوسرا یہ کہ وہ سفر بہت کرتا تھا۔ ہر وقت اسے کہیں نہ کہیں جانا پڑتا تھا۔ وہ مکمل طور پر مجھ پر انحصار کرنے لگا تھا۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوئی اور ہم دونوں کی طرف دیکھا۔ "بہر حال... مجھے اس کے ساتھ کام کرتے ہوئے چند مہینے ہی گزرے ہوں گے کہ ایک دن اس نے مجھ سے کہا کہ وہ اپنے مقدر کو بہتر بنانے کے لیے ایک سودا طے کرنے کے لیے شہر سے باہر جا رہا ہے۔"

"مقدر کا سودا؟" ہم دونوں نے بیک وقت اس کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے کہا۔

"ہاں... مقدر کا سودا۔" اس نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

وہ سر جھکا کر کچھ سوچنے لگی۔ "مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ تم لوگوں کو یہ بات کیسے سمجھاؤں۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے سر اٹھایا۔ "خیر... تو بات یہ ہے کہ سیموئل کو ماورائیت میں بہت دلچسپی تھی۔ شاید اس کی وجہ اس کا نسلی اور مذہبی تعلق بھی ہو۔"

"کیا مطلب؟" میں نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

"ایک بار اس نے ڈنر کے موقع پر مجھے اپنے خاندانی پس منظر کے بارے میں تفصیل سے بتایا تھا۔"

"کیا بتایا تھا؟" مشرا نے پوچھا۔

سیموئل شائے مذہبی طور پر یہودی اور نسلاً آئرش تھا۔" شوبھا نے کہا۔ "اس کے دادا نے راج کے زمانے میں تجارت کے لیے ہندوستان کا رخ کیا اور پھر وہ بمبئی کے ہی ہو کر رہ گئے۔ سیموئل کا باپ پُراسرار صیہونی تحریک فری میسن کا بہت سرگرم رکن تھا۔ اس نے خود اقرار کیا کہ وہ دیدہ دنیا سے زیادہ نادیدہ دنیا اور ماورائی قوتوں پر یقین رکھتا ہے۔ اسے پُراسرار قوتوں سے اتنی زیادہ دلچسپی تھی کہ اس نے گھر میں بھی طرح طرح کے مجسمے اور اسی طرح کی چیزیں جمع کر رکھی تھیں۔"

"مگر وہ مقدر کا سودا؟" مشرا جی نے استفسار کیا۔

"یہ چند ماہ پہلے کی بات ہے۔" شوبھا نے بتایا۔ "وہ کئی روز کلکتہ میں گزار کر لوٹا تھا۔ ناشتے پر اپنی مصروفیات کا ذکر کرتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا کہ وہ اپنے مقدر کو مزید خوش نصیب اور طاقتور بنانے کا راز پا گیا ہے۔ اسے تقدیر سازی کی قوت حاصل ہو چکی ہے۔ وہ لوگوں سے مقدر خرید بھی سکتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے شوبھا کے چہرے پر تذبذب کے آثار تھے۔ اس نے توقف کر کے ہماری طرف دیکھا اور کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا مگر خاموش رہی۔

"آگے کی بات بتاؤ پھر کیا ہوا؟" مشرا اس کی خاموشی پر پریشان نظر آ رہا تھا۔

"ایک بار اس نے مجھے اپنے نام کے بارے میں بتایا..."

ہم دونوں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ کہہ رہا تھا کہ اس کے والد نے اس کا نام سیموئل ایڈورڈ رکھا تھا، شائے کا اضافہ اس نے ایک نجومی کے کہنے پر کیا تھا۔"

"وجہ کیا بتائی تھی اس نے؟" مشرا نے سوال کیا۔

"اس کا کہنا تھا کہ وہ ایک بار اپنے وطن آئرلینڈ گیا تھا جہاں اسے ایک بوڑھا نجومی ملا۔ وہ کئی دہائیوں تک مصر میں رہا تھا۔ اس نے مشورہ دیا کہ اگر نام میں لفظ شائے کا اضافہ کر لیا جائے تو اس کا نصیب مزید چمک سکتا ہے۔ تو جب وہ واپس آیا، تب اس نے اپنے نام میں شائے کا اضافہ کر لیا اور قانونی طریقوں کو استعمال کر کے اسے اپنے نام کا باضابطہ حصہ بنا لیا۔" یہ کہہ کر شوبھا نے ہماری طرف دیکھا۔ "اس کا کہنا تھا کہ ویسے تو شائے آئرش نام ہے مگر قدیم مصری میتھالوجی میں بھی یہ لفظ موجود ہے..."

"ہاں... یاد آیا۔" مشرا جی نے قطع کلامی کی۔ "میں نے قدیم مصری میتھالوجی کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کے مطابق تقدیر کے دیوتا کا لقب شائے تھا۔" اگرچہ مشرا نے اسٹیج اور پرفارمنس آرٹ کی دنیا میں بڑا عرصہ گزارا تھا لیکن ساتھ ہی وہ پروفیسر بھی تھا اور ادب سے گہرا شغف رکھتا تھا۔ اسے قدیم تہذیبوں کے دیو مالائی اسرار سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ جیسے ہی شوبھا نے شائے کے حوالے سے مصر کی بات کی، اس نے فوراً قطع کلامی کی۔ "قدیم مصریوں کا خیال تھا کہ دیوتا شائے امر تھا۔ وہ انسانوں کے اندر حلول کر چکا تھا اور ہر بچے کے ساتھ ہی اس دنیا میں جنم لیتا تھا اور پھر موت اسے ایک اور نئی زندگی دے دیا کرتی تھی۔" وہ بہت دلچسپی سے دیوتا شائے کے بارے میں بتا رہا تھا۔ اس کا انداز اتنا دلچسپ تھا کہ میں اور شوبھا دم سادھے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ "کیا تم اس بارے میں جانتے ہو؟" مشرا نے مزید کچھ کہنے سے پہلے رک کر ہم دونوں کے چہروں پر نظر ڈالی۔

شوبھا نے تو کچھ نہیں کہا البتہ میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"میرا خیال ہے سیموئل اس بارے میں جانتا تھا۔" مشرا نے ایک بار پھر کہنا شروع کیا۔ "وہ شائے کی دیو مالائی داستان سے بہت متاثر ہوگا۔ اس نے یہ سوچا اور محسوس کرنے لگا کہ وہ خود ہی دیوتا شائے بن چکا ہے۔ اسی لیے اس نے مقدر خریدنے کی بات کی ہوگی۔ وہ خود کو یہ باور کرا چکا ہوگا کہ اس کے اندر شائے دیوتا کی روح ہے اور وہ اتنی طاقت ور ہے کہ وہ چاہے تو مقدر بنا اور بگاڑ سکتا ہے ورنہ اسٹاک بروکر جیسا کوئی شخص کیسے ایسی بات کر سکتا ہے، جسے سن کر کوئی بھی شخص ہنسے بنا نہیں رہ سکتا۔"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" وہ خاموش ہوا تو شوبھا نے بات بڑھائی۔ "یہ کئی ماہ پہلے کی بات ہے۔ وہ چند روز کے لیے باہر گیا تھا۔ جب لوٹا تو اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ سیموئل نے مجھے بتایا کہ وہ عورت انسان کا مستقبل پڑھنے کی ماہر ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ کچھ ایسے لوگوں کی نشاندہی کرے جن کا مقدر میں خرید سکوں۔"

"تو پھر اس نے مقدر خریدا؟" مشرا نے شوبھا کے چپ ہوتے ہی سوال کیا۔ اگرچہ اس نے بہت دلچسپی سے سوال کیا تھا مگر میری حالت اس سے مختلف تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ دونوں کس بحث میں الجھ رہے ہیں۔

شوبھا نے میری طرف دیکھا۔ "ہاں تو شکر دیال جی... آپ کیا کہتے ہیں ان سب باتوں کے بارے میں؟"

"بمبئی میں تو پہلی بار مقدر کے سودے کی بات سن رہا ہوں۔" میں نے کھنکھارنے کے بعد کہنا شروع کیا۔ "میرے خیال میں تو کسی کے مستقبل سے متعلق پیش گوئی وغیرہ سب جادو ٹائپ کی ہی چیزیں ہیں۔ بعض لوگ پیسے کمانے کے لیے یہ دھندا اپنا لیتے ہیں۔ میرے نزدیک تو اس بات کی کوئی حقیقت نہیں ماسوائے اس کے کہ انسانی نفسیات سے کھیل کر اگلے سے دو پیسے اینٹھ لیے جائیں۔" میں نے نہایت بیزاری سے اپنی بات مکمل کی۔ سچ پوچھیں تو مجھے وہاں بیٹھنا ہی وقت کا زیاں لگ رہا تھا۔

"او کے..." مشرا نے میری بات مکمل ہوتے ہی سرد مہری سے کہا اور شوبھا کی طرف دیکھا۔ "ہم بات کر رہے تھے شائے کی... تو پھر وہ مقدر خریدنے میں کامیاب ہوا؟"

"مجھے تو وہ اس معاملے میں جنونی لگ رہا تھا۔" شوبھا کے جواب سے کم از کم میں تو کچھ سمجھ نہیں پایا تھا۔ "گیتا دیوی کے آنے کے بعد اکثر وہ دونوں باہر ساتھ جانے لگے۔ کئی بار کچھ لوگ گھر پر بھی ان سے ملنے آتے تھے۔ سیموئل اور گیتا دیوی اکیلے میں ان سے گفتگو کرتے تھے۔ ان دونوں نے کبھی مجھے یہ تو نہیں بتایا کہ وہ لوگ کس لیے آتے تھے اور ان کے درمیان کیا باتیں ہوتی تھیں مگر ایک بات میں بخوبی جانتی تھی کہ یہ سب کچھ مقدر کی سوداگری ہی کا معاملہ تھا۔" یہ کہہ کر اس نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر سوچنے کے بعد بولی۔ "بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ وہ لوگوں سے تنہا ملی۔ دو چار بار میں نے اسے سیموئل کی ذمّے داری پر لوگوں کو رقم کی پیشکش کرتے بھی سنا تھا۔"

"تم جانتی ہو کہ گیتا نے مقدر کا سودا کتنے لوگوں سے کیا تھا؟" مشرا نے پوچھا۔

"ہاں!" شوبھا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "وہ کل تین تھے، دو مرد اور ایک عورت۔" یہ کہہ کر وہ کچھ سوچنے لگی۔

"ان کے نام!" میں نے وضاحت چاہی۔

"راجیو سنگھ، وتو پا اور لکشمی..." اس نے کنپٹی کو انگلی سے دباتے ہوئے کہا۔ پہلی بار اس نے کسی سوال کا سیدھا سادہ جواب دیا تھا۔

"اور کیا جانتی ہو ان کے بارے میں؟" مشرا نے پوچھا۔

"لکشمی بنگالی تھی۔ وہ تقسیم کے بعد ڈھاکا سے بمبئی چلی آئی تھی۔" یہ کہہ کر اس نے سائڈ ٹیبل پر رکھا ایک لفافہ اٹھایا۔ "میں نے ان تینوں کے بارے میں معلومات پہلے سے ہی لکھ رکھی تھیں، تا کہ تفتیش میں تمہارے لیے مددگار

ثابت ہوں۔“ اس نے ایک لفافہ مشرا کی طرف بڑھا دیا۔

اس نے لفافہ کھول کر اس میں رکھے صفحات پر ایک نظر ڈالی اور اسے مجھے تھما دیا۔ میں نے ان کاغذات کو نظر بھر کر دیکھا۔ ”تمہاری یہ معلومات تفتیش میں بہت مددگار ثابت ہوسکتی ہیں مگر وہ مقدر کا سودا...“ میں نے شوبھا پر نظر ڈالتے ہوئے الجھے لہجے میں ادھوری بات کی۔

”میرا تو خیال ہے کہ تم لوگوں کو گیتا دیوی سے بھی ضرور ملنا چاہیے۔ اس کاغذ پر میں نے اُن سب کے پتے بھی لکھ دیے ہیں۔“ شوبھا نے میرے سوال کے جواب میں کہا۔ ”میں تو کبھی اس سے مل کر خوش نہیں ہوئی اور مجھے یقین ہے کہ اس سے ملنے کے بعد تمہارے تاثرات بھی یہی ہوں گے مگر پھر بھی اس سے ملنا ضرور پڑے گا۔ آخر اسی سے مل کر کوئی کارآمد بات پتا چل سکتی ہے۔“

”سب سے ملیں گے مگر ایک بات بتاؤ۔ اس سے تمہاری ناراضی کی وجہ کیا رہی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”جادوگری...“ شوبھا نے نفرت سے کہا۔ ”اس طرح کے لوگوں سے مل کر کم از کم مجھے کوئی خوشی نہیں ہوسکتی۔“

”تم کہہ رہی تھیں کہ جس انداز میں سیموئل کی لاش پڑی ملی تھی، اس سے بھی تمہیں شک ہوا کہ وہ حادثہ نہیں قتل تھا۔“ میں نے شوبھا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”ذرا اس بات کی وضاحت کروگی؟“

”میں نے ہی سب سے پہلے اس کی لاش دیکھی تھی۔“ شوبھا نے کہنا شروع کیا۔ ”لاش پائیں باغ کی سنگ مرمر والی سیڑھیوں کے نیچے بالکل قدمچے کے ساتھ پڑی تھی۔ یہی بات میرے لیے شک کی وجہ ہے۔ وہ سیڑھیوں سے گرا نہیں بلکہ اسے پیچھے سے دھکا دیا گیا تھا۔“ یہ کہہ کر اس نے باری باری ہم دونوں کو دیکھا۔ ”اس شک کی وجہ ہے میرے پاس۔“ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دوبارہ بات شروع کی۔ ”سیموئل کی ایک ٹانگ دوسری سے کم از کم دو انچ چھوٹی تھی۔ بنا جوتوں کے وہ چلتا تو اس کے پاؤں کا لنگ صاف محسوس ہوجاتا تھا اسی لیے وہ خاص قسم کے بنے ایسے جوتے استعمال کرتا تھا جن میں سے ایک کی ایڑی دوسرے سے دو انچ اونچی ہوتی تھی۔ اس طرح فرش پر چلتے ہوئے پاؤں کا لنگ چھپ جاتا تھا مگر پھر بھی وہ سیڑھیاں چڑھتے اترتے وقت غیر معمولی احتیاط برتتا تھا۔ یہ احتیاط پاؤں کے پیدائشی لنگ کے سبب اس کی عادت بن چکی تھی۔ میں مان ہی نہیں سکتی کہ جتنی احتیاط سے وہ سیڑھیاں اترتا چڑھتا تھا، اس سے اس بے احتیاطی کی توقع ہی نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ سیڑھیوں پر توازن برقرار نہ رکھ سکے اور نیچے گر کر مر جائے۔“ یہ کہہ کر وہ کچھ دیر خاموش رہی اور پھر کہنے لگی۔ ”کئی مہینے ساتھ رہنے کے باعث میں اس کی یہ بات جان چکی تھی کہ وہ عام طور پر سیڑھیاں چڑھنے اترنے سے گریز کرتا تھا۔ ویسے بھی وہ شاذ ہی پائیں باغ کا رخ کرتا تھا۔“

”کتنے قدمچے ہیں پائیں باغ کی سیڑھی کے؟“

”دس۔“ اس نے جواب دیا۔

”تم نے یہ بات پولیس کو بتائی تھی؟“ میں نے سوال کیا۔

”ہاں... مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔“ اس نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔ ”ان کا کہنا تھا کہ وہ سیدھا سادہ حادثہ ہی تھا۔ اترتے ہوئے سیموئل کا پاؤں پھسلا، وہ لڑھکا اور فرش پر گرتے وقت اس کے سر پر چوٹ لگی جو جان لیوا ثابت ہوئی اور قتل ماننا تو دور، تفتیشی پولیس افسر تو میری بات سن کر الٹا مذاق اڑانے لگا تھا۔“

”اس پولیس افسر کا رویہ غیر پیشہ ورانہ تھا۔ اس طرح کی موت ہو تو کسی بھی امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔“ میں نے کہا۔

”بالکل... تمہاری بات سو فیصد درست ہے۔“ شوبھا نے تائید کی۔

”جن سیڑھیوں سے وہ گرا تھا، ان میں سب سے اوپر اور سب سے نچلے قدمچے کے درمیان کتنے فٹ کا فاصلہ ہوگا؟“ میں نے وہ بات مکمل کی جسے اس نے بیچ میں کاٹ دیا تھا۔

”تقریباً سات آٹھ فٹ کا فاصلہ تو ہوگا۔“ شوبھا نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ”مجھے سمجھ نہیں آتا کہ وہ اس رات جوتے اتار کر وہاں کیا کرنے گیا تھا۔ اس سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔“

”تم نے کچھ دیر پہلے بتایا تھا کہ جس روز اس کی موت ہوئی، اس صبح اس نے تم سے ایسا کچھ کہا تھا جس کی وجہ سے کم از کم تمہارے نزدیک اس کی حادثاتی موت مشکوک ہے؟“ میں نے بات مکمل کرکے اس کی طرف دیکھا۔

”بالکل ٹھیک کہا تم نے۔“

”تو اس صبح اس نے ایسا کیا کہا تھا؟“ میں نے قطع کلامی کرکے پوچھا۔

”وہ ناشتا کرکے فارغ ہوا تو میں اسے اگلے ہفتے کی مصروفیات کا شیڈول بتانے لگی۔“ شوبھا نے کہنا شروع کیا۔ ”سال کے آخری ایام تھے۔ لوگ کرسمس کی چھٹیاں منانے

اور نئے سال کے حوالے سے تقریبات کے منصوبے بنا رہے تھے۔ اسی لیے میں نے اس سے بھی پوچھ لیا کہ کیا ان کے لیے نئے سال کے آغاز پر تفریح کا کوئی پروگرام بناؤں جس پر اس نے انکار کردیا تھا۔“

”کیا کہا تھا سیموئل نے؟“ میں نے جلدی سے اس کی بات کاٹ کر سوال کیا۔ ”کوئی وجہ تو بتائی ہوگی؟“ میں نے اسے غور سے دیکھا۔

”وجہ تو کوئی نہیں بتائی، البتہ اس نے کہا تھا کہ اس دنیا میں ایسا کون ہے جو 1956ء کو الوداع کہنے والوں میں نہ پا کر اس کی کمی محسوس کرے گا۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئی۔ ”یہ کہنے کے بعد وہ کچھ دیر تک خاموش رہا اور پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگا کہ معلوم نہیں کہ میں 1957ء کا پہلا سورج اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں۔ اس وقت اُس کا لہجہ بہت بدلا ہوا تھا۔ جب وہ یہ کہہ رہا تھا، تب مجھے بھی یہ بات بہت عجیب لگی تھی۔“ یہ کہہ کر وہ رکی اور میری طرف غور سے دیکھا۔ ”جس صبح اس نے یہ بات کی اسی شام وہ مارا گیا۔ تب مجھے اس کی بات کا مطلب سمجھ میں آیا۔ میں نے یہ بات بھی پولیس افسر کو بتائی تھی مگر اس نے اس کو بھی کوئی اہمیت نہیں دی۔ اسی لیے میں سمجھتی ہوں کہ وہ حادثہ نہیں قتل تھا اور سیموئل جانتا تھا کہ کوئی اسے بہت جلد موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے ورنہ اس نے موت والی صبح سے پہلے، کبھی مجھ سے اس طرح کی کوئی بات نہیں کی تھی۔“

”سیموئل دیکھنے میں کیسا تھا؟“ مشرا نے شوبھا سے سوال کیا۔

”وہ تقریباً پچاس سال کا ہوگا مگر اس کی صحت پھر بھی بہت اچھی تھی۔“ وہ بتانے لگی۔ ”چھریرا بدن، قد بھی نارمل تھا۔ خوش شکل بھی تھا۔“

”اور عادت میں؟“ مشرا نے پھر سوال کیا۔

”ایک اچھا انسان تھا وہ۔“ شوبھا نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ”وہ اپنے کام سے کام رکھتا تھا اور کبھی کسی پر رعب جھاڑنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ وہ ہر کسی کے ساتھ بڑے اخلاق سے پیش آتا تھا۔“

”کسی کے ساتھ کوئی چکر...“ میں نے پوچھا۔ ”میرا مطلب ہے کہ کوئی گرل فرینڈ وغیرہ؟“

”میرے خیال میں تو نہیں۔“ شوبھا نے جواب دیا۔ ”ویسے اس کی کئی عورتوں سے سلام دعا تھی مگر میرا خیال نہیں ہے کہ کسی سے اس کے قریبی تعلقات ہوں گے۔ میں سمجھتی ہوں کہ وہ صرف سماجی تعلقات کی حد تک ہی ہوں گے۔“ وہ اپنی بات مکمل کرکے چھت کی طرف دیکھنے لگی۔

”وہ شادی شدہ تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں مگر کئی برس پہلے اس نے بیوی کو طلاق دے دی تھی۔“ شوبھا نے جواب دیا۔ ”میں نے سنا تھا کہ وہ اپنی سابقہ بیوی کو ہر سال باقاعدگی سے اخراجات کی رقم بھجواتا تھا۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ علم نہیں۔“

”اب کہاں رہتی ہے وہ؟“ مشرا نے پوچھا۔

”سیموئل سے پتا چلا تھا کہ وہ آئرش تھی اور طلاق کے بعد واپس اپنے وطن چلی گئی تھی۔“

”اس کی موت سے کس کو سب سے زیادہ فائدہ ہوسکتا ہے؟“ میں نے شوبھا کو مخاطب کیا۔

”یقین سے تو کچھ کہنا مشکل ہے البتہ سیموئل کی قریب ترین رشتے داروں میں صرف اس کی دو یتیم بھتیجیاں ہیں جو شملہ کے کانونٹ میں پڑھتی ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ رکی اور کچھ توقف کے بعد کہنے لگی۔ ”سیموئل کی موت کے بعد ان دونوں لڑکیوں کو بہت تھوڑا ہی ملے گا۔ اس کی دولت کا بڑا حصہ ان متعدد فلاحی اداروں کو جائے گا جسے اس نے اپنے نام پر قائم کیا اور موت تک اپنے خرچ سے ان کا انتظام چلا تا رہا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں ہی وراثت کا معاملہ طے کردیا تھا۔“ یہ کہہ کر وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئی۔ ”اسے اپنے نام پر قائم فلاحی اداروں سے بہت محبت تھی۔“

”کیا ہم اس کے گھر کے پائیں باغ کو دیکھ سکتے ہیں؟“ میں نے جاننا چاہا۔

”اب ممکن نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔ ”اس کی موت کے بعد اس کے وکیلوں کی درخواست پر گھر کو سیل کردیا گیا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ تم وہ جگہ نہیں دیکھ پاؤ گے جہاں اس کی موت ہوئی تھی۔“

”چلو... ایک بات تو طے ہوئی۔“ شوبھا کے خاموش ہونے پر مشرا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب ہم دونوں اس کیس کی تحقیقات کریں گے۔“

اس کی بات سن کر شوبھا نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں خاموشی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

”کیس کے حوالے سے اب تک کی بات چیت میں جو نکات سامنے آئے ہیں، اس میں سرفہرست موت سے پہلے سیموئل کا وہ بیان ہے جو اس نے شوبھا سے گفتگو کرتے ہوئے دیا۔“ مشرا نے اب تک کی گفتگو سے اخذ شدہ نتائج بیان کرنا شروع کیے۔ ”اسے ہم ملاتے ہیں اسی شام سیموئل کی مشتبہ حالات میں واقع ہونے والی موت سے اور پھر ان دونوں کا

تعلق جوڑیں گے مقدر کی سوداگری جیسے غیر معمولی اور ماورائی معاملے اور پھر گیتا دیوی کے کردار سے۔" مشرا نے نوٹ بک پر ایک نقشہ بناتے ہوئے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ "اس طرح ہماری ابتدائی تفتیش کے لیے خاکہ تیار ہو جاتا ہے۔" اس نے نقشہ میرے سامنے کرتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

"میں جانتی ہوں کہ یہ باتوں، اندیشوں اور امکانات کا ایک ملغوبا ہے۔" شوبھا نے انگلی سے نقشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کیا تم دونوں کی باتیں سنتے ہوئے مجھ پر وجدانی کیفیت طاری ہوگئی، اس دوران ایک راز بھی منکشف ہوا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے توقف کیا اور دونوں کے چہروں پر باری باری نظر ڈالی۔ "اس وقت تم دونوں ہی سراغ رساں لگ رہے ہو۔" اس نے انگلی سے باری باری ہم دونوں کی طرف اشارہ کیا۔ "کیا تم وجدان پر یقین رکھتے ہو؟"

یہ سنتے ہی ہم دونوں نے جلدی سے ایک ساتھ جواب دیا اور وہ جواب مجھے یقین ہے کہ اوور لیپ ہونے کی وجہ سے شوبھا کو سمجھ نہیں آیا ہوگا۔ میں نے گردن موڑی اور مشرا کو دیکھا۔ "مجھے اس طرح کی چیزوں سے ڈر نہیں لگتا۔"

"میرا بھی یہی جواب ہے۔" مشرا نے شوبھا کی طرف دیکھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"کیا جوڑی ہے تم دونوں کی۔" وہ ہنس کر بولی۔ "خیر، میں اپنے بارے میں کہہ سکتی ہوں کہ شاید میرا تخیل بہت زیادہ تیز ہے۔ میں تصور کی آنکھ سے بہت کچھ دیکھ لیتی ہوں، بالکل فلم کی طرح۔"

"تو اب تم نے اپنے وجدان سے کیا دیکھ لیا؟" مشرا مسکرا دیا۔

"ابھی بیٹھے بیٹھے میں نے کھلی آنکھوں سے اپنے تخیل میں دیکھا کہ تقدیر کے سودے کا معاملہ ختم ہو گیا ہے اور اس کے قاتل بھی پکڑے گئے۔"

"سوچنے اور عمل کرنے میں بہت فرق ہے۔" میں نے لقمہ دیا۔

مشرا بھی مسکرا دیا۔ "سچ کہا تم نے، آخر ہو تو پولیس افسر ہی نا۔"

مجھے یقین تھا کہ دو دن کی فیلڈ ریسرچ کے نتیجے میں ہم کچھ نہ کچھ ایسے شواہد یا اشارے ضرور تلاش کر لیں گے جس کی وجہ سے پولیس کو سیموئل کی موت کی بطور قتل تفتیش پر مجبور کر سکیں۔

"تو پھر تم کیا کہتی ہو، سیموئل کی موت اور تقدیر کی سوداگری کے اس معاملے کی تفتیش شروع کر دیں؟" میں نے مسکرا کر شوبھا سے کہا۔

"میں تو یہی چاہتی ہوں۔" شوبھا نے ہم دونوں کی طرف دیکھا۔

"مشرا جی!" میں نے اسے مخاطب کیا۔ "وہ اجازت دے چکی ہیں تفتیش شروع کرنے کی اور اس کام کے لیے ہمیں یہاں سے اٹھ کر باہر جانا ہوگا۔"

"بہتر...." یہ کہتے ہوئے مشرا نے سائڈ ٹیبل سے وہ لفافہ اٹھایا، جس میں رکھے کاغذات پر وہ معلومات درج تھیں جنھیں شوبھا نے اکٹھا کیا تھا اور اب یہ تفتیش کے لیے خزانے کا کام دینے والی تھیں۔ "یہ معلومات ہمارے بہت کام آئیں گی۔" مشرا نے لفافہ جیب میں رکھتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ ہم بہت جلد معاملے کی تہ تک پہنچ جائیں گے۔" یہ کہہ کر وہ صوفے سے اٹھا۔ اسے اٹھتا دیکھ کر میں اور شوبھا بھی کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر بعد ہم شوبھا کے اپارٹمنٹ سے باہر نکل رہے تھے۔

☆☆☆

اُس وقت ہم سینٹرل بمبئی کی طرف جا رہے تھے۔ ہمارا مقصد گیتا دیوی سے ملنے کا تھا۔ میں گاڑی چلا رہا تھا۔ مشرا برابر بیٹھا شوبھا کے دیے ہوئے نوٹس بلند آواز میں پڑھ رہا تھا۔ میرے کان وہیں لگے تھے۔

"گیتا دیوی کو اس کے ملنے والے چنبیلی کہتے ہیں۔ یہ کہنے کی وجہ شاید اس کی گوری چٹی رنگت اور خوبصورتی ہو سکتی ہے۔ وہ دلی کے مضافات میں رہتی تھی۔ گزشتہ موسم بہار میں وہ دلی سے بمبئی منتقل ہوئی تھی۔ یہاں منتقل ہونے کے چند ہفتوں بعد اس کی ملاقات سیموئل شائے سے ہوئی جس کے کچھ عرصے بعد ہی وہ ماورائی قوتوں کے معاملات میں اس کی مشیر بن گئی۔ اس نے بظاہر گیتا کی خدمات اپنے کاروباری کمپلیکس کو چلانے کے لیے حاصل کی تھیں۔ البتہ بعد میں وہ مقدر کے پھیر میں پڑ گیا۔ شاید گیتا ہی اس کا سبب بنی ہوگی۔ وہ تقدیر کا سودا کرنا چاہتا تھا اور گیتا بہترین تقدیر والے لوگوں کی تلاش میں اس کی مدد کر رہی تھی۔" مشرا خاموش ہوا اور سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"وہ کہہ رہی ہے تقدیر کی سوداگری.... مگر میرے خیال میں یہ شعبدہ بازی ہے۔" میں نے گاڑی چلاتے ہوئے لمحہ بھر کے لیے گردن موڑ کر اسے دیکھ کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ "ویسے سیموئل شعبدہ بازی اور جادوگری پر یقین رکھتا ہوگا۔ وہ اسے اپنی دولت میں اضافے کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہوگا۔ وہ اسٹاک بروکر تھا اور تم جانتے ہو کہ یہ کاروبار چلتا ہی ہے پیش گوئی، اندازوں، افواہوں اور امکانات پر.... شوبھا کے مطابق وہ تھا بھی کچھ ایسا ہی۔ گیتا اسے ملی تو اس کے دماغ میں خناس بھرا کہ وہ کچھ اچھی قسمت والے لوگوں کے ساتھ ملے اور ان کے نام پر کاروبار کر کے اپنی دولت میں اضافہ کرے۔" یہ کہہ کر میں نے لمحہ بھر کے لیے توقف کیا اور ایک بار پھر مشرا کی طرف دیکھا۔ "شوبھا کی ایک بات میں کچھ وزن ہے کہ اس کی موت حادثہ نہیں قتل ہو سکتی ہے ورنہ یہ تقدیر کی سوداگری تو میرے نزدیک فضول اور بکواس ہے۔"

"تو تم شوبھا کی کم از کم ایک بات سے متفق ہو؟" اس نے کہا۔

"قطعی نہیں۔" میں نے فوراً جواب دیا۔ "البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی بات میں کچھ وزن ہے اور پولیس کو بھی اس طرف دھیان دینا چاہیے۔" یہ کہہ کر میں مسکرایا۔ "سچ پوچھو تو مجھے تمہاری دوست کچھ کھسکی ہوئی لگتی ہے۔ ویسے بھی اس نے اپنے مضبوط تخیل کی بات کی تھی۔ مجھے تو لگتا ہے کہ قتل کے حوالے سے بھی اس نے جو بات کی ہے، وہ اس کے تخیل کی پیداوار ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ اُس کی موت حادثاتی ہی ہو۔"

تقریباً تیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد ہم اپنی منزل پر پہنچ چکے تھے۔ ہمارے سامنے خون کی طرح گہرے سرخ رنگ میں رنگی عمارت تھی۔ وہ ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور تھا۔ اسی عمارت کے فرنٹ والے حصے کی پچلی منزل پر واقع ایک دکان نما دفتر کے باہر گہرے سرخ رنگ کی دیوار پر نہایت چمک دار سنہری رنگ میں لکھا تھا: "گیتا دیوی مستقبل شناس۔" وہی دکان یا دفتر فی الحال ہماری منزل تھی۔ گاڑی سے اتر کر ہم اس طرف بڑھے۔ دروازے پر نصب چھوٹی سے گھنٹی بجائی اور چند لمحوں بعد دفتر کے اندر تھے۔

اندر بہت مدھم روشنی تھی۔ کچھ دیر بعد جب آنکھیں نیم تاریک ماحول میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو میں نے نظریں گھما کر جائزہ لیا۔ وہ جنگل کی کھولی جیسا چھوٹا سا کمرا تھا۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر کالے مخمل کے دبیز پردے پڑے تھے۔ کمرے میں چھوٹی چھوٹی کئی میزیں تھیں جن پر کتابوں کے ڈھیر تھے۔ کانسی، پیتل اور پتھر کے بنے کئی مجسمے بھی اِدھر اُدھر رکھے گئے۔ وہ ایسے چمک رہے تھے جیسے ابھی ابھی ان پر پالش کی گئی ہو۔ ایک طرف سیاہ مخمل کے بڑے سے پردے کو لٹکا کر اس دکان نما کمرے میں قائم دفتر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ پردے کے دوسری طرف شاید گیتا دیوی اپنے گاہکوں سے رازدارانہ ماحول میں ملاقات کیا کرتی ہوگی۔ اسی دوران میں وہ پردہ کھسکا اور جو عورت باہر آئی، مجھے سو فیصد یقین تھا کہ وہ گیتا دیوی ہی ہے۔ اگرچہ شوبھا کہہ چکی تھی کہ وہ خوبصورت عورت ہے مگر مجھے اس کی بات پر یقین نہیں تھا۔ میرے تخیل نے اس کا جو حلیہ بنایا، وہ اس طرح کے نجومیوں کے روایتی حلیے جیسا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ جھکی کمر، جھریوں والے چہرے، استخوانی ہاتھوں اور نہایت مکروہ مسکراہٹ والی بڑھیا یا ادھیڑ عمر عورت ہوگی مگر میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ وہ ہرگز ویسی نہیں تھی جیسا میں نے سوچا تھا۔ وہ چھوٹے قد کی چھریرے بدن والی خوبصورت عورت تھی۔ اس کی مسکراہٹ دلکش تھی۔ اس کا سراپا عاشق مزاجوں کے دلوں پر اثر کر دینے والا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ دل پھینک مرد اسے دیکھنے کے بعد، اپنے ذہن سے اس کا سراپا محو کرنے میں کافی وقت لگاتے ہوں گے۔ میں نے اس پر گہری نظر ڈالی۔ وہ چالیس سال کے قریب کی ہوگی۔ سیاہ چوڑے فریم اور بڑے بڑے سیاہ شیشوں والا قیمتی چشمہ اس کی آنکھوں پر چڑھا ہوا تھا۔ ہونٹوں پر گہری سرخ لپ اسٹک تھی۔ اس نے نہایت نفیس سرخ بنارسی ساڑی پہن رکھی تھی جس کے پلو پر بروچ لگا تھا۔ نیم تاریک ماحول میں اس کی آتشی سرخ ساڑی لوگوں کے دلوں پر قیامت ڈھانے کے لیے کافی تھی۔

"بہت خوشی ہوئی آپ لوگوں سے مل کر۔" بڑی ادا سے چلتی ہوئی وہ قریب آئی اور دو قدم کی دوری پر رک کر شاہانہ انداز سے ہمارے چہروں پر بے نیازی سے نظر ڈالتے ہوئے بولی۔ "تو تم لوگ اپنے مستقبل کا حال جاننے آئے ہو؟" اس کا لحن پرترنم تھا۔

"جی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تو کیا دوسری دنیا سے راہنمائی حاصل کرنے آئے ہو؟" میرا انکار سن کر لمحہ بھر کے لیے بھی اس کا انداز گفتگو تبدیل نہیں ہوا تھا۔

"کم از کم یہ بات بھی نہیں ہے۔" میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"تو پھر کس لیے یہاں آئے ہو؟" اس بار اس کی آواز میں ہلکی سے بے رخی محسوس ہوئی۔ "میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ اس علم پر یقین نہ رکھنے والوں کے ساتھ بحث کر کے اسے ضائع کر دوں۔" اس کے لہجے کے ترنم کی جگہ تلخی نے لے لی تھی۔

"تمہارے علم پر یقین یا بے یقینی سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔" میں نے بھی بے رخی سے اونچی آواز میں جواب دیا۔ "ہمیں صرف مقدر کی اس سوداگری کے بارے میں بتاؤ جو تم سیموئل شائے کے لیے کررہی تھیں۔" یہ کہہ کر میں نے لمحہ بھر توقف کیا۔ "تم ہی تو اس کے لیے باتقدیر شکار تلاش کررہی تھیں نا؟" میرا لہجہ بیک وقت طنزیہ اور سوالیہ تھا۔

"کون ہو تم دونوں؟" میری بات سنتے ہی وہ گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹی اور انگلی سے ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ وہ یکدم پریشان نظر آنے لگی تھی۔

"ایک پارٹی نے ہماری خدمات حاصل کی ہیں تاکہ سیموئل کی حادثاتی موت کی تفتیش کرکے حقیقت کا پتا چلا سکیں۔" مشرا نے کہا۔

"اب بھی..." اس نے ہنکارا بھرنے کے بعد زیرلب کہا اور پھر ہم دونوں پر نظر ڈالی۔ "اور یہ پارٹی شوبھا آنند ہے۔" یہ کہہ کر وہ طنزیہ انداز میں ہنسی۔ "ٹھیک کہا نا میں نے؟" وہ ایک بار پھر ہنسی۔ "وہ ہے کیا... ماضی کی ایک ناکام اداکارہ... ایک قابلِ رحم بیوہ... جو اس وقت بھی اپنے مستقبل کا درخشاں ستارہ ڈھونڈ رہی ہے جب اس کی زندگی کا سورج غروب ہونے کے قریب ہے۔" اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اپنے کسی گاہک کو اس کی قسمت کا حال بتارہی ہو۔

"جو کچھ تم نے کہا، وہ متنازع بات ہے مگر فی الوقت ہم شوبھا کے بارے میں تمہاری رائے جاننے کے لیے یہاں نہیں آئے ہیں۔" مشرا کا لہجہ بظاہر مہذب مگر سپاٹ اور آواز پاٹ دار تھی۔ آخر کو وہ تھیٹر کا منجھا ہوا اداکار تھا۔ الفاظ کے اتار چڑھاؤ اور لہجے کا استعمال وہ مجھ سے بہتر جانتا تھا۔ میں سمجھ گیا۔ وہ جان چکا تھا کہ اس شاطر عورت کی بدزبانی کا مقابلہ اسی طرح کیا جاسکتا ہے۔ "جو کچھ تمہاری رائے ہے وہ تم جانو، شوبھا کو صرف حقیقت جاننے میں دلچسپی ہے اور کس بارے میں..." وہ بات ادھوری چھوڑ کر ایک قدم آگے بڑھا اور چشمے کے پیچھے پوشیدہ اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اسے صرف حقیقت جاننے سے دلچسپی ہے اور تم تو ویسے بھی قسمت کا حال بتاتی ہو۔ سیموئل شائے مرحوم ہے یا مقتول... تم تو یہ بھی جان سکتی ہو۔ ویسے بھی مقدر کی سوداگری کے دوران تم تو اس کے بہت قریب رہی تھیں، مشیر تھیں اس کی... اس کی قسمت کے بارے میں بھی بہت کچھ جان چکی ہوگی۔" یہ کہہ کر وہ پلٹا اور میرے قریب پہنچ کر واپس مڑا اور ایک بار پھر گیتا دیوی کی طرف دیکھا۔ وہ دم بخود کھڑی تھی۔ "تم تو اس کے لیے دوسروں کے مقدروں کی سوداگری میں دلالی کرارہی تھیں، آخر یہ بھی تو جانتی ہوگی کہ خود اس کے مقدر میں کیا لکھا ہے؟ اس کا اپنا انجام کیا ہونے والا ہے؟" یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر توقف کیا۔ "کیوں... درست کہا نا... امید ہے کہ جو کچھ کہا، وہ تم اب اچھی طرح سمجھ چکی ہوگی گیتا دیوی..." آخری الفاظ اس نے ایسے چبا چبا کر ادا کیے جیسے نئے سگار کے سلگانے والے جسے کو کچھ پرانے لوگ اس طرح چباتے ہیں کہ اس کا تمباکو نرم پڑے مگر سگار خراب نہ ہونے پائے۔

میں نے مشرا کی اداکاری کے جوہر اسٹیج پر تو کبھی نہ دیکھے تھے مگر گیتا دیوی سے اس کا مکالمہ مجھے یہ سمجھانے کے لیے کافی تھا کہ وہ غضب کا اداکار رہا ہوگا۔

"میں قسمت کا حال بتاتی ہوں، مستقبل شناس ہوں مگر..." کچھ دیر کمرے میں خاموشی رہی اور پھر گیتا نے کہنا شروع کیا۔

"مگر کیا...؟" مشرا نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی۔ وہ نفسیاتی طور پر اس پر حاوی ہوچکا تھا۔ "تم تو قسمت کے سودے کرواتی ہو، مقدروں کی دلالی کرتی ہو، ذرا ہمیں بھی بتاؤ کہ سیموئل کے لیے تم کس طرح مقدر کی دلالی کررہی تھیں؟" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا۔ "ویسے یہ بات ہے بہت عجیب اور حیران کن... مقدروں کے سودے...... وہ بھی خود شیئر بازار کے ایک بہت بڑے دلالی کے ایجنٹ کے طور پر۔" یہ کہہ کر مشرا ہنسا اور پھر اس کی طرف دیکھا۔

"ذرا بتاؤ تو سہی اس بارے میں۔" یہ کہہ کر اس نے میری طرف دیکھا۔ "میرے ساتھی کو بھی اس بارے میں جاننے کا بہت اشتیاق ہے۔"

"مسٹر سیموئل شائے کے لیے میں نے جن لوگوں کا انتخاب کیا، وہ میرے اردگرد ہی تھے۔ انہیں کہیں اور سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر نہیں لائی تھی۔" گیتا دیوی نے کہنا شروع کیا۔ اس کی آواز ہلکی اور لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔ "جن تین لوگوں کا انتخاب ہوا، وہ کوئی غیر معمولی نہیں تھے۔ مثال کے طور پر راجیو کچھ دور واقع اسٹور پر کام کرتا تھا۔ ونود گوالا ہے اور گھروں میں دودھ پہنچاتا تھا۔ میں نے ان لوگوں کے اٹھنے بیٹھنے کے انداز اور چال ڈھال سے ان کی قسمت کے بارے میں اندازہ لگایا۔ انٹرویو کیے اور وہ سیموئل کی تلاش کے معیار پر پورا اترے اور بس!" گول مول جواب دے کر وہ خاموش ہوئی اور چھت کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سانس لی اور کچھ توقف کے بعد کہنے لگی۔

"کچھ لوگ بہت معمولی سی زندگی بسر کرتے ہیں لیکن ان کی تقدیر بہت مضبوط ہوتی ہے۔ میں انسان کے مقدر کو بھانپ لیتی ہوں۔ میں اکثر لوگوں سے کہتی ہوں کہ اچھی تقدیر انسان کی لمبی اور پرسکون زندگی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ وہ تینوں بھی بہت مضبوط مقدر کے مالک تھے، اسی لیے سیموئل کے لیے ان کی خدمات حاصل کیں۔"

"ہوسکتا ہے۔" مشرا نے لقمہ دیا۔ "مگر افسوس کہ مقدر کا سوداگر تمہاری مدد حاصل کرنے کے باوجود اچھی تقدیر کا مالک نہ بن سکا۔" یہ کہہ کر اس نے طنزیہ انداز سے اس کی طرف دیکھا۔ "تین اچھے مقدر خریدنے والا بھی اپنی کم نصیبی سے ہار گیا۔ ورنہ تو اسے اُن تین اور انسانوں کی عمریں بھی لگ جاتیں جن کا مقدر وہ پیسے کے بل بوتے پر خرید چکا تھا۔"

"تم غلط کہہ رہے ہو؟" اس نے تڑپ کر کہا۔ "میں نے ان کا مقدر نہیں خریدا تھا بلکہ یہ ایک باہمی معاہدہ تھا۔"

"تو پھر تم نے اُن تینوں کی تقدیر کے اچھے دنوں کا سودا کیا تھا؟" مشرا کا لہجہ سوالیہ تھا۔

"کبھی کبھار خوش نصیبوں کے ساتھ رہنے والے بدنصیبوں کے حالات بھی سنور جاتے ہیں۔" گیتا دیوی نے نجومیوں کے انداز میں اصل جواب دینے سے پہلے تمہید باندھی۔ "اس کے لیے ضروری نہیں کہ مقدر خریدے جائیں۔" یہ کہہ کر اس نے مشرا کو غور سے دیکھا۔ "ویسے مقدر کی خریداری کے سوال کا سیموئل کے معیار سے تعلق ہے تو پھر میرا جواب ہے ہاں... ایسا ہی ہوا تھا۔"

"تو پھر بات یہ ہوئی کہ اس نے خواہش کے مطابق مقدر پانے والے تین افراد کو تلاش کرنا چاہا۔" مشرا نے کہنا شروع کیا۔ "اس نے تمہاری خدمات حاصل کیں اور پھر تم نے تین لوگ تلاش کیے۔ پھر سیموئل نے تینوں کو رقم دی اور اپنے من پسند مقدروں کا مالک بن گیا؟"

"شاید اُن کے مقدروں کے اپنے من پسند حصے کا یا پھر شاید ان کے پورے مقدر کا مالک بن گیا ہو۔" اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتی، میں نے بھی لقمہ دیا۔ اب مجھے بھی اس بحث میں مزہ آنے لگا تھا۔

"ارے ہاں..." مشرا نے میری طرف دیکھا اور پھر خاموش کھڑی گیتا دیوی پر نظر ڈالی۔ "مقدر خرید لو تو اس سے کام کیسے لے سکتے ہیں؟"

"یہ بات تم نہیں سمجھ سکتے۔" اس نے ناراض لہجے میں جواب دیا۔ "تمہارے لیے اس کا تصور کرنا ہی محال ہے۔"

"تم مجھے سمجھانے کی کوشش تو کرو۔" مشرا نے کہا۔ "چلو یہی بتادو کہ تم اچھے مقدر کا پتا کیسے لگا سکتی ہو؟"

"یہ ہماری دنیا کی باتیں ہیں۔ تم اس کا اندازہ بھی نہیں کرسکتے مگر پھر بھی... اگر تم بضد ہو تو سنو۔" گیتا کی آواز اچانک بھاری اور گمبھیر ہوچکی تھی۔ "ہماری دنیا کی کچھ صدیوں پرانی روایتیں ہیں، جادوئی رسوم ہیں اور چند مقدس اور موثر الفاظ..."

"جنتر منتر...؟" میں نے اس کی بات کاٹی۔

"کہہ سکتے ہو۔" اس نے میری طرف گردن گھما کر دیکھا۔ "مگر یہ ادراک کا معاملہ ہے اور جب تم اپنے فہم و ادراک سے آگے ہوکر دیکھنے کی صلاحیت حاصل کرلیتے ہو تو پھر جان سکتے ہو کہ کس کے مقدر میں کیا ہے۔"

میں اپنے فہم و ادراک کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اپنی زبان پر قابو رکھا۔ اب مجھے یقین ہوچلا تھا کہ اس کیس میں مشرا نے شامل ہوکر میری کتنی مدد کی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ فی الوقت بے وقوفوں کی اس ملکہ سے نمٹنے کے لیے وہی کافی تھا۔

"خیر... یہ بحث چھوڑو۔" مشرا نے مکالمے کا رخ ایک بار پھر اصل معاملے کی طرف موڑا۔ "سیموئل شائے نے تمہاری مدد سے اپنی پسند کے مطابق تین مقدر خرید لیے تھے اور پھر اُس کے بعد..." اس نے لمحہ بھر رک کر گیتا کی طرف دیکھا۔ "اس نے ان تینوں مقدروں کا استعمال کیسے کیا؟"

"اُس نے تین خوش نصیب مقدروں کو خریدا اور انہیں اپنے مقدر میں حلول کرلیا تھا۔" گیتا نے لہجے کو پُراسرار بناتے ہوئے خوفناک آواز میں بتایا۔ اس کے لہجے کا وہ ترنم تو کب کا غائب ہوچکا تھا جو ہم سے ملتے وقت اس کی آواز میں تھا۔ "وہ تینوں مقدر اس کی تقدیر میں ضم ہوچکے تھے۔ اب وہ ایک انسان اور چار مقدروں کا مالک تھا۔ وہ چار قسمتوں سے خود پر خوش نصیبی کے تمام دروازے کھول کر جینا چاہتا تھا۔" وہ بالکل جادوگرنیوں کی طرح ڈراؤنے انداز میں چھت پر نظریں جمائے بول رہی تھی۔ وہ لہجے کے اتار چڑھاؤ سے یہ تاثر دینے کی کوشش کررہی تھی جیسے اس وقت وہ کسی خاص ماورائی قوت کے زیرِاثر ہو۔ مشرا کا تو پتا نہیں، پر مجھے واقعی... لطف آرہا تھا۔

"وہ بہت مال دار تھا۔ اس کی جائداد اور دولت بے شمار تھی۔ اچھی زندگی بسر کررہا تھا۔ اسے تو دیکھنے والے ویسے ہی خوش نصیب مانتے تھے تو پھر..." مشرا نے بات ادھوری چھوڑی اور ایک قدم آگے بڑھا کر گیتا کے قریب ہوا۔ "ایسے

شخص کو کیا ضرورت تھی مزید خوش نصیب مقدر کی؟ وہ تو دولت میں کھیلتا تھا اور ہم خوش نصیب اسے ہی کہتے ہیں جو صحت مند ہو، دولت میں کھیلتا ہو، اچھی زندگی گزار رہا ہو... یہ سب کچھ تو تھا اس کے پاس پھر جو کچھ ہوا، اس کی ضرورت اسے کیوں پیش آئی تھی؟"

"ویسے ایک شخص کو کتنے اچھے مقدر کی طلب ہو سکتی ہے؟" میں نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے اس کی بات میں اضافہ کیا۔

"کچھ لوگ اپنی زندگی اور مقدر سے کبھی مطمئن نہیں ہوتے۔" گیتا نے ہم دونوں کی طرف باری باری نظریں گھما کر دیکھا اور کہنا شروع کیا۔ "چاہے دیکھنے والا اسے کتنا ہی مقدر کا دھنی سمجھے مگر وہ پھر بھی نا آسودہ ہوتے ہیں۔ اُن کی تلاش اور ہوس کبھی ختم نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشہ اس بات کے متمنی رہتے ہیں کہ قدرت ان کے مقدر کو مزید طاقتور بنا دے مگر کتنا... یہ تو وہ خود بھی نہیں جانتے۔ اُن کے اپنے نزدیک بھی اس بات کی کوئی حد نہیں ہوتی کہ کتنی خوشحالی انہیں مقدر پر شاکر کر دے گی۔" میں نے محسوس کیا کہ جو گھبراہٹ اس پر طاری تھی، اب ختم ہو چکی تھی۔ اس کا اعتماد بحال ہو چکا تھا اور وہ ہماری بات کا براہِ راست جواب دینے کے بجائے اپنا لیکچر دینے لگی۔ مجھے لگا کہ وہ ہمیں مسحور کر کے اصل موضوع سے بھٹکانا چاہتی ہے۔

"یہ ہمارے سوال کا جواب نہیں۔" اس کے خاموش ہوتے ہی میں نے کہا۔ مشرا نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔

"سیموئل شائے بھی اسی طرح کے نا آسودہ لوگوں میں سے ایک تھا۔" گیتا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "اس کی بظاہر زندگی سے تم اسے مطمئن سمجھ سکتے ہو خوش حال قرار دے سکتے ہو مگر حقیقت اس کے برعکس تھی۔ وہ بہت کچھ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اسے اپنی تقدیر سے گلہ اور ماورائی قوتوں پر یقین تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ ایک تقدیر اس کے لیے ناکافی ہے۔ وہ یہ راز جان گیا تھا کہ دوسروں کی تقدیر حاصل کیے بنا اپنے مقاصد پورے کرنا مشکل ہے۔ اسی لیے وہ مجھ سے ملا۔ مجھ سے ملنے کے بعد وہ کافی مطمئن تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں اس کا کام کر سکتی ہوں اور میں نے ایسا کر دکھایا۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کا لہجہ فخریہ ہو گیا۔

"اوہ..." مشرا نے اس کی بات مکمل ہوتے ہی حیرانی سے کہا۔ "تو تمہاری خدمات کے اعتراف میں یہ دکان..." وہ کہتے کہتے رک گیا۔ "معاف کیجیے گا گیتا دیوی جی! میرا کہنے کا مطلب تھا کہ یہ دفتر تمہیں بنا کر دیا تھا اس نے۔" اس نے چاروں طرف نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہاں... اس نے ہی یہ کیا تھا مگر اب میں یہ نہیں جانتی کہ کب تک اسے چلا سکوں گی۔" اس نے اعتراف کرتے ہوئے بے بسی ظاہر کی۔ وہ شاید یہ تاثر دینا چاہتی تھی کہ اس کے مالی وسائل اتنے نہیں کہ وہ یہ دفتر چلا سکے۔ ساتھ ہی وہ یہ باور کرانے کی کوشش بھی کر رہی تھی کہ اس نے سیموئل سے غیر معمولی مالی فوائد ہرگز حاصل نہیں کیے تھے۔ مجھے امید تھی کہ اس جواب کے پیچھے پوشیدہ اس کا مقصد مشرا بھی سمجھ چکا ہو گا۔

"تمہارے مطابق سیموئل نے کچھ لوگوں کی خوش قسمتی خرید کر ان کے اثرات کو اپنے مقدر میں حلول کرایا تھا؟"

"بالکل درست۔" اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ خوش قسمتی بظاہر تو اس کے کسی کام نہ آ سکی، وہ تو شاید بے وقت مارا گیا۔" میں نے جان بوجھ کر مارے جانے کی بات کی تاکہ وہ سمجھے کہ کم از کم ہم دونوں اب تک اس کی موت کو حادثہ سمجھنے پر تیار نہیں ہیں۔

گیتا کا ردعمل میری توقع کے عین مطابق تھا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے ہلکا سا لرزی مگر فوراً ہی سنبھل گئی۔ اس نے چاروں طرف نظر ڈالی اور پھر ہم دونوں کو دیکھنے لگی۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ تقریباً ایک منٹ کی خاموشی کے بعد اس نے کہنا شروع کیا۔ "اگر تم دونوں سمجھ رہے ہو کہ میں نے کچھ کیا ہے تو یہ تم دونوں غلطی پر ہو۔" اس کی آواز دھیمی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سرگوشی میں بول رہی ہو۔ اس نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔ "میرا خیال ہے کہ اب تم دونوں کو یہاں سے چلا جانا چاہیے۔" اس نے زبردستی ہونٹوں پر مسکراہٹ طاری کرنے کی کوشش کی۔ "میں تمہیں پہلے ہی بہت وقت دے چکی ہوں۔ اب مجھے کچھ نہایت ضروری عملیات کرنے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر توقف کیا۔ "امید ہے آپ میری بات سمجھ رہے ہوں گے۔" اس بار اس کا لہجہ نفرت آمیز تھا۔ اس نے یہ بات دانت کچکچا کر کہی تھی۔

ہم تینوں اب تک کمرے کے وسط میں کھڑے تھے۔ اس کی بات سن کر ہم دونوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک منٹ تک وہ ہمیں گھورتی رہی مگر جب ہم کچھ نہ بولے تو وہ آگے بڑھی اور ہمیں ہلکا سا دھکا دیا۔ "میں نے کہا تھا کہ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" اس نے شدید غصے کی حالت میں کہا۔ البتہ آواز پھر بھی دھیمی تھی۔ اس کی وجہ شاید اس کی معاملہ فہمی ہو گی۔ ہم بھرے پرے ڈپارٹمنٹل اسٹور کی بلڈنگ میں تھے

اور وہ تماشا کھڑا کر کے اپنی دکان کی ساکھ خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ہم دونوں پلٹے اور دکان سے باہر نکلے تو عقب میں زور سے دروازہ بند کرنے کی آواز آئی۔

"وہ بُری طرح تپ چکی ہے۔" مشرا نے ہنستے ہوئے کہا۔ میں بھی مسکرا دیا۔ ہم نے اپنے گلے کے گرد مفلر لپیٹے۔ سردی کی یخ بستہ ہوا چہرے سے ٹکرا رہی تھی۔ "میرا خیال ہے کہ راجیو سنگھ سے بھی مل لیا جائے۔ وہ یہیں قریب میں کام کرتا ہے۔" مشرا نے تجویز دی۔

"بہتر ہے۔" میں چلتے چلتے رک گیا۔ "اس کا پتا کیا ہے؟"

"سڑک پار کر کے سامنے کی طرف جانا ہو گا۔" اس نے کاغذ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"تو چلو۔" میں نے قدم آگے بڑھائے۔

جب ہم ہالی شاپنگ مال کے اندر داخل ہوئے تو تیز موسیقی کانوں سے ٹکرائی۔ وہ امریکا میں راک موسیقی کے عروج کا زمانہ تھا۔ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، ہر امریکی راک کے سحر میں جکڑا ہوا تھا۔ یہ وبا ہندوستان بھی پہنچ گئی تھی۔

"میرے خیال میں تو ہم پہنچ گئے۔" مشرا نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ دائیں ہاتھ پر شیشے کے دروازے پر بڑا بڑا لکھا تھا۔ "ایلوس میوزک سینٹر" تیز موسیقی کی آواز وہیں سے آ رہی تھی۔

ہم اسٹور کے اندر داخل ہوئے تو کانوں کو پھاڑ دینے والی موسیقی سماعتوں سے ٹکرائی۔ میری اور مشرا کی عمر نہ تو اس قسم کے شوق پالنے کی تھی، نہ اس پرشور ہجوم میں گھومنے پھرنے کی۔

"راجیو سنگھ کدھر ہے؟" مشرا نے ایک لڑکے کو روک کر پوچھا۔ اس کی شرٹ پر ایلوس راک میوزک سینٹر لکھا ہوا تھا۔

"وہ اُدھر..." اس نے انگلی سے ایک کارنر کی طرف اشارہ کیا۔ ہم اس طرف بڑھ گئے۔

"کیسے ہو راجیو؟" مشرا نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ اس کی شرٹ پر بھی ایلوس راک میوزک سینٹر لکھا ہوا تھا۔

"بالکل ٹھیک مگر تم لوگ کون ہو؟" اس نے ذرا سا ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ مشرا کا قیافہ بالکل درست نکلا۔ ہم سیدھے اپنے مطلوبہ شخص تک پہنچ گئے تھے۔

"تو تم ہی ہو راجیو سنگھ..." میں نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اُلٹا سوال کر دیا۔

"بالکل... میں ہی ہوں راجیو سنگھ۔" اس نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہمیں تم سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنی ہیں۔" میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ "کیا یہاں بات ہو سکتی ہے؟" میں نے چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ وہ اچھی خاصی ہال نما دکان تھی۔

"کیوں نہیں۔" یہ کہہ کر وہ ہمیں دکان کے ایک کونے کی طرف لے گیا۔ اگرچہ اس وقت وہاں خاصے گاہک موجود تھے مگر پھر بھی اس کونے میں کوئی موجود نہیں تھا۔ "یہاں بات کی جا سکتی ہے۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "اب بتانا پسند کریں گے کہ آپ دونوں کون ہیں اور کیا بات کرنا چاہتے ہیں؟" اس کا لہجہ مہذب، دوستانہ مگر سوالیہ تھا۔

"میں ہوں سابق اسسٹنٹ کمشنر بمبئی پولیس شنکر دیال اور یہ ہیں میرے دوست رومی مشرا جی!"

"واہ..." اس نے خوش ہو کر مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ "آپ لوگ تو بہت اہم لوگوں میں سے ہیں۔ بتائیے... میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"ہمیں معلوم ہوا ہے کہ گیتا دیوی نامی ایک عورت نے تمہارے اور سیموئل شائے کے درمیان ایک سودا کروایا تھا؟" میں نے کہا۔

"بالکل ٹھیک۔" اس نے لمحہ بھر کی تاخیر کیے بنا تصدیق کی۔ "لیکن سچ پوچھیں تو مجھے یہ سب کچھ بہت عجیب لگا تھا۔"

"تو سودا ہوا اور رقم لی...؟" مشرا نے لقمہ دیا۔

"بالکل..." اس نے مشرا کی طرف دیکھا۔ "اس وقت رقم لیتے ہوئے میری عجیب حالت ہوئی تھی۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔"

"لیکن پھر بھی تم نے اپنے مستقبل کا سودا کیا؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "بظاہر تو ایسا ہی تھا۔"

"یہ سودا کیسے طے ہوا تھا؟" اس بار مشرا نے سوال کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر خوف کی ہلکی ہلکی پرچھائیاں تیرنے لگی تھیں۔

"گیتا دیوی جی مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر مسٹر سیموئل شائے کے گھر لے گئی تھیں تاکہ ان سے مل کر سودا طے کیا جا سکے۔" اس نے کہنا شروع کیا۔ اس کی آواز سے گرم جوشی غائب ہو گئی تھی۔

"وہاں کیا ہوا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"وہاں ہم تینوں تھے۔" اس نے جواب دینا شروع کیا۔ "سودا ہو جانے کے بعد گیتا جی نے مجھے اور مسٹر شائے کو فرش پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے آمنے

سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ تب اس نے چاک سے ہم دونوں کے گرد ایک دائرہ بنایا۔ ہمیں کہا کہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکیں۔ اس کے بعد گیتا دیوی نے کوئی منتر پڑھنا شروع کیا۔ مجھے یہ تو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ جو لفظ بول رہی ہے، اس کے معنی کیا ہیں البتہ ایک دو لفظ ہی پلے پڑ سکے تھے۔"

"وہ کیا تھے؟" مشرا نے قطع کلامی کی۔

"کچھ نئے جنم کی بات تھی۔" اس نے چند لمحے سوچنے کے بعد جواب دیا۔ "مقدر جیسا لفظ تھا، باقی میں کچھ نہیں سمجھ سکا۔"

"پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"اس نے اپنا منتر پڑھنے کے بعد ہمیں کہا کہ ایک دوسرے کے ہاتھ تھام لیں اور آنکھیں بند کر لیں۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔ کچھ دیر تک میرے کانوں میں اس کے منتر کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر اس نے آنکھیں کھولنے کا کہا۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو پہلے اس نے سیموئل اور پھر مجھ پر پھونکیں ماریں اور کہا کہ اب میرا مقدر سیموئل کے مقدر میں حلول کر چکا ہے۔" یہ کہہ کر وہ رکا اور ہم دونوں کی طرف غور سے دیکھا۔ "سچ پوچھو تو اس وقت جو کچھ ہوا تھا، وہ میری اب تک کی زندگی کا سب سے حیران کن اور ناقابل فراموش واقعہ ہے مگر ایک بات سچ ہے...."

"وہ کیا؟" میں نے تجسس کے باعث فوراً سوال کیا۔

"میں نے آج تک اتنی آسانی سے کبھی پیسا نہیں کمایا۔" وہ مسکرا دیا۔

"اس روز کے بعد کیا تم سیموئل شائے سے پھر کبھی ملے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"کبھی نہیں۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"ویسے یہ پوچھنا بڑا عجیب لگتا ہے مگر پھر بھی...." مشرا نے کچھ سوچتے ہوئے کہنا شروع کیا اور پھر بات ادھوری چھوڑ کر راجیو کو تکنے لگا۔ "معاملہ کچھ ایسا ہے کہ ہم جاننا چاہیں گے کہ تم نے کتنی رقم کے عوض اپنی خوش نصیبی کا اس سے سودا کیا تھا؟"

"بیس ہزار۔" اس نے فوراً جواب دیا۔

"یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔" اس کی بات سنتے ہی میں نے کہا۔

"سودا بھی تو مقدر کا تھا۔" اس نے مسکراتے ہوئے برجستہ جواب دیا۔

"تم نے اس رقم سے کیا کچھ کیا؟" میں نے بنا تمہید سوال کیا۔

"بہت کچھ...." اس نے گول مول جواب دیا۔

"پھر بھی۔" میں نے جاننے پر اصرار کیا۔

"میں نے اپنی گرل فرینڈ کو سیکنڈ ہینڈ کار خرید کر تحفے میں دی۔ کپڑے بنائے اور باقی رقم بینک میں رکھ دی۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا اور پھر کہنے لگا۔ "کاش.... میں نے اسے کار نہ دلوائی ہوتی۔"

"کیوں؟" میں نے چونک کر پوچھا

"میں آج بھی اسے بہت مس کرتا ہوں۔"

"ہوا کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"حادثہ...." راجیو نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ "اسے تیز ڈرائیونگ کا جنون تھا مگر وہ اچھی ڈرائیور نہیں تھی۔ وہ فلموں میں اپنا کیریئر بنانے کی تگ و دو کر رہی تھی۔ اس شام ہم دونوں ایک پورا اسٹوڈیو سے لوٹ رہے تھے۔ ہم ساحل پر جانا چاہتے تھے۔ اسے آڈیشن میں مسترد کر دیا گیا تھا۔ وہ بہت دکھی تھی اور شاید اسی لیے بہت تیز گاڑی چلا رہی تھی۔ اچانک ایک موڑ مڑتے ہوئے ایک ٹرک سامنے آ گیا۔ وہ قابو نہ رکھ سکی۔ کار الٹ گئی اور موقع پر ہی...." وہ رکا اور آنکھ کے کونے میں تیرتی نمی کو انگلی کے پور سے صاف کرنے لگا۔ "میں اسے کبھی نہیں بھلا پاؤں گا۔"

"تم بھی تو اس کے ساتھ تھے.... تمہیں کچھ نہیں ہوا؟" مشرا نے سوال کیا۔

"کچھ نہیں ہوا۔" اس نے مشرا کی طرف دیکھا۔ "خوش قسمتی سے مجھے خراش تک نہیں آئی مگر وہ بے چاری...."

"اپنی خوش قسمتی کو فروخت کرنے کے باوجود تم اتنے خوش قسمت تھے کہ موت تمہیں چھوئے بنا ہی نکل گئی۔" میں نے کہا۔

"شاید...." اس نے میری آنکھوں میں دیکھا۔ "شاید میرا خوش نصیب مقدر ساتھ چھوڑنے کے باوجود میرے ساتھ تھا۔ شاید وہ اپنے نئے مالک سے دھوکا کر کے اس وقت میرے پاس آ گیا ہوگا۔"

میں اور مشرا راجیو کی بات سن کر خاموش رہے۔

"میری دادی کہتی تھیں کہ خوشی اور صحت دولت سے نہیں خریدی جا سکتی، یہ تو مقدر سے ملتی ہے۔" ہمیں خاموش دیکھ کر راجیو نے بات آگے بڑھائی۔ "مجھے بھی اس اتفاق پر سخت حیرت ہے کہ اگر وہ میرے مقدر کو خرید کر، بقول دیوی جی کے اپنے مقدر میں حلول کر چکے تھے تو اس حادثے کے وقت میں کس طرح بچ گیا؟ بڑا ہی خوفناک حادثہ تھا وہ۔ اب

بھی سوچتا ہوں تو لرز اٹھتا ہوں۔"

"تم اس حادثے میں مر نہیں سکتے تھے، کیونکہ خوش نصیب مقدر تمہارا ساتھ دے رہا تھا۔"

میری بات سن کر اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"مگر سب اتنے خوش نصیب نہیں ہوتے، چاہے کتنے ہی مقدر خرید لیں۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "مقدر ساتھ نہ دے تو ماربل کی سیڑھیوں سے پھسل کر بھی جان جاسکتی ہے۔" یہ کہتے ہوئے میں اس کے چہرے کے تاثرات کا گہری نظروں سے جائزہ لے رہا تھا۔

"کیا مسٹر سیموئل شائے کو کچھ ہو گیا ہے؟" اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"میں اُن کی بات نہیں کر رہا، یہ تو ایک تھیوری ہے۔"

"اوہ... تھیوری ہے۔" اس نے گہری سانس لی۔ اب اس کے چہرے پر اطمینان نظر آرہا تھا۔ "میں نے سراغ رسانی والے جتنے ناول پڑھے ہیں، اس سے یہی بات جان سکا ہوں کہ ان کی روزی روٹی تھیوری پر ہی چلتی ہے۔ نئے نئے نکات، امکانات اور پھر بھاری فیس..." یہ کہہ کر وہ بے فکروں کی طرح مسکرا دیا۔

"راجیو سنگھ!" مشرا نے بیچ میں لقمہ دیا۔ "تم نے ہمیں اچھا خاصا وقت دیا۔ اس کے لیے شکریہ۔ اگر ضرورت پڑی تو پھر ملاقات ہوگی۔"

"میری جب ضرورت پڑے، آجایئے گا۔" اس نے خوش دلی سے جواب دیا۔

"اب ہم چلتے ہیں۔" میں نے اس کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ "پہلے ہی تمہارے کام کا کافی حرج ہوا ہے۔"

"ارے... ایسی کوئی بات نہیں۔ میں یہاں اکیلا نہیں، کئی لڑکے کام کرتے ہیں۔" اس نے پُرجوش انداز میں ہاتھ ملاتے ہوئے جواب دیا۔

چند منٹ بعد میں اور مشرا میوزک سینٹر سے نکل کر پارکنگ کی طرف جا رہے تھے۔

☆☆☆

وہ جدید فیشن والے لیڈیز کپڑوں کی ایک بہت بڑی مارکیٹ تھی۔ اسی مارکیٹ کی ایک دکان پر جا کر ہمیں مقدر کا سودا کرنے والی اس عورت سے ملنا تھا۔ شوبھا نے اپنے نوٹس میں دکان کا پتا اور اُس خاتون کا حلیہ تفصیل سے بیان کیا تھا جس نے سیموئل شائے سے مقدر کا سودا کیا تھا۔

مجھے یقین تھا کہ اگر میں اور مشرا عورت ہوتے تو اس مارکیٹ میں ایک بار گھسنے کے بعد گھنٹوں وہاں سے نکلنے کا نام نہ لیتے۔ دو رویہ دکانوں کے بیچ سے گزرتے ہوئے ہماری آنکھیں طرح طرح کے ملبوسات، پرفیومز، پرس اور اسی طرح کی ان نسوانی استعمال کی اشیا سے ٹکرا رہی تھیں جن کی ایک مرد کو اس وقت تک ہرگز ضرورت نہیں پڑ سکتی، جب تک اسے اپنی محبوبہ کو تحفہ نہ دینا نہ پڑے۔ بالآخر ہم دونوں کو دکان نظر آگئی۔

یہ خواتین کے جدید تراش خراش کے ملبوسات اور دیگر آرائشی اشیا فروخت کرنے والی خاصی بڑی دکان تھی۔ ہم نے باہر کھڑے ہو کر اندر کی طرف نظر ڈالی۔ اس وقت دکان پر کوئی گاہک نہیں تھا۔ کاؤنٹر کے عقب میں دراز قامت خوبصورت عورت نظر آرہی تھی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور اندر داخل ہوگئے۔

"گڈ آفٹر نون..." ہمارے اندر داخل ہوتے ہی وہ کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل کر ہماری طرف بڑھی۔ "کہیے... میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟" شوبھا کے نوٹس کے مطابق وہ بنگالن تھی لیکن اس وقت نہایت شستہ انگریزی ملی ہندی بول رہی تھی۔

میں نے اس کی طرف نظر ڈالی۔ وہ تیس بتیس سال کی ہوگی۔ نکلتا ہوا قد، چھریرا جسم، سنہری بال، نیلی آنکھیں... وہ بنگال کے حسنِ فسوں گر کا منہ بولتا شاہکار تھی۔ اس نے اینگلو انڈین عورتوں کی طرز کا گہرے نیلے رنگ کا اسکرٹ اور سفید بلاؤز پہنا ہوا تھا جو اس پر بہت جچ رہا تھا۔ "لکشمی جی؟" میں نے تصدیق چاہنے کے انداز میں پوچھا۔

"جی ہاں..." اس نے ایک نظر ہم پر ڈالی۔ "میں ہی ہوں لکشمی۔ فرمایئے، آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟" اس نے استفسار کیا۔

"ہمیں خوشی ہوگی اگر آپ ہماری مدد کریں گی۔" یہ کہہ کر میں نے اسے مختصراً اپنا تعارف اور یہاں آنے کا مقصد بتایا۔ جب تک میں بولتا رہا، وہ حیران کن نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی مشرا کو دیکھتی رہی۔

"بہتر ہے کہ آپ وہاں آجائیں۔" میری بات مکمل ہونے کے بعد اس نے لمحہ بھر سوچ کر کہا۔ وہ کاؤنٹر کی طرف بڑھی۔ "بیٹھیے..." اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا اور خود ہمارے سامنے والے اسٹول پر بیٹھ گئی۔

میں نے اس کے چہرے کا گہری نظروں سے جائزہ لیا۔ وہ بہت پریشان تھی تاہم خود پر قابو رکھ کر پُرسکون نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"تو آپ کیا کہتی ہیں اس سارے معاملے کے بارے میں؟" تقریباً دو منٹ تک ہم تینوں خاموش رہے۔ آخر میں نے سکوت توڑا۔

"میں سمجھ نہیں پا رہی ہوں کہ آپ کو اس بارے میں کیا بتاؤں۔ میری سیموئل شائے سے صرف ایک ہی ملاقات ہوئی تھی۔ اس سے زیادہ میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔" اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"تم اس سے پہلی بار اُس وقت ملی تھیں، جب اس نے مقدر کا سودا کیا تھا؟" میں نے وضاحت طلب انداز میں سوال کیا۔

"ہاں... اُسی وقت، جب اس نے میری تقدیر خریدی تھی۔" لکشمی نے بے ساختگی سے جواب دیا۔

"اُس موقع پر تم نے اُسے کیسا پایا تھا؟" میں نے بات آگے بڑھائی۔

"میرا خیال ہے کہ مناسب شخص ہی تھا۔" اس نے کہنا شروع کیا۔ "ویسے وہ خالص بزنس مین تھا۔ اس وقت بھی اس کا انداز کاروباری تھا، البتہ یہ کہہ سکتی ہوں کہ اس کا انداز غیر دوستانہ یا غیر مہذبانہ ہرگز نہیں تھا۔ ویسے مجھے لگا کہ وہ سودا جلدی جلدی طے کرنا چاہتا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اسے اس کام میں تاخیر ہرگز پسند نہیں تھی۔ وہ جلد از جلد تقدیر کا سودا اور اس کی اپنے تک منتقلی کا عمل پورا کرنے کا خواہش مند تھا۔"

"اور پھر مقدر کی منتقلی کا عمل پورا ہوگیا... مگر یہ کام کیسے اور کس نے کیا؟" میں نے پوچھا۔

"یہ کام گیتا دیوی نے کیا تھا۔" اس نے کہنا شروع کیا۔

"مگر کیسے؟" میں نے تشنہ کلامی کی۔

"کمرے میں صرف ہم تین لوگ تھے۔" لکشمی نے کہنا شروع کیا۔ "دیوی نے اپنے ہاتھ میں میرا ہاتھ تھاما۔ سیموئل کمرے کے وسط میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ وہ میرا ہاتھ تھامے ہوئے کمرے میں گول گول گھومتی رہی۔ ساتھ ہی وہ بلند آواز میں کچھ پڑھتی بھی جا رہی تھی۔"

"کیا پڑھ رہی تھی؟" مشرا نے لقمہ دیا۔

"معلوم نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "وہ الفاظ شاید اس کی اپنی اختراع تھے یا پھر کسی نامانوس زبان کے ہوں گے، میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ مجھے تو اس کا ایک لفظ بھی سمجھ نہیں آرہا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کوئی پُراسرار علم کا منتر ہو۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکی اور باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا۔ "میں کئی زبانیں جانتی ہوں لیکن یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ کسی زبان کے الفاظ تو ہرگز نہیں ہوسکتے۔ ضرور کوئی پُراسرار جاپ ہوگا۔"

"وہ تم سے کیسے ملی اور اس کام پر کس طرح رضامند کیا تھا؟" میں نے دریافت کیا۔

"چند ماہ پہلے کی بات ہے، وہ پہلی بار بینک آف انڈیا میں مجھ سے اچانک ملی تھی۔ اس نے کہا کہ اگر میں چاہوں تو وہ مجھے میری قسمت کا حال بتا سکتی ہے۔" لکشمی نے جواب دیا۔ "خیر، آہستہ آہستہ وہ میرے قریب ہوتی گئی اور پھر ایک دن اس نے مجھے پیشکش کر دی۔ میں مالی بدحالی کا شکار تھی۔ مجھے اس کی پیشکش پُرکشش لگی اور میں نے ہامی بھر لی۔" یہ کہہ کر اس نے چند لمحوں کا توقف کیا۔ "ویسے تو مقدر کے سودے کی بات مجھے بڑی عجیب لگی تھی مگر پھر بھی... میں نے سوچا کہ میرا کیا جاتا ہے۔ دو پیسے تو ہاتھ لگ رہے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے ہم دونوں کی طرف دیکھا۔ "سچ پوچھو تو مجھے یہ فائدے کا سودا لگا۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوئی اور مسکرا دی۔

میں نے مشرا اور اس نے میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ چند لمحوں تک ہم دونوں ہی سوچتے رہے۔ آخر میں نے کہنا شروع کیا۔ "تو وہ سودا تمہارے لیے نفع ہی نفع تھا مگر جس دن یہ ڈیل فائنل ہوئی، اُس روز کیا ہوا تھا؟"

"میں کچھ سمجھی نہیں۔" اس نے حیرانی سے پلکیں جھپکائیں۔

"سیدھی سی بات ہے۔" میں نے اپنے سوال کی وضاحت شروع کی۔ "جائداد بیچو تو رجسٹری کی منتقلی ہوتی ہے، رجسٹرار کے سامنے اُس کے دفتر میں۔ تو جب تم نے اپنا مقدر اسے بیچا تو اپنی ملکیت کو کس طرح اسے منتقل کیا تھا؟"

"بڑا عجیب و غریب لمحہ تھا وہ۔" اس نے کہنا شروع کیا۔ "یہ تو بتا چکی ہوں کہ اس نے مجھ سے کمرے میں پھیرے لگوائے تھے مگر حیرت کی ایک اور بات تھی، اس نے کچھ منتر بھی مجھ سے بھی پڑھوائے۔ بڑے عجیب سے تھے وہ۔ مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آیا تھا۔ اس کے بعد ہم تینوں آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد گیتا نے اعلان کیا کہ میرا مقدر مسٹر سیموئل شائے کو منتقل ہو چکا ہے۔"

"تمہاری اس ڈیل کے بارے میں اور کون کون جانتا ہے؟" مشرا نے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔

"کم از کم میری حد تک تو میرے سوا کوئی اور اس بات سے واقف نہیں۔ میں نے تو اپنے شوہر تک سے یہ بات چھپائی ہے۔"

"تمہیں کتنی رقم ملی تھی مقدر فروشی کے عوض؟" میں نے

پوچھا۔

"اتنی کہ یہ دکان کھولنے کے قابل ہو سکی۔" لکشمی نے چاروں طرف نظریں گھماتے ہوئے پوچھا۔

"شوہر نے پوچھا نہیں، اتنی رقم آئی کہاں سے؟" میں نے سوال کیا۔

"کہہ دیا بینک سے قرض لیا ہے اور کچھ رقم والدین سے لی ہے۔"

"اچھا جواز تلاش کیا ہے۔" میں اس کی چالاکی پر مسکرا دیا۔

"تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟" مشرا نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ "سیموئل کو اپنا خوش نصیب مقدر فروخت کرنے کے بعد اب تم کیسا محسوس کرتی ہو؟"

"مجھے تقدیر پر بھروسا نہیں۔" اس نے فوراً جواب دیا۔ "میں تدبیر پر یقین رکھتی ہوں اور اتفاقات کو کسی غلطی کا منطقی نتیجہ... اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے اس زندگی میں۔" یہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ ٹھوس تھا۔ "جب میں نے سیموئل شائے سے سودا کیا، اس وقت بھی مقدر میرے لیے بے معنی تھا اور اب بھی۔" یہ کہہ کر وہ رکی۔

"مگر گیتا سے ملاقات یہ تو اتفاق تھا نا۔" مشرا نے لقمہ دیا۔

"ہاں مگر ایک غلطی کا نتیجہ... میں بینک گئی تھی پیسے نکلوانے اور پھر وہیں رقم گنتے گنتے اپنا پرس کاؤنٹر پر بھول کر چلی آئی تھی۔ باہر نکلتے ہی یاد آیا۔ واپس گئی تو وہیں کاؤنٹر پر وہ کھڑی تھی۔ یوں ملاقات کی ابتدا ہوئی۔" وہ بھی ضد کی پکی لگ رہی تھی۔ "خود ساختہ مقدر فروشی کے بعد میری نفسیاتی زندگی میں تو کوئی تبدیلی نہیں آئی البتہ میری عقل سے معاشی حالات بہتری کی طرف چل پڑے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے دکان میں چاروں طرف نظر گھمائی۔

"کیا ہوا لکشمی!" اسی دوران میں ہمارے عقب میں ایک مردانہ آواز گونجی۔ میں اور مشرا نے بیک وقت گردن موڑی۔

"کچھ نہیں جی..." اس نے فوراً بات بنادی۔ "میں ذرا ان لوگوں سے بات چیت کر رہی تھی۔"

وہ شخص دکان کے عقبی حصے سے برآمد ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ پیچھے دکان کا اسٹور ہوگا۔

"میں نے تمہارے بولنے کی آواز سنی تو..." اس نے ہم دونوں پر طائرانہ نظر ڈالی۔ "میں سمجھا کہ تمہیں کہیں میری مدد کی ضرورت نہ ہو۔"

"نہیں، ایسا کچھ نہیں۔" لکشمی نے اسے مطمئن کرنے کے لیے کہا۔

"او کے..." اس نے پلٹتے ہوئے کہا۔ "میں ذرا نیا مال چیک کر رہا ہوں۔ ضرورت پڑے تو آواز دے لینا۔"

"شکریہ۔" لکشمی نے کہا۔

اسی دوران میں وہ واپس جا چکا تھا۔ وہ عمر میں لکشمی سے کم از کم پندرہ سال تو بڑا ہوگا۔ میں نے دل ہی دل میں اس جوڑے کا تقابلی جائزہ لیا۔

"بہت پیار کرتا ہے تم سے۔" مشرا نے کہا۔

"بہت زیادہ۔" لکشمی نے فخریہ لہجے میں بتایا۔ "جان چھڑکتا ہے مجھ پر اور رادھا پر۔"

"رادھا..." میں نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"ہماری بچی ہے، آٹھ سال کی ہو گئی ہے۔"

"اوہ... لگتا نہیں کہ تم اتنی بڑی بچی کی ماں ہوگی۔" میں نے کہا

"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔" اس نے عورتوں کے مخصوص انداز میں شرماتے ہوئے کہا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ بھی دوسری عورتوں کی طرح اس وقت اس بات پر خوش ہو رہی ہوگی کہ لوگ شاید اسے اب بھی نوجوان سمجھتے ہیں۔ ویسے یہ بات سچ بھی تھی۔ وہ کہیں سے آٹھ سال کی بچی کی ماں نہیں لگتی تھی بلکہ کوئی دل پھینک اسے دیکھتے تو شاید پہلی ہی نظر میں فریفتہ ہو جائے۔

"خیر... ہم آپ کے مشکور ہیں کہ اتنا وقت دیا۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔ بس! میری ایک درخواست ہے آپ سے۔"

"وہ کیا...؟" مشرا نے پوچھا۔

"میرے شوہر کو اس معاملے کی بھنک نہیں لگنی چاہیے۔"

"اوہ... بے فکر رہو۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔" مشرا نے مسکرا کر یقین دلایا۔

اسی دوران میں تین نوجوان لڑکیاں دکان میں داخل ہوئیں اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے ہینگر پر لٹکے ایک ڈریس کے گرد دائرہ بنا کر کھڑی ہو گئیں۔ وہ تینوں مسلسل بولے جا رہی تھیں۔ انہیں اندر داخل ہوتا دیکھ کر لکشمی کے چہرے پر اضطراب کی ایک ہلکی سی لہر ابھر آئی تھی۔

"معذرت چاہتی ہوں، وہ میرے گاہک..." اس نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"کوئی بات نہیں، آپ انہیں نمٹائیں۔ ہم چلتے ہیں۔" میں نے کہا اور ہم دونوں باہر نکل گئے۔

☆☆☆

ہمیں مقدروں کی سوداگری سے کوئی سروکار نہ تھا البتہ سیموئل شائے قتل کیس... اگر یہ شوبھا کی تھیوری کے مطابق قتل تھا تو پھر ہمیں حقیقت تک پہنچنا تھا۔ کیس بظاہر بہت پیچیدہ تھا۔ ہم مستقل پولیس کی بھی ٹن گن لیے ہوئے تھے۔ ابھی تک لاش پولیس کی تحویل میں تھی اور سرکاری اسپتال کے مردہ خانے میں رکھی تھی جس کے باہر پولیس کا پہرا تھا۔ مشکل یہی تھی کہ پولیس اب تک اسے حادثہ قرار دے رہی تھی۔ یہ اور بات کہ اس کے وکیلوں کی مداخلت کے سبب تفتیش بدستور جاری تھی۔ ہماری کوشش تھی کہ اس سے پہلے کہ پولیس تفتیش مکمل کر کے میت کو دفن کرنے کی اجازت دے، تب تک ہمیں اپنی تفتیش مکمل کر کے پولیس کے سامنے یہ بات ثابت کر دینی چاہیے کہ وہ حادثہ نہیں قتل تھا۔ مشکل یہ تھی کہ قتل ثابت کرنے کے لیے کم از کم ایک شک ضرور پیش کرنا تھا کہ اگر وہ قتل تھا تو پھر اس کی موت کا سب سے بڑا فائدہ کس کو پہنچتا؟ بظاہر تو اس کا کوئی عزیز یا رشتے دار بھی سامنے نہیں آیا تھا۔ دو نابالغ یتیم بھتیجیاں تھیں، وہ بھی کہیں سوئٹزرلینڈ دور ایک ہاسٹل میں پڑھ رہی تھیں۔ ویسے وہ اپنی زندگی میں ہی وراثت میں دونوں کا حصہ طے کر چکا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی کاروباری حریف بھی نہیں تھا اور رہی دولت تو اس کا بڑا حصہ وہ اپنے نام پر چلنے والے کئی ٹرسٹ اور فلاحی اداروں کے نام کر چکا تھا۔ اب ایسے میں بنا ثبوت حادثے کو قتل کہہ دینا کم از کم میرے لیے تو ناممکن تھا۔

دوسری طرف شوبھا کا اصرار برقرار تھا۔ وہ ماننے کو ہی تیار نہیں تھی کہ وہ حادثے کا شکار ہوا۔ اس کی بات تھیوری کی حد تک درست تھی مگر پولیس ثبوت مانگتی ہے۔ عدالت اس کے بنا فیصلہ نہیں کرتی اور ہم اسی کی تلاش میں دن رات ایک کیے ہوئے تھے۔

سیموئل کی موت حادثہ نہیں قتل تھی۔ اس کی تفتیش ہم نے اس کی زندگی کے آخری چند ہفتوں کے اُن کرداروں سے کی تھی جس میں لین دین کا عنصر موجود تھا اور یہ معاملہ تھا مقدر فروشی کا۔ سیموئل کے سوا اس کے باقی کرداروں میں سرِ فہرست تھی شوبھا جس نے معاملے کو نیا پہلو بخشا۔ اس کے علاوہ باقی چار کردار تھے۔ ہمارے لیے وہ چاروں مشتبہ تھے۔ سب سے پہلے گیتا دیوی، اس کے بعد باقی تینوں مقدر فروش۔ ہم انہیں بھی بڑا مشتبہ سمجھ رہے تھے۔ اگر گیتا دیوی معصوم تھی تو پھر تینوں مقدر فروشوں میں ایک ایسا شاطر ضرور موجود تھا جو پیسا بھی لے گیا اور اب مقدر بھی واپس لینا چاہتا تھا۔ لکشمی نے تو مقدر پر یقین سے ہی انکار کر دیا تھا۔ راجیو کہتا تھا کہ مقدر بیچ دینے کے باوجود اس کی خوش نصیبی حادثے میں اس کی زندگی بچا گئی۔ ممکن ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہو۔ تیسرا تھا ولود... بس یہی ایک تھا جس سے ہم نہیں ملے تھے۔ اس کے بعد یہ سوچنا تھا کہ ان تینوں میں سے ایسا کون ہو سکتا ہے جسے مقدر پر بھی یقین ہو اور پیسے کا لالچی بھی۔ اسی لیے جب اس نے مقدر بیچا تو شاید اس کے ساتھ ایسا کچھ ہوا ہو جسے اس نے بدقسمتی پر محمول کیا اور مقدر واپس حاصل کرنے کے لیے خریدار کو ہی مار ڈالا۔ مقدر فروشی کے اس کھیل میں میری سوچ بھی کچھ کچھ توہم پرستوں جیسی ہو چکی تھی۔ میں بھی انہی کے انداز میں سوچ رہا تھا۔

لکشمی سے ملاقات کے بعد ہم دونوں اپنے اپنے گھر لوٹ گئے۔ رات ڈنر پر میں اور مشرا دوبارہ ملے۔ اس کے بعد شوبھا کی طرف گئے اور پھر تینوں اس بحث میں کئی گھنٹے تک الجھے رہے کہ اگر سیموئل کی موت واقعی قتل ہے تو پھر قاتل کون تھا یا تھی۔ اس کیس میں بظاہر دو عورتیں بھی تھیں... گیتا اور لکشمی۔

ہم اس خونی قصے کے تمام کرداروں سے مل چکے تھے۔ اب لے دے کے صرف ایک ولود ہی باقی رہ گیا تھا۔ کل کا دن اس پر صرف ہونا تھا۔ اس کے بعد شاید کوئی نتیجہ مل پاتا۔

☆☆☆

"بے بی بلیو ملک سپلائرز" بمبئی کی بہت پرانی دودھ سپلائی کرنے والی ڈیری کمپنی تھی۔ انگریز دور میں اسے ایک گورے تاجر نے قائم کیا تھا۔ شوبھا کی اطلاع کے مطابق ولود سے ملنے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ ہم اس کی دودھ کمپنی کے ٹرک کو پکڑ لیں۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔ بے بی بلیو ملک سپلائرز کا ٹرک بمبئی کے مضافات میں واقع کمپنی سے شہر کی طرف آ رہا تھا۔ ہم پہلے سے ہی اس کی راہ میں کھڑے تھے۔ ٹرک سامنے سے گزرا تو ہم نے اپنی گاڑی اس کے پیچھے لگا دی۔

میپل اسٹریٹ کا موڑ کاٹتے ہی ٹرک ایک سائڈ میں ہو کر رکا۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی اس میں سے ایک نوجوان اترا۔ میں نے مشرا کی طرف دیکھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے ٹرک کے عین پیچھے جا کر گاڑی روکی۔ تب تک وہ دودھ کی باسکٹ تھام کر سامنے بنے دو رویہ گھروں کی قطار کے سامنے بڑھ چکا تھا۔

"اسے اپنا کام کر کے پلٹنے دو۔ ہمیں کوئی جلدی نہیں۔" میں اسے آواز دے کر بلانا چاہتا تھا مگر مشرا نے ایسا کرنے سے روک دیا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ پلٹا۔ جیسے ہی وہ ٹرک کے قریب پہنچا یا۔ میں نے کار کے اندر بیٹھے بیٹھے اسے آواز دی۔ "ونود..."

"کون ہے؟" اس نے چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے اونچی آواز میں کہا۔ شاید وہ ہمیں نہیں دیکھ سکا تھا۔ ویسے بھی ہماری کار درختوں تلے، اس کے ٹرک کی اوٹ میں کھڑی تھی۔ ہمیں وہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے جواب دینے کے بجائے اس کا گہری نظر سے جائزہ لیا۔ گھروں میں دودھ سپلائی کرنے والے عام سیلز مینوں کی طرح اس نے سفید چینو شرٹ اور سفید جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ سر پر سفید کیپ تھی۔ کمپنی کے پرانے گاہک ہونے کی وجہ سے میں اور مشرا اچھی طرح جانتے تھے کہ انگریز مالک کے زمانے سے ہی یہ لباس کمپنی کے ملازمین کی پہچان تھا۔ دور سے دیکھنے کے باعث میں اسے پہلے نوجوان سمجھا تھا مگر وہ نظر کا دھوکا تھا۔ وہ نوجوان نہیں بلکہ چالیس پچاس سال کا ادھیڑ عمر مرد تھا۔ اس کا چہرہ سخت گیر تھا۔ وہ مجھے قطعی غیر دوستانہ شخص لگ رہا تھا۔

"تو تم ہو ونود..." میں گاڑی سے اتر کر اس کے قریب پہنچا۔ میرے پیچھے پیچھے مشرا تھا۔

"جی ہاں۔" اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا اور غور سے میرے سراپا پر نظر ڈالی۔

میں نے اپنا اور مشرا کا تعارف کرایا اور مختصراً اسے بتایا کہ ہم سیموئل شائے...

"سیموئل شائے۔" اس نے قطع کلامی کرتے ہوئے الفاظ چبا چبا کر اس کا نام اپنی زبان سے ادا کیا۔ "وہ دولت مند چوہا جو دوسروں کی زندگی اجیرن بنا کر اپنی زندگی خوشحال کرنا چاہتا تھا۔" اس کے لہجے سے تلخی اور نفرت صاف ظاہر تھی۔ اب تک جتنے مشتبہ کرداروں سے ہم ملے یہ اُن میں سب سے تلخ تھا۔ وہ سیموئل کا نام اس طرح لے رہا تھا جیسے اُسے اپنے اوپر آنے والی تمام تر مصیبتوں کا ذمے دار سمجھتا ہو۔ اس نے چند لفظ ہی کہے ہوں گے کہ میں نے معنی خیز نظروں سے مشرا کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہوں نے بھی بہت کچھ بھانپ لیا تھا۔

"وہ بڑا کمینہ شخص تھا۔ دوسروں کے مقدر چراتا تھا کمبخت۔" اس نے یہ کہہ کر شدید نفرت بھرے انداز میں زمین پر تھوکا۔ "میرا اندازہ ہے کہ اب تک بازی پلٹ گئی ہوگی۔" اس کی بات بے ربط اور لہجہ غصے سے بھرا تھا۔ "میں تمہیں کچھ دکھاتا ہوں۔"

"کیا مطلب...؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

میری بات سن کر وہ اور بپھر گیا۔ "کیا... کیا مطلب کیا... تم تو بڑے چالاک لگتے ہو۔ میں کیوں بتاؤں کیا... خود دیکھو اور طے کرو کہ میں نے کیا دکھایا تھا... بڑی مصیبت اٹھائی ہے میں نے بھی۔"

بظاہر ونود بہت بے وقوف انسان نظر آرہا تھا، اور انتہائی جذباتی بھی۔ "تم ناامید مت ہو۔" مشرا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر سمت درست ہو تو مسافر منزل سے بھی نہیں بھٹکتے۔ کبھی نہ کبھی منزل پر پہنچ ہی جاتے ہیں۔" وہ اس کی تلخی کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"سب بکواس ہے۔" وہ پھر غصے سے بولا۔ "ایک منٹ۔" یہ کہہ کر اس نے ہماری طرف دیکھا۔ "اے مسٹر نصیحت! تم... کیا نام ہے تمہارا؟"

"مشرا۔"

"ہاں تو مسٹر مشرا... کیا وہ تمہارا کوئی رشتے دار تھا جو تم یوں پوچھ گچھ کرتے پھر رہے ہو؟" اس کا لہجہ سخت طنزیہ تھا۔

"بالکل نہیں۔" مشرا نے آرام سے جواب دیا۔ "ویسے اگر میں اس کا کوئی رشتے دار ہوتا تو تم کیا کچھ خوف محسوس کرتے؟"

"ہرگز نہیں، مجھے اس کے کسی رشتے دار سے کوئی خوف نہیں۔"

"تم کچھ کہہ رہے تھے کہ اُس کی وجہ سے تم..." مشرا نے بدستور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بات شروع کی مگر اس نے بات مکمل نہیں ہونے دی۔

"بڑی مصیبتیں سہی ہیں میں نے اس کمینے کی وجہ سے۔" اس نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے اس کی بات پوری کی۔

"یہی تو جاننا چاہتے ہیں کہ کیسے؟" مشرا نے لوہا گرم دیکھ کر بھرپور وار کیا۔

"کیا تم یہ بتانا پسند کرو گے کہ یہ چکر کیسے شروع ہوا؟" میں نے لقمہ دیا۔

ونود نے گہری نظروں سے ہم دونوں کی طرف دیکھا اور چند گہری سانسیں لیں۔ آسمان کی طرف منہ اٹھا کر تکتا رہا اور پھر ہم دونوں پر طائرانہ نظر ڈالی۔ وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال چکا تھا۔ اب امید تھی کہ کچھ کام کی بات کرے گا۔

"وہ ایک معاہدہ تھا۔" آخر اس نے اپنی بات شروع کی۔ اس بار اس کا لہجہ قدرے ٹھہرا ہوا تھا۔ "پہلے تو اس جادوگرنی نے مجھے سہانے باغ دکھائے کہ میری قسمت تو بہت روشن ہے اور پھر اس نے مجھے آمادہ کیا کہ اپنا تابناک مقدر سیموئل شائے کو فروخت کر دوں۔ اس طرح مجھے اچھی خاصی رقم مل سکتی ہے۔ انہوں نے مجھے بیس ہزار دینے کا معاہدہ کیا تھا۔ میرے لیے یہ رقم بہت بڑی تھی۔ میں دن رات کئی سال کام کرتا، تب کہیں جا کر اتنی رقم کما پاتا اور یہاں صرف ایک خیالی خرید و فروخت سے مجھے یہ رقم مل رہی تھی۔ میں تو سچ مچ پاگل ہو گیا تھا۔" یہ کہہ کر اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ "واقعی... میں تو پاگل ہی ہو گیا تھا اور اب تک ہوں۔" وہ روہانسا ہو رہا تھا۔

"پھر کیا ہوا؟" میں اسے خاموش دیکھ کر پریشان ہوا۔ ذرا اسے بولنے پر اکسانے کے لیے اس بچے کی طرح پوچھا جو پسندیدہ کہانی سن رہا ہو۔

"میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔" ایک بار پھر وہ سیدھا کھڑا ہوا اور اپنی بات شروع کی۔ "میں سارا الزام گیتا جادوگرنی پر نہیں ڈالوں گا۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے بھی اُس وقت رقم کی سخت ضرورت تھی اور جو راستہ وہ مجھے دکھا رہی تھی، اس میں میری ضرورت سے زیادہ پیسا تھا۔"

"گیتا سے کیسے معاملہ طے ہوا تھا؟" مشرا نے سوال کیا۔

"جلونٹ ریس کورس میں۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "میں گھڑ دوڑ کا جواری ہوں۔ ہر روز گھوڑوں کی دوڑ پر جوا کھیلتا ہوں۔ وہ بھی وہیں آتی تھی۔ وہیں یہ معاملہ چلا۔" وہ اپنی دھن میں مگن کہے جا رہا تھا اور ہم دونوں پوری توجہ سے اس کی بات سن رہے تھے۔

"میں ہر روز ہارتا تھا اور دوسرے دن پھر کھیلتا جیتنے کی امید پر مگر قسمت کبھی کبھار ہی ساتھ دیتی تھی۔" یہ کہہ کر وہ دم لینے کو رکا۔ "تو جب گیتا نے کہا کہ میرا مقدر تو بہت اچھا ہے، تب میں اس کی بے وقوفی پر دل ہی دل میں ہنسا اور جب اس نے مقدر فروخت کرنے کی بات کی، تب وہ مجھے کھسکی ہوئی لگی۔ مجھے جوئے میں ہاری گئی رقم کا قرض چکانا تھا۔ میں نے اس کی پیشکش کو غنیمت جانا اور رقم پکڑ لی۔ مجھے لگا کہ مقدر کے ساتھ قرض داروں سے بھی جان چھوٹ گئی اور جو رقم بچ گی، وہ ریس پر لگاؤں گا۔ ممکن ہے بدبخت مقدر ہی میری شکست کا ذمے دار ہو۔ بس! پھر کیا تھا، میں نے رقم پکڑ لی۔"

"مسٹر ونود... ارے او مسٹر ونود..."

ہم باتوں میں محو تھے کہ کسی عورت نے اسے پکارا۔ ہم تینوں کی نظریں بیک وقت اس جانب اٹھیں۔ سڑک پار بنے گھروں کی قطار میں سے ایک گھر کے دروازے پر بوڑھی عورت کھڑی اس کی طرف ہاتھ ہلا رہی تھی۔

"ابھی لایا، میں ذرا ان لوگوں سے کچھ بات کر رہا تھا۔"

"تم ہر روز ہی لیٹ ہو جاتے ہو۔" بڑھیا چلائی۔

"مگر پھر بھی مجھ سے ہی دودھ لیتی ہو۔" اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا اور ہماری طرف دیکھا۔ "اس پارسی بڑھیا کو ہماری کمپنی کا دودھ بہت پسند ہے۔ آپ لوگ ذرا ایک منٹ انتظار کریں، میں اسے دودھ پہنچا کر آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ ٹرک سے دودھ کی بوتلیں نکالنے لگا۔

دو منٹ بعد ونود پھر ہمارے سامنے کھڑا تھا۔ "ہاں تو کیا کہہ رہا تھا میں؟" اس نے کنپٹی کو انگلی سے دباتے ہوئے کہا۔

"مقدر کی فروخت اور رقم پکڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔" میں نے یاد دلایا۔

"ٹھیک کہا تم نے۔" اس نے میری طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ "جب مجھے چیک ملا تو سمجھا کہ اب سارے دلدر دور ہو گئے۔ زندگی میں پہلی بار اتنی بڑی رقم ملی تھی۔ خوشی کے مارے پاؤں زمین پر ٹکتے ہی نہ تھے مگر پھر بہت جلد ساری خوشی غارت ہو گئی۔ مصیبتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔"

"تو کیا رقم چوری ہو گئی؟" مشرا نے بات کاٹی۔

"نہیں مگر راس بھی نہیں آئی۔" اس نے بات شروع کی۔ "میں نے سب سے پہلے اپنا قرض ادا کیا، اس کے باوجود اچھی خاصی رقم بچ گئی تھی مگر بہت جلد..."

"بہت جلد..." مشرا نے ایک بار پھر قطع کلامی کی۔ "بہت جلد آخر ایسا کیا ہوا جو تم رقم ملنے کے باوجود مسائل سے چھٹکارا نہ پا سکے؟"

"میں نے گھڑ دوڑ میں دو تین ایسی شرطیں لگائیں کہ بس سمجھو لٹ گیا۔ کچھ نہ بچا میرے پلے۔" وہ ایک بار پھر روہانسا ہو رہا تھا۔ "میں نے پُرامید نامی گھوڑے پر شرطیں لگائیں اور ہمیشہ کے لیے ناامید ہو گیا۔ وہ جادوگرنی تو میری زندگی کا نہایت ڈراؤنا سپنا ثابت ہوئی ہے۔"

"تمہیں آج اس سودے پر افسوس ہے؟" میں نے استفساریہ لہجے کہا۔

ونود نے اثبات میں سر ہلایا۔ "بالکل ہے اور جب تک زندہ ہوں تب تک رہے گا۔" مقدر بیچنے کے چند ہفتوں کے اندر ہی اندر مجھے احساس ہو گیا تھا کہ اپنی زندگی کی سب سے

بڑی غلطی کر بیٹھا ہوں۔ میں اپنا مقدر واپس حاصل کرنا چاہتا تھا۔"

"تو اس کے لیے تم نے کیا کیا؟" مشرا نے بات کاٹ کر پوچھا۔

"میں نے اس حوالے سے کئی بار گیتا سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ تو بات کرنے کو ہی تیار نہیں۔ اس نے بڑی رکھائی سے کہہ دیا کہ وہ سودا تھا... طے ہوا، رقم دی اور بات ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم۔ اب جو کچھ ہوگا یا ہو چکا، اس کے ذمے دار صرف تم خود ہو، کوئی اور نہیں۔ حالانکہ میں نے اسے پیشکش بھی کی تھی کہ جو رقم لی تھی، اس سے زیادہ دینے کو تیار ہوں۔"

"مگر تم دیتے کہاں سے؟" میں نے کہا۔

"کر لیتا کچھ نہ کچھ۔" اس نے کہا۔ "میرا مقدر میری زندگی تھا، میں اپنی زندگی واپس لینے کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ کہیں سے بھی رقم کا بندوبست کر لیتا مگر وہ حرافہ تو مان ہی نہیں رہی تھی۔"

"تو اس کے بعد تم نے کیا کیا؟" مشرا نے دریافت کیا۔

"میرے پاس ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ گیتا کو چھوڑ کر خود براہِ راست ہیسوکل سے بات کروں۔" اس نے کہا۔ "اور میں نے ایسا ہی کیا۔ کئی روز تعاقب کے بعد آخر میں نے اسے اس وقت پکڑ لیا جب وہ تاج ہوٹل سے باہر نکل رہا تھا۔ میں نے اسے اپنی ساری بپتا سنائی اور درخواست کی کہ میرا مقدر لوٹا دو اور اپنی رقم لے لو مگر وہ تو گیتا دیوی سے بھی بڑا کمینہ نکلا۔"

"کیا جواب دیا تھا اس نے؟" میں نے پوچھا۔

"کہنے لگا دفع ہو جاؤ۔ میں تم جیسے لوگوں کی بک بک سنتے سنتے تھک چکا ہوں۔ تم گھوڑوں پر شرط لگا کر لٹے یا کسی اور طرح... میں ہرگز ہرگز تمہارے فعل کا ذمے دار نہیں ہوں۔"

"بڑا بددماغ اور مغرور تھا وہ۔" میں نے یہ سن کر زیرِ لب کہا۔

"کیا اس کے یہی الفاظ تھے؟" مشرا نے چونک کر کہا۔

"ہاں... اسی طرح کی بات کی تھی۔ اب میں حرف بہ حرف تو بتا نہیں سکتا البتہ بات یہی کہی تھی۔"

"اس کے بعد...؟" مشرا نے سوال کیا۔

"وہی مصیبتیں جو گھٹنے کے بجائے بڑھتی جا رہی تھیں۔ اسی طرح کچھ دن گزرے کہ میں نے اخبار میں پڑھا کہ ہیسوکل سیڑھیوں سے گر کر اپنی گردن تڑوا بیٹھا اور فوراً ہی مر گیا۔" دنو دو لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا اور پھر کہنے لگا۔ "اب تو اس کی موت کے بعد رہی سہی امید بھی ختم ہو گئی ہے۔"

"کیسی امید؟" میں نے چونک کر کہا۔

"اپنا مقدر واپس حاصل کرنے کی۔" اس کے لہجے سے بے بسی ظاہر تھی۔

"اوہ... اب میں سمجھا۔" میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

"تم نے جو سودا کیا تھا، اس تناظر میں مسٹر ہیسوکل کی بے وقت موت کو کس طرح دیکھتے ہو؟" مشرا نے نہایت سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" یہ سنتے ہی وہ چونک پڑا۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ اس نے تم سے تمہارے مقدر کا سودا کیا اور چند ہفتوں کے اندر ہی اندر مر گیا۔" مشرا نے نرم لہجے میں سمجھانے والے انداز میں کہنا شروع کیا۔ "کبھی تم نے سوچا کہ اس کے مقدر میں اتنی جلدی موت نہیں تھی۔ ممکن ہے کہ یہ موت تمہارے مقدر کی وجہ سے اسے آئی ہو۔ اگر تم اپنا مقدر فروخت نہ کرتے تو شاید یہ بے وقت موت تمہاری ہوتی۔"

"تم شاید ٹھیک کہہ رہے ہو۔" دنو دو نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ایک دو بار میں نے بھی اس پر سوچا۔ ویسے تو یہ بات مجھے احمقانہ لگی۔ ممکن ہے کہ موت اس کے اپنے ہی مقدر کی لکھی ہو مگر پھر بھی..." اس نے لمحہ بھر کا توقف کیا۔ "بات میری ہو یا اس کے مقدر کی، جب ثبوت نہ ہو تو پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ میرے مقدر کی لکھی موت بھی ہو سکتی تھی۔" اس نے پہلی بار منطقی انداز میں کسی بات کا جواب دیا تھا۔

ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ مشرا کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک تھی۔

"آپ دونوں سے میری ایک درخواست ہے..." دنو دو نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"کہو..." مشرا نے جواب دیا۔

"اگر گیتا دیوی سے تمہاری ملاقات ہو تو اس حرافہ سے کہنا کہ تمہارا سوداگر تو مر گیا۔ اب اگر وہ میرا مقدر مجھے واپس دلا سکے تو میں اسے بھاری رقم دینے کو تیار ہوں۔"

"کوشش کریں گے کہ اس تک تمہارا پیغام پہنچا دیں۔" مشرا نے اسے تسلی دلا دیا۔ میں نے بھی تائید میں سر ہلا دیا۔

"مجھے اپنا مقدر ہر حال میں واپس چاہیے۔" اس نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب میں جان چکا ہوں کہ میری زندگی کے لیے میرے مقدر کی کیا اہمیت ہے۔"

"ارے مسٹر دنو دو..." ایک زوردار آواز سنائی دی۔ "تم دودھ کیوں نہیں لا رہے؟"

"دیکھا... تم لوگوں نے میرے کام کا کتنا حرج کیا ہے۔" ایک بار پھر وہ غصے میں لگ رہا تھا۔

"معافی چاہتے ہیں؟" میں نے بظاہر شرمندہ لہجے میں کہا۔

"بھاڑ میں جاؤ..." یہ کہہ کر وہ پلٹا اور دودھ کی بوتلیں نکالنے لگا۔

میں نے مشرا کی طرف دیکھا اور آنکھ سے اشارہ کیا۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور عورت دروازے پر کھڑی ہو کر دنو دو کو چلائے اور وہ ہم پر برسے، بہتر ہے کہ ہم نکل لیں۔ میں نے دنو دو کی طرف دیکھا۔ وہ دودھ کی بوتلیں نکال کر دروازہ بند کر رہا تھا۔ اس کی پشت ہماری طرف تھی۔ ہم دونوں تیزی سے اپنی کار کی طرف لپکے اور وہاں سے کھسک لیے۔

"اس موڑ پر پہنچ جانے کے بعد ہمیں اب خود سے سوال کرنا چاہیے کہ آیا ہم کچھ جان چکے ہیں؟" دنو دو سے ملاقات کے بعد جو ہو واپس آتے ہوئے مشرا نے مجھ سے کہا۔

"سکون سے بیٹھو اور غور کرو۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ تین انسانوں کا معاملہ ہے، جنہیں ایک شخص نے اپنی دولت کے بل پر جکڑا اور اب وہ مر چکا ہے۔ ان میں سے کم از کم ایک شخص شدید ذہنی کرب میں مبتلا ہے۔" یہ کہہ کر مشرا نے میری طرف دیکھا۔ "تم نہیں سمجھتے کہ ہمیں ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر بیٹھنے کے بجائے اُن کی مدد کرنی چاہیے۔ کم از کم دنو دو تو ہے ہی قابلِ مدد۔"

"سچ پوچھو تو کم از کم دنو دو اور راجیو سے مل کر مجھے قطعی نہیں لگا کہ وہ اتنے خوش نصیب تھے کہ گیتا کی نظروں میں اُن کا مقدر کھب گیا تھا۔" میرا لہجہ طنزیہ تھا۔

"جج مت بنو۔" اس نے تنبیہ کی۔

"نہیں بنتا۔" میں نے برجستگی سے کہا تو وہ مسکرا دیا۔ "تم بتاؤ مجھے کیا بننا چاہیے؟" میں نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

"ہم اس کیس کے تمام کرداروں سے مل چکے ہیں، ان کی باتیں جان چکے ہیں۔" مشرا نے کہنا شروع کیا۔ "میرے نزدیک اس کیس کے دو اہم پہلو ہیں۔"

"معاف کیجیے... ذرا بتائیے تو سہی وہ دو پہلو کیا

ہیں؟'' میں نے قطع کلامی کی۔

''اول تو یہ کہ سیموئل کی موت کس طرح واقع ہوئی اور دوم یہ کہ کیا جو مقدر اس نے خریدے، وہ اس کے مقدر میں حلول ہو کر واقعی کام بھی کر رہے تھے۔'' اس نے سامنے دیکھتے ہوئے فلسفیانہ انداز میں بات مکمل کی۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' میں نے مشرا کی بات سن کر کہا۔ ''ایک بات ذہن نشین رکھو کہ میری خدمات تمہارے پہلے نکتے تک محدود ہیں۔ دوسرا نکتہ تم نے از خود شامل کرلیا ہے اور مجھے اس بات سے کوئی اتفاق نہیں۔''

''ٹھیک ہے... اپنی جگہ تم بالکل درست ہو۔'' مشرا نے کہا۔ ''ویسے تم نے اب تک میرے پہلے سوال کا جواب بھی نہیں دیا ہے۔''

''تفتیش تو مکمل ہو چکی، اب نتیجہ ڈھونڈنا ہے۔'' میں نے اس کی طرف گردن موڑی۔ ''یہ تمہارے سوال کا جواب ہے، غور سے سنو۔'' میں نے لمحہ بھر کا توقف کیا اور پھر کہنا شروع کیا۔ ''ہم اپنے اپنے گھر لوٹتے ہیں۔ اب تک کی ساری تفتیش اور شوبھا کی تشویش کو سامنے رکھ کر یہ جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں کہ کیا سیموئل قتل ہوا... کیا قاتل گیتا دیوی یا اُن تین لوگوں میں سے کوئی ایک ہو سکتا ہے... یا پھر یہ کہ واقعی اُس کی موت حادثاتی تھی۔''

''بہت بہتر۔'' اس نے سر ہلا کر تائید کی۔

کچھ دیر بعد میں نے مشرا کو اس کے گھر کے سامنے اتارا اور اپنے گھر چلا آیا جہاں رادھیکا اور جنو میرے منتظر تھے۔

☆☆☆

دوسرے دن میں ناشتے سے فارغ ہو کر... سیموئل کیس کے بارے میں اپنی تفتیشی رپورٹ کی نوک پلک درست کر رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ ''ہیلو...'' میں نے ریسیور اٹھا کر کہا۔

''تم کب پہنچ رہے ہو اپنی رپورٹ لے کر؟'' دوسری طرف مشرا تھا۔

''تیار تو کرلی ہے، بس... ذرا آخری نظر ڈال رہا تھا۔''

''جتنا جلد ہو سکے، پہنچ جاؤ۔''

''مگر کیوں؟''

''ہمیں اب دوسرے مرحلے پر کام کرنا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں مشرا کی بات سن کر چونک گیا۔ ''یہ دوسرا مرحلہ... مطلب کیا ہے اس بات کا؟ میرا کردار تو صرف تفتیش کی حد تک تھا، وہ کام میں کر چکا ہوں تو اب پھر یہ...'' میں نے وضاحت طلب انداز میں بات مکمل کی۔ میں سمجھ نہیں سکا کہ وہ کہنا کیا چاہ رہا تھا۔

''دوسرا مرحلہ ہے کیس کو اس کے منطقی انجام تک پہنچانے کا۔'' اس کا لہجہ پُرجوش تھا۔ ''اچھا ایسا کرو... تم مجھے ٹھیک دس بجے گھر سے پک کرو۔ ہم کہیں باہر جا کر کسی تنہائی میں بیٹھ کر کچھ باتیں کریں گے۔ یہ معاملہ عقیدے اور عقل سے بڑھ کر ہے۔''

''کیا مطلب...؟'' میں پھر چونکا۔ ''کیا تم میرے علاوہ بھی از خود تفتیش میں لگے ہوئے تھے؟'' میرے لہجے میں ناراضی کی جھلک تھی۔

''ٹھیک دس بجے... بائے۔'' مشرا نے میرے سوال کا جواب دینے کی زحمت ہی نہ کی اور فون بند کر دیا۔

میں دم بخود کھڑے کا کھڑا سوچتا رہ گیا کہ آخر مشرا کیا چاہ رہا تھا۔ میری سمجھ میں جب کچھ نہ آیا تو سر جھٹک کر ڈائننگ ٹیبل کی طرف بڑھا۔ مگ میں کیتلی سے کافی انڈیلی اور ایک گھونٹ بھر کر گھڑی کی طرف دیکھا۔ پونے نو بج رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ مجھے ساڑھے نو بجے تک گھر سے نکلنا ہوگا۔ مشرا شہر کے قلب میں رہتا تھا اور میں مضافات میں۔ اس تک پہنچنے میں مجھے آدھا گھنٹا لگ جاتا۔ ویسے بھی صبح کا وقت تھا۔ اس وقت سڑک پر ٹریفک کا رش ہوتا تھا۔

میں پہنچا تو مشرا گھر سے باہر ہی ٹہل رہا تھا۔ لپک کر اس نے دروازہ کھولا۔ ''لاؤ، ذرا اپنی رپورٹ دکھاؤ۔'' اندر بیٹھتے ہی اس نے کہا۔

میں نے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا اور لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''یہ لو۔''

اس نے جھٹ سے لفافہ اچکا اور اگلے ہی لمحے وہ دو صفحے پر مشتمل رپورٹ کو جلدی جلدی بلند آواز سے پڑھ رہا تھا۔

''تمہاری رپورٹ کہاں ہے؟'' میں نے سوال کیا۔ اصولاً میرے کہے بغیر ہی اسے اپنی رپورٹ مجھے دکھانی چاہیے تھی۔

''گیتا کی دکان پر چلو۔'' اس نے میری بات کا جواب دینے کے بجائے حکم دیا۔

''مگر تمہاری رپورٹ...'' میں نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے دبے دبے لہجے میں کہا۔

''وہ رپورٹ ہی کیا جو کیس حل نہ کرے اور اپنے منہ آپ نہ بولے۔'' اس نے شاعرانہ انداز میں کہا۔

مشرا کا جواب سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کہہ کر وہ مجھے کیا جتانا چاہ رہا تھا۔ میں نے جھلا کر گاڑی گیئر میں ڈالی اور سڑک پر آ گیا۔

''اسی رفتار سے چلتے رہو۔ دس منٹ میں ہم اس کی دکان تک پہنچ جائیں گے۔'' اس نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے جوشیلے انداز سے کہا۔

''اوکے باس!'' میرا لہجہ طنز بھرا تھا۔ سڑک خالی تھی۔ میں نے ایکسلریٹر پر پاؤں کا دباؤ تھوڑا سا بڑھایا۔ ''میرا خیال ہے کہ اس رفتار پر ہم سات منٹ میں ہی وہاں پہنچ سکتے ہیں۔''

''مزید جلدی نہ دکھاؤ۔'' وہ مسکرا کر بولا۔ ''اب رفتار بڑھائی تو ہم صرف دو منٹ میں اوپر بھی پہنچ سکتے ہیں۔''

میں ایک بار پھر جھلا کر رہ گیا۔ ایکسلریٹر پر پاؤں کا دباؤ کم ہو گیا تھا۔ تین چار دن سے مقدروں کے اس سودے کے چکر کی تفتیش نے مجھے بھی وہمی بنا دیا تھا۔

ہم نے پارکنگ میں کار کھڑی کی اور جیسے ہی باہر نکلے، فٹ پاتھ پر شوبھا دیوی ٹہلتی ہوئی مل گئی۔

ہم پر نظر پڑتے ہی وہ تیزی سے ہماری طرف بڑھی اور مشرا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''کب سے یہاں کھڑی ہوں؟'' اس کا انداز شکایتی تھا۔

''تو اندر چلی جاتیں۔'' مشرا نے مسکرا کر کہا۔

''تمہارے بنا وہاں جانے کا سوچ کر ہی مجھے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔''

''گیتا پہنچ گئی ہے کیا؟'' مشرا نے آگے بڑھتے ہوئے سوال کیا۔

''دروازہ کھلا ہے۔''

''وقت کی پکی ہے۔ ساڑھے دس بجے کا وقت لکھا ہے دکان کھلنے کا۔'' مشرا نے جواب دیا۔

''وہ تم فون پر بتا رہے تھے کہ کیس حل ہو چکا؟'' شوبھا نے چلتے چلتے گردن موڑ کر مشرا کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''مجھ سے بھی فون پر انہوں نے لگ بھگ ایسا ہی کچھ کہا تھا مگر اب تک بتایا کچھ نہیں۔'' میں نے لقمہ دیا۔

مشرا ہنس پڑا۔ ''بے صبرے مت بنو، ابھی سب کچھ پتا چل جائے گا۔''

ہم دکان کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ ''چلو... اندر چلتے ہیں۔'' مشرا نے رک کر چٹخنی کی جگہ ڈور بیل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ اگلے ہی لمحے دروازہ کھلا اور مشرا اندر داخل ہو گیا۔ ہم دونوں بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر آ گئے۔

نیم تاریک کمرے میں ہمارے داخل ہوتے ہی گیتا دیوی کی آواز گونجی۔ ''تم منحوس بڈھے... پھر آ گئے یہاں پر۔'' وہ بہت غصے میں لگ رہی تھی۔ ''اور تم کمینی اداکارہ...'' جیسے ہی شوبھا میرے پیچھے اندر داخل ہوئی، گیتا نے زور سے چلاتے ہوئے کہا۔ ''آخر تم لوگ کیا چاہتے ہو مجھ سے؟'' شوبھا نے اندر داخل ہوتے ہوئے دروازہ لاک کیا تو وہ ایک بار پھر چلائی۔ شوبھا کو کنڈی لگاتا دیکھ کر وہ خوف زدہ ہو گئی تھی۔ اس کی آواز میں لرزش تھی۔

ہم تینوں خاموشی سے اس کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔ وہ ہمیں گھور رہی تھی۔ اچانک وہ پھر غصے سے چلائی۔ ''تم منحوس بڈھے... میں جانتی تھی کہ تم ضرور پلٹو گے، کمینے انسان... تمہاری شکل پر لکھا ہے تم خباثت بھری تقدیر کے مالک ہو۔'' یہ کہہ کر وہ دھڑام سے صوفے پر ڈھے گئی۔ غصے سے اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

مشرا نے دو قدم آگے بڑھائے اور عین اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ میں اور شوبھا اور اس کے دائیں بائیں مگر دو قدم پیچھے کھڑے صورت حال کو دیکھ رہے تھے۔

''کیا تم مجھے مار ڈالنا چاہتے ہو؟'' وہ مشرا سے مخاطب تھی۔

میں نے لمحہ بھر کو سوچا۔ ہمیں دیکھ کر اس نے جس شدید ردعمل کا اظہار کیا تھا، وہ کم از کم میرے لیے تشویش کا باعث تھا۔ ایسا کچھ ضرور تھا جو وہ جان چکی تھی۔ اس کا مطلب صاف تھا کہ مشرا نے میری لاعلمی میں از خود کوئی نہ کوئی ایسا قدم ضرور اٹھایا تھا جس کی خبر اس کو تھی۔ ورنہ اس طرح کا ردعمل...

''تمہارے ضمیر پر بہت بوجھ ہے۔'' کئی منٹ کی خاموشی کے بعد پہلی بار مشرا نے زبان کھولی۔ صوفے پر نیم دراز گیتا گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے اسے دم بخود دیکھے جا رہی تھی۔ ''اپنے ضمیر کو ہلکا کر دو۔ میں اس میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔'' مشرا اس طرح گیتا سے کہہ رہا تھا جیسے سرگوشی کر رہا ہو۔

''ہاں، ہاں...'' کافی دیر کی خاموشی کے بعد وہ ایک بار پھر چلائی۔ ''میں نے مارا ہے اسے، میں نے سیموئل شاہ کی جان لی ہے۔'' اس وقت گیتا پر ہذیانی کیفیت طاری تھی۔

وہ جو کچھ کہہ گئی تھی، اسے سن کر میں اور شوبھا سخت حیران تھے۔ ہم دونوں نے کن انکھیوں سے معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کو دیکھا۔

''تم نے جو کچھ کہا، وہ بالکل درست ہے۔'' کچھ توقف کے بعد مشرا نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''میں یہ سب کچھ پہلے ہی جان گیا تھا۔''

''تو اس نے سیموئل کو قتل کیا ہے۔'' شوبھا نے میرے

کان میں سرگوشی کی۔ اس کا لہجہ افسردہ اور غیر یقینی تھا۔ ”اوہ بھگوان... میں تو تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ گیتا...“ اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑی اور انگلی کی پور سے آنکھوں کی نمی صاف کرنے لگی۔

”میں نے جو کچھ کیا، اس کے لیے میرا بھگوان مجھے معاف کرے۔“ اس بار اس کی آواز خاصی اونچی تھی۔ ”یہ سچ ہے کہ سیموئل کی جان لینے والوں میں سے ایک میں بھی ہوں مگر میں ایسا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ جو ہوا، وہ انجانے میں ہوا... غلطی سے ہوا۔“ وہ اپنے جرم کا اعتراف کر رہی تھی۔ ہم حیرانی سے اس کی بات سن رہے تھے۔ میں نے شوبھا کی طرف دیکھا۔

”میں کہتی تھی نا کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔“ اس نے میرے کان کے قریب اپنا منہ لا کر سرگوشی میں کہا۔ اس کی آواز بھرا رہی تھی۔

”مگر یہ سب کچھ کیوں ہوا... کیسے ہوا؟“ کئی منٹ کی خاموشی کے بعد کمرے میں مشرا کی بھاری سپاٹ آواز گونجی۔ ”بہتر ہوگا کہ جہاں تم جرم قبول کر رہی ہو، اس کے پس پردہ محرکات اور مقاصد بھی بیان کر دو۔“ یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر توقف کیا۔ ”اب چھپانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ بہتر ہے کہ سب کچھ سچ سچ بتا دو۔“

”جو کچھ ہوا، اگرچہ آج اس کی ذمے دار میں ہوں مگر مجھ سے زیادہ ذمے دار وہ خود تھا اپنی موت کا۔“ کمرے پر طاری سکوت گیتا کی آواز سے ٹوٹا۔ اس کی آواز دھیمی، لہجہ گمبھیر اور زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ ”دولت نے اس کا دماغ خراب کر دیا تھا۔ اگر وہ اس روز اپنی زبان پر قابو رکھتا تو شاید یہ سب کچھ نہیں ہوتا۔“

”کیا ہوا تھا اس روز؟“ مشرا نے قطع کلامی کی۔

گیتا دیوی خاموش رہی اور کافی دیر بعد بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”اس روز سیموئل نے میری بہت بے عزتی کی تھی۔“ یہ کہہ کر اس نے پرس سے رومال نکالا اور چشمے کو تھوڑا اوپر کر کے آنکھیں صاف کرنے لگی۔

”کیا کیا تھا اس نے؟“ پہلی بار میں نے کچھ کہنے کی جسارت کی۔

”کہہ رہا تھا کہ کتنی عجیب بات ہے دلی کے مضافات کی دیہاتی عورت مکئی کے کھیتوں سے نکل کر لوگوں کی تقدیر شناسی تک پہنچ گئی۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہوئی اور کچھ توقف کے بعد دوبارہ بات شروع کی۔ ”ممکن ہے کہ یہ اس کے تعریفی الفاظ ہوں مگر میرے لیے انتہائی ناقابل برداشت تھے۔ مجھ سے اس طرح کبھی کسی نے کوئی بات نہیں کی تھی۔“ اس نے گہری سانس لی۔ ”میں نے یہاں تک پہنچنے کے لیے بہت قربانیاں دی ہیں، کڑی محنت کی ہے۔ کسی کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میرے منہ پر اس طرح کی بات کہے۔“ یہ کہہ کر وہ تقریباً ایک منٹ تک خاموش رہی اور پھر کہنے لگی۔ ”خیر... مجھے لگا کہ اس کا کام ہو چکا، وہ اب خود کو خوش قسمت ترین مقدروں کا مالک سمجھ رہا ہے۔ اس لیے اس کا اندازِ بدل رہا ہے۔ وہ مجھے اب خود سے دور کرنا چاہتا ہے۔ اس وقت مجھے اس کی ذہنیت بکی کاروباری لگی۔ اس کا کام نکل چکا تھا۔ وہ مجھے دودھ میں پڑی مکھی کی طرح باہر نکالنا چاہتا تھا۔ مجھے لگا کہ جس طرح اس نے مجھ سے بات کی تھی، اس کا صاف مطلب تھا کہ میں خود ہی اس سے دور ہو جاؤں۔ وہ بچارا کمزور عقیدے کا مالک تھا اور جب سے ملا تھا، تب سے مجھے دیوی کی طرح پوجتا تھا مگر دو مقدر خرید لینے کے بعد خود کو دیوتا سمجھنے لگا تھا۔“

”دو مقدر... مگر تم نے تین لوگوں کو رقم ادا کی تھی؟“ مشرا نے کہا۔

”تب تک صرف دو مقدر خریدے تھے اسی بے میں نے ایک چال چل کر اسے اس کی اوقات یاد دلانے کا فیصلہ کیا۔“ گیتا نے بات شروع کی۔ ”میں نے چند روز پہلے اس سے کہا کہ تمہارے مقدر پر اب تک نحوست کے اثرات برقرار ہیں جنہیں دور کرنے کے لیے ایک اور مقدر درکار ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو تمہیں نئے سال کا سورج دیکھنے سے پہلے کوئی مہلک حادثہ پیش آ سکتا ہے۔“

”اور اس نے تمہاری بات مان لی؟“ مشرا نے لقمہ دیا۔

”ہاں...“

”اس کے بعد کیا ہوا؟“

”میں نے اس کے لیے ایک اور مقدر بیچنے والا ڈھونڈا اور جب سارا عمل ہو چکا تو میں اسے لے کر پائیں باغ پہنچی۔ یہاں اسے جوتا اتار کر سیڑھیوں کے قریب پلیٹ فارم پر کھڑا کیا۔ میں نے اس سے کہا کہ دونوں ہاتھ سر کے پیچھے کر کے کھڑا رہے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں نے اس سے کہا کہ ایک خاص عمل کر رہی ہوں تاکہ تمہارے مقدر پر جو نحوست کے سائے ہیں، وہ دور ہو سکیں۔ میں اسے پہلے ہی کہہ چکی تھی کہ اس کی زندگی میں ایک حادثہ ہے اور مجھے اس کے اثرات دور کرنے ہیں۔ منصوبے کے مطابق مجھے عمل کے دوران میں اسے اس طرح دھکا دینا تھا کہ وہ سیڑھیوں سے لڑھک جائے۔ اس طرح وہ یقین کر سکتا تھا کہ واقعی اس پر نحوست کے اثرات منڈلا رہے ہیں مگر اس نے...“ وہ کہتے کہتے رک گئی۔

مشرا نے ہماری طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔

”کم از کم میں اسے جان لیوا دھکا نہیں دینا چاہتی تھی۔“

”ٹھیک کہا تم نے...“ مشرا نے مداخلت کی۔ ”اس کام کے لیے تم نے ایک اور شخص کی خدمات حاصل کی تھیں۔ وہ جوان تھا، طاقتور بھی اور پھر اس نے سیموئل کو دھکا بھی پوری قوت سے دیا تھا۔“

”اسی لیے وہ جان لیوا ثابت ہوا مگر میں ایسا مذاق نہیں کرنا چاہتی تھی۔“

”کیا کہا تم نے...“ مشرا چلایا۔ ”مذاق... ایک آدمی کی جان گئی تمہاری وجہ سے اور تم اسے مذاق کہہ رہی ہو۔“ وہ بری طرح بھڑک چکا تھا۔

اسی دوران میں دروازے پر دستک ہوئی۔ شوبھا نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ ”معاف کیجیے مشرا صاحب...“

”کیا ہوا انسپکٹر راج پال...“

”اپنا ماتحر دفون آف کریں۔“ وہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔ ”پولیس نے راجیو سنگھ کو گرفتار کر لیا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”اسی بات کی معذرت کی تھی۔“ وہ مسکرایا۔ ”جب گیتا جی نے کسی تیسرے کی بات کی تو میں سمجھ گیا کہ یہ وہی ہو سکتا ہے۔ اسی لیے میں نے آپ کی ہدایت نظر انداز کی۔ دو پولیس والے یہاں کھڑے کیے اور خود اسے جا کر پکڑ لایا۔“ یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ ”اسے اندر لاؤ۔“

اگلے ہی لمحے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگائے راجیو کمرے میں داخل ہوا۔ ہمیں دیکھتے ہی اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ میں نے گیتا پر نظر ڈالی۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔

”تو یہ تھا جس نے تمہارے منصوبے سے ہٹ کر آہستہ کے بجائے پوری قوت سے اُسے دھکا دیا۔“ مشرا نے گیتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اور ہاں راجیو... اس روز تم نے حادثے میں اپنے بچ جانے کی کہانی بہت اچھی

بنائی تھی۔“

”غلطی ہو گئی تھی سر!“ وہ منمنایا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

”بعد میں سب مجرم ایسے ہی کہتے ہیں۔“ یہ کہہ کر مشرا راجیو کی طرف بڑھا۔ اس کی ٹھوڑی کو پکڑ کر چہرہ اوپر کیا اور کہنے لگا۔ ”اب یہ بتاؤ بیٹا راجیو... اس سارے خونی ڈرامے میں اپنے حصے کی کہانی تم خود بیان کرو گے یا پھر میں سناؤں؟“

”میں بتا سکتا ہوں۔“ اس نے لرزتے ہوئے کہا۔

”تو اب ان سب کو بتاؤ کہ تم نے دھکا کیسے دیا تھا؟“ مشرا نے کہا۔

”مجھے دیوی جی نے کہا تھا۔“

”وہ تو کہا تھا پر کس طرح راضی کیا؟ کیسے تم نے یہ کام کیا؟“

”جب جاپ پورا ہو گیا تو دیوی جی ہمیں پائیں باغ میں لے کر آ گئیں۔ مجھے کچھ فاصلے پر اندھیرے میں کھڑا کر دیا۔ وہ پہلے ہی مجھ سے کہہ چکی تھیں کہ جب میں کہوں تو اسے دھکا دینا۔“

”تو تم نے دھکا دیا۔“

”پوری طاقت سے۔“ اس نے تائید کی۔

”مگر کیوں؟“ مشرا نے سوال کیا۔

”دیوی جی نے کہا تھا کہ وہ نہیں چاہتیں کہ سیموئل ایسا کرے۔ وہ اس کی ضد سے مجبور ہو کر یہ کام کر رہی تھیں۔“

”تو تمہیں کیا فائدہ ملا؟“

”بیس ہزار اور مقدر بھی واپس مل گیا۔“ اس نے کہنا شروع کیا۔ ”گیتا جی نے کہا تھا کہ جاپ کے آخری لمحوں میں اگر سیموئل کی سوچ میں خلل ڈال دیا جائے تو تمہیں رقم کے ساتھ ساتھ جاپ ادھورا رہ جانے کے باعث مقدر بھی واپس مل جائے گا۔ دیوی جی کا کہنا تھا کہ اس طرح سیموئل یہ سمجھے گا کہ اسے مقدر مل گیا حالانکہ ایسا نہیں ہوتا تھا۔“

راجیو خاموش ہوا تو مشرا نے مسکرا کر ہماری طرف دیکھا۔

”بس! اب آپ رہنے دیں، معاملہ حل ہو چکا۔ اب انہیں لے جانے کی اجازت دیں۔“ انسپکٹر راج پال نے آگے بڑھ کر مشرا سے کہا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”اٹھیے گیتا دیوی...“ اس نے ہتھکڑیاں آگے کرتے ہوئے کہا۔ ”جیل میں بہت بدنصیب ملیں گے، ان

کے مقدر کا احوال بتانا فی الحال دکان بڑھانے کا وقت آ گیا ہے۔“ اس نے بازو سے پکڑ کر اسے صوفے سے اٹھایا۔

تقریباً دو منٹ بعد ہم دکان سے نکلے۔ باہر پولیس موجود تھی۔ وہ دکان کو سر بمہر کرنے لگے۔ دو پولیس والے گیتا دیوی اور راجیو کو تھامے ہوئے سامنے سڑک پر کھڑی پولیس کار کی طرف بڑھ رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ... اچھا خاصا مجمع لگ گیا تھا۔ لوگ حیرت سے دیکھ رہے۔ مجھے یقین تھا کہ ان میں سے کئی ایسے ہوں گے جو فیس دے کر اپنے خوش نصیب مقدر کی کہانی اس سے خرید چکے ہوں گے۔

☆☆☆

”تم ناقابلِ بھروسا پارٹنر ہو۔“ میں نے روکھے لہجے میں مشرا سے کہا۔ اس وقت ہم تینوں کافی شاپ میں بیٹھے تھے۔

”کیوں...؟“ شوبھا نے لقمہ دیا۔

”ہم کیس میں پارٹنر تھے مگر...“

”تمہاری ناراضی بجا ہے۔“ وہ مسکرا دیا۔

”مگر تم کیسے اس نتیجے پر پہنچے؟“ میں نے وہ سوال کیا جو مجھے پریشان کیے جا رہا تھا۔

”سوچ سوچ کر...“ وہ مسکرا دیا۔ ”ویسے یہ مشورہ بھی تم نے ہی دیا تھا۔ یاد ہے یا بھول گئے؟“

”اصل حقیقت بتاؤ۔“ میں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”تم تو جانتے ہی ہو کہ جب کوئی بات میرے ذہن میں اٹکے تو پھر میں اس پر تب تک سوچتا رہتا ہوں جب تک وہ بات صاف نہ ہو جائے۔“ اس نے کافی کا گھونٹ بھر کر باہر دیکھا۔ کافی شاپ کی شیشے کی اس دیوار کے پار ... دھند تھی اور موسلا دھار بارش شروع ہو چکی تھی۔

”ہاں تو تم کیا کہہ رہے تھے کہ...“

”کل شام جب میں اپنی اسٹڈی میں بیٹھا ... اب تک کی تفتیش کی روشنی میں تمام تر واقعات کو ترتیب دے کر رپورٹ لکھ رہا تھا، تب کئی حیران کن پہلو میرے سامنے آئے۔“

”وہ کیا تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”کئی باتیں ایسی تھیں جن کا پتا ہمیں شوبھا سے چلا اور ان سب باتوں سے ایک ہی بات واضح ہو رہی تھی کہ وہ گرا نہیں بلکہ اسے نیچے گرایا گیا تھا۔ یہی نہیں، گرانے والے کا مقصد اسے دھمکانا نہیں بلکہ جان سے مارنا تھا۔“ مشرا نے کہنا شروع کیا۔ ”اس کے پاؤں کا لنگ، سیڑھیوں کے استعمال سے کترانا، نئے سال کی تقریبات کے لیے پروگرام مرتب کرنے سے شوبھا کو روک دینا، ساتھ ہی یہ کہنا کہ کوئی ہے جو نہیں چاہتا کہ میں نئے سال کا سورج دیکھ سکوں۔ اس کا مطلب کہ اسے بھی ڈر تھا کہ کوئی اس کی جان لے سکتا ہے یا ایسا کرنے کی خواہش رکھتا ہے... یا پھر وہ شدید توہمات کا شکار ہو کر یہ سب کچھ سوچ رہا تھا۔“

میں نے اس کی بات کاٹی۔ ”ممکن ہے کہ جو آخری بات تم نے بیان کی وہ اس لیے سیموئل کے دل میں گھر کر گئی ہو کہ گیتا اسے باور کرا چکی تھی کہ اس کے اپنے مقدر پر نحوست کے سائے ہیں اور اس کی زندگی کو مستقبل قریب میں کسی مہلک حادثے کا امکان ہے۔ اس لیے اس نے باتوں باتوں میں اس نے شوبھا سے وہ بات کہہ دی ہو۔“

”تمہاری بات بھی ٹھیک ہے لیکن ہم صرف ان امکانات کی بات کر رہے ہیں جن کے ذریعے ہم قاتل اور اس کے محرکات تک پہنچے ہیں۔“ یہ کہہ کر مشرا مسکرایا۔ ”سچ کہوں تو اگر کل شام میں نے ان امکانات کو ترتیب دے کر سوچتے ہوئے نہ گزاری ہوتی تو شاید مسز سیموئل شائے کی موت حادثہ ہی رہتی۔“

”خیر... آگے کی بات بتاؤ۔“ میں نے اسے ٹوک دیا۔

”کافی دیر کی سوچ بچار کے بعد مجھے لگا کہ جو کچھ ہوا، اس میں سب سے مرکزی کردار گیتا کا تھا۔ باقی تینوں میں سے ایک اس کا مہرہ ہو سکتا ہے۔“ مشرا نے کہنا شروع کیا۔ ”لکشمی کو اس لیے اس فہرست سے خارج کیا کہ وہ مقدر کو اہمیت ہی نہیں دیتی تھی۔ ونود جذباتی تھا اور وہ تو خود اپنا مقدر واپس خریدنے کے جتن کر رہا تھا۔ لے دے کر رہ گیا راجیو... وہ مقدر بیچنے کے باوجود جتنا خوش اور مطمئن تھا، اس سے تو یہی ظاہر تھا کہ اسے کسی بات کا اطمینان ضرور تھا اور یہی بات قاتل تک پہنچنے کا سبب بنی۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا اور کافی پینے لگا۔ میں اور شوبھا بھی کافی پیتے ہوئے، سر گھما کر کھڑکی کے پار برسنے والی بارش کا نظارہ کرنے لگے۔

”تم نے پولیس کے ملوث ہونے والی بات تو پوچھی ہی نہیں۔“ مشرا نے کپ میز پر رکھتے ہوئے شاکی لہجے میں مجھ سے کہا۔

”تم خود ہی بتا دو نا؟“ میرے کچھ کہنے سے پہلے شوبھا بول اٹھی۔

”چلو... بتائے دیتا ہوں۔“ وہ مسکرایا۔ ”جب میں اس نتیجے پر پہنچا کہ سیموئل کی موت حادثہ نہیں بلکہ قتل تھا تو پھر دو ہی مجرم تھے۔ گیتا دیوی اور اس کا ساتھی...“ مشرا نے کہنا شروع کیا۔ ”اب میرے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہ تھا کہ پولیس سے رابطہ کروں۔ خوش قسمتی سے بمبئی پولیس کا کمشنر میرا شاگرد رہ چکا ہے۔ میں نے اسے فون کر کے ملنے کو کہا۔ وہ فوراً گھر چلا آیا۔ جب میں نے اسے سارا قصہ سنایا تو وہ بھی میری بات سے متفق ہوا، یوں انسپکٹر راج پال کی ڈیوٹی میرے ساتھ لگا دی گئی اور پھر تم سب کے سامنے معاملہ اپنے انجام کو پہنچا۔“ یہ کہہ کر اس نے گردن موڑی اور کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔

کافی دیر تک ہم تینوں خاموش بیٹھے رہے۔

”مجھے خوشی ہے کہ جو ہوا اچھا ہوا، کم از کم قاتل اپنے منطقی انجام کو پہنچے۔“ میں نے سکوت توڑا۔

”سیموئل اس طرح کی موت کا حق دار نہیں تھا مگر کیا کریں۔ وہ بھی تو حد سے زیادہ توہم پرست ہو چکا تھا۔“ شوبھا نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ”میں اپنے شوہر کے بعد اگر کسی مرد کی شخصیت سے متاثر ہوئی تھی تو وہ سیموئل تھا مگر...“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ ”ویسے مجھے یہ کہنے میں اب کوئی جھجک نہیں کہ اگر وہ توہم پرست نہ ہوتا اور دولت مند ہونے کے باوجود قناعت پسند رہتا تو شاید...“

”تم اس سے شادی کر لیتیں۔“ مشرا نے جملہ پورا کر دیا۔

اس نے نظریں جھکا لیں مگر شرم سے نہیں، اپنی آنکھوں میں اُمڈتے ہوئے آنسو چھپانے کے لیے۔

میں نے کھڑکی کے باہر نظر ڈالی، بارش بہت تیز ہو چکی تھی۔

”پلیز...“ میں نے اشارے سے ویٹر کو بلایا۔ ”تین کپ کافی اور... ذرا جلدی۔“

مشرا نے میری طرف دیکھا۔

”سردیوں کی بارش میں ٹھنڈ سے بچنے کے لیے خود کو احساس دلاؤ کہ موسم گرم اور خوشگوار ہے۔“ میں نے مشرا سے کہا اور مڑ کر شوبھا کی طرف دیکھا۔

میری بات سن کر اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”رگوں میں حرارت ہو تو زندہ رہنے کا لطف آتا ہے۔“ مشرا نے باری باری ہم دونوں کے چہروں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

مجھے لگا کہ وہ بھی شوبھا دیوی کا دکھ سمجھ گیا تھا اور اب اسے واپس زندگی کی طرف آنے کی ترغیب دے رہا تھا۔ ویسے بھی یہ اس کا فرض تھا۔ وہ اس کی بہت پرانی دوست جو تھی۔

”ارے سر! کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا صبح سے آپ دونوں کو۔“ اچانک کسی نے قریب آ کر اتنے زور سے کہا کہ ہم تینوں چونک گئے۔ سامنے ونود کھڑا تھا۔ ”بس سر! لگتا ہے آپ نے میرا کام کروا دیا۔“

”ہم نے گیتا دیوی کو رضامند کر لیا تھا۔“

”کل دوپہر ہی تمہارا کام کروا دیا تھا۔“ میں نے اس کی خوشی کو بھانپتے ہوئے اندھیرے میں تیر چلایا۔

”تبھی تو... کل شام ہی میں نے ریس میں چالیس ہزار جیت لیے ورنہ میرا مقدر...“

”مبارک ہو۔“ مشرا نے کہا۔

”وہ تو ٹھیک ہے مگر گیتا دیوی کا پتا نہیں چل رہا۔“

”اب کیا کام ہے تمہیں؟“ مشرا نے پوچھا۔

”انہیں بیس ہزار لوٹانے ہیں۔“ ونود نے کہا۔

”ہمیں دے دو، ہم پہنچا دیں گے۔“ مشرا نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”یہ لیں...“ اس نے جیکٹ کی جیب سے ایک پھولا ہوا بڑا سا لفافہ نکال کر اسے تھمایا۔

”ہاں ایک مشورہ دیتا ہوں۔“ مشرا نے نوٹوں والا لفافہ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”دو کام کرنا۔“

”کیسے سر!“ اس نے تابع داری سے جواب دیا۔

”ایک تو آئندہ ریس مت کھیلنا اور باقی کے بیس ہزار سنبھال کر رکھنا۔ دوسری بات یہ کہ گیتا دیوی اور مقدر بیچنے والی بات ہمیشہ کے لیے بھول جاؤ۔“

”بالکل ٹھیک...“

”تو اب تم یہاں سے نکلو۔“ مشرا کی بات سنتے ہی وہ فوراً باہر نکل گیا۔

”یہ لو شوبھا...“ انکل نے لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔ ”دس ہزار تمہارے اور باقی کے دس ہزار سے ہم تینوں گوا گھومنے چلتے ہیں۔ ذرا نوابوں کی طرح کچھ وقت گزاریں گے۔“ میں نے زور کا قہقہہ لگایا۔ ”یہ بہت اچھا ہوا، رادھیکا اور بنٹو بھی وہیں ہیں، وہ بھی ساتھ چلیں گے۔ ہم کل صبح گوا کے لیے نکل رہے ہیں۔“

”ڈن...“ شوبھا اور مشرا یک زبان بولے۔

”ڈن... ڈن... ڈنا ڈن...“ میں نے میز کو انگلیوں سے طبلے کی طرح بجاتے ہوئے کہا۔ اسی دوران میں ویٹر مزید تین گرما گرم کافی بھی لے آیا تھا۔

امجد جاوید

دھن، زن اور زمین کی تکون کا ساتھ تو ازل سے ہے... مگر اس رفاقت کے باوجود ان تینوں زاویوں میں کبھی وہ قربت نہ پنپ سکی... جو انہیں ایک دوسرے کا رفیق بنادیتی... ہم راز و ہم سبیل بنادیتی... اس تکون نے ہمیشہ دشمنی کا بیج بویا ہے... پیار و محبت... ایثار و قربانی سے دور اس دشمنی سے کسی نہ کسی جرم کی آبیاری ہی ہوتی ہے۔ فتنہ و فساد کی تکون میں الجھی ایک ایسی ہی کہانی... جس کے کردار اپنے ناآسودہ جذبوں کی تسکین کے لیے جرم کی دلدل میں دھنستے چلے گئے۔

نادیدہ منزلوں کی تلاش اور انجانے راستوں پر بھٹکنے والوں کی عبرت اثر داستان

شہر کے ماحول سے ہٹ کر مضافات میں وہ نئی پوش آبادی تھی۔ جدید طرز کے بنگلوں میں آشیانہ بھی ایک ایسا بنگلا تھا جو اپنے مکینوں کی امارت کا مظہر تھا۔ بیرونی گیٹ سے سیاہ تارکول کی سڑک پورچ سے ہوکر دوسرے آہنی گیٹ پر جاکر ختم ہوجاتی تھی۔ درمیان میں لان تھا۔ سامنے لمبی دومنزلہ عمارت تھی جس کے عقب میں بڑے بڑے سبز قطعات تھے۔ ایک جانب ٹینس کورٹ پھر لان اور اس کے آخر میں سوئمنگ پول تھا۔

اوائل فروری کی دھوپ میں سوئمنگ پول سے ملحق لان میں سمیرا افضل سفید رنگ کی نرم کرسی پر بیٹھی ہوئی انگریزی اخبار پڑھنے میں مگن تھی۔ اگرچہ وہ پینتیس سال کی تھی لیکن اس نے اپنے بالوں میں آئی ہوئی چاندی کو نہیں چھپایا تھا۔ متناسب جسم اور قبول صورت تو تھی مگر اس کے چہرے پر زخم کی ایک لکیر تھی جو دائیں آنکھ کے کونے سے تھوڑی تک تھی۔ زخم کی اس لکیر نے جہاں اس کے چہرے کے حصے کو بدنما کردیا تھا، وہاں اس کی زندگی میں آنے والی خوشیوں پر بھی لکیر پھیر دی تھی۔ پھر وقت کے ساتھ اس کے اور خوشیوں کے درمیان ایک لکیر ہی کھنچی رہی جسے وہ پار نہ کرسکی۔

سرورق کی دوسری کہانی

ان دنوں وہ یونیورسٹی سے کامرس کی تعلیم حاصل کرکے اپنے پاپا افضل علی رندھاوا کے ساتھ بزنس میں شامل ہوگئی تھی جبکہ باپ کی خواہش تھی کہ اس کی جلد از جلد شادی ہوجائے۔ اس کا ایک جاگیردار دوست اپنے بیٹے کے لیے اس کا طلب گار تھا۔ کسی بھی فیصلے کے لیے حتمی بات کرنا ابھی باقی تھی۔ انہی دنوں وہ اپنے والدین کے ساتھ اپنی آبائی زمینوں پر جارہی تھی کہ ایک ٹریکٹر کی ٹکر لگنے سے ان کی فوروہیل جیپ حادثے کا شکار ہوگئی۔ اس کا باپ تو وہیں دم توڑ گیا جبکہ ماں اسپتال میں اس دنیا کو چھوڑ گئی۔ اسے جب ہوش آیا تو دونوں کی تدفین ہوچکی تھی۔ یہ حادثہ اس کے جسم پر ہی نہیں، اس کی زندگی میں بھی زخم بھر گیا۔ وہ اور اس کا سولہ سالہ بھائی دونوں رہ گئے۔ اس کا چھوٹا بھائی ازلان علی رندھاوا لندن میں پڑھ رہا تھا۔ وہ اس حادثے کا سن کر واپس آچکا تھا۔ جس دن وہ اسپتال سے ڈسچارج ہوکر گھر واپس آئی اور پہلی بار آئینے کا سامنا کیا تو اس کا دل لہو لہو ہوگیا۔ اس کا سارا حسن اس لکیر نے ختم کرکے رکھ دیا تھا۔ تبھی اس نے کئی فیصلے کر ڈالے۔

اس کا پہلا فیصلہ یہی تھا کہ وہ زندگی بھر شادی نہیں کرے گی۔ اپنی زندگی اپنے بھائی کے لیے وقف کردے گی اور اسے اعلیٰ مقام دلائے گی۔ جب تک وہ لندن سے تعلیم مکمل نہیں کرلیتا اور واپس آکر بزنس کو سنبھالنے کے قابل نہیں ہوجاتا، اس وقت تک وہ پوری تندہی اور یکسوئی سے اپنے باپ کا بزنس سنبھالے گی۔ اپنی آبائی زمینوں کی حفاظت کرے گی۔ ازلان علی اپنے والدین کے کھوجانے پر بہت آزردہ تھا۔ سمیرا نے اسے واپس لندن بھیجنا چاہا مگر وہ نہیں گیا۔ تاہم اس نے اپنے باپ کا بزنس سنبھال لیا۔ ازلان نے زیادہ تعلیم حاصل نہ کی، بہ مشکل بی اے تک پہنچا۔ وہ خود بہ خود سیاسی میدان میں آتا چلا گیا پھر وقت کے ساتھ سمیرا نے بھی اسے سیاست ہی میں لانے کا فیصلہ کرلیا۔ پھر جب وہ بزنس کے ساتھ ساتھ سیاست کو بھی سمجھنے لگا اور ایم این اے کی نشست جیت گیا تو سمیرا نے بھی سب کچھ اسے سونپ دیا۔ وہ اپنے بھائی پر نازاں تھی کہ جس نے بہت کم وقت میں نہ صرف سب کچھ سنبھال لیا تھا بلکہ علاقے میں بھی اپنی ساکھ بنالی تھی۔ تقریباً ایک سال سے وہ اپنا سب کچھ سونپ کر تنہائی کی زندگی گزار رہی تھی اور انہی دنوں وہ اس بنگلے میں شفٹ ہوگئی تھی۔

اس دن بھی وہ معمول کے مطابق ناشتے سے فراغت کے بعد لان میں بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی جب اخبار کا صفحہ پلٹتے ہوئے اس نے ازلان کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس نے اخبار تہ کرکے میز پر رکھا اور دلچسپی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ لمبے قد، بھاری جثے اور بارعب شخصیت کا مالک تھا۔ اس وقت نیوی بلیو سوٹ میں ملبوس تھا جس کے ساتھ اس نے گہرے کلر کی ٹائی لگائی ہوئی تھی۔ وہ بڑے ادب کے ساتھ اس کے سامنے والی کرسی پر آکر بیٹھ گیا تو سمیرا نے بڑے پیار سے پوچھا۔

"خیریت تو ہے نا ازلان! آج تم آفس جانے کے بجائے میرے پاس آبیٹھے؟"

"خیریت ہی ہے آپی۔ وہ دراصل میں رات دیر سے آیا تھا، آپ سوچکی تھیں۔ میری آنکھ بھی اب دیر سے کھلی تو... خیر، مجھے آپ سے ایک بات کرنا تھی۔" وہ قدرے تذبذب سے بولا۔

"کوئی بہت ہی اہم بات ہے تو کرلو ورنہ ہم شام کے وقت کرلیں گے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"نہیں، ابھی کرنی ہے۔" اس نے تیزی سے کہا تو وہ کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے ہمہ تن گوش ہوگئی۔

"آپی! آپ کو تو معلوم ہے کہ میں حکومتی پارٹی میں اپنا اثر رسوخ رکھنے کے باعث کافی مراعات لے رہا ہوں۔ میں چند مہینوں سے ایک پراجیکٹ کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ وہی نئی انڈسٹری لگانے کے لیے جس کے بارے میں آپ کو بتایا تھا۔" اس نے کافی حد تک اعتماد سے کہا۔

"ہاں، وہ تو ٹھیک ہے لیکن تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟" اس نے اصل مدعا جاننا چاہا تو وہ بولا۔

"مجھے فارن ٹور کی آفر ہوئی ہے۔ جس میں نہ صرف چھ ملکوں کی سیر کرلوں گا بلکہ بہ آسانی نئی انڈسٹری بھی لگا سکتا ہوں۔ دو ڈھائی ماہ لگ جائیں گے تقریباً... یورپ اور چھ ایشیائی ملکوں میں جانا ہوگا۔"

"تو جاؤ، اس میں اتنا پریشان ہونے کی ضرورت کیا ہے؟"

"پریشانی یہ ہے کہ میری غیر حاضری میں آپ یہاں کے معاملات کو دیکھ لیا کریں تو میں پُرسکون ہوکر جاؤں گا ورنہ..." اس نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"تمہاری بات سمجھ میں آتی ہے لیکن ذرا سوچو ازلان... میں اگر نہ رہی تو پھر تم کیا کروگے؟" اس نے سرد لہجے میں مایوسی بھرے انداز میں کہا تو اس نے تیزی سے غصے میں کہا جیسے وہ اس کی بات سن کر تڑپ گیا ہو۔

"آپی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

"میرا مطلب ہے تم خود پر بھروسا کیوں نہیں کرتے؟ تم اگر نہیں سنبھال سکتے تو یہ سب اتنا پھیلاؤ کیوں کر رہے ہو؟ جو ہے اسے سنبھالو، زیادہ کا لالچ مت کرو۔ اور تم کیا کر رہے ہو؟ کیا تمہارے پاس ایسے بندے بھی نہیں ہیں جن پر تم اعتماد کر کے کہیں جا سکو؟ مجھے افسوس ہے اذلان! تم اب تک اپنے اردگرد ایسے بندے بھی نہیں بنا سکے ہو۔"

"آپی! میرا مطلب یہ نہیں کہ آپ بزنس کو یا زمینوں کی دیکھ بھال دوبارہ سنبھال لیں۔ صدیقی صاحب ہیں جو بزنس دیکھتے ہیں، نجیب اللہ ہے جو زمینوں کے اور یہاں کے معاملات دیکھتا ہے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ جو اتنے ڈھیر سارے ملازمین ہیں، انہیں کم از کم یہ احساس رہے کہ ان کے مالکان ان کے سر پر ہیں۔ میں جہاں بھی ہوں ان سے، آپ سے رابطہ رہوں گا۔" اس نے تفصیل سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اذلان! میں اپنی اس پُرسکون زندگی میں بہت خوش ہوں۔ اس سے نکلنا بہت مشکل تو ہوگا لیکن خیر... تم جاؤ، میں دیکھ لوں گی مگر میری ایک شرط ہے۔" اس نے اپنے لبوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔

"وہ کیا؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"یہی کہ جیسے ہی تم واپس آئے، میں تمہاری شادی کردوں گی۔ اگر تمہاری کوئی پسند ہے تو بتادو ورنہ میں اس دوران کوئی لڑکی پسند کرلوں گی۔"

"اوہ...!" یہ کہتے ہوئے وہ ہنس دیا پھر بولا۔ "ابھی تک تو میری کوئی پسند نہیں۔ یہ حق آپ کا ہے، آپ جو مرضی کریں۔" اس نے لاڈ سے کہا تو میرا اخبار اٹھاتے ہوئے بولی۔

"کب جانا ہے؟"

"کل شام کی فلائٹ ہے۔ بس آج ٹکٹ اوکے کروانا ہے۔ اب آپ صائمہ سے کہہ کر میرا سامان تیار کروا دیجیے گا۔" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گیا۔

"اوکے، کہہ دوں گی۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور پھر سے اخبار پڑھنے میں مگن ہو گئی جیسے وہ سب کچھ معمول کے مطابق ہو۔

☆☆☆

سرسبز و شاداب دیہی علاقے میں "نور نگر" ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس سے ایک کچی سڑک نکلتی تھی اور قریبی قصبے سے ملانے والی پکی سڑک سے جا ملتی تھی۔ چھوٹے سے اس گاؤں میں زندگی کی بنیادی ضرورتیں تو میسر تھیں لیکن بہت ساری ضروریات کے لیے قریبی قصبے میں جانا پڑتا تھا۔ جاتی ہوئی بہار کا رنگ و روپ ہر شے سے ظاہر ہو رہا تھا۔ اس گاؤں میں مہر دین کا کچا گھر قدرے کھلا ہوا سا تھا۔ اس کے دو ہی بچے تھے خرم اور ذکیہ۔ دونوں ہی جوان ہو چکے تھے۔ خرم جس قدر کڑیل جوان، وجیہہ اور بانکا نکلا تھا، ذکیہ بھی اسی طرح لمبی، جوان، خوب صورت اور الہڑ تھی۔ مہر دین کو اگر خرم کے لیے روزگار کی فکر کھائے جا رہی تھی تو اس کی بیوی آمنہ کو اپنی جوان بیٹی کی شادی کا غم مارے ڈال رہا تھا۔ معاشی طور پر ان کی حیثیت کچھ بھی نہیں تھی۔ مہر دین ایک معمولی مالی تھا جو زمینداروں کے فارم ہاؤس پر کام کرتا تھا۔ یہ مالکوں کی مہربانی تھی کہ انہوں نے اسے وہاں سالوں سے رکھا ہوا تھا۔ گھر میں چند مویشی تھے اور گزارہ ہو رہا تھا۔

خرم بمشکل ایف اے تک تعلیم حاصل کر سکا تھا۔ قریبی گاؤں کے ہائی اسکول سے میٹرک کر لیا تو پڑھنے کا جنون کم نہ ہوا۔ ایف اے کی پرائیویٹ تیاری کر کے امتحان دے کر پاس ہو گیا۔ شاید اس کے پڑھنے کا یہ جنون نہ ہوتا اگر اس کی بچپن کی منگیتر عائزہ سے اسے محبت نہ ہوتی۔ وہ اس کی ماموں زاد اور اکلوتی تھی جو بی اے کر لینے کے بعد استانی بن جانے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ خرم نے بہت ہاتھ پاؤں مارے کہ مزید تعلیم حاصل کرے مگر غربت نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ مہر دین اسے کام کاج کے لیے کہتا تو آمنہ اپنی بیٹی کے دکھڑے لے کر بیٹھ جاتی اور خرم اپنا سر پکڑ کر بیٹھ جاتا کہ آخر وہ کرے تو کیا کرے؟

اس دن بھی وہ اپنے دوست کے پاس جانے کے لیے گاؤں سے قصبے جانے والی کچی سڑک پر سائیکل لے کر نکل گیا۔ اس کا ایک جگری دوست فرحان تھا جو اسی سڑک کے آس پاس اپنا ریوڑ چرایا کرتا تھا۔ وہ اس سے اپنے دل کی باتیں کر کے اور ہلکا پھلکا ہو کر گاؤں واپس چلا جاتا تھا۔ وہ تیزی سے سائیکل چلاتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا۔ فرحان سڑک کے کنارے درخت کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی بولا۔

"اچھا ہوا تُو آ گیا۔ مجھے بڑی بھوک لگ رہی ہے۔ تو کچھ دیر ریوڑ کا خیال رکھ میں گھر سے کچھ کھا کر آتا ہوں۔"

"صرف کھا کر نہیں، میرے لیے بھی کچھ لے کر آنا۔" اس نے بےپروا انداز میں کہا اور سائیکل کھڑی کر دی۔

"کیوں... آج پھر؟" اس نے عام سے لہجے میں کہا۔

"ہاں... بس تُو جا اور جلدی آ۔" اس نے وہیں درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے کہا جہاں کچھ دیر پہلے فرحان بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ایک نگاہ خرم پر ڈالی اور سائیکل لے کر چل دیا۔

اس کی نگاہ ریوڑ پر تھی لیکن تنہائی پاتے ہی سوچوں نے اسے گھیر لیا۔ اس دن بھی وہ حسبِ معمول چھت پر دن چڑھے تک لیٹا رہا تھا حالانکہ وہ کب کا جاگ چکا تھا۔ بس اپنے باپ کے کام پر جانے کا منتظر تھا۔ وہ آنکھیں موندے اپنے باپ کے غصے میں بھیگے لفظوں کا زہر اپنے کانوں میں انڈیلتا رہا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"کام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا۔ دیکھا، اب تک شہزادوں کی طرح پڑا سو رہا ہے جیسے اس کا باپ کوئی مہاراجا ہو۔ میں اگر چار پیسے کما کر نہ لاؤں تو اس گھر میں فاقے ہو جائیں۔ ہر وقت سستی میں رہتا ہے۔ کوئی فکر نہیں کہ باپ کا ہاتھ بٹانے کا سوچے۔ میں بوڑھا ہو رہا ہوں، کب تک کوئی کرتا رہوں گا۔ بیگم! اگر کل کلاں کو میں آنکھیں موند لوں تو سن لو تمہارا تو بس اللہ ہی حافظ ہوگا۔ اس نامراد خرم سے کوئی امید نہ رکھنا۔ خود بھی بھوکا مرے گا اور دوسروں کو بھی مارے گا۔"

"خدا کے لیے زبان سے اچھا، اچھا بولیں۔ یہ کیا ہر وقت اسے پھٹکارتے رہتے ہیں۔ بس میری ذکیہ کسی طرح اپنے گھر کی ہو جائے تو پھر چاہے مجھے موت آ جائے۔ مجھے کسی سے کوئی غرض نہیں ہوگی۔ میں نے سوچا تھا کہ یہ پڑھ لکھ کر کہیں نوکری کرے گا۔ گھر کے حالات اچھے ہوں گے تو اس کی بہن کا کوئی رشتہ بھی آئے گا اور عزت کے ساتھ اسے گھر سے رخصت کر دوں گی۔" وہ دکھی لہجے میں بولی۔

"ہاں، یہ پڑھنے کا خوب کہا تم نے۔ نہ اب کوئی مزدوری کر سکتا ہے اور نہ کہیں نوکری پر لگ سکتا ہے۔ بےکار ہو گیا ہے یہ۔ اب تو کوئی اور ہی وسیلہ ہوگا، اس کی امید چھوڑ دو..." باپ نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا تو ماں اس سے بھی زیادہ اکتائے ہوئے انداز میں بولی۔

"اچھا تم جاؤ کام پر، کیوں اپنا خون جلاتے ہو۔ یہ روز کا رونا تو ہماری قسمت میں لکھا ہوا ہے۔ ہماری تو تقدیر ہی پھوٹ گئی۔ کس سے گلہ کریں؟"

"جاتا ہوں، جاتا ہوں۔ اپنے لاڈلے سے کہنا کسی کام دھندے کی فکر کرے ورنہ میں کسی جگہ مزدوری پر رکھوا دوں گا پھر مت رونا کہ میرا پڑھا لکھا بیٹا۔"

"روز تو کہتی ہوں پر خیر... تم جاؤ، پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔"

اور وہ آنکھیں بند کر کے سنتا رہا۔ روز کی طرح آج بھی اس نے اپنے باپ کی باتوں کو دل پر نہیں لیا تھا۔ باپ کے جانے کے بعد وہ چھت سے اترا تو ماں معمول کے مطابق بڑبڑانے لگی۔ وہ خاموشی سے نہایا دھویا، کپڑے پہنے اور عائزہ کے گھر کی طرف چل دیا۔ اسے احساس تھا کہ وہاں سے نا صرف کچھ کھانے کو مل جائے گا بلکہ چند باتیں کر کے وہ پُرسکون بھی ہو جائے گا۔ عائزہ گھر میں اکیلی ہی تھی۔ وہ دبلی پتلی، تیکھے نقوش والی حسین لڑکی تھی جس کے چہرے پر فطری معصومیت تھی۔

"ماموں تو خیر کام سے گئے ہوئے ہوں گے، ممانی کہاں ہیں؟"

"ہمسائیوں کے ہاں گئی ہیں۔" عائزہ نے کہا تو خرم چونک گیا۔ اس کا لہجہ اجنبی تھا۔ اس نے غور سے عائزہ کو دیکھا۔ وہ ہلکے کاسنی رنگ کے شلوار سوٹ کے ساتھ بڑا سا آنچل لیے کافی حد تک سنجیدہ دکھائی دے رہی تھی۔ وہ دھیمی دھیمی سی من کو لبھانے والی مسکراہٹ نہیں تھی بلکہ مایوسی کی پرچھائیاں بکھری ہوئی تھیں، جسے محسوس کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"خیریت تو ہے عائزہ! تم..."

"ہاں خرم، میں پریشان ہوں۔ جس طرح پھپھو ذکیہ کے بارے میں فکرمند رہتی ہیں نا، میرے والدین بھی اسی طرح فکرمند ہیں۔ میں نے بی اے کا امتحان دے دیا ہے اور جلد ہی استانی بھی لگ جاؤں گی لیکن تم تو کچھ بھی نہیں کرتے ہو۔ کیا مستقبل ہے تمہارا؟" وہ ٹوٹے ہوئے لہجے

جوابی تھپڑ

فلم چل رہی تھی۔ ایک جذباتی سین میں ہیرو نے ہیروئن کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا۔ وہ زمین پر گر کر رونے لگی۔

اچانک ہال میں سے ایک تیز آواز گونجی۔

"ممی! جوابی تھپڑ کیوں نہیں مارتیں جس طرح آپ مارتی ہیں؟"

آخری خواہش

تھانے دار چور سے۔ "پانچ منٹ میں تجھے آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ بتا تیری آخری خواہش کیا ہے؟"

چور۔ "آگ بجھانے والوں کو پہلے بلا لیں۔"

(حسن ابدال سے ریاض بٹ کی سوغات)

اور مایوسی بھرے انداز میں بولی۔

"دیکھو ابھی تو میں خود اپنے مستقبل کے بارے میں نہیں جانتا لیکن تم میری محبت پر بھروسا رکھو۔ میں کچھ نہ کچھ کرلوں گا۔" اس نے امید بھرے انداز میں محبت سے لبریز لہجے میں کہا تو وہ دکھی لہجے میں بولی۔

"اس میں کوئی شک نہیں ہے خرم کہ میں تم سے شدید محبت کرتی ہوں۔ تمہارے علاوہ کسی دوسرے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی کیونکہ میں نے تمہیں ہی چاہا ہے۔ بچپن سے تمہارا نام میرے نام کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ اس لیے تو میں تمہیں آنے والے کل کے بارے میں آگاہ کررہی ہوں۔ اگر میرے والدین نے اپنا فیصلہ بدل دیا تو پھر کیا کرو گے... کیا میں اپنے والدین کے خلاف بغاوت کردوں... بولو؟" اس نے جذباتی انداز میں کہا تو وہ بھنا کر بولا۔

"عائزہ! ہر بندے نے مجھے نکما، احمق اور بے وقوف سمجھا ہوا ہے۔ کیا میں نہیں چاہتا کہ میں کوئی کام کروں؟ چار پیسے کماؤں؟ ہر بندے کی باتیں سنوں اور خوامخواہ ذلیل و خوار ہوتا رہوں۔ نہیں، میں بھی کام کرنا چاہتا ہوں۔ میری بھی انا ہے مگر کرنے کو کچھ تو ملے۔"

"تمہیں کہاں کوئی معیاری کام ملے گا۔ محض ایف اے ہو، کوئی ہنر بھی تو نہیں ہے تمہارے پاس۔ کون دے گا تمہیں نوکری؟" عائزہ نے پریشانی سے کہا۔

"یہی تو میں بک رہا ہوں۔ اچھی نوکری کے لیے مجھے شہر جانا پڑے گا اور میرے والدین تو مجھے اتنا بھی سہارا نہیں دے سکتے کہ شہر میں بے روزگاری کے دن گزارنے کے لیے کوئی زادِ راہ ہی دے دیں۔ یہاں گاؤں میں تو کوئی ایسی نوکری نہیں ہے۔ مزید پڑھ نہیں سکتا میں کہ غربت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ بتاؤ... تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کروں؟" اس نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

"جو کچھ بھی کرو، اپنے بارے ہی میں نہیں میرے بارے میں بھی سوچو۔ تمہاری بے روزگاری ہی ہمارے راستے کی دیوار ہے۔ تم کمانے لگ جاؤ گے، اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاؤ گے تو میرے والدین بھی ہنسی خوشی مجھے تمہارے ساتھ بیاہ دیں گے۔ اور تم سوچ لو خرم کہ میں کسی دوسرے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔" اس نے مرتعش لہجے میں حتمی طور پر کہا تو خرم چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر انتہائی مایوس لہجے میں بولا۔

"مجھے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں کیا کروں۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ میں خودکشی کرلوں۔ مجھے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ سارے عذابوں سے جان چھوٹ جائے گی۔"

"خدا نہ کرے خرم۔" عائزہ تڑپ کر بولی۔ "تم ایسا کیوں سوچتے ہو؟ اللہ پر بھروسا کرو اور کچھ نہ کچھ کرو۔ میں استانی لگ گئی تو پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم دل چھوٹا مت کرو۔" اس نے ڈھارس دیتے ہوئے کہا۔ اس نے خرم کو ڈھارس دینے اور حوصلہ بڑھانے کے لیے بہت کچھ کہنا چاہا لیکن وہ سمجھتا تھا کہ سب دلاسے ہیں ورنہ حقیقت بہت تلخ تھی۔ معاشی فکر نے ان کی محبت کی مٹھاس میں زہر گھول دیا تھا۔ خرم کو کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس لیے وہ اٹھ کر جانے لگا تو عائزہ نے کہا۔

"تم بیٹھو تو سہی، ابھی آتی ہوں گی۔ میں تمہارے لیے چائے بناتی ہوں۔"

"نہیں، میں پھر آؤں گا۔" یہ کہتے ہوئے وہ اپنی سائیکل اٹھا کر نکل گیا۔

وہ درخت کے ساتھ ٹیک لگائے غمِ جاناں و غمِ دوراں کے تلخ حقائق سوچتا چلا جارہا تھا۔ وہ عائزہ کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ والدین کی تو روز سنتا تھا لیکن آج عائزہ نے اسے آئینہ دکھایا تو وہ خود اندر سے ٹوٹ کر کرچی کرچی ہوگیا۔ وہ جو اس کی محبت تھی، اسے پانے کے لیے درمیان میں معاشی دیوار ایستادہ تھی۔ اسے توڑنا فی الحال اس کے بس میں نہیں تھا۔ وہ کیا کرے؟ یہی اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

وہ انہی سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ اسے تیز ہارن کی آواز سنائی دی۔ قصبے والی سڑک کی جانب سے ایک فور وہیل تیزی سے آرہی تھی جبکہ کچی سڑک کے درمیان میں ایک میمنا بے نیازی سے کھڑا تھا۔ بلاشبہ اس بے زبان نے جیپ کے نیچے آکر کچل جانا تھا۔ خرم نے کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر میمنے کو بچانے کے لیے چھلانگ لگادی۔ وہ میمنے کو لیتا ہوا کچی سڑک کے دوسرے کنارے جا گرا۔ یہ سب لمحے میں ہوا۔ خرم کے ہاتھوں اور کہنی پر چوٹیں آئی تھیں اور کافی خراشیں بھی تھیں۔ اٹھتے ہوئے اس نے اپنے گھٹنے پر بھی چوٹ محسوس کی۔ وہ چوٹوں کے درد اور خراشوں کی جلن پر قابو پانے کی لاشعوری کوشش میں تھا کہ ذرا فاصلے پر جیپ گھرگھراہٹ کے ساتھ رک گئی۔ وہ لنگڑاتا ہوا اٹھ گیا۔ اتنے میں جیپ کا دروازہ کھلا اس میں سے سفید وردی میں ملبوس شوفر اترا۔ پہلے ایک خاتون نکلی پھر اس کے پیچھے کاگلز لگائے سمیرا افضل برآمد ہوئی۔ اس نے اپنے کاگلز اتارے اور حیرت سے خرم کو دیکھا

اور جیسے چونک گئی۔ پھر کتنے ہی لمحے یوں دیکھتی رہی جیسے اس کی کوئی پرانی شناسائی ہو اور وہ اسے پہچاننے کی کوشش کررہی ہو۔ تبھی اس نے خلوص اور شناسائی بھرے لہجے میں پوچھا۔

"تمہیں چوٹ تو نہیں لگی، کیا ضرورت تھی اس طرح..." وہ کہتے کہتے رک گئی جیسے کوئی سخت لفظ کہنا نہ چاہ رہی ہو اور خود کو روک لیا ہو۔ خرم نے اس کی طرف دیکھا پھر بے پروا انداز میں کہا۔

"جان بچانی ہے میڈم! وہ چاہے جانور ہی کی کیوں نہ ہو۔ آپ جائیں پلیز اور میں معذرت خواہ ہوں کہ آپ کو میری وجہ سے رکنا پڑا۔" یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر کرب کا فطری تاثر پھیل گیا۔ سمیرا چند لمحے اس کو دیکھتی رہی پھر تیزی سے پلٹ کر جیپ میں جا بیٹھی۔ شوفر بھی پلٹا اور پھر چند لمحوں میں وہ جیپ نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ خرم درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس وقت وہ نہ صرف ذہنی بلکہ جسمانی تھکن بھی محسوس کررہا تھا۔ وہ اپنی قسمت کو کوس رہا تھا کہ وہ غریب کیوں ہے۔

☆☆☆

نور نگر کے دوسرے سرے اور گاؤں سے ہٹ کر کچھ فاصلے پر سمیرا افضل اپنے فارم ہاؤس کے ایک کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اپنی آبائی زمینوں پر اس کے بھائی نے کچھ برس قبل ہی فارم ہاؤس بنوایا تھا۔ اس میں شاندار رہائش گاہ تھی۔ تقریباً سولہ ایکڑ زمین کی چار دیواری کے اندر چار ایکڑ پر دو منزلہ عمارت تعمیر تھی۔ اس سے ذرا فاصلے پر خصوصی مہمانوں کا ایک الگ بلاک تھا۔ وہ انہی کے لیے کھولا جاتا تھا جن میں وزیر، سفیر، اعلیٰ درجے کے بیوروکریٹ یا سیاست دان جو کسی نہ کسی حوالے سے اس کے لیے فائدہ مند ثابت ہو سکتے تھے۔ اس بلاک کی سجاوٹ اس لیے بڑی منفرد سی تھی۔ باہر سے جدید دکھائی دینے والی عمارت کو اندر سے ان پرانی چیزوں سے سجایا گیا تھا جو اس کے والد کے زیرِ استعمال رہی تھیں۔ قدیم اشیا کو بہت نفاست سے سجایا گیا تھا۔ سمیرا افضل اپنا زیادہ تر وقت اسی بلاک میں گزارتی تھی اور باقی سارا وقت رہائشی بلاک میں جہاں وہ اس وقت ایک کمرے میں گم صم بیٹھی ہوئی تھی۔ اس بار وہ یہی سوچ کر آئی تھی کہ چند دن پُرسکون ماحول میں گزارے گی۔ وہ اپنے ساتھ ڈھیر ساری کتابیں، میگزین اور ویڈیو فلمیں لائی تھی کہ تنہائی میں ان سے خوب لطف اندوز ہوگی لیکن یہاں آتے ہی وہ یکسر سب کچھ بھول گئی تھی۔ اسے یاد رہا تھا تو وہ لڑکا جس نے میمنے کو بچاتے ہوئے اپنی زندگی داؤ پر لگادی تھی۔ اس لڑکے نے ایک دم ہی اس کو ڈسٹرب کرکے رکھ دیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ جب سے فارم ہاؤس آئی تھی، اپنے کمرے میں بند ہو کر رہ گئی تھی اور دوسرے بلاک تک نہیں گئی تھی۔

دوپہر سے شام ہوگئی اور سورج غروب ہو کر اندھیرا پھیل گیا۔ اس دوران اس نے فقط چائے کا ایک کپ پیا تھا۔ بس وہ تھی اور اس کی سوچیں تھیں۔ وہ اپنی زندگی کے اس دور میں جا پہنچی تھی جب من میں محبت کے جذبات کونپل کی طرح پھوٹتے ہیں اور احساس کے ہر موسم کو بہار میں لپیٹ کر خوابوں کے جزیرے میں لے جاتے ہیں۔ جہاں فقط پیار ہی کے رنگ بکھرے ہوتے ہیں۔ ان لمحوں میں وہ خود کو محبت کے ایسے ہی گمنام جزیرے کا باسی محسوس کررہی تھی۔ دل تھا کہ اس کے قابو سے باہر ہوگیا تھا۔ وہ خواب جو اس نے وقت کی پٹاری میں بند کرکے رکھ دیے تھے، وہ زہریلے ناگوں کی طرح اس کے سامنے پھن پھیلائے ہوئے تھے۔ ہر لڑکی کی طرح اس کا ایک آئیڈیل تھا۔ وہ بھی اپنی پسند کے لیے شدت پسند تھی جو اسے نہیں ملا تھا۔ کچھ شبیہات مختلف لوگوں میں اسے ضرور ملی تھیں مگر یوں پوری طرح مجسم حالت میں اس کے خوابوں کا شہزادہ اس کے سامنے آجائے گا، اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس کے خوابوں کا شہزادہ اور اس لڑکے کے پہناوے میں فرق تھا۔ اس کے اندر شدت سے یہ خواہش ابھری تھی کہ کاش اس لڑکے کو ایک بار اپنی پسند کے روپ میں دیکھ لے۔ وہ حیران تھی کہ وہ ایسا کیوں سوچ رہی ہے؟ اچانک اس کے خیالوں کا ردھم ٹوٹ کر رہ گیا۔ اس کی خاص ملازمہ صائمہ اس کے سامنے کھڑی اسے پکار رہی تھی۔

"میڈم! آپ کہاں گم ہیں... کیا ہوگیا ہے آپ کو؟" اس پر سمیرا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر حواسوں میں آکر ایک لمبی سانس لے کر جو بولی تو اس کے لہجے میں حالات کی تلخی، صدیوں کی تھکن اور تمناؤں کا نوحہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔

"کیا تمہیں کبھی ایسا محسوس ہوا ہے صائمہ کہ جس ہیرے کی تمہیں تلاش ہو مگر وقت، حالات اور موسم تمہارے خلاف ہو جائیں۔ خاک چھانتے ہوئے تم تھک ہار کر جاں بلب ہو کر مایوسی کی چادر اوڑھے وقت کے تپتے صحرا میں بس موت کے انتظار میں بیٹھ جاؤ۔ حالات کا دھارا تمہیں بے بس کرکے اس مقام تک لے آئے جہاں واپسی کا راستہ بھی نہ ہو۔ تم موت کی جانب بڑھ رہی ہو، موسم کی شدت میں گدھ تمہاری موت کا انتظار کررہے ہوں اور ایسے

میں تمہیں اچانک وہ مطلوبہ ہیرا مل جائے تو پھر تم کیا کرو گی؟'' صائمہ چونک گئی۔ اس کے سامنے... تو تمیرا الجھن تھی۔ اس لیے حیرت زدہ نگاہوں سے چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر گھٹنوں کے بل اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''میڈم، آپ وہ نہیں جو شہر سے میرے ساتھ آئی تھیں۔ یہاں تک آتے ہوئے آپ کو کیا ہوگیا ہے؟ پلیز مجھے بتائیں۔ آپ کا لہجہ...''

''آج میں ہاری ہوں اپنے آپ سے۔'' سمیرا نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ ''وہ خوش کن خیال جو میرے اندر موجود تھا، جس کے سہارے میں جی رہی تھی، اپنے خواب بنتی تھی اور ان خوابوں میں اپنی مرضی کی زندگی جی رہی تھی۔ وہ آج چھن گیا مجھ سے۔ صائمہ! تم بتاؤ، کیا خوابوں کی تعبیر اس قدر بھیانک ہوتی ہے؟''

''میڈم پلیز! مجھے بتائیں آپ کو ہو کیا گیا ہے؟'' وہ لجاجت سے بولی تو سمیرا کی آنکھوں میں ستارے چمک اٹھے، وہ آہستگی سے بولی۔

''وہ لڑکا... جس نے میمنے کو بچایا تھا۔ وہ... تم ایک لڑکی ہو صائمہ۔ تم سمجھ سکتی ہو کہ ہر لڑکی خواب دیکھتی ہے اور اس کے خوابوں کا ایک شہزادہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے شہزادے کی شکل و شبیہات، وجاہت، انداز سب کچھ اپنی مرضی کا بناتی ہے مگر اسے کبھی یہ یقین نہیں ہوتا کہ وہ اس دنیا میں کہیں موجود ہوسکتا ہے۔ کسی کو یقین ہو نہ ہو، میں نے اپنے خوابوں کا شہزادہ دیکھ لیا ہے۔''

''سوری میڈم، کیا اس طرح... ایک غریب لڑکا... جو...'' وہ اٹکتے ہوئے بولی۔

''نہیں صائمہ! ہیرا کیچڑ میں بھی پڑا ہو تو ہیرا ہی ہوتا۔ ہیرے کو تراشنا، سنوارنا اور اس کا جائز مقام دینا تو ہماری مرضی سے ہوتا ہے۔ کوہ نور ہیرا بھی زمین کے ساتھ مٹی میں پیوست تھا، اب کہاں ہے؟'' وہ بے حد جذباتی لہجے میں بولی تو صائمہ نے حیرت سے اس کی شدت کو محسوس کیا۔ جس پانی کے آگے... بڑا بند باندھا گیا ہو جب وہ ٹوٹتا ہے تو پانی اتنی ہی طوفانی شدت سے بہتا ہے۔ چند لمحوں کی خاموشی ہوگئی۔ تبھی صائمہ نے خوش کن لہجے میں کہا۔

''میڈم! کیا آپ اس لیے مایوس ہیں کہ اس ہیرے کو اپنی انگوٹھی میں نہیں جڑ سکتیں... کیا صرف یہی بات ہے؟''

''ہاں، وقت کو واپس نہیں لایا جاسکتا۔ ناممکن بات ہے۔ حالات تو لمحوں میں بگاڑے جاسکتے ہیں مگر بنانے میں بڑا وقت لگتا ہے۔ میں ماضی اور مستقبل کے درمیان حال میں کھڑی ہوں اور جس حال میں کھڑی ہوں۔ وہاں ذرا سی بے احتیاطی سب کچھ ڈسٹرب کرسکتی ہے۔ تمہیں شاید احساس نہیں، یہ آگ سے کھیلنے والی بات ہے۔'' سمیرا کے لہجے سے مایوسی ٹپک رہی تھی۔ تبھی وہ بولی۔

''ماضی... وہ جو بیت گیا، ہمارے ہاتھ میں نہیں۔ مستقبل ہم خود بناتے ہیں، حال کی بنیاد پر۔ یہ حال ہی ہے جس سے ہم چاہے خوشیاں کشید کرلیں یا محض حسرتیں۔''

''کیا کہنا چاہتی ہو تم؟'' سمیرا نے چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ خوش کن لہجے میں بولی۔

''دیکھیں میڈم! دولت میں بڑی کشش ہوتی ہے۔ یہی کشش اسے آپ کے قریب کرے گی۔ اسے بنائیں، سنواریں، اپنی مرضی سے تراش لیں۔ بھول جائیں کہ آپ وقت کے کس حصے میں کھڑی ہیں۔ اپنے خوابوں کو حقیقت میں بدل لیں۔ اس تعبیر کو اس قدر مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے لیں کہ وہ پھر آپ کے ہاتھوں سے نکل ہی نہ سکے۔''

''کیا ایسا ممکن ہے صائمہ؟ یہ دنیا...'' وہ حیرت آمیز لہجے میں بولی تو صائمہ نے امید افزا انداز میں کہا۔

''ہاں، کیوں ممکن نہیں۔ چند دن میں اسے آپ کے پاس لے آؤں گی پھر آپ اسے جیسا چاہیں تراش لیں۔ میں ہوں نا آپ کے ساتھ اور رہی دنیا کی بات تو اسے چھوڑیں۔ میں نے کئی بیگمات کو پالتو جانوروں کی طرح ایسے لڑکے پالتے ہوئے دیکھا ہے۔ آپ کون سا شوبز یا سیاست سے تعلق رکھتی ہیں جہاں سب کچھ منظرِ عام پر آجائے گا۔ بس ذرا سا حوصلہ چاہیے۔''

''میں انکار نہیں کر پاؤں گی صائمہ۔ شاید انکار کرنے کی مجھ میں سکت ہے ہی نہیں۔'' اس نے یاس و امید سے کہا۔

''آپ سب کچھ بھول جائیں اور فقط یہ یاد رکھیں کہ وہ آپ کے پاس آنے والا ہے۔ باہر دیکھیں، سورج ڈھل گیا ہے۔ ابھی تک آپ نے کھانا نہیں کھایا۔ یہاں کے لوگ کیا سوچیں گے، آئیں۔'' صائمہ نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا، تب اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''تم چلو، کھانا لگواؤ... میں آتی ہوں۔'' صائمہ نے اس کا ہاتھ چھوڑا اور باہر کی سمت واپس پلٹ گئی۔

☆☆☆

اگلی صبح سورج بہت چمک دار تھا۔ سمیرا کی آنکھ بہت دیر سے کھلی تھی۔ وہ رات گئے تک یونہی خیالوں کے جنگل میں بھٹکتی رہی تھی۔ وہ حیران تھی کہ سپنے پھر سے بھی رنگین

ہوسکتے ہیں۔ وہ جب بیدار ہوئی تو اس کا موڈ بہت خوشگوار تھا۔ اس دن وہ اہتمام سے تیار ہوئی تھی۔ سفید کاٹن کے سوٹ پر براؤن کڑھائی... گلے میں آنچل، نازک سفید سلیپر، کھلے گیسو۔ اس دن اس کا لپ اسٹک لگانے کو جی چاہا لیکن اس کے پاس سامانِ زیبائش نہیں تھا۔ اسے یاد آیا کہ عرصہ ہوا اس نے میک اپ کا سامان ہی نہیں خریدا تھا۔ وہ تیار ہو کر ناشتا کرکے باہر آئی تو صائمہ اس کے انتظار میں تھی۔ بلاشبہ خوابوں کی رنگینی کا اثر اس کے چہرے پر بھی تھا کہ صائمہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔ یہ مسکراہٹ پیشہ ورانہ نہیں فطری تھی۔

''صبح بخیر میڈم! میں نے آج آپ کے لیے کوریڈور میں بیٹھنے کا اہتمام کیا ہے۔ نجیب کو میں نے بلوایا ہے۔ وہ آپ کا انتظار کررہا ہے۔''

''چلو۔'' اس نے اختصار سے کہا اور اس کے ساتھ بڑھ گئی۔

کوریڈور سے باہر کا منظر بہت حسین تھا۔ ایک چھوٹی سی میز پر کتابیں اور میگزین پڑے ہوئے تھے۔ دوسری پر چائے کے نفیس برتن سجے ہوئے تھے۔ ان میزوں کے... اردگرد آرام دہ کرسیاں دھری ہوئی تھیں۔ سمیرا نے دور کھڑے نجیب کو دیکھا اور بیٹھ گئی۔ صائمہ نے چائے بنائی اور اسے دی۔ اتنے میں نجیب پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ ابھی سمیرا نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ تبھی اچانک وہ یوں چونکی جیسے کسی بھڑ نے اسے کاٹ لیا ہو۔ پیالی سے چائے تک چھلک گئی۔ سمیرا ایک ٹک دور گیٹ کی جانب دیکھے چلی جارہی تھی۔ صائمہ نے تیزی سے مڑ کر دیکھا۔ فارم ہاؤس کے ہیڈ مالی مہردین کے ساتھ وہی کل والا لڑکا سست قدموں سے ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کل کی نسبت آج اس نے کافی اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ سمیرا نے چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کی۔ وہ دونوں ان کے قریب آکر کھڑے ہوئے تھے کہ نجیب نے تیزی سے کہا۔

''مہردین! کیا بات ہے؟ کوئی کام ہے تو مجھے بتاؤ۔ ابھی جاؤ یہاں سے۔''

''میں بی بی جی سے ملنے آیا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے سلام کیا تو سمیرا نے جواب دیتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''کیا بات ہے مالی بابا؟'' یہ پوچھتے ہوئے اس نے واضح طور پر اپنے لہجے میں لرزش محسوس کی تھی کیونکہ اس کی نگاہیں خرم کے چہرے سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں۔

''بیٹی، میری زندگی کا زیادہ وقت آپ کے خاندان کی خدمت میں گزر گیا ہے۔ آپ لوگوں کے سوا ہمارے دکھ درد سننے والا کون ہے۔ میں بڑی آس اور امید لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ ایک عرض کرنا تھی آپ سے۔''

''ہاں بابا، بولو کیا بات ہے؟'' اس وقت تک وہ خود پر قابو پا چکی تھی اور خرم سے نگاہیں ہٹا کر مہردین کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے احساس ہوگیا تھا کہ نجیب اس کے پاس کھڑا ہے۔

''میرا یہ بیٹا بارھویں جماعت پاس ہے مگر کوئی کام دھندا نہیں کرتا، نہ ہی نوکری ملتی ہے اور نہ ہی مزدوری۔ آپ کے پاس اتنے ملازم ہیں، وہاں اسے بھی نوکری دے دیں۔'' مہردین نے منت بھرے انداز میں کہا تو سمیرا کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ جس کی تلاش میں وہ نکلنا چاہتی تھی، وہ خود چل کر اس کے پاس آگیا تھا اور وہ اسے جیسے چاہے رکھ سکتی تھی۔ نہ جانے کیوں وہ اپنی قسمت پر نازاں ہونے لگی۔ اسے لگا کہ یہ محض اتفاق نہیں۔ قدرت کی طرف سے اس کی ریاضتوں کا صلہ ہے۔ اس نے ترچھی نگاہوں سے خرم کو دیکھا۔ وہ بے نیاز سا، لاابالی انداز میں یوں کھڑا تھا جیسے وہ ابھی انکار سنے گا اور فوراً واپس پلٹ جائے گا۔ تبھی اس نے جی کڑا کرکے براہِ راست خرم سے پوچھا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''جی، خرم۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''کیا کام کرنا چاہتے ہو تم؟'' اس نے پوچھا۔

''جو بھی، کام تو کام ہی ہے نا جیسا بھی ہو میڈم صاحب۔'' اس کے لہجے میں اکتاہٹ تھی۔

''نہیں، میرا مطلب کوئی لکھنے پڑھنے والا کام اگر تمہیں دیا جائے تو کیا تم کرلوگے؟'' سمیرا نے جان بوجھ کر ایسا پوچھا تھا تبھی وہ اس کی توقع کے مطابق بولا۔

''آپ سکھا دیں گی تو میں کرلوں گا۔''

''گڈ۔'' یہ کہہ کر اس نے مہردین کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''دیکھو مالی بابا! یہاں فارم ہاؤس پر رہ کر کیا کرے گا یہ۔ لکھنے پڑھنے والا کام تو ہے نہیں، جو ہے اسے یہ نجیب دیکھ لیتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ سارا حساب کتاب اسی کے پاس ہوتا ہے۔ ہاں، شہر میں اس کے لیے کوئی نہ کوئی گنجائش نکالی جاسکتی ہے۔''

''بیٹی، اس نے آپ ہی کی سرپرستی میں رہنا ہے۔ یہاں کیا، شہر کیا۔'' مہردین نے انتہائی ممنونیت بھرے انداز

میں کہا تو سمیرا نے خرم سے پوچھا۔

"کیوں خرم! کیا تم شہر میں رہ لو گے؟"

"جی میڈم! اگر مجھے وہاں کام کے ساتھ ساتھ پڑھنے کا چانس مل جائے تو میں ضرور شہر ہی میں رہوں گا۔" خرم کے دل میں اچانک خواہش جاگ اٹھی تھی۔ عائزہ بی اے کر چکی تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی طرح بھی اس سے پیچھے رہ جائے۔ اس کے ساتھ ہی وہ سارے خواب ایک لمحے میں اس کی آنکھوں میں پھیل گئے جو اس نے کھلی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ اپنے مستقبل کو شاندار بنانے کی امنگ اس کے اندر انگڑائی لے کر بیدار ہوئی تھی۔ شاید وہ مزید انہی سوچوں میں رہتا کہ سمیرا نے کہا۔

"ٹھیک ہے ماما! میں آج شام کو واپس جا رہی ہوں۔ آپ اسے تیار کر کے بھیج دو۔ میرے ساتھ ہی چلا جائے گا۔ آپ بے فکر ہو جائیں، میں اسے کہیں نہ کہیں ایڈجسٹ کر لوں گی۔" یہ کہہ کر اس نے بڑی مشکل سے خرم پر سے نگاہیں ہٹائیں اور نجیب سے پوچھا۔

"تم حساب کے رجسٹر لائے ہو؟"

"نہیں جی، میں نے سوچا کہ آپ یہاں چند دن رہیں گی اور..."

"نہیں فوراً لاؤ۔ میں نے واپس جانا ہے اور باقی باتیں پھر بتانا مجھے آ کر۔" سمیرا نے سختی سے کہا تو وہ فوراً ہی پلٹ گیا تبھی مہر دین بولا۔

"بہت مہربانی ہے جی آپ کی۔ میں احسان مند ہوں جی آپ کا۔ یہ کہیں اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے تو میں سمجھوں گا کہ مجھے میری ساری زندگی کی محنت کا صلہ مل گیا آپ لوگوں سے۔ بہت مہربانی جی۔" مہر دین یوں گویا ہوا جیسے اسے کوئی خزانہ مل گیا ہو۔

"ٹھیک ہے بابا! آپ اسے بھیج دو۔" سمیرا نے اپنے سامنے کھڑے خرم کو جی بھر کے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے اپنے سامنے کھڑا کر کے چھو کے دیکھے۔ وہ یہی سوچ رہی تھی کہ وہ دونوں باپ بیٹا پلٹ کر گیٹ کی جانب چل دیے۔

"یہ تو منزل خود ہی چل کر آپ کے پاس آ گئی میڈم۔" صائمہ نے خوش کن لہجے میں کہا تو سارے جہاں کی خوشیاں لہجے میں سمیٹے سمیرا بولی۔

"ہاں، وہ کہتے ہیں نا کہ جذبے سچے ہوں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ تم واپسی کی تیاری کرو۔ تم دیکھنا، میں اس ہیرے کو کیسے تراشتی ہوں۔ میں اب یہاں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتی۔"

"ٹھیک ہے میڈم! میں تیاری کرتی ہوں لیکن ایک بات... سیانے کہتے ہیں کچے پکے سو میٹھا ہو۔ اسے پتا بھی نہ چلے اور یہ آپ کی قربت کا عادی ہو جائے۔ اسے اپنی راہ پر لانے کے لیے بہت صبر سے کام لینا ہو گا۔"

"میں سمجھتی ہوں صائمہ۔ آخر ایک طویل عرصہ ان مردوں کو سمجھتے ہوئے گزارا ہے۔ اتنی معصومیت بھری سادگی اور انا... یہ لڑکا اتنا آسان نہیں جتنا دکھائی دے رہا ہے۔ چاہے مجبوریاں ہیں اس کی مگر مخلص ہے، تم دیکھ لینا۔ خیر بس تم واپس چلنے کی تیاری کرو۔" سمیرا نے خیالوں میں ڈوبے ہوئے چونک کر کہا۔ وہ خود پر حیران تھی کہ وہ کیسے بدل گئی ہے۔ کیا محبت انسان کو اس طرح بھی اچانک بدل دیتی ہے۔ یہ اس کے لیے بڑا خوشگوار تجربہ تھا۔ صائمہ چلی گئی تو وہ آئندہ آنے والے دنوں میں کھو گئی۔

☆☆☆

خرم کو شہر آئے ایک دن اور دو راتیں گزر چکی تھیں۔ اسے یہاں ملازمین کے رہائشی کوارٹر میں جگہ دی گئی تھی جہاں فقط سونے اور سوچتے رہنے کے علاوہ کوئی کام نہیں تھا۔ کھانا اسے وقت پر مل جاتا اور وہ گاؤں کی یادوں اور اپنے خوابوں کے درمیان پنڈولم کی مانند جھول رہا تھا۔ خاص طور پر جب وہ افراتفری میں یہاں آیا تھا۔ ماں اور بہن نے بڑی خوشی کے ساتھ اسے شہر روانہ کیا تھا لیکن عائزہ بہت سوگوار تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس نے اوپری دل سے اسے شہر جانے کی اجازت دی تھی لیکن جدائی تو بہرحال جدائی ہوتی ہے۔ اس نے زخمی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے الوداع کرتے ہوئے کہا تھا۔

"دیکھو خرم! اب اگر زندگی نے تمہیں ایک اچھا موقع دے دیا ہے تو اس کا بھرپور فائدہ اٹھانا۔ میں مانتی ہوں کہ تمہیں بہت محنت کرنا پڑے گی لیکن خدا کے لیے آگے تعلیم جاری رکھنا اور اسی بل بوتے پر تم کوئی اچھی سی نوکری کرنا۔ اور یہ یاد رکھنا کہ میں تمہارا یہاں شدت سے انتظار کروں گی۔" یہ کہتے ہوئے وہ اس کے سینے سے لگ گئی تھی اور ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

"تم تو یوں کہہ رہی ہو جیسے میں پھر لوٹ کر ہی نہیں آنے والا۔ میں آتا جاتا رہوں گا۔" اس نے شکوہ بھرے انداز میں کہا اور خود سے الگ کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھا جہاں امید اور یقین کے دیے روشن تھے۔

عائزہ نے اس کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ تبھی خرم نے محسوس کیا کہ اگر وہ کچھ دیر مزید یونہی اس کے پاس رہا تو شاید اپنے ارادے میں متزلزل نہ ہو جائے۔ اس لیے جلدی سے بولا۔

"اب میں جاتا ہوں، اپنا خیال رکھنا۔"

"ہاں جاؤ۔" اس نے آنکھوں میں آنسو اور لبوں پر مسکراہٹ سجائے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ چند لمحے اس کی طرف بڑے جذباتی انداز میں دیکھتا رہا پھر ایک جھٹکے سے پلٹ گیا۔ عائزہ کی وہ تصویر اس کے آنکھوں میں ثبت ہو کر رہ گئی تھی۔ اس وقت بھی وہ ناشتا کرنے کے بعد انہی یادوں میں کھویا ہوا تھا کہ میڈم سمیرا کا بلاوا آ گیا۔

مختلف راستوں سے گزرنے کے بعد وہ رہائشی عمارت کے عقب میں سوئمنگ پول کے پاس بیٹھی سمیرا کے قریب پہنچ گیا۔ میڈم نے سرخ رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا جس پر پیلے سفید اور نارنجی رنگ کے دائرے بنے ہوئے تھے۔ مہین سا آنچل گلے میں ڈالے ہوئے وہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ خرم اس کی سانسوں کا زیر و بم واضح طور پر دیکھ چکا تھا۔ اس نے فوراً ہی اپنا دھیان بدل لیا تو سمیرا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ تبھی اس نے خوشگوار لہجے میں سامنے پڑی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آؤ خرم! بیٹھو۔ میں نے تم سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔"

"جی فرمائیں۔" وہ ہچکچاتے ہوئے بولا اور کرسی پر سمٹ کر بیٹھ گیا۔ تب وہ مسکراہٹ بھرے چہرے کے ساتھ بولی۔

"میں نے بہت سوچا کہ تمہارے لیے کون سا کام ہو مگر مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔" وہ کہتے کہتے رکی تو خرم کو اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ملازمت نہ ملی تو پھر کیا ہو گا؟ کیا واپس جانا پڑے گا؟ تبھی وہ حوصلہ کرتے ہوئے بولا۔

"میڈم! آپ نے مجھے کام سکھانے کا وعدہ کیا تھا۔ باقی آپ مجھے کوئی کام بھی دیں گی، میں وہ کر لوں گا۔ میں پڑھنا بھی تو چاہتا ہوں۔"

"میں تمہاری مجبوری جانتی ہوں۔ تمہاری بہن کی شادی ہونے والی ہے اور تمہارے گھر کے حالات... خیر، میں تمہیں واپس نہیں بھیج رہی بلکہ میں نے تمہارے لیے ایک کام سوچا ہے۔" وہ پُرسکون لہجے میں بولی۔

"کون سا میڈم؟" خرم نے تیزی سے پوچھا۔

"تم نے صائمہ کو دیکھا ہے؟ وہ جو کرتی ہے اس کا کام تم کرو گے۔" میڈم نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی دیکھا ہے مگر وہ..."

"تم اس کی فکر نہ کرو۔ اس کے لیے بہت سارے دوسرے کام ہیں لیکن پہلے تمہیں خود کو اس کا اہل بنانے کے لیے خود پر توجہ دینا ہو گی۔ میں نے تمہارے لیے ایک گائیڈ مقرر کر دیا ہے اور صائمہ تمہیں تمام اینی کیٹس اور کام سکھائے گی۔ پہننا، بولنا، رکھ رکھاؤ سب کچھ۔ تمہیں پڑھنا بھی ہے۔ خرچ کی فکر نہ کرو، تمہاری تنخواہ گھر پہنچتی رہے گی۔ آج سے تمہارا یہی کام ہے۔"

"ٹھیک ہے میڈم۔" اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا تو سمیرا قدرے گمبھیر لہجے میں بولی۔

"اور ایک بات اور... یہ جاب جو تم کرنے جا رہے ہو اس میں رازداری سب سے اہم ہوتی ہے۔ ہر معاملے کی رازداری۔"

"میں سمجھ گیا میڈم۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"اب تم جاؤ، صائمہ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ وہ تمہارے لیے شاپنگ کرنے جائے گی۔" یہ کہہ کر سمیرا نے خود پر جبر کرتے ہوئے اپنی توجہ اخبار کی طرف کر لی۔ خرم اٹھا تو خود کو خوش قسمت فرد محسوس کر رہا تھا۔ اسے لگا کہ وہ اپنی منزل پا لے گا۔

☆☆☆

مئی کی جھلسا دینے والی گرمی کو چھوڑ کر سمیرا ایبٹ آباد کے پوش علاقے میں آن ٹھہری تھی۔ وہ بہت عرصے بعد یہاں آئی تھی۔ یہ کوٹھی بھی اس کے پاپا نے بنوائی تھی اور وہ گرمیوں کا کچھ حصہ ادھر ہی گزارا کرتے تھے۔ وہ اپنے مخصوص ملازمین کو ساتھ لائی تھی اور ان میں خرم بھی تھا۔ وہ خوش تھی جس کا اظہار نہ صرف اس کے چہرے سے عیاں تھا بلکہ اس کے پہناوے تک میں تبدیلی آ گئی تھی۔ وہ سادہ لباس پہننے والی اب اچھے ملبوس میں ہر طرح کے امتزاج کا خیال رکھنے لگی تھی۔ انہیں آئے ہوئے وہ تیسری شام تھی۔ سورج مغرب میں سرنگوں ہو گیا تھا جس کے باعث بادل بھی نارنجی ہو گئے تھے۔ ایسے میں سمیرا چھت پر کھڑی تھی۔ اس نے میرون رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا جس پر سنہری کڑھائی تھی۔ اس کے قریب ہی نیلی جینز اور سفید ٹی شرٹ پہنے خرم کھڑا تھا۔ سمیرا ڈوبتے ہوئے سورج کو کچھ دیر تکتے رہنے کے بعد پلٹی اور چند لمحے تک خرم کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"ذلان آج کل ہی میں واپس آنے والا ہے۔ دوسرے لوگوں کی طرح اس کے ذہن میں بھی سوال پیدا ہوں گے کہ تم میرے ساتھ کیوں ہو؟ میں تمہیں جس قدر

اہمیت دے رہی ہوں اس سے وہ تمہاری حیثیت کا تعین کرے گا اور ممکن ہے وہ تم سے پوچھ گچھ کرے۔ میں نہیں جانتی کہ تمہارے ساتھ اس کا رویہ کیسا ہوگا۔"

"آپ جو حکم دیں، میں..." خرم نے کہنا چاہا تو وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

"وقت آنے پر میں تمہیں بتاؤں گی کہ تمہاری حیثیت اور مقام کیا ہے میری نگاہوں میں۔ اس وقت میں تم سے فقط یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اذلان کی تفتیش سے کہیں گھبرا مت جانا۔"

"جب تک آپ ہیں، میں کیوں گھبراؤں گا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ سمیرا کیا چاہتی ہے۔

"بہت بہتر... یہی اعتماد رکھنا۔ آؤ، اب کھانا کھاتے ہیں۔" سمیرا نے یوں کہا جیسے بہت بڑا بوجھ اس کے ذہن سے اتر گیا ہو۔ اس نے بھرپور نگاہوں سے خرم کو دیکھا اور چھت کے ایک کونے میں بنی سیڑھیوں کی جانب چل دی۔ خرم اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ سمیرا چند سیڑھیاں ہی اتری تھی کہ لڑکھڑا گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ گرتی، خرم نے اسے سنبھال لیا۔ جیسے کسی روئی کے گالے کو پکڑ لیا جاتا ہے۔ سمیرا کی سانسیں ایک دم سے تیز ہو گئیں۔ وہ خرم کی بانہوں میں دبی، اس کے سینے سے لگی ہوئی تھی۔ وہ خود اپنے آپ کو سنبھال نہیں پا رہی تھی۔ وہ یوں ادھ موئی ہو گئی جیسے اس پر نشہ طاری ہو گیا ہو تبھی خرم نے پوچھا۔

"آپ ٹھیک تو ہیں میڈم؟"

"آں... ہاں، میں ٹھیک ہوں۔" اس نے یوں کہا جیسے کسی کنوئیں میں سے بول رہی ہو پھر اس نے خود پر قابو پالیا اور خرم کی بانہوں سے نکل کر آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترنے لگی۔

☆☆☆

ڈنر کے فوراً بعد سمیرا چلی گئی حالانکہ پچھلے دو دن سے یہی معمول تھا کہ وہ خرم کو لے کر ٹی وی لاؤنج میں آجاتی۔ گپ شپ کے ساتھ چائے پیتی اور پھر کافی دیر بعد اپنے بیڈروم میں جاتی۔ خرم کے ذہن میں بھی نہیں تھا کہ وہ اپنے آپ سے لڑتی ہوئی بے بس ہو رہی ہے۔ اگر وہ زیادہ دیر اس کے ساتھ رہی تو برف کی طرح پگھل جائے گی۔ وہ برف جو اس نے کئی برسوں سے خود پر مسلط کی ہوئی تھی۔ وہ ٹی وی لاؤنج میں آکر ٹی وی دیکھنے لگا۔ کافی دیر گزر گئی۔ وہ چائے پی کر ٹی وی دیکھتے دیکھتے اکتا گیا تھا۔ اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ جب اچانک فائر ہوا، اس کے ساتھ ہی سمیرا کی چیخ گونج اٹھی۔ چند لمحے تو اسے یوں لگا جیسے اسے وہم ہوا ہو مگر جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ سمیرا ہی ہذیانی انداز میں چیخ رہی ہے۔ سمیرا کی آواز بیڈروم سے نہیں بلکہ پچھلے لان کی طرف سے آرہی تھی۔ فائر کی آواز نے اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ وہ چشم زدن میں کاریڈور پار کرکے اندازے کے مطابق اس جانب بڑھا۔ کچھ ہی فاصلے پر سمیرا اسے اوندھے منہ پڑی دکھائی دی۔ وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔ اس نے سمیرا کو سیدھا کیا تو خون کی چپچپاہٹ اس نے اپنے ہاتھوں پر محسوس کی۔ گولی اس کے کندھے میں لگی تھی۔ اس نے تیزی سے ٹٹول کر دیکھا۔ بس وہی ایک زخم تھا جس سے خون ابل رہا تھا۔ اس وقت تک دوسرے ملازمین بھی وہاں تک پہنچ گئے تھے۔ اس نے دیکھا کہ سمیرا بے ہوش ہو چکی ہے۔ اس نے اپنے حواس بحال رکھے۔ دونوں ہاتھوں سے اسے اٹھایا اور تیزی سے پورچ کی جانب چل دیا۔ وہاں گاڑی کھڑی تھی، تب تک صائمہ بھی وہاں پہنچ گئی تھی۔ وہ بن کہے اسے گاڑی میں لٹا کر اس کا خون روکنے کی کوشش کرنے لگی جبکہ خرم نے گاڑی اسپتال کی جانب بڑھا دی۔

☆☆☆

اسپتال... سے فراغت کے بعد سمیرا واپس جانے کے لیے بضد ہو گئی۔ جس شام وہ واپس پہنچی، اسی رات اذلان بھی وطن واپس لوٹ آیا۔ وہ آتے ہی اپنی بہن کے کمرے میں گیا اور رات گئے تک اس کے پاس رہا۔ جس وقت وہ ڈرائنگ روم میں آیا، اس کے چہرے پر ندامت، پریشانی اور غصہ پھیلا ہوا تھا۔ صائمہ اس کے سامنے تھی اور اس سے یہی سوال کیا گیا کہ یہ فائر کس نے کیا ہے اور وہ سمیرا کو نشانہ کیوں بنانا چاہتا تھا؟

"یہ تو میں ہی نہیں، کوئی بھی نہیں جانتا۔ ہم سب کا یہی خیال تھا کہ وہ اپنے بیڈروم میں چلی گئی ہیں لیکن وہ باہر لان میں چلی گئیں۔ کیوں گئیں؟ ہم یہ بھی نہیں جانتے۔" صائمہ نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

"تم سب لوگ وہاں پر کس لیے تھے؟ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ قاتلانہ حملہ کس نے کیا اور کیوں کیا؟ اس دشمن کے مقاصد کیا تھے کیونکہ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ ہمارے ہزار دوست، دشمن ہیں لیکن کبھی کسی کی جرأت نہیں ہوئی پھر یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب خرم ان کے پاس تھا۔" وہ غصے میں بولا۔

"خرم پر شک اس لیے نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اس

وقت..." صائمہ نے کہنا چاہا لیکن وہ تیزی سے بات کاٹتے ہوئے بولا۔

"نہیں مس صائمہ نہیں۔ یہ واقعہ اس وقت ہوا جب وہاں پر وہ موجود تھا اور یہ جو تبدیلی آئی ہے، خرم کے یہاں ہونے کی وجہ سے آئی ہے۔ مجھے یہ بتاؤ، یہ خرم آپی کے ساتھ کیوں ہے اور آپی اس پر اتنی نوازشات کیوں کر رہی ہیں؟"

"مجھے یقین تھا کہ آپ ایسا سوال ہی کریں گے۔ میں نے پہلے ہی سے سوچ رکھا تھا کہ آپ کو نہ صرف بتا دوں گی بلکہ اس معاملے میں آپ کو اچھی طرح سمجھا بھی دوں گی۔" صائمہ نے تحمل سے کہا تو وہ حیرت سے بولا۔

"کیا مطلب... تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"وہی جو آپ کو بتانا ضروری ہے۔ دیکھیں، سمیرا بی بی کو خرم پسند آگیا ہے اور انہوں نے اپنے طور پر یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ وہ خرم سے شادی کرلیں گی لیکن اس وقت تک نہیں جب تک خرم اس سطح پر نہیں آجاتا جہاں کسی کو بھی اس کی کم عمری کے سوا کوئی دوسرا عیب دکھائی نہ دے۔" صائمہ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ متذبذب سے بولا۔

"کیوں صائمہ، ایسا کیوں کیا انہوں نے؟ جب ان کی عمر تھی تب انہوں نے شادی کا نہ سوچا اور اب..."

"معاف کیجیے گا، آپ کا یہ سوال ہی غلط ہے۔ کیا آپ کو یہ بتایا جائے کہ انہوں نے شادی کیوں نہیں کی؟ آپ جو ساری دنیا سے بہتر جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔"

"اس عمر میں شادی؟" اس نے سرسراتے ہوئے کہا تو صائمہ جذباتی لہجے میں بولی۔

"دل پر کسی کا زور نہیں ہوتا اذلان صاحب۔ آپ ایک عورت کے جذبات شاید نہ سمجھ سکیں۔ کیا وہ بوڑھی ہو گئی ہیں؟ وہ جوان ہیں اگر انہوں نے اس عمر میں اپنی تنہائی کا مداوا کرلیا ہے، ایک شخص انہیں پسند آہی گیا ہے تو مجھ یا کسی کو ان پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

"لیکن گناہ کی زندگی..." وہ دھیرے سے کہتے ہوئے جان بوجھ کر خاموش ہو گیا۔ صائمہ نے تیزی سے کہا۔

"نہیں... اگر وہ گناہ کا راستہ اختیار کرتیں تو ان کے پاس بہت سارے ذرائع تھے۔ بڑے چور دروازے تھے لیکن انہوں نے اپنا جائز حق حاصل کرنے کا راستہ اختیار کیا ہے۔ وہ خرم کو اپنی سطح پر لانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ وہ اپنی خواہشوں سے مجبور نہیں ہوئیں کہ اپنی سطح سے گر جائیں۔"

"لیکن اس قدر نوازشات... وہ ان کے خاندان کو بہت نواز رہی ہیں۔ بے دریغ دولت لٹا رہی ہیں۔ خرم کی بہن کی شادی کے لیے، گھر پختہ کروانے کے لیے اور خرم کی ذات پر... سوال یہ ہے کہ اگر وہی احسان مندی سے انحراف کر جاتا ہے تو؟"

"تو پھر سمیرا بی بی کی قسمت۔ کیا آپ اپنی بہن کی زندگی میں خوشیاں نہیں دیکھنا چاہتے؟ جنہوں نے اپنی ساری زندگی..."

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ نہ ان کے دولت لٹانے پر نہ ان کے انتخاب پر۔ اس دولت پر آپی کا مجھ سے زیادہ حق ہے لیکن کہیں وہ اس سے بلیک میل تو نہیں ہو رہیں؟"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"اس کا ثبوت آپی پر فائر کا ہونا ہے۔ یہ واقعہ اس وقت ہوا جب خرم وہاں موجود تھا۔ خیر، میں اپنے طور پر دیکھتا ہوں کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ پتا چل گیا تو ٹھیک ورنہ میں پھر پولیس کی مدد لوں گا۔"

"کیا میڈم یہ چاہیں گی کہ اس واقعے کی تشہیر ہو؟" صائمہ نے پوچھا۔

"کچھ بھی ہے لیکن مجھے بہرحال اپنے نادیدہ دشمن تک پہنچنا ہے۔" اذلان نے کہا اور صائمہ کی مزید کوئی بات سنے بغیر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

جیسے ہی سمیرا کا زخم بھرا، اس نے کراچی جانے کا اعلان کر دیا۔ برسوں پہلے جو لکیر اس کے چہرے پر پڑ چکی تھی، وہ پلاسٹک سرجری کے ذریعے ختم کروانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس نے کراچی کے ایک مشہور ڈاکٹر سے رابطہ کر کے وقت بھی لے لیا تھا۔ اس بار سمیرا نے خرم کے سوا کسی ملازم کو بھی اپنے ساتھ نہیں لیا تھا۔ اذلان انڈسٹری کا نیا سیٹ اپ لگانے میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔ صائمہ کو اس نے جان بوجھ کر اپنے ساتھ نہیں لیا تھا۔ نہ جانے اس سے کیا خار ہو گئی تھی کہ سمیرا نے چند ہفتوں سے سرد مہری والا رویہ اپنایا ہوا تھا۔ اب اس کے تمام تر معاملات کو خرم ہی دیکھ رہا تھا پھر ایک روز وہ اور خرم کراچی پہنچے۔ ائرپورٹ پر کلفٹن والے بنگلے کے ملازمین اسے لینے کے لیے آئے تھے۔ سمیرا اسی شام ڈاکٹر سے ملی۔ اس نے ابتدائی چیک اپ کے بعد حوصلہ افزا خبر سنائی تو اس کے چہرے پر خوشی پھیل گئی۔

اس وقت سورج نارنجی ہو رہا تھا، جب سمیرا اور خرم ساحل سمندر پر چہل قدمی کر رہے تھے۔ خرم نے پہلی بار سمندر دیکھا تھا اور سمندر سے آنے والی ہواؤں کو محسوس کیا تھا۔ وہ سمندر کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا کہ سمیرا

نے خمار آلود آواز میں پوچھا۔
"خرم! اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہو؟"
"سورج سے لے کر ساحل تک آنے والی روشنی کی اس لکیر کو دیکھ رہا ہوں۔ کتنا اضطراب ہے اس میں۔" اس نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا تو وہ اسی خمار آلود آواز میں بولی۔
"تم نے پہلی بار دیکھا ہے نا؟"
"ہاں، پہلی بار۔ یہاں آکر محسوس کر رہا ہوں کہ وہ ساحل اتنے کیوں آباد ہوتے ہیں جہاں آزادی ہے۔" خرم نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولی۔
"واؤ... تم تو بہت دور کی سوچ رہے ہو۔ پتا نہیں ان ہواؤں میں خمار ہوتا ہے یا پھر سمندر کے قرب کا نشہ کہ بندہ اپنے آپ میں نہیں رہتا۔ اندر سے کچھ نہ کچھ ہونے لگتا ہے۔" اس کے یوں کہنے پر خرم چونک اٹھا۔ تبھی اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے سمیرا کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر نہ جانے کیا کیا تحریر تھا۔ ایسے میں وہ دھیرے سے بولا۔
"تو چلیں پھر... شام کا اندھیرا پھیلنے لگا ہے۔"
"ہاں چلو۔" سمیرا نے بھی ایک دم سے کہا اور وہ دونوں گاڑی کی طرف بڑھنے لگے۔ ذرا سے فاصلے پر وہ بنگلا تھا جس میں وہ رہائش پذیر تھے۔

☆☆☆

رات کے گہرے سناٹے میں ہوا تھمی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھی۔ سمیرا کب سے لان میں تنہا بیٹھی اپنی سوچوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ کاریڈور کی روشنی میں اس کا ہیولا ہی دکھائی دے رہا تھا۔ ایسے میں اچانک بجلی کڑکی اور پھر اس کے ساتھ ہی بوندا باندی شروع ہوگئی۔ حدت بھرے بدن پر ٹھنڈی ٹھنڈی بوندیں پڑیں تو اک عجب سا کیف اس پر طاری ہو گیا۔ وہ یونہی بیٹھی رہی یہاں تک کہ بوندا باندی بارش میں بدلنے لگی۔ وہ پوری طرح بھیگ گئی تھی، تبھی اسے احساس ہوا کہ کاریڈور میں خرم کھڑا اسے آوازیں دے رہا ہے۔
"میڈم پلیز آپ اندر آجائیں، آپ کی طبیعت خراب ہو سکتی ہے۔"
"نہیں بلکہ تم ادھر آؤ۔ دیکھو بارش میں کتنا مزہ آرہا ہے۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے اپنی بات پوری کی تو خرم بھی آگیا۔ تبھی وہ اپنی کرسی پر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اس کے قریب آگیا۔ یہاں تک کہ خرم کے بدن پر سے لگے اس کے پسندیدہ پرفیوم کی مہک وہ محسوس کرنے لگی تھی۔ خرم نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ وہ بولی۔
"یہ فطرت کے مناظر انسانی جذبات پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں، تم نے کبھی سوچا؟"
"بہت... کیونکہ میں گاؤں میں فطرت کے زیادہ قریب رہا ہوں۔ اس وقت مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ آپ..." خرم نے کہا تو وہ تیزی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔
"خوشی کے سوتے انسان کے اندر ہی سے پھوٹتے ہیں۔ ہمارے سماجی نظام میں کیوں اس قدر پابندیاں ہیں کہ انسان اپنے آپ میں مقید ہو کر رہ جاتا ہے؟ خیر... یہ تو ایک لمبی بحث ہے، میں تم سے ایک بات کہنا چاہ رہی ہوں۔"
"جی بولیں۔" خرم نے اپنے حواسوں پر قابو پاتے ہوئے کہا کیونکہ تنہائی، بارش، رات اور وہ بھیگے بدن اپنے اندر کی آگ میں سلگ اٹھے تھے۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔
"میرے چہرے پر سے یہ لکیر ختم ہو جائے تو تمہیں کیسا لگے گا؟"
"میڈم! آپ ہر حال میں میرے لیے محترم ہیں۔ لکیر ختم ہو گئی تو آپ کا حسن بڑھ جائے گا۔" اس نے عقیدت مندانہ انداز میں جواب دیا۔
"خرم! تم جانتے ہو کہ میں نے تمہیں اپنے قریب کیوں رکھا ہوا ہے؟ احساس ہے تمہیں؟" وہ اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولی۔
"آپ ہی بہتر بتا سکتی ہیں۔ میں تو آپ کا ملازم ہوں۔" خرم اس کے لہجے سے مزید محتاط ہوتے ہوئے بولا۔
"کیا تم اپنے آپ کو فقط ملازم ہی تصور کرتے ہو... کوئی اور احساس نہیں ابھرا تمہارے اندر؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔
"یہی کہ آپ میری محسن ہیں، آپ نے مجھے فرش سے اٹھا کر عرش..."
"نہیں، تمہارا اس سے بھی بڑھ کر مقام ہے۔ تم میرے دل کے مالک تو بن ہی گئے ہو، کیا تم میرے جسم کے مالک نہیں بننا چاہو گے؟" یہ پوچھتے ہوئے جہاں اس کا لہجہ خمار آلود تھا، وہاں اسے اپنی پوری توانائی بھی صرف کرنا پڑی تھی۔ تبھی وہ جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے بولا۔
"میڈم! میں سمجھ نہیں کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"
"خرم! تم اتنے بچے نہیں ہو کہ میری بات نہ سمجھ سکو۔ تم سمجھتے ہو کہ میں کیا کہہ رہی ہوں اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ

میرے ہو جانے کے بعد تم زندگی کے کس مقام تک جا پہنچو گے۔ اس کا تم نے تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔" سمیرا کے لہجے میں حاکمیت بھی اتر آئی تھی تو وہ تیزی سے بولا۔
"میں آپ ہی کا تو ہوں میڈم... جو حکم دیں میں حاضر ہوں۔"
"کیا تم مجھ سے شادی کرو گے؟" سمیرا نے ایک دم سے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔
"شادی... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں میڈم؟ میں آپ سے شادی نہیں کر سکتا۔ میں آپ کا ہر حکم ماننے کے لیے تیار ہوں مگر شادی تو عائزہ سے کروں گا۔ اس سے محبت کرتا ہوں اور وہ میرے بچپن کی منگیتر ہے۔" خرم کے لہجے میں بغاوت کے علاوہ احتجاج بھی جھلک رہا تھا، تبھی وہ حیرت سے بولی۔
"وہ عائزہ... تمہاری کزن... تم اس سے محبت کرتے ہو؟" یہ کہتے ہوئے وہ لمحہ بھر کو رکی پھر بڑے گمبھیر لہجے میں بولی۔ "اگر بات محبت ہی کی ہے تو میں تم سے کہیں زیادہ محبت کرتی ہوں، عشق کرتی ہوں تم سے... تم کسی اور کے نہیں ہو سکتے، تم صرف میرے ہو۔"
"کیوں نہیں ہو سکتا میڈم... میں آپ کا ملازم ہوں اور ملازمت کر رہا ہوں لیکن اپنی محبت پر کوئی سودا نہیں کر سکتا۔ معاف کیجیے گا میڈم... آپ نے بہت غلط سوچا۔ آپ میری محسن ہیں لیکن میری محبت کوئی اور ہے۔ میں آپ کے احسانات تلے دبا ہوا ہوں۔ آپ کے لیے جان دے سکتا ہوں لیکن محبت، اس پر کوئی سمجھوتا نہیں کر سکتا۔" اس نے واشگاف الفاظ میں سمیرا پر واضح کر دیا تو وہ ایک دم بھڑکتے شعلے جوالہ بن گئی۔ اس نے پوری قوت سے اپنا ہاتھ گھمایا اور ایک زوردار تھپڑ خرم کے منہ پر دے مارا۔
"اگر مجھے ایک لمحے کے لیے بھی احساس ہوتا کہ تم یوں نگاہیں پھیر جاؤ گے تو میں تمہیں کبھی خاک سے نہ اٹھاتی۔ دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔ یہ دنیا ہے ہی ظالم، کبھی محبت نہیں دے سکتی۔ جاؤ، دفع ہو جاؤ۔ مجھے تنہا چھوڑ دو۔" سمیرا نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ لمحہ بھر شعلہ بار نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر تیزی سے تقریباً بھاگتے ہوئے اندر کی جانب چلی گئی۔ خرم چہرے پر ہاتھ رکھے چند لمحے کھڑا سوچتا رہا پھر لان سے نکل کر بیرونی گیٹ پر آیا اور وہاں سے نکل کر باہر روڈ پر آگیا۔ اس نے گہری سانس لی اور اندھیرے ہی میں ایک جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

اگلے دن کی شام جب وہ کچی سڑک پر بس سے اترا تو اسے میڈم کی ملازمت چھن جانے کا کوئی افسوس نہیں تھا۔ اگرچہ اس وقت وہ خالی ہاتھ گاؤں جانے والی کچی سڑک پر چل رہا تھا لیکن اس کے اندر اعتماد کی دولت پوری طرح موجود تھی۔ اس نے اپنے خوابوں کو نئے سرے سے ترتیب دے لیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ فرحان اپنا ریوڑ لے کر جا چکا ہوگا۔ اس لیے تیز تیز قدموں سے چل رہا تھا کہ سورج غروب ہونے سے پہلے اپنے گھر پہنچ جائے۔ گھر پہنچ جانے تک اسے لوگوں کی نگاہوں میں بڑا عجیب سا تاثر ملا جیسے وہ اس سے کوئی بات کہنا چاہتے ہوں لیکن کہہ نہ پا رہے ہوں۔ اس نے اپنے گھر کی دہلیز پر قدم رکھا تو صحن میں بیٹھی اپنی ماں پر نگاہ پڑی۔ وہ انتہائی خستہ و پریشان حال دکھائی دی۔ قریب ہی اس کا باپ مہر دین سر جھکائے افسردہ حالت میں بیٹھا ہوا تھا۔ جیسے ہی ماں کی نگاہ اس پر پڑی، وہ بلبلاتی ہوئی چیخ مار کر اٹھی اور چلانے والے انداز میں بولی۔
"تو اب آیا ہے خرم... جب سارا کچھ ہی لٹ گیا ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ماں کی آہ و زاری پر اس کا دماغ گھوم کر رہ گیا۔ تبھی اس نے ایک دم سے پریشان ہوتے ہوئے بے ساختہ پوچھا۔
"کیا کہہ رہی ہو ماں... خیر تو ہے نا؟"
"خیر ہی تو نہیں ہے پتر... سب کچھ لٹ گیا۔" وہ دہائی دیتے ہوئے بولی تو خرم نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔
"اماں ذکیہ تو ٹھیک ہے نا؟ بابا بولتے کیوں نہیں، بتاؤ گے بھی؟"
"ذکیہ تو ٹھیک ہے پتر تو بیٹھ میرے پاس۔ میں تجھے بتاتا ہوں۔" مہر دین نے کہا تو وہ اس کے چہرے کو دیکھتا ہوا اس کے ساتھ ہی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ تب مہر دین گویا ہوا۔ "وہ اپنی عائزہ ہے نا... وہ اغوا ہو گئی ہے۔"
"ع... عا... کو... کیسے؟" اس نے شدید حیرت سے پوچھا۔
"رات کے پچھلے پہر کچھ لوگ آئے، انہوں نے اغوا کیا اور جاتے ہوئے بے تحاشا فائرنگ کی۔ پتا نہیں چل سکا کہ وہ کون لوگ تھے۔" مہر دین نے دھیمے سے لہجے میں بتایا۔
"ماما اور مامی، وہ کہاں تھے؟" اس نے مرتعش لہجے میں پوچھا۔
"سارے گھر ہی میں سو رہے تھے صحن میں۔ انہوں نے تیرے مامے اور مامی کو باندھا اور اسے اٹھا کر لے گئے۔" وہ مایوسی بھرے انداز میں کہہ کر خاموش ہو گیا۔ خرم

کے دماغ میں غصہ ٹھوکریں مارنے لگا۔ اسے گمان بھی نہیں تھا کہ سمیرا اس قدر گھٹیا انتقام لے گی۔ یہ خبر سننے سے پہلے تک وہ سمیرا کو معصوم، مجبور اور بے قصور خیال کرتا تھا۔ کسی کا بھی کسی پر دل آجانا ایک فطری سی بات ہے۔ وہ من پسند کے حصول کے لیے اپنی بھرپور کوشش کرتا ہے مگر اب اس کے انکار کا وہ اس طرح بدلہ لے گی، یہ اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ ایک طرف اسے جہاں سمیرا پر بے تحاشا غصہ آرہا تھا تو دوسری جانب عائزہ پر ہونے والے ظلم نے اسے ادھ موا کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ ظالم نہ جانے اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گی؟ دماغ بھی بڑے عجیب شے ہے۔ کسی بھی نامعلوم بات کے بارے میں ایسے ایسے منظر ابھارتا ہے کہ بندہ خود ہی لرز کر رہ جاتا ہے۔ وہ اٹھا اور اپنی بائیک لے کر گھر سے باہر نکل گیا۔ اس کا رخ عائزہ کے گھر کی طرف تھا۔

ممانی کی حالت بہت خستہ تھی۔ وہ تو یوں تھیں جیسے سکتے کی حالت میں ہوں۔ ان سے کچھ بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔ ماموں نے ہی اسے تفصیل بتائی۔

"ہمیں پتا ہی نہیں چلا کہ وہ لوگ کب صحن میں آگئے۔ چہروں پر ڈھاٹا باندھے وہ پانچ یا چھ افراد تھے۔ میری آنکھ عائزہ کی چیخ سے کھلی تو وہ ہم پر گنیں تانے ہوئے تھے۔ میں نے تو یہی سمجھا کہ وہ ڈاکو ہیں ڈاکا ڈالنے کے لیے آئے ہیں۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ چابیاں وغیرہ ان کے حوالے کردوں لیکن انہوں نے کوئی بات ہی نہیں سنی اور ہم سب کو باندھ دیا۔ چوکیدار کو اسی وقت پتا چل گیا تھا۔ اس نے گاؤں میں آتے ہوئے گاڑیاں دیکھ لی تھیں۔ اس نے شور مچا کر بندے تو اکٹھے کرلیے تب ان لوگوں نے بہت زیادہ فائرنگ کرنا شروع کردی۔ گاؤں کے لوگ سہم کر پیچھے ہٹ گئے۔ وہ بھی سمجھے تھے کہ مال لوٹ کر لے جا رہے ہیں۔ ان کے نکل جانے کے بعد گاؤں کے لوگ ادھر آئے۔ انہوں نے ہمیں کھولا تو پتا چلا کہ کسی شے کو ہاتھ تک نہیں لگایا گیا۔ وہ فقط عائزہ ہی کو اغوا کرنے آئے تھے اور کر کے چلے گئے۔"

تفصیل سن کر خرم کے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ اسے کراچی سے اپنے گاؤں تک پہنچنے میں پوری رات اور دن لگ گیا تھا۔ اس کا سیل فون بھی وہیں کمرے میں رہ گیا تھا۔ سمیرا کے لیے عائزہ کو اغوا کروانا بہت آسان تھا۔ وہ ایک فون کال پر سارے کام کرواسکتی تھی۔ اس کی اتنی قوت اور رسائی تو تھی۔ دماغ کے کسی کونے میں یہ خیال بھی سر ابھار رہا تھا کہ ممکن ہے یہ سمیرا نے نہ کروایا ہو۔ ماموں کا اپنا ہی کوئی معاملہ ہو۔ عائزہ کی رنجش ہو، کچھ بھی ممکن تھا۔ خرم نے اس بارے میں ماموں سے بات کی تھی مگر کوئی ایسا معاملہ یا سراغ نہیں ملا تھا کہ جس سے کسی دوسرے کے ملوث ہونے کا شک ہو۔ ماموں نے بھی نامعلوم افراد کے خلاف پرچہ درج کروا دیا تھا۔ خرم نے بہت سوچا، اسے سمیرا کے علاوہ کوئی دوسرا خیال نہیں آیا۔ تبھی اس نے ماموں سے کہا۔

"ماموں، آپ کا سیل فون کہاں ہے؟"

"یہ لو۔" انہوں نے جیب سے نکال کر دیا تو خرم فون لے کر گھر سے باہر چلا گیا۔ اس نے سمیرا کا نمبر ملایا، وہ بند تھا پھر اس نے شہر والے بنگلے کا نمبر ملایا۔ کچھ ہی دیر بعد صائمہ لائن پر تھی۔ وہ اس کی آواز پہچانتے ہوئے بولی۔

"خرم! یہ اچھا نہیں کیا تم نے۔ میڈم کا دل توڑ دیا کر انکار کر..."

"بولتی ہی رہو گی یا میری بات بھی سنو گی؟" اس نے انتہائی غصے میں کہا تو صائمہ نے حیرت سے پوچھا۔

"خرم! کیا ہوا ہے تمہیں؟"

"اب بھی مجھے کچھ نہ ہو۔ وہ جو تمہاری میڈم نے گھٹیا پن کیا ہے نا تم بھی اسے جانتی ہو۔ کہاں ہے وہ؟ میری بات کرواؤ اس سے۔ اس کا فون بند جا رہا ہے۔" اس نے اسی طرح شدید غصے میں کہا تو وہ تحمل سے بولی۔

"میڈم تو سو رہی ہیں۔ رات پچھلے پہر ہی یہاں پہنچی تھیں۔ آتے ہی انہوں نے مجھے تمہارے متعلق بتایا۔ وہ بہت غم زدہ ہیں۔ آج دوپہر تک نہیں سو پائی تھیں۔ میں خود تم سے رابطہ کرنا چاہ رہی تھی مگر تمہارا سیل فون میڈم کے پاس تھا لیکن تمہارا جارحانہ لہجہ بتا رہا ہے کہ..." یہ کہتے ہوئے اس نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا تو خرم نے جارحانہ انداز میں کہا۔

"اسے جگا کر میری بات کرواؤ ورنہ اگر میں نے شہر میں آکر بات کی تو سارا زمانہ دیکھے گا۔ اس نے جو گھٹیا حرکت کی ہے اس کا خمیازہ اسے بھگتنا پڑے گا۔"

"مجھے بتاؤ تو سہی کیا ہوا ہے، کیا کردیا میڈم نے وہ تو خود..."

"تم تو اسی کی زبان بولو گی۔ تم نے کون سا سچ بتا دینا ہے۔ تم بس اس سے میری بات کرواؤ۔" خرم نے اس کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے غصے میں کہا تو صائمہ نے سخت لہجے میں کہا۔

"خرم! تمیز سے بات کرو اور اپنی اوقات میں رہو۔ کہو کیا کہنا ہے تمہیں؟"

"تو پھر سنو، تمہاری میڈم نے گھٹیا حرکت کرتے ہوئے عائزہ کو اغوا کروایا ہے۔ اسے کہہ دو جس طرح رات

کے اندھیرے میں اسے اغوا کروایا ہے، اسی طرح آج رات ہی واپس بھجوا دے ورنہ پھر کوئی بھی سکون سے نہیں سو پائے گا، میں جان لے لوں گا۔" خرم نے وحشیانہ انداز میں کہا۔

"تم ہوش میں تو ہو خرم۔ میڈم ایسا نہیں کرسکتیں اور نہ ہی انہوں نے ایسا کیا ہے۔ تم فکر نہیں کرو، میں میڈم سے بات کرتی ہوں۔ تم خود پر قابو رکھو۔ میں تم سے دوبارہ رابطہ کرتی ہوں اور تم ادھر ادھر کوئی بات نہ کرنا۔" صائمہ نے کہہ کر فون بند کردیا۔ خرم نے کال منقطع ہو جانے پر صائمہ کی بات پر غور کیا تو اسے یقین ہوگیا کہ عائزہ کے اغوا میں سمیرا ہی کا ہاتھ ہے ورنہ وہ اتنے یقین سے بات نہ کرتی۔

خرم نے سیل فون اپنے ماموں کو واپس کیا اور سوچنے لگا کہ زخمی شیرنی کے منہ سے عائزہ کو کیسے چھڑوایا جائے۔ اگرچہ سمیرا کے مقابلے میں اس کی اپنی کوئی اہمیت نہیں تھی لیکن عائزہ کے لیے اور اپنے خاندان کی عزت کے لیے وہ اپنی جان بھی دے سکتا تھا۔ اب یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے چپ چاپ بیٹھ جاتا۔ اسے کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا۔ گاؤں میں اس کا ایک دوست فرحان تھا جس سے وہ کوئی مشورہ کرسکتا تھا۔ وہ اس قابل نہیں تھا کہ کوئی مدد کرسکے۔ شہر میں جو اس نے وقت گزارا تھا، تھوڑے بہت اس کے تعلق بنے تھے۔ خرم نے جو وقت سمیرا کی قربت میں گزارا تھا، اس سے وہ بہت حد تک اس کی نفسیات سے واقف ہوگیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کیا کرسکتی ہے۔ اس لیے خرم نے سمیرا کے بارے میں اپنے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا تھا۔ ان کی آپس کی چپقلش میں نشانہ بے چاری عائزہ بن گئی تھی۔ اگر وہ یہ بات اپنے منہ سے نکال دیتا تو سب سے پہلے ماموں اور ممانی ہی اس کے مخالف ہو جاتے۔ سارے گاؤں والے اسے ہی برا بھلا کہتے۔ اس لیے وہ فی الحال اس ذلت سے بچنا چاہتا تھا۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اگر سمیرا نے اس کی بات نہ سنی تو وہ شہر چلا جائے گا۔ اس کے بعد ہی وہ اگلا قدم اٹھائے گا۔ وہ ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ماموں کا فون بج اٹھا۔ اسے لگا کہ سمیرا کا فون ہوگا، تب تک ماموں نے فون ریسیو کرلیا تھا۔ ماموں بہت غور سے بات سن رہے تھے اور سرسراتے ہوئے جواب دے رہے تھے پھر اچانک ان کے منہ سے نکلا۔

"ایک کروڑ... میں..." اس کے ساتھ ہی فون بند ہوگیا۔ ماموں ہونقوں کی طرح اسے دیکھنے لگے تو خرم نے پوچھا۔

"کیا ہوا ماموں؟"

"جنہوں نے عائزہ کو اغوا کیا ہے، انہی کا فون تھا۔ وہ عائزہ کی رہائی کے بدلے میں ایک کروڑ مانگ رہے ہیں اور صرف آج رات کا وقت دیا ہے۔ اگر پولیس کو بتایا یا کسی دوسرے کو تو وہ مار دیں گے عائزہ کو۔ بتاؤ اتنی رقم کہاں سے لائیں؟"

یہ سنتے ہی خرم کو یقین ہوگیا کہ یہ صرف اور صرف سمیرا کا کیا دھرا ہے۔ صرف اسے جھکانے کے لیے ورنہ سارا دن گزر گیا تھا اس نے رابطہ نہیں کیا۔ خرم کے اس نمبر سے رابطہ کرتے ہی انہوں نے تاوان مانگ لیا۔ اس نے لمحہ بھر میں فیصلہ کرلیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس لیے بڑے اطمینان سے بولا۔

"ماموں، آپ ان سے سودے بازی کی کوشش کریں اور نمبر مجھے دے دیں۔ کوشش کریں کہ معلوم ہو جائے کہ وہ کون لوگ ہیں۔ میں کچھ نہ کچھ کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے نمبر ایک کاغذ پر نوٹ کر کے جیب میں ڈالا اور بائیک لے کر چلا گیا۔ اس کا رخ فرحان کے گھر کی طرف تھا۔ اس سے مشورہ کر کے ہی وہ کوئی قدم اٹھانا چاہتا تھا۔

☆☆☆

ابھی رات کا دوسرا پہر تھا جب خرم کے گھر کے سامنے فور وہیل جیپ آن ٹھہری۔ یہ سمیرا کی پسندیدہ گاڑی تھی۔ وہ تو ہر آہٹ پر کان دھرے بیٹھا تھا۔ فوراً باہر نکلا۔ دروازے پر صائمہ کھڑی تھی اور گاڑی میں فقط ڈرائیور تھا۔ صائمہ نے کسی تمہید کے بغیر پوچھا۔

"کچھ پتا چلا عائزہ کا؟"

"نہیں، ابھی تو نہیں۔" اس نے اجنبی لہجے میں بتایا۔

"اچھا خیر، فارم ہاؤس پر میڈم آگئی ہیں تم چلو میرے ساتھ، وہیں بات کرتے ہیں۔ گھر میں بول دو۔" صائمہ نے کہا تو وہ سمجھ گیا کہ بلاشبہ وہ اس سے سودے بازی کرے گی۔ وہ واپس پلٹا اور اپنے باپ مہر دین کو بتا کر صائمہ کے ساتھ چل پڑا۔

فارم ہاؤس پہنچتے ہی وہ ڈرائنگ روم میں چلے گئے جہاں سمیرا بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ ایک ہی دن میں گویا نچڑ کر رہ گئی تھی جیسے صدیوں کی بیمار ہو۔ خرم نے واضح طور پر محسوس کیا کہ گزشتہ رات اس کے اندر سناٹا تھا اور ماحول میں شور تھا۔ آج رات ماحول میں سناٹا تھا اور اس کے اندر شور برپا تھا۔ اس نے خود پر قابو پایا اور سمیرا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"مجھے عائزہ چاہیے، اس کے لیے میں ہر قیمت دینے پر تیار ہوں۔ یہاں تک کہ آپ بھی۔"

اس کے یوں کہنے پر سمیرا نے شاکی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور بڑے تحمل سے بولی۔ ”خرم! کاش تم میرے لیے اتنا تڑپتے اور جہاں تک تمہاری اپنی قیمت ہے تو تم خود جانتے ہو کہ تم کیا ہو۔ تمہاری قیمت صرف میں نے لگائی تھی، کوئی دوسرا لگا ہی نہیں سکتا۔“

”سودے بازی تو کر سکتی ہو۔“ خرم نے سارا احترام ایک طرف رکھتے ہوئے تیزی سے کہا تو اس نے زخمی مسکراہٹ سے پوچھا۔

”کیا دے سکتے ہو؟“

”وہی جو تم چاہتی ہو۔ عائزہ پر ظلم کر کے تم نے اچھا نہیں کیا۔ اس کی زندگی تم نے داؤ پر لگا دی۔“ خرم نے طنزیہ انداز میں کہا تو وہ بڑے تحمل سے بولی۔

”خرم! تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے کہ میں نے عائزہ کو اغوا کروایا ہے۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ یہی سچ ہے اور کسی بھی سودے بازی کو ذہن سے نکال دو۔ ہاں، اگر تم چاہو تو میں اس کی بازیابی کے لیے تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔“

”کیا مدد کروں گی تم۔۔۔؟ انہوں نے ایک کروڑ مانگے ہیں۔ وہ کون سا کسی جاگیردار یا مل اونر کی بیٹی ہے یا پھر اس کے باپ کا بزنس چل رہا ہے۔۔۔ بے چارہ غریب کسان ہے۔ اغوا کرنے والے بھی بندے دیکھ کر اغوا کرتے ہیں کہ انہیں کچھ مل جائے۔ وہ اپنی زمینیں بھی بیچ دے تو اتنی رقم نہیں لا سکتا اور پھر ان کی کسی سے دشمنی بھی نہیں ہے۔ وہ صرف اس لیے اغوا ہوئی کہ وہ تمہارے لیے کباب میں ہڈی بن گئی تھی۔“ اس نے انتہائی بدتمیزی سے کہا تو اس بار صائمہ نے خرم کو جھڑکتے ہوئے کہا۔

”خرم! یہ تم کس لہجے میں بات کر رہے ہو؟ میڈم جب کہہ رہی ہیں کہ انہوں نے اغوا نہیں کروایا تو۔۔۔“

”میں بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ مجھے عائزہ چاہیے کسی بھی صورت میں۔“ خرم نے اس کی بات کاٹ کر نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ اس پر صائمہ اور سمیرا دونوں خاموش رہیں تو وہ بولا۔ ”چلیں، میں مان لیتا ہوں کہ عائزہ آپ کے پاس نہیں ہے تو اس طرح سودا کر لیں۔ آپ مجھے ایک کروڑ دے دیں، اس کے عوض میں اپنا آپ دیتا ہوں پھر میں وہی کروں گا جو آپ چاہیں گی۔“

”تمہاری دماغی حالت پر میں شبہ تو نہیں کر سکتی لیکن اس وقت تم پاگلوں جیسی باتیں کر رہے ہو۔“ سمیرا نے افسوس بھرے انداز میں کہا پھر لمحہ بھر توقف کے بعد بولی۔ ”خیر، تم پُرسکون ہو جاؤ اور میری بات سنو۔ اگر تم مجھ پر اعتماد کرو تو میں ہر طرح سے تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔“

”میں تیار ہوں، وہ اپنے گھر خیریت سے پہنچ جائے پھر آپ جو کہو گی میں مانوں گا۔“

”صائمہ، اسے فون دو۔“ سمیرا نے کہا اور پھر خرم سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”اپنے ماموں سے تازہ ترین صورت حال پوچھو۔ اغوا کرنے والے جو رقم بھی بتائیں انہیں کہہ دو کہ دیں گے۔ رقم کیسے وصول کریں گے اور۔۔۔“

”میڈم! پولیس کو اس معاملے کی بھنک بھی مل گئی تو عائزہ کی زندگی کو خطرہ ہوگا۔ اس لیے ہم نے پولیس کو نہیں بتایا۔“

”جانتی ہوں۔ میں جو کہہ رہی ہوں اسے غور سے سنو اور اسی پر عمل کرو بس۔“

”بولیں۔“ اس نے تحمل سے کہا۔

”صرف یہ پوچھو کہ رقم دے کر عائزہ کو کیسے لینا ہے؟ باقی تم مجھ پر چھوڑ دو۔“ سمیرا نے کہا تو خرم کو پختہ یقین ہو گیا کہ وہ اس کے سامنے ڈراما کر رہی ہے۔ ایک بار تو اس کے جی میں آئی کہ ابھی اسی وقت وہ اس پر تشدد کر کے سب کچھ اگلوا لے مگر اس نے فوراً ہی خود پر قابو پایا اور تحمل سے صائمہ کی طرف دیکھا جو اس کی جانب فون بڑھا رہی تھی۔ خرم نے اپنے ماموں کو فون کر کے صورتِ حال معلوم کی پھر وہی کہہ دیا جو سمیرا نے کہا تھا۔

”کیا کہتے ہیں؟“ سمیرا نے تجسس سے پوچھا۔

”وہ لوگ سودے بازی میں پچاس لاکھ تک آ گئے ہیں۔“

”ٹھیک ہے، یہ طے کر لو کہ وہ رقم کس طرح لیں گے اور عائزہ کو کس طرح حوالے کریں گے۔“ اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا تو خرم فون پر اپنے ماموں کے نمبر پش کرنے لگا۔

☆☆☆

صبح کا ملگجا اندھیرا ابھی پھیلا ہوا تھا۔ جب خرم، صائمہ اور سمیرا کے ساتھ فور وہیل جیپ میں اس مقام کی جانب بڑھ رہا تھا جہاں اغوا کاروں نے رقم کے عوض عائزہ کا تبادلہ کرنا تھا۔ وہ جگہ فارم ہاؤس سے تقریباً ڈھائی کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ جس وقت مقام کے بارے میں سمیرا نے سنا تھا، اسی وقت اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک ابھر آئی تھی۔ وہ درختوں کا بڑا سا جھنڈ تھا جو کسی جنگل کے مانند دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے قریب سے کچی سڑک گھوم کر گزرتی تھی۔ کچی سڑک آگے جا کر دائیں جانب مڑ جاتی تھی۔ ایک طرف نشیب تھا اور آگے فصلیں تھیں اور بائیں جانب چڑھائی تھی جس پر جنگل کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ وہ کچے کا علاقہ

تھا۔ اغوا کاروں نے یہ جگہ بہت سوچ کر منتخب کی تھی۔ وہ دور دور تک دیکھ سکتے تھے کہ ان کے پیچھے کوئی مددگار یا پولیس تو نہیں ہے۔

اس نے جیپ روکتے ہی فیصلہ کر لیا کہ سمیرا کو اس کے اس گھٹیا انتقام کی سزا ضرور دے گا۔ وہ سلگتے ہوئے دماغ کے ساتھ گاڑی سے اترا، بریف کیس اٹھایا اور چڑھائی پر چڑھنے لگا۔ وہ چلتا جا رہا تھا۔ اس کے اردگرد درخت تھے لیکن کوئی ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اچانک اس کا سیل فون بج اٹھا۔ اس نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف سے کوئی بولا۔

”میں تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ یہاں سے دس قدم آگے بڑھ کر بریف کیس زمین پر رکھو اور پھر پلٹ جاؤ۔“

”عائزہ کو سامنے کرو۔“ اس نے کہا تو دوسری طرف سے کوئی بولا۔

”وہ بھی آ جائے گی لیکن جیسا میں کہتا ہوں، ویسا ہی کرو۔ بریف کیس رکھتے ہی وہ سامنے آ جائے گی۔“

اس نے ایک طویل سانس لی، خود پر قابو پایا اور آگے بڑھتے ہوئے قدموں کی گنتی کی۔ دس قدم چل کر بریف کیس رکھ دیا پھر الٹے قدموں واپس پلٹ کر رک گیا۔ وہ انتظار کرنے لگا تبھی سامنے کی طرف سے ایک بندہ نمودار ہوا۔ اس کا چہرہ پوری طرح چھپا ہوا تھا۔ اس نے بریف کیس کھولا، اس میں پڑے نوٹ دیکھے اور کوئی مخصوص اشارہ کر کے بریف کیس سمیت جنگل میں کہیں غائب ہو گیا۔ چند لمحوں بعد اسے عائزہ آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ بے حال ہو رہی تھی، اس کی حالت بڑی خراب تھی۔ بکھرے بال، میلے ہوئے کپڑے جس پر مٹی لگی ہوئی تھی۔ اس کا آنچل غائب تھا۔ وہ اس کے قریب آتے ہی اس کے سینے سے لگ کر ہچکیوں سے رونے لگی تبھی خرم نے کہا۔

”چلو، جلدی چلو۔“

وہ پلٹ کر تیز قدموں سے جیپ کی طرف جانے لگے۔ اب یہ رسک تو اس نے لینا ہی تھا کہ سمیرا کے ساتھ واپس جائے۔ اس نے جی کڑا کیا اور جیپ کی طرف لپکا، تبھی اس نے دیکھا دو نقاب پوش جیپ کی طرف فائرنگ کرتے ہوئے بھاگ رہے تھے پھر اس کے ساتھ ہی زبردست فائرنگ ہونے لگی۔ خرم کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اچانک یہ کیا ہو گیا ہے۔ پُرسکون سناٹا اچانک ہی موت کی لرزہ خیزی سے دہل اٹھا تھا۔ اب یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ جیپ کی طرف جا سکتے۔ گاڑی کے پاس فائرنگ کرنے والے دونوں نقاب پوش بھی سڑک پر گرے ہوئے تھے۔ نہ جانے کون سی گولی ان کی زندگی چاٹ جائے اس لیے وہ جیپ کی طرف جانے کے بجائے نشیب میں اتر گئے۔ تبھی انہیں اپنی پشت پر سمیرا کی چیخ سنائی دی۔ خرم نے ایک لمحے کے لیے رک کر سمیرا کی مدد کرنے کا سوچا لیکن یہ وقت نہیں تھا۔ اس نے عائزہ کا ہاتھ زور سے پکڑا اور کچی سڑک پار کر کے نشیب میں سے نکل کر کھیتوں کی جانب بھاگ اٹھا۔

وہ دونوں کھیتوں کے درمیان سے گزرتے گرتے پڑتے بھاگتے چلے جا رہے تھے۔ وہ کافی دور نکل آئے تھے۔ فائرنگ کی آواز دور کہیں پیچھے رہ گئی تھی۔ عائزہ کا سانس پھولا ہوا تھا۔ وہ راستے میں کئی جگہ گری پھر ہمت کر کے اٹھ کر بھاگنے لگی۔ وہ کسی خدائی مدد کے طالب تھے ورنہ تو انہیں تقریباً دو کلومیٹر کا سفر بہرحال ایسے ہی طے کرنا تھا۔ ایک جگہ تو اس کا دم اکھڑ گیا۔ وہ بے حال ہو کر گر پڑی۔ وہ سانس بحال کرنے کے لیے رکے تبھی خرم نے غور سے دیکھا۔ ذرا فاصلے پر کھیتوں کے درمیان سے کچی سڑک جاتی ہوئی دکھائی دی۔ بلاشبہ یہ کسی بڑے راستے پر جا کر ملتی ہوگی یا پھر نزدیک ہی انہیں کہیں پناہ مل جائے۔ چند منٹ بعد ہی اس نے خرم سے کہا۔

”چلو مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے، خدا کے لیے نکلو یہاں سے۔“

اس نے ادھر اُدھر دیکھا، دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ وہ چلتے گئے۔ انہوں نے کچی سڑک والا راستہ اختیار کر لیا تھا۔ اچانک انہیں سامنے سے ایک جیپ آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ شش و پنج میں پڑ گئے۔ وہ ان کے دشمن بھی ہو سکتے تھے کیونکہ خوف زدہ آدمی یا تو ہر شے سے ڈرتا ہے یا پھر وہ نڈر ہو جاتا ہے۔ ان دونوں کے پاس فرار کا راستہ نہیں تھا۔ وہ سڑک سے ہٹ کر چلنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ جیپ ان کے قریب آ کر رک گئی اور چشم زدن میں تین آدمی باہر نکل آئے۔ ان کے چہرے چھپے ہوئے تھے۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، وہ سب خرم پر پل پڑے۔ اسے مزاحمت کا موقع ہی نہیں ملا۔ اسی دوران کسی نے اس کے سر پر ریوالور کا دستہ مارا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاتا چلا گیا۔ وہ چکرا کر زمین پر گرا اور دنیا و مافیہا سے بیگانہ ہو گیا۔

جس وقت اسے ہوش آیا، سورج کی تیز روشنی ہر جانب پھیلی ہوئی تھی۔ جیسے ہی اسے احساس ہوا کہ وہ کچی سڑک پر پڑا ہوا ہے تو اسے یاد آیا کہ وہ یہاں کیوں ہے۔ وہ تیزی سے اٹھا تو ایک دم سے چکرا گیا۔ تبھی کسی نے اسے تھام لیا۔ اس نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا تو وہ کوئی اجنبی شخص تھا۔ اس نے تیزی سے پوچھا۔

"تم... تم کون ہو؟"

"یہی سوال اگر میں تم سے کروں تو۔ تم کون ہو اور یہاں کیوں بے ہوش پڑے ہو؟" اس اجنبی نے جواب دینے کے بجائے سوال کر دیا۔ تبھی خرم نے انتہائی اختصار سے اسے اپنے بارے میں بتایا۔ اس شخص نے پانی کا پیالہ اسے دیا۔ اس کے پاس گاگر نما برتن تھا جس میں سے پانی نکال کر پیالے میں بھرا تھا۔ خرم نے پانی پیا تو وہ اجنبی بولا۔

"یہ زمین میری ہے اور میں ابھی کچھ دیر پہلے ہی آیا ہوں۔ تمہیں یہاں بے ہوش دیکھا تو ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ آؤ کچھ دیر آرام کر لو۔"

"نہیں، مجھے ابھی جانا ہوگا۔ وہ عائزہ کو کہیں لے گئے ہوں گے۔ مجھے انہیں تلاش کرنا ہے۔" اس نے انتہائی غصے میں کہا۔ یہ اس کی بے بسی کا غصہ تھا۔ وہ ہاتھ آئی بھی تھی اور پھر گم کر دی گئی۔ بلاشبہ میرا نے اسے واپس چھین لیا تھا کیونکہ وہ ان کے ساتھ جیپ میں نہیں آیا تھا۔ اس نے یہ قطعاً دھیان نہیں دیا کہ میرا کی ہذیانی چیخ کیوں بلند ہوئی تھی۔

"چلو تو میں تمہیں تمہارے گاؤں تک چھوڑ دیتا ہوں۔ یہاں قریب ہی ڈیرے پر میری بائیک کھڑی ہے۔"

"تمہارا احسان ہوگا۔" خرم نے بے بسی اور احسان مندی سے کہا۔ یہ سنتے ہی اجنبی نے اسے اٹھایا اور ڈیرے کی جانب چل پڑا۔ خرم خود کو سنبھالنے کی بھرپور کوشش کرتا ہوا اس کے ساتھ چل دیا۔

☆☆☆

خرم انتہائی مایوسی کے عالم میں اپنے گھر میں چارپائی پر پڑا ہوا تھا۔ اسے اپنے زخموں کی تکلیف کم اور عائزہ کے دوبارہ کھو جانے کا زیادہ دکھ تھا۔ یہ ہزیمت اسے توڑے جا رہی تھی۔ اس کی ماں اس کے زخم صاف کر کے اور ان دشمنوں کو بددعائیں دیتی ہوئی کچن میں دودھ گرم کر رہی تھی جبکہ مہر دین گاؤں کے ڈسپنسر کو بلانے گیا ہوا تھا۔ دوپہر کا وقت ہو گیا تھا جب فرحان اس کے پاس آیا۔ وہ اس کی حالت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کی طرف دیکھ کر وہ سراسراتے ہوئے بولا۔

"یہ تمہاری حالت کیسے ہوئی؟ تم تو رات کو شہر گئے ہوئے تھے۔"

"میں شہر نہیں جا سکا۔ میڈم ہی ادھر فارم ہاؤس پر آ گئی۔" یہ کہہ کر اس نے اختصار کے ساتھ ساری روداد کہہ دی۔ فرحان یہ سب کچھ سن کر پریشان ہو گیا پھر حیرت زدہ لہجے میں بولا۔

"تو پھر عائزہ... صبح نجیب کے ساتھ کیسے جا رہی تھی؟"

اس نے کہا تو خرم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر یوں بولا جیسے اسے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا ہو۔

"کیا کہا تم نے؟ ذرا پھر سے کہنا۔" فرحان نے تشویش بھرے لہجے میں اپنی بات دہرائی تو خرم نے کہا۔

"عائزہ اور وہ بھی نجیب کے ساتھ... پاگل ہو گئے ہو۔ یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ ہوش میں تو ہو؟" اس کے لہجے سے شدید حیرت چھلک رہی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے فرحان نیند میں بڑبڑا رہا ہو لیکن فرحان نے اعتماد سے کہا۔

"میں پورے ہوش میں ہوں۔ میں صبح جب ریوڑ لے کر جا رہا تھا، تب میرے قریب سے نجیب کی گاڑی گزری تھی۔ میں نے اس میں بیٹھی ہوئی عائزہ کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو شاید ذہن میں نہ رہتا۔"

"کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟ کہیں تمہیں وہم تو نہیں ہوا؟" خرم نے اپنے زخموں کی پروا نہ کرتے ہوئے اٹھ کر پوچھا۔

"میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں اور مجھے وہم بالکل نہیں ہوا۔" اس کے لہجے میں وہی اعتماد تھا۔

"کیسی دکھائی دے رہی تھی وہ؟" خرم نے کسی سوچ کے تحت پوچھا تو وہ بولا۔

"وہ ٹھیک ٹھاک اور پُرسکون بیٹھی ہوئی تھی۔ میں تو یہی سمجھا کہ وہ عائزہ کو واپس گھر چھوڑنے جا رہا ہے۔ تمہارے اور میڈم کے درمیان کوئی سودے بازی ہو گئی ہوگی۔ میں مطمئن ہو گیا لیکن اب چھوٹا بھائی آیا تھا میرے پاس روٹی دینے تو میں نے تمہارے متعلق پوچھا۔ اس نے بتایا کہ تم زخمی حالت میں گھر آ گئے ہو اور عائزہ تو ابھی تک گھر نہیں پہنچی۔ اب تم کچھ اور ہی کہانی سنا رہے ہو۔"

"وہ اپنے گھر نہیں پہنچی تو پھر کدھر گئی؟ نجیب سے اس کا کیا تعلق ہے؟ یہ کیا معما ہے؟" خرم نے وحشت ناک انداز میں کہا تو فرحان پریشان ہوتے ہوئے بولا۔

"اب یہ تو عائزہ ہی بتا سکتی ہے یا پھر نجیب۔" اس نے کہا تو خرم چونک گیا۔ اس نے بے خیالی میں اپنا سیل فون نکالنا چاہا مگر وہ کہیں گر گیا تھا۔ پھر احساس ہوتے ہی اس نے جوتے پہننے شروع کر دیے اور بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

"ہاں، یہ نجیب ہی بتا سکے گا۔ وہ عائزہ کے بارے میں کوئی سرپرائز تو دے گا ہی۔ چل اٹھ، میں تجھے راستے میں اتار دوں گا۔"

وہ دونوں اچانک ہی صحن میں آ گئے۔ آمنہ آوازیں دیتی رہی لیکن خرم نے اپنی ماں کی سنی ان سنی کر دی۔ اس نے صحن میں کھڑی بائیک اسٹارٹ کی تو فرحان اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ پھر دونوں ہی گھر سے نکل گئے۔ اس نے فرحان کو راستے میں اتارا اور اپنا رخ فارم ہاؤس کی طرف کر لیا۔ اس کے ذہن میں خیالات آندھی اور طوفان کی طرح... گردش کر رہے تھے۔

☆☆☆

حسب معمول فارم ہاؤس کا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ اس نے بائیک جا کر پورچ میں روکی۔ تبھی فارم ہاؤس کے ایک ملازم نے اسے دیکھا تو اس کی جانب بڑھ آیا۔ خرم نے حال احوال کے بعد نجیب کے بارے میں پوچھا۔

"وہ ادھر خاص مہمانوں والے بلاک میں ہیں۔"

"کیا ادھر کوئی مہمان آئے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"پتا نہیں، میں کچھ دیر پہلے ہی آیا ہوں۔ مجھے تو یہی بتایا گیا ہے کہ وہ ادھر ہیں۔"

"اچھا، میں دیکھتا ہوں۔" یہ کہہ کر خرم تیزی سے اس طرف جانے لگا۔ ابھی وہ اس بلاک کے نزدیک نہیں پہنچا تھا کہ نجیب باہر آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ سوٹ پہنے ہوئے تھا اور کہیں جانے کی تیاری میں تھا کیونکہ وہ تیزی سے گاڑی کی طرف لپکا تھا اور اس کا سارا دھیان اسی طرف تھا۔ خرم تیزی سے اس کے پاس پہنچا تو نجیب اسے دیکھ کر ٹھٹکا اور رک گیا۔ تبھی اس نے انتہائی غصے سے پوچھا۔

"عائزہ کہاں ہے؟" نجیب نے چند لمحے اس کی طرف حیرت سے دیکھا پھر حقارت آمیز لہجے میں بولا۔

"پاگل ہو گئے ہو تم؟ مجھے کیا معلوم... اور تم معمولی مالی کے بیٹے ہو کر میرے ساتھ کس لہجے میں بات کر رہے ہو؟"

"میں پوچھ رہا ہوں کہ عائزہ کہاں ہے، اسے فوراً میرے حوالے کر دو۔" اس کی آواز میں غراہٹ تھی۔ تب نجیب نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر اسی حقارت بھرے لہجے میں کہا۔

"تم لوگوں کو اب ہر بندہ چور دکھائی دے گا۔ جاؤ، اسے کہیں اور جا کر تلاش کرو۔ میرا مغز مت چاٹو۔ مجھے پہلے ہی دیر ہو رہی ہے۔" یہ کہہ کر وہ گاڑی کی طرف بڑھا، تب خرم نے غصے میں کہا۔

"تمہیں میری بات سمجھ نہیں آ رہی ہے، میں کیا کہہ رہا ہوں؟"

"یہ بات اپنی میڈم کو جا کر سمجھاؤ جس نے تمہیں خوامخواہ سر پر چڑھا رکھا ہے۔ تمہاری اوقات یہ نہیں کہ میرے منہ لگو۔ جاؤ دفع ہو جاؤ۔" اس کے لہجے میں حقارت کے ساتھ

طنز بھی شامل ہو گیا تھا۔ تبھی خرم نے دائیں ہاتھ کا مکا اس کے منہ پر دے مارا۔ نجیب نے دفاعی انداز میں اپنے ہاتھ آگے کیے تو خرم وحشیانہ انداز میں اس پر پل پڑا۔ نجیب اپنی عمر اور بھاری تن و توش کے باعث اتنا پھرتیلا نہیں تھا جبکہ خرم پاگل پن کی حد تک غصے میں آ گیا تھا۔ اس نے اپنے زخموں کی پروا نہ کرتے ہوئے نجیب کی کمر میں دونوں ہاتھ ڈالے۔ اسے اٹھا کر اوپر کیا اور پھر زمین پر دے مارا۔ وہ منہ کے بل گرا تو اس نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ ایک بار نجیب نے اس کا پاؤں پکڑا اور مروڑ کر پرے دھکیلا۔ وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ پایا اور ایک جانب لڑھک گیا۔ اسی لمحے کی مہلت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ تیزی سے اٹھا اور واپس بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کا رخ اسی بلاک کی طرف تھا جہاں سے نکل کر وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھا تھا۔ وہ بھی تیزی سے اس کے تعاقب میں لپکا۔ اگرچہ دونوں کا فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا لیکن نجیب اچانک ہی کہیں غائب ہو گیا۔ خرم کے لیے وہ جگہ اجنبی نہیں تھی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ کسی بھی آہٹ کا دھیان رکھتے ہوئے وہ دبے پاؤں آگے بڑھنے لگا۔ وہاں چند کمرے تھے بلاشبہ وہ انہی میں سے ایک میں ہوگا۔ وہ محتاط انداز میں آگے بڑھ رہا تھا۔ اسے لگا کہ کسی کمرے میں سے آواز آ رہی ہے۔ اس نے اندر جھانکنے کے لیے کوئی درز یا جھری تلاش کرنے کی کوشش کی تو اسے پرانی طرز کی کھڑکی ذرا سی کھلی ہوئی ملی جس سے اندر کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ کلین شیو نجیب کے چہرے پر ذرا سی پریشانی تھی جبکہ اس کے بائیں گال پر انگریزی کے حرف ایکس کی صورت گہری خراش میں سے خون ابل رہا تھا۔ اس نے بائیں ہاتھ میں پرانے طرز کے فون کا ریسیور پکڑا ہوا تھا۔ اس کے سوٹ پر کہیں کہیں دھول لگی ہوئی تھی۔ اس کی آواز آنا بند ہو گئی تھی۔ شاید وہ اپنی بات کہہ کر دوسری جانب سے سن رہا تھا پھر جیسے ہی اس نے ریسیور رکھا تو دوسرے کمرے سے عائزہ برآمد ہوئی، تب خرم حیران رہ گیا۔ وہ تازہ دم دکھائی دے رہی تھی جیسے ابھی سنگھار میز سے اٹھ کر آئی ہو۔ کیا وہ عائزہ ہی تھی؟ یا اس کی نگاہوں کو دھوکا ہو رہا ہے؟ اس نے پھر غور سے دیکھا۔ وہی چوڑا ماتھا، ستواں ناک، چمک دار سیاہ بھونرا آنکھیں، پتلے لب جس پر سرخ لپ اسٹک لگی ہوئی تھی۔ نفاست سے سنواری ہوئی سیاہ زلفیں جو اس نے کھلی چھوڑ رکھی تھیں۔ اس نے بسنتی رنگ کا شلوار سوٹ پہنا ہوا تھا اور اسی رنگ کا آنچل کندھوں پر پھیلایا ہوا تھا۔ اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ نجیب کو دیکھ کر کچھ کہا جسے اس نے نہیں سنا۔ وہ ایک طرف پوری یکسوئی سے دیکھ رہا تھا۔ خرم نے اس

کی نگاہوں کی سمت دیکھا، اسے کچھ اور تو دکھائی نہیں دیا۔ بس سفید کرتے کی آستینوں میں سے دو مردانہ ہاتھ دکھائی دیے جن میں ریوالور دبا ہوا تھا۔ بائیں ہاتھ میں نال اور دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور انگلی میں ایک گولی دبی ہوئی تھی جو وہ چیمبر میں ڈال رہا تھا۔ باقی تین انگلیاں دستے پر تھیں۔ دو گولیاں ابھی لوڈ کرنے کے لیے باقی تھیں جو اس ...... کے قریب ہی پڑی ہوئی تھیں۔ خرم کو عائزہ کی وہاں موجودگی اور اس قدر پرسکون ہونے کی وجہ سمجھ نہیں آئی لیکن وہ لمحہ بھر میں سمجھ گیا کہ وہ لوگ اسے ختم کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ وہ تیزی سے پیچھے ہٹا اور باہر کی سمت دوڑا۔ وہ اتنا سمجھ گیا تھا کہ یہ کوئی سازش ہے، کون کس کے ساتھ کیا کر رہا ہے، یہ سمجھنے کا ابھی وقت نہیں تھا۔ وہ جلد از جلد وہاں سے دور جانا چاہتا تھا کیونکہ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا اور وہ بے موت مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہاں کے گارڈ اس کی جان کے دشمن بن جاتے، وہ بھاگتے ہوئے پورچ کے پاس پہنچا۔ وہاں پر بائیک نہیں تھی اس نے پریشانی میں اِدھر اُدھر دیکھا تبھی فارم ہاؤس کے گارڈ کہیں تھا سے اس کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ ابھی یہ ساری صورت حال سمجھ ہی رہا تھا کہ پولیس وین گیٹ سے اندر آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ قریب آ کر رکی تو پولیس والوں نے اسے قابو کر لیا۔

☆☆☆

ایک ہفتے سے وہ لاک اپ میں تھا۔ وہاں سوائے تشدد کے اور کچھ بھی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ تنہا تھا، اسے کھانے پینے کے لیے فقط اتنا ہی دیا جاتا تھا کہ وہ زندہ رہے۔ جہاں وہ جسمانی تشدد سے بے حال تھا، وہاں ذہنی اذیت سے بالکل پاگل ہو گیا تھا۔ وہ منظر جو اس نے فارم ہاؤس کے مہمانوں والے بلاک کے کمرے میں دیکھا تھا، اس کی اسے قطعاً سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اتنی پُرسکون عائزہ وہاں کیا کر رہی تھی؟ کیا وہ بھی ان کے ساتھ ملی ہوئی تھی؟ اس سوچ کے ساتھ ہی اس کا دماغ ماؤف ہو جاتا۔ اسے کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اسے یہ احساس تو ہو گیا تھا کہ اس کے ساتھ دھوکا ہوا ہے مگر یہ کوئی اتنی انہونی بات نہیں تھی۔ راہ چلتے ہوئے کتا بھی دھوکے سے کاٹ سکتا ہے، اس کے ساتھ تو سازش ہوئی تھی۔ سازش انہی لوگوں کی کامیاب ہوتی ہے جو اعتماد رکھتے ہوں۔ دھوکا یا سازش جو بھی تھا اسے اس سطح پر گھیر کر لے آیا تھا کہ وہ بے بس پنچھی کے مانند قفس میں پڑا تھا اور اس کا پُرسانِ حال کوئی نہیں تھا۔ اسے لاک اپ میں دوسرا دن تھا جب اذلان غصے میں بھرا ہوا اس کے پاس آیا۔ اس کی آنکھوں سے اور لفظوں سے آگ برس رہی تھی۔

"تم نے میری آپی کے ساتھ دھوکا کیا ہے، گھٹیا انسان۔ اسے قتل کرنے کی سازش کی۔ پہلی بار تو میں نے آپی کے صدقے تمہیں معاف کر دیا تھا لیکن تم اس قدر گھناؤنی حرکت کرو گے، یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اس قدر گھٹیا حرکت، اس قدر احسان فراموشی... وہ اس وقت زندگی اور موت کی کشمکش میں ہیں۔ اپنا جرم قبول کرو ورنہ یہ خود ہی تم سے اگلوا لیں گے۔ یہ مت سمجھنا کہ تمہاری زندگی بچ جائے گی اگر میری آپی کو کچھ ہو گیا نا تو پھانسی کا پھندا تمہاری گردن میں ڈالنے سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ عدالت نے اگر تمہیں سزا نہ بھی دی تو میں تمہیں سزا دوں گا اور ایسی عبرت ناک سزا دوں گا کہ دنیا دیکھے گی۔"

"میری بات سنو اذلان! میں نے..." خرم نے کچھ کہنا چاہا تو وہ حقارت سے بولا۔

"خاموش کمینے۔ میں تمہاری نہیں، تم میری بات سنو اور جرم قبول کر کے عدالت سے سزا پا لو اور بس..." اس نے کہا اور کوئی بات سنے بغیر واپس پلٹ گیا پھر اس کے بعد خرم سے کوئی بھی نہیں مل سکا۔ دن رات کے تشدد سے وہ اس قدر ٹوٹ گیا تھا کہ ناکردہ گناہ بھی ماننے کو تیار ہو گیا۔ اس کے ساتھ یہ سب کیا ہو گیا؟ بس ایک یہی سوال اسے زندہ رکھنے کی امید بنا ہوا تھا ورنہ تو اس کی حالت مُردوں سے بھی بدتر ہو گئی تھی۔ وہ ذہنی اور جسمانی طور پر ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔

☆☆☆

قفس میں روشنی اذیت کو بڑھا دیتی ہے۔ خرم کی اذیت مزید بڑھ گئی تھی کہ اس کا ریمانڈ لینے کے لیے قصبے سے شہر کی عدالت میں پیش کیا جانا تھا۔ یہ بات اسے اس وقت معلوم ہوئی جب اسے لاک اپ سے نکالا گیا اور انسپکٹر آصف کے سامنے لایا گیا۔ وہ تھانے میں باہر جانے والے راستے پر کھڑا تھا۔ اس کے قریب ہی پولیس وین کھڑی تھی۔ انسپکٹر آصف بڑے ڈیل ڈول، موٹے نین نقش اور سانولے رنگ کا تھا۔ اس نے اپنی سرخ آنکھوں سے ہتھکڑی لگے خرم کو دیکھا۔ اس نے خرم کو لے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ خود پولیس وین میں اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ اور چار سپاہی پیچھے بیٹھے تو وین چل دی۔ خرم اپنی سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ یہ کیا ہو گیا ہے؟ سمیرا اسے اس قدر ذلیل و رسوا کرنے کے بعد اذیت میں بھی ڈال دے گی یہ تو کبھی اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ عائزہ اور نجیب کے درمیان کیا تعلق تھا؟ کیا وہ بے وفائی کر گئی ہے یا کسی مجبوری میں ایسا کیا ہے؟ وہ ان سوالوں کا جواب چاہتا تھا۔ بس اس کے ذہن میں عائزہ کی وہ مسکراہٹ چپک گئی تھی جو اس نے فارم ہاؤس کے خاص مہمانوں والے بلاک کے کمرے میں دیکھی تھی۔ اس مسکراہٹ میں انجانی کہانی تھی جس کے بارے میں سوچنا بھی اس کی اذیت بڑھا دیتا تھا۔ وہ پولیس کے نرغے میں ایسا پھنسا تھا کہ کسی سے رابطہ تک نہیں ہو پایا تھا ورنہ وہ خود ان سوالوں کا جواب تلاش کر لیتا۔ اسے حیرت اس پر بھی تھی کہ کیا اس کے گھر والوں نے بھی اسے تلاش نہیں کیا کہ وہ کہاں ہے؟ ایک سوال جو اسے چٹکیاں بھر رہا تھا کہ اگر سمیرا نے دشمنی کرنا ہی تھی تو پھر وہ موت و حیات کی کشمکش میں کیوں ہے؟ اذلان جھوٹ بول رہا ہے یا واقعتاً ایسا کچھ ہو گیا ہے؟

وہ جس قدر سوچتا رہا سوال اسی قدر بڑھتے رہے اور اس کی اذیت کو بڑھاتے رہے۔ اچانک اس کی سوچوں کا بہتا ہوا دھارا رک گیا۔ پولیس وین پکی سڑک سے ہٹ کر ایک ذیلی کچی سڑک پر آ گئی تھی پھر ہچکولے کھاتی ہوئی کچھ فاصلے پر رک گئی۔ وہ حیران ہو گیا کہ یہ کدھر آ کر رک گئے ہیں۔ تبھی ایک سپاہی نے اس کے پہلو میں ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔

"چلو نیچے اترو۔"

"تم لوگ تو مجھے عدالت لے جا رہے تھے، یہاں کیوں...؟" خرم نے حیرت سے پوچھا۔

"اوئے عدالت تو اس لیے لے جاتے تاکہ تم ہمارے کاغذوں میں گرفتار ہوتے۔ تمہاری گرفتاری تھانے میں ہے ہی نہیں۔ اس لیے تجھے اوپر والی عدالت میں بھیج رہے ہیں۔" سپاہی نے انتہائی خباثت سے کہا تو وہ سمجھ گیا کہ اذلان نے اسے یونہی دھمکی نہیں دی تھی۔ یہ ماورائے عدالت قتل کے آثار تھے۔ اسے پتا چل گیا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے، تبھی ایک دوسرے سپاہی نے کہا۔

"نیچے اترو گے یا تجھے گھسیٹ کر اتاریں۔"

خرم کو موت کا پیغام دے دیا گیا تو اس کے حواس ایک دم سے جھنجھنا اٹھے۔ وہ اتنی آسانی سے مرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ تیزی سے سوچنے لگا کہ موت کے ان ہرکاروں کے ہاتھوں سے کیسے نکلا جائے۔ فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ ساکت ہو کر بیٹھا ہی تھا کہ سپاہیوں نے اسے بازوؤں سے پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے وین سے اتارنے لگے۔ اس دوران میں پیچھے سے کسی نے زور سے دھکا دیا تو وہ سیدھا کچی زمین پر جا گرا۔ سامنے ہی انسپکٹر آصف کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر خرم کے ہاتھوں میں لگی ہتھکڑی کھول دی تو انسپکٹر نے سرد لہجے میں کہا۔

"اٹھو اور بھاگو۔"

"نہیں، میں نہیں بھاگوں گا۔ مجھے عدالت لے جائیں جو..." خرم نے بچنے کی آخری کوشش کرتے ہوئے سنی ان سنی کرتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔

"میں کہہ رہا ہوں، اٹھو اور بھاگو۔ نہیں بھاگو گے تو کیا بچ جاؤ گے، چلو..." یہ کہتے ہوئے اس نے ایک سپاہی کو اشارہ کیا۔ اس نے گن سیدھی کر کے بولٹ مارا تبھی تیز سائرن کی آواز قریب آتی ہوئی سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی ڈی ایس پی رضوان کی گاڑی نمودار ہوئی۔ وہ تیزی سے ان کے قریب آئی اور ان سے ذرا فاصلے پر رک گئی۔ اس کے پیچھے دو پولیس وین تھیں جن کے رکتے ہی اس میں موجود پولیس نفری اتری اور انہوں نے ان سب کو گھیر لیا۔ انسپکٹر آصف پُرسکون انداز میں یہ سب دیکھ رہا تھا۔ ڈی ایس پی رضوان جیپ میں سے اترا اور قریب آ کر بولا۔

"میں یہ سوال نہیں کروں گا انسپکٹر کہ تم یہ کیا کر رہے ہو، کیوں کر رہے ہو؟ میں جانتا ہوں۔ اسے میری گاڑی میں بٹھاؤ۔"

"سر... وہ آپ اگر..." انسپکٹر نے کہنا چاہا تو ڈی ایس پی نے غصے میں کہا۔

"میں نے جو کہا ہے، وہ نہیں سنا تم نے؟ کیا میں نفری کو حکم دوں؟"

"نہیں سر! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" اس نے یہ کہتے ہوئے گن تانے سپاہی کو ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ سپاہی پیچھے ہٹ گیا۔ انسپکٹر خود آگے بڑھا اور خرم کو اٹھا کر ڈی ایس پی کی گاڑی کی طرف لے گیا۔ اسے گاڑی میں پچھلی نشست پر بٹھانے کے بعد ڈی ایس پی کو سیلوٹ کیا۔

"ٹھیک ہے، اب تم فوراً تھانے رپورٹ کرو۔ میں وہیں آ رہا ہوں۔" یہ سن کر انسپکٹر نے دوبارہ سیلوٹ کیا تو وہ اپنی جیپ کی جانب بڑھا۔ وہ وہاں سے چلا گیا تو نفری بھی اپنی اپنی وین میں بیٹھ کر واپس چل دی۔ خرم موت کے منہ سے بچ نکلا۔

☆☆☆

سہ پہر ہو چکی تھی۔ فارم ہاؤس کے شاندار ڈرائنگ روم میں اذلان اور سمیرا کے فیملی فرینڈز آ چکے تھے۔ ان میں تین مرد کاروباری طبقے سے تھے، ایک بزرگ سیاست داں جو سیاسی طور پر ان کا گاڈ فادر تھا۔ ایک ان کا خاندانی وکیل اور ایک خاتون تھی جو نہایت امیر اور مشہور خاندان سے تھی۔ وہ ایک سوشل ورکر بھی تھی۔ انہیں یہ خبر نہیں تھی کہ انہیں فوری طور پر

یہاں کیوں بلوایا گیا ہے۔ ان سب کو بلانے والا ڈی ایس پی رضوان تھا۔ مہمانوں کو اگرچہ خبر نہیں تھی کہ کیوں بلوایا گیا ہے تاہم وہ ان دونوں کی مخدوش حالت سے آگاہ تھے اسی لیے اپنے سارے کام چھوڑ کر پہنچے تھے۔ ڈی ایس پی رضوان وہیں موجود تھا اور ان کا استقبال کر رہا تھا۔ سب سے آخر میں اذلان پہنچا۔ جس وقت اذلان مہمانوں سے مل رہا تھا، انہی لمحوں میں چند پولیس والے خرم کو بھی وہیں لے آئے۔ اسے یوں خستہ حالت میں دیکھ کر سبھی کو معاملے کی نزاکت کا احساس ہوگیا۔ ماحول میں سنجیدگی پھیل گئی، تبھی ڈی ایس پی بولا۔

''آپ سب مہمانوں سے معذرت کہ بغیر بتائے آپ کو یہاں فوری طور پر پہنچنے کی زحمت دی۔ میں نے آپ کو انتہائی اہم نوعیت کے معاملے کے لیے بلایا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ میری بات سنیں اور پھر اس کا کوئی حل نکالیں۔''

''جی، جی بولیں۔'' بزرگ سیاست داں نے فوراً کہا تو وہ کہتا چلا گیا۔

''ایک ہفتہ قبل مجھے یہ اطلاع ملی تھی کہ خرم نامی ایک نوجوان نے سمیرا بی بی پر قاتلانہ حملہ کیا ہے جس میں وہ بچ گئی ہیں لیکن انتہائی نازک حالت میں ہیں جبکہ خرم فرار ہے۔ قصبے کے تھانے میں یہ درخواست نجیب نامی آدمی نے دی تھی جس پر ایف آئی آر درج کرلی گئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسپکٹر آصف نے خرم کو گرفتار تو کرلیا تھا لیکن اس کی گرفتاری نہیں ڈالی تھی اور سمیرا موت وحیات کی کشمکش میں تھیں۔ آج صبح خرم کو ایک ویرانے میں لے جا کر قتل کیا جا رہا تھا کہ میں بروقت پہنچا اور اسے قتل ہونے سے بچالیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خرم کی گرفتاری کیوں نہیں ڈالی گئی اور اسے قتل کیوں کیا جا رہا تھا؟''

''جی بالکل، یہ سوال تو بنتا ہے۔'' وکیل نے فوراً کہا۔

''دوسری طرف گزشتہ رات اسپتال سے سمیرا بی بی پراسرار طور پر غائب ہوگئیں حالانکہ وہاں پر پولیس کا سخت پہرا تھا۔ ان کا ابھی تک سراغ نہیں ملا۔ کسی کو بھی ان کا پتا نہیں ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اذلان کی طرف دیکھا پھر پوچھا۔

''شاید آپ کو معلوم ہو... کوئی سراغ، کوئی پتا؟''

''نہیں ڈی ایس پی صاحب! ان کا کوئی پتا نہیں چل رہا۔''

''اذلان صاحب! آپ کو یاد ہوگا کہ جب آپ ملک سے باہر تھے اس وقت سمیرا پر ایبٹ آباد میں قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔ اس واقعے کی اطلاع کسی بھی تھانے میں نہیں دی گئی، میں پوچھتا ہوں آخر کیوں؟''

''میری تحقیق کے مطابق وہ کارستانی خرم ہی کی تھی لیکن آپی کے کہنے پر میں نے اس معاملے کو دبا دیا۔'' اذلان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''جب آپ کو یقین تھا پھر بھی آپ نے اپنی بہن کو اس کے ساتھ بلکہ اس کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔ ان کی حفاظت کی کوشش نہیں کی؟''

''یہاں موجود سب لوگ یہ جانتے ہیں کہ وہ اپنی مرضی کی مالک تھیں اور میں ان کے معاملات میں دخل نہیں دے سکتا۔ وہ اگر میری بات مان لیتیں تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ جہاں تک ان کی حفاظت کی بات ہے تو میں نے ان کا ہر طرح سے خیال رکھنے کی کوشش کی۔ انہیں کسی سے خطرہ نہیں تھا۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''مگر آپ یہ نہ جان سکے کہ ان کے پیچھے قاتل لگے ہوئے تھے تاکہ انہیں قتل کردیں۔ قاتلوں نے پہلے ایبٹ آباد میں کوشش کی اور پھر ایک ہفتے پہلے جب وہ خرم کے ساتھ جاکر عائزہ کو اغوا کاروں سے چھڑوانے گئی تھیں۔'' رضوان نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

''ڈی ایس پی صاحب! آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ خرم اس معاملے میں ملوث نہیں تھا؟'' وکیل نے جرح کرتے ہوئے کہا۔

''میں اسے بے گناہ قرار نہیں دے رہا۔ آپ سب کے سامنے حقائق پیش کر رہا ہوں۔ فیصلہ تو آپ نے کرنا ہے۔ خیر، میں یہ واضح کرنا چاہ رہا ہوں کہ خرم تو تھانے میں تھا مگر اسپتال سے سمیرا غائب ہوگئیں کیا انہیں اغوا کرلیا گیا ہے یا وہ خود ہی کہیں غائب ہوگئی ہیں یا پھر سارا ڈراما خود سمیرا کر رہی ہیں؟ اس سے اگرچہ مزید سوال پیدا ہوں گے لیکن میں بات کو محدود رکھتے ہوئے اس سوال کا جواب چاہتا ہوں تو یہ معاملہ خود بہ خود حل ہوجائے گا۔''

''تو آپ سمجھائیں نا اس معاملے کو۔ کیوں خوامخواہ تجسس پیدا کر رہے ہیں؟'' بزرگ سیاست داں نے کسی حد تک تلخی سے کہا تو ڈی ایس پی مسکراتے ہوئے بولا۔

''تو پھر سنیں، سمیرا میری کالج فیلو رہی ہیں، بعد میں بھی ہمارے درمیان اکثر وبیشتر رابطہ رہتا تھا۔ وہ میری شادی پر بھی آئی تھیں۔ جن دنوں ایبٹ آباد میں ان پر حملہ ہوا تو انہوں نے مجھے وہاں بلایا اور قاتلانہ حملے کے بارے میں تمام تر تفصیلات بتا کر اپنے طور پر تفتیش کرنے کو کہا۔ میں نے اپنا تبادلہ یہاں کروایا اور خفیہ طور پر اپنی تفتیش شروع کردی۔ مجھے خرم اور سمیرا کے تعلق کے بارے میں پوری طرح علم تھا۔ گاہے بگاہے ہم دونوں کے درمیان معلومات کا

تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ میں ان قاتلوں تک پہنچ تو گیا لیکن ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے وہ میری دسترس میں نہیں آرہے تھے۔ تب اچانک سمیرا نے مجھے بتایا کہ خرم اس پر عائزہ کے اغوا کا الزام لگا رہا ہے، تب میں نے پوری کوشش کرکے اس گروہ کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی۔ سمیرا نے جو کیا، وہ خرم کی مدد کرنے کے لیے نہیں بلکہ میرے کہنے پر کر رہی تھی کیونکہ اغوا کار کوئی اور نہیں اسی گروہ کے لوگ تھے جنہوں نے ان پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔''

''کون تھے وہ لوگ؟'' اذلان نے تیزی سے پوچھا۔

''لیکن پہلے یہ تو معلوم ہوجائے کہ سمیرا اس وقت کہاں ہیں؟'' ڈی ایس پی نے اذلان کی بات نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا تو اذلان بولا، اس کے لہجے میں حد درجہ بے چینی تھی۔

''ہم پہلے ہی بہت پریشان ہیں ڈی ایس پی صاحب۔ آپ خوامخواہ سنسنی پھیلا رہے ہیں۔ اگر آپ کو آپی کے بارے میں معلوم ہے یا اس گروہ کے بارے میں پتا ہے تو پلیز، ہمیں بتائیں تو ہم کچھ کریں۔ میں ڈی آئی جی سے بات کرتا ہوں اگر وہ لوگ آپ کی دسترس میں نہیں آرہے ہیں۔''

''سمیرا پر قاتلانہ حملہ کرنے والا اور عائزہ کو اغوا کرنے والا مجو گینگ اس وقت میری حراست میں ہے۔ سمیرا بی بی رات اسپتال سے اغوا ہوچکی ہوتیں اگر میرا وہاں پہرا نہ ہوتا۔ انہوں نے کوشش کی اور میرے جال میں پھنس گئے۔ سمیرا کو اسپتال سے میں نے اپنے گھر میں شفٹ کردیا تھا۔ میں نے ایسا کیوں کیا؟ اس کی ساری وجہ خود سمیرا ہی سے سنیں۔'' ڈی ایس پی نے ڈرامائی انداز میں کہا اور پھر اندرونی کمرے کی طرف دیکھنے لگا۔ سب لوگ بھی ادھر ہی دیکھنے لگے۔ تبھی وہاں سے سمیرا نمودار ہوئی۔ وہ وہیل چیئر پر بیٹھی ہوئی تھی جسے وہ خود ہی دھکیلتی ہوئی ان کے پاس آگئی۔ اس نے سب کی طرف دیکھا پھر آزردہ لہجے میں بولی۔

''میں نے یہاں ہونے والی ساری باتیں سن لی ہیں۔ رضوان تو کچھ اور ہی چاہتا تھا لیکن یہ میں نے ہی تجویز دی تھی کہ آپ سب کو یہاں جمع کرکے سارے حقائق آپ کے سامنے رکھ دیے جائیں تاکہ ہم سب کسی فیصلے پر پہنچ سکیں۔''

''ہاں بولو بیٹا۔'' بزرگ سیاست داں نے گہری سوچ کے ساتھ کہا۔

''اس وقت مجھے قطعاً سمجھ نہیں آئی تھی کہ اچانک کسے میرے ساتھ دشمنی ہوگئی ہے، جب مجھ پر پہلی بار حملہ ہوا۔ اگرچہ اذلان نے کہا تھا کہ وہ دشمن کو تلاش کرے گا لیکن اس نے تو نہیں کیا، میں نے تلاش کرلیا کیونکہ رضوان کی مدد سے مجھ پر آہستہ آہستہ حقیقت کھل گئی۔ مجو گینگ کسی اور کا نہیں، میرے اپنے سگے بھائی اذلان کا ہے۔ میرا بھائی ہی میری موت چاہتا تھا جسے میں نے اپنی اولاد کی طرح پالا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ وہاں پر موجود سبھی ششدر رہ گئے کہ اذلان ایسا کرسکتا ہے جبکہ اذلان پھٹی پھٹی نگاہوں سے ایک ٹک اپنی بہن کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''بتاؤ اذلان! تم نے ایسا کیوں کیا؟'' ڈی ایس پی رضوان نے تحکمانہ انداز میں پوچھا تو وہ یوں چونکا جیسے سکتے سے باہر آیا ہو پھر چند لمحے بعد اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

''ہاں، میں... میں ہی اپنی بہن کی موت چاہتا تھا۔ ایک معمولی ملازم کے بیٹے اور وہ بھی کم عمر نوجوان کے ساتھ تنہائی میں وقت گزارے، ایک بھائی یہ کیسے برداشت کرسکتا ہے اور اس پر بجا آپی نے اس کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ خرم... آپی کے حواسوں پر کیسے چھا گیا؟ میں یہ برداشت نہیں کرسکتا تھا اور پھر آپی اس سے شادی کرلیتیں تو ہماری جائداد میں سے وارث پیدا ہوجاتے۔ میں اپنی جائداد کی تقسیم نہیں چاہتا تھا اور وہ بھی ایک کمین کے پتر کی اولاد... اور پھر میں یہ کیسے برداشت کرسکتا تھا کہ میرا سیاسی کیریئر داؤ پر لگ جائے۔ میرے سیاسی مخالفین میرا مذاق اڑاتے کہ میری بہن ایک کمین کو خود بیاہ کر لائی ہے۔ میرا تو سیاسی کیریئر تباہ ہوکر رہ جاتا اور بزنس کمیونٹی مجھ پر تھو تھو کرتی۔ میں نے اس کا قصہ ہی ختم کردینا چاہا اور اس کا سارا الزام خرم پر ڈال دینا چاہتا تھا۔'' وہ اعتراف کرچکا تو ڈی ایس پی نے کہا۔

''ظاہر ہے، سمیرا کو ختم کرنے کا کوئی جواز تو ہوتا۔ وہ خرم پر عائزہ کے اغوا کی صورت میں مسلط کردیا گیا تاکہ سمیرا کے ساتھ خرم بھی نہ رہے۔ یہ تو اس کی قسمت اچھی تھی اور میرے لگائے ہوئے بندے وہاں موجود تھے۔ ورنہ یہ دونوں ہی ادھر ختم ہوجاتے اور یہ اس واقعے کو اپنی مرضی کا رنگ دے دیتے۔''

''نہیں، اس میں اذلان کے سرغنہ ہونے کا معلوم کیسے ہوا؟'' وکیل نے اپنی تسلی کے لیے پوچھا۔

''اذلان کھل نہیں رہا تھا، اس نے بڑا مضبوط نیٹ ورک بنایا ہوا تھا۔ جس دن سمیرا گئی تھی، عائزہ کو چھڑوانے کے لیے تو وہ جان بوجھ کر گئی تھی تاکہ مجو گینگ کے لوگ ان پر حملہ کریں۔ میں نے بھی اپنے بندے گھات میں لگائے ہوئے تھے۔ سمیرا کو گولی اس لیے لگ گئی کہ خرم اپنے ساتھ عائزہ کو لے کر کسی اور طرف نکل گیا۔ تو جونہی مجو گینگ کے لوگ سمیرا تک پہنچ گئے۔ وہی ان کی ٹارگٹ تھی لیکن پھر اذلان

کے اس وقت ہاتھ پیر پھول گئے جب سمیرا کو دوبارہ اسپتال میں اغوا یا قتل کرنے کی کوشش کی گئی اور سمیرا وہاں سے غائب ہوگئی۔ تبھی اسے تلاش کرنے میں بہت ساری غلطیاں ہوگئیں اس سے۔ فون تو اس کا ٹیپ کیا ہی جارہا تھا۔ اس نے احتیاط نہیں کی۔ بدحواسی میں اس نے بہت سارے ثبوت چھوڑے اور یہ سب سامنے آ گیا۔"

"بہت بُرا کیا۔" خاتون سوشل ورکر پہلی بار بولی تو ڈی ایس پی نے کہا۔

"سمیرا کے غائب ہونے پر خرم کی صورت میں اس کے خلاف ثبوت ہو سکتا تھا۔ اس کو ختم کرنے کے لیے اس نے ایک بھیانک منصوبہ بنایا۔ اس کا گروہ اغوا کرنے میں مہارت تو رکھتا ہی تھا۔ انہوں نے انسپکٹر آصف کے بچے کو اغوا کرکے اسے مجبور کیا کہ وہ خرم کو پار کردے۔ اگر بجو گینگ کے کچھ لوگ پکڑے نہ گئے ہوتے تو اب تک خرم قتل ہو چکا ہوتا اور اس طرح آپ کے سامنے نہ بیٹھا ہوتا۔ یہ گینگ اس لیے بنایا گیا تھا کہ علاقے پر اپنا دباؤ رکھا جا سکے۔" یہ کہہ کر اس نے مہمانوں کی طرف دیکھا پھر چند لمحے توقف کے بعد بولا۔

"بس اب ایک اور کردار..." یہ کہہ کر اس نے ایک دوسرے دروازے کی طرف دیکھا جہاں سے لیڈی پولیس کی حراست میں عائزہ برآمد ہوئی۔ اس کے چہرے پر شرمندگی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے ایک بار خرم کی طرف دیکھا اور پھر نگاہیں جھکا لیں۔

"یہ عائزہ ہے۔ یہ خود ہی بتائے گی کہ اس سارے معاملے میں اس کا کردار کیا رہا ہے۔" وہ چند لمحے خاموش کھڑی رہی پھر سسکتے ہوئے بولی۔

"خرم کے شہر جانے سے پہلے میں ایک بار نوکری کے سلسلے میں اذلان سے ملی تھی۔ اس نے نہ صرف مجھے نوکری دلوانے کی آفر کی تھی بلکہ یہ تک کہا کہ میں کیوں یہ چھوٹی موٹی نوکری کرنا چاہتی ہوں۔ اس نے مجھے بہت سبز باغ دکھائے۔ مجھ پر بہت خرچ کیا اور میں یہاں فارم ہاؤس پر ان سے ملنے کے لیے آتی رہی۔ اس وقت میں خود خرم سے جان چھڑانا چاہتی تھی۔ جب یہ سمیرا کے لیے نور نگر چھوڑ کر شہر چلا گیا تو میں نے یہی سنا تھا کہ وہ سمیرا سے شادی کرلے گا، تب اذلان نے مجھے لندن بھیجنے... کی آفر کی۔ پھر انہوں نے جو کہا میں کرتی چلی گئی۔ میرے اغوا والا سارا ڈراما تھا۔ میں جان بوجھ کر اسے کھیتوں میں لے گئی تھی کہ اگر یہ یہاں بچ گیا تو وہاں قتل کردیا جائے گا۔ اس ڈرامے کا مقصد صرف یہی تھا کہ خرم بھڑک کر سمیرا کو قتل کردے۔" عائزہ نے کہا اور رونے لگی۔

"اور بے چاری صائمہ، خرم اور سمیرا کے بارے میں پل پل کی خبریں اذلان تک پہنچاتی رہیں اور وہ اس دن ماری گئی۔ یہ ہے وہ ساری بات جو میں نے آپ سے کہنی تھی۔ اب آپ سب سے ہی فیصلہ چاہوں گا کہ اذلان کے ساتھ کیا کیا جائے؟"

سب پر خاموشی چھا گئی، کوئی بھی کچھ نہیں بولا۔ کتنا ہی وقت گزر گیا۔ تبھی اس بزرگ سیاست داں نے کہا۔ "اذلان، اپنی بہن سمیرا کا مجرم ہے۔ اس کے بارے میں وہی فیصلہ کرے گی کہ اسے کیا سزا دی جائے۔ بولو سمیرا بیٹی، کیا کہتی ہو؟"

"میں نے اسے پالا ہے، پرورش کرکے جوان کیا ہے۔ بتائیں ایک ماں اپنے بچے کو کیا سزا دے گی؟"

"یہ ماں کی عدالت سے تو بری ہو سکتا ہے لیکن قانون کی نگاہ میں مجرم ہے۔ مجھے تو اپنا فرض نبھانا ہے۔ قتل اور اغوا کو کہاں ڈالوں، بتائیں؟" ڈی ایس پی رضوان نے کہا۔

"ٹھیک ہے، جب آپ نے قانون کے مطابق سب کچھ کرنا تھا تو پھر ہم سب کو یہاں..."

"تاکہ بعد میں آپ ہی لوگوں نے میڈیا اور عدالت میں شور مچانا ہے۔ آپ سوچ لیں کیا کرنا ہے، میں انتظار کرلیتا ہوں۔" ڈی ایس پی رضوان نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"اور یہ خرم... اس کا فیصلہ کیا ہے، کیا یہ اب بھی عائزہ کو معاف کرسکتا ہے جو مجرم ہے؟ یہ بھی تو..." خاتون سوشل ورکر نے کہا۔ سب کی نگاہیں خرم کی طرف اٹھ گئیں۔ اگر وہ عائزہ کو معاف کردیتا... تو پھر یہ جواز تھا کہ اذلان کو بھی معاف کردیا جائے۔ تبھی خرم نے کہا۔

"سیانے کہتے ہیں کہ شادی اس سے کی جائے جو تم سے پیار کرتا ہو۔ سمیرا نے تو دو بار میرے لیے جان کی بازی لگا دی۔ میں عمر کو کوئی فرق نہیں سمجھتا۔ میں کسی بھی شرط کے بغیر سمیرا کی بات ماننے کو تیار ہوں۔ میں اس سے شادی کروں گا... اگر یہ مجھے قبول کرے تو۔"

اس کے یوں کہنے پر سب کے چہروں پر دھیمی سی مسکراہٹ آگئی جبکہ عائزہ پھوٹ پھوٹ کر رونے اور چلانے لگی۔ خرم نے اسے مسترد کرکے ہتک کا تیر مار دیا تھا جس پر وہ بلبلا اٹھی تھی۔ ایسے میں اذلان کھڑا ہوا، نہ جانے کس وقت اس نے ریوالور نکال لیا تھا جو اس نے اپنی کنپٹی پر رکھا اور ٹریگر دبا دیا۔

*